سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ سرگزشت کراچی
فروری 2016
کتاب دوست
ڈاٹ کام
www.kitaabdost.com
ملکہ موسیقی: پاکستان کی وہ گلوکارہ جس نے پوری دنیا میں شہرت کا ریکارڈ بنایا
فدائے اردو: اس محقق نے ثابت کر دکھایا کہ اردو دہلی نہیں پنجاب میں پیدا ہوئی
فرض مرض اور قرض: ایک شریف انسان کی بیچارگی کا بیان، خون کے آنسو رُلا دینے والی سچ بیانی

MEDICAM
MGC
Dentist's 1st Recommendation
10 PROBLEMS
SOLUTION
MEDICAM
MEDICAM

Shangrila
Hot Sauce
Soy Sauce

facebook.com/snscares

©
Care
Heel Cream
بیوٹی ٹریٹمنٹ
Care Heel Cream
Care Heel Cream
کیئر کے ساتھ!

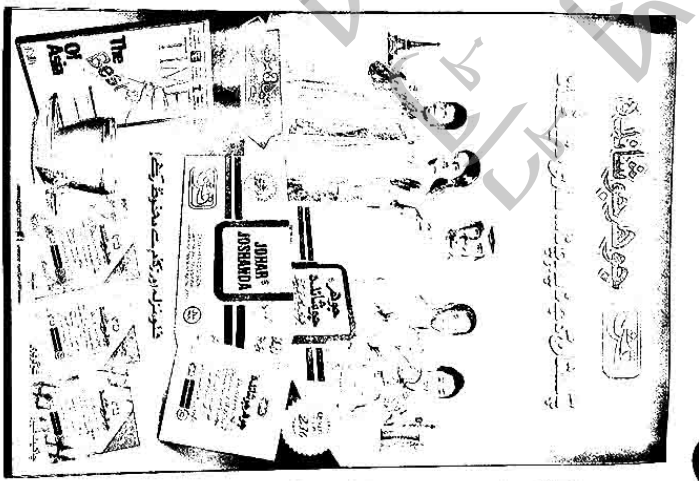
The Best Of Asia
JOGGING

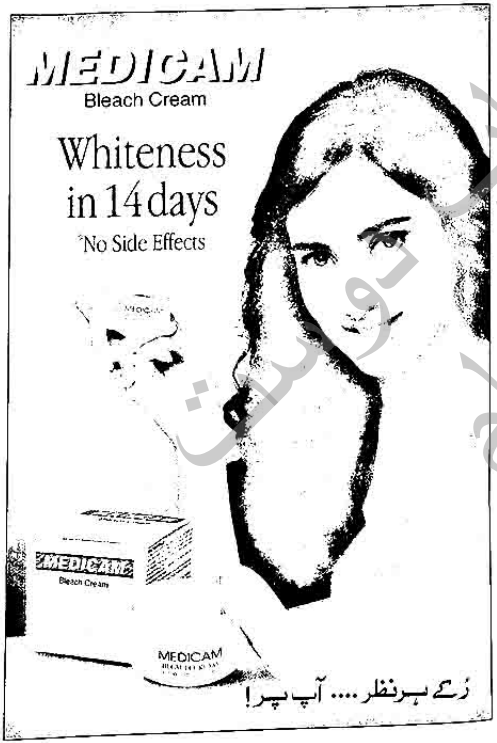

قرشی عرقِ گلاب

قرشی عرقِ گلاب کی خصوصیات:

جلد کو شگفتہ اور تر و تازہ رکھتا ہے
جلد میں نکھار پیدا کر کے چہرے کو رعنائی بخشتا ہے
آنکھوں کی جلن اور خراش وغیرہ میں مفید ہے

facebook.com/QarshiPakistan www.qarshi.com

Medora
Perfumed Talc
خوشبو جو دل کو بھائے
تازگی جو ہر کوئی چاہے
Medora
Pleasure
Cherish
Joy
Passion
Greetings
Dignity
Salute
خوشبو کی دنیا کے 8 شگفتہ احساس
MEDORA OF LONDON

Medora
Lipsticks with matching
Nail Polish
MATTE
IN 91 COLOURS
SEMI MATTE
IN 25 COLOURS
GLITTER
IN 21 COLOURS
Lipstick
GLOSSY
IN 28 COLOURS
Colours impossible to ignore
QUALITY
NAIL POLISH
REMOVER
MEDORA OF LONDON

16 شہر خیال تجربہ — ناولٹ
ناولٹ

تب کی باتیں آپ کے خیال آپ کے شوہر اور آپ کے سال

30 ندائے اردو — شخصیت
شخصیت

اس نے شخصیت سے روایت کو بدل دیا

51 پت جھڑ کے رنگ — سفرنامہ
سفرنامہ

کسی کو آنکھ خط محمدہ تحریر پڑھا نہیں جا سکتا ہے

57 انوکھے امراض — تحقیق
تحقیق

کیسے کیسے اسرار اس جسم کے راز ہے ہیں

61 ناز گا پربت کا عشق — سیر و سیاحت
سیر و سیاحت

ایک منفرد سفرنامہ اپنے ہی خطہ ارض کا

79 مرد بحران — کشمیر کہانی
کشمیر کہانی

کرگل کے ہیرو کیپٹن کرنے والوں کے لیے تحفہ

85 ملکۂ موسیقی — فلم نگری
فلم نگری

پاکستانی فلمی دنیا کی مدلیہ گلوکارہ کا احوال

97 میری کوم — فرد واحد رابطہ
فرد واحد رابطہ

اس نے عزم جیتنے سے ہتھیلی کا سفر طے کیا

103 تاریخ عالم — تاریخ
تاریخ

کرۂ ارض پر ہونے والی تبدیلیوں پر ایک نظر

109 فرد کی شخصیات — تجزیہ خاص
تجزیہ خاص

اس ماہ سے جھلکیاں اہم شخصیات کا ذکر خاص

125 نظریے — ملفوظات
ملفوظات

دنیا میں پہلے نظریوں پر ایک نظر

131 رسم شادی — رسم و رواج
رسم و رواج

شادی بیاہ کی دلچسپ رسموں کا تذکرہ

135 قدیم تہذیب — آثار یات
آثار یات

دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہمارے خطے کی

141 لڑاکو — طاہر خنجراں
طاہر خنجراں

انا کی تسکین کے لیے خون کی زبان بیسائے داؤں کا تذکرہ

148 سراب — عاشقیات
عاشقیات

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں کے گنہ بھی تھکتے فیروز استان

190 فرض مرض اور قرض — برلن سچ بیانی
برلن سچ بیانی

انسان بھی بعض اوقات کتنا مجبور ہوتا ہے

209 علم عروض — دوسری سچ بیانی
دوسری سچ بیانی

آج عمل کی لڑکیاں کیسے بے خوف بیانی ہیں

223 کینسر اور ریپیل — تیسری سچ بیانی
تیسری سچ بیانی

ایک بیوی کی گیند نے ٹڈے جسم کے پڑ ہوئے دیا

253 ٹھوکر — ہفتاوی سچ ملیشیا
ہفتاوی سچ ملیشیا

حسن اخلاق سے تسخیر دل آسان ہے

47 اے نئی — ہفتاوی سچ بیانی
ہفتاوی سچ بیانی

مسائل کیسے کیسے سائل کھڑے کرتی ہے

263 پراسرار خط — چوتھی سچ بیانی
چوتھی سچ بیانی

ایک خط جو خود کشی کی لہر دوڑا دی تھی

261 مذاق — پانچویں سچ بیانی
پانچویں سچ بیانی

کبھی مذاق سبھی کی عناد ترک کیسے کرنی چاہیے

265 اجنبی راستے — چھٹی سچ بیانی
چھٹی سچ بیانی

انسان نیکی کی تلاش گاڑی کا ایک موڑ

283 مانا زبوائے — پانچویں سچ بیانی
پانچویں سچ بیانی

عقل سے ہر غم کے جھگڑے نمٹائے جا سکتے ہیں

ماہنامہ ہر گز شت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی تحریر کا ادارے کے نام کی کسی بھی شکل کی اشاعت اپنی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ سرقہ دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● ادارہ کا اشتہارات یکسر حق کی ضمانت پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس سلسلے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے از تشفیح کیے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جب صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق باوضو صفائی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 26 ✡ شمارہ 01 ✡ فروری 2016ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ: عذرا رسول

شعبۂ اشتہارات
نیجر اشتہارات محمد شیراز عثمان 0333-2256789
نمائندہ کراچی محمد صفدر خان 0333-2168391
ذیشان جنید 0323-2895528
نمائندہ لاہور فرخ علی چشتی 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ✡ زرِ سالانہ 800 روپے

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول
مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن
مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ✡ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200
Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

آج دل کر رہا ہے کہ ایک کہانی سناؤں۔ بہت چھوٹی سی کہانی ہے۔
ایک صاحب نے موبائل ریپئرنگ کی دکان کھول رکھی تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ وہ دکان بند کرنے ہی والے تھے کہ ایک گاہک آگیا۔ اس نے موبائل آگے بڑھا کر کہا کہ یہ آن نہیں ہو رہا ہے۔ ان صاحب نے موبائل ہاتھ میں لیتے ہی کہا۔ چیک کرنے کی فیس تین سو روپے ہے۔ گاہک راضی ہو گیا۔ ان صاحب نے موبائل کھولا اور خالی ایک نظر میں پکڑ لی۔ انہوں نے نہایت پھرتی سے موبائل کے مائیک کا اسکرو ڈھیلا کیا اور مائیک کو دراز میں گرا لیا۔ ننھا سا پرزا گاہک کو کیسے نظر آتا کہ کب وہ دراز میں گرا۔ ان صاحب نے موبائل کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔ ایل سی ڈی اڑ گئی ہے۔ پاور سسٹم بیٹھ گیا ہے۔ کل ملا کر چار سے پانچ ہزار کا خرچ آئے گا۔ اتنی رقم میں بالکل نیا سیٹ مل جائے گا۔
یہ دیکھیے بالکل ایسا ہی سیٹ، قیمت صرف ساڑھے تین ہزار۔ چائنا کا ہے اس لیے سستا ہے۔ ان صاحب نے اپنا موبائل واپس لیا۔ ساڑھے تین ہزار میں نیا سیٹ خریدا چیکنگ کی فیس تین سو روپے دی۔ روپے لے کر ان صاحب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ دکان بند کرتے کرتے بھی چیکنگ کے تین سو، مائیک پانچ سو تک بک جائے گا وہ اور ایک ہزار نے سیٹ پر منافع مل گیا۔ اس نے دکان بند کی اور برابر والے آصف کی دکان پر پہنچا۔ وہ دونوں ایک ہی محلے میں رہتے تھے اس لیے رات میں ساتھ ہی نکلتے۔ آصف نے کپڑوں کی تہ لگاتے ہوئے کہا ایک محترمہ نے جان کھالی تھی۔ جو کپڑا دکھاؤ وہ اس کی سو دو سو قیمت کم لگاتی۔ بڑی مشکل سے تین سو روپے میٹر والا پانچ سو روپے میٹر پر تھمایا۔ دونوں نے قہقہہ لگایا اور دکان کو تالا لگا کر بس اسٹاپ کی طرف چل پڑے۔ رکشے والے سے پوچھا کہ نیو کراچی چلو گے۔ رکشے والے نے اثبات میں سر ہلا کر کہا لیکن تین سو لوں گا کیونکہ آج سی این جی بند ہے رات بھی زیادہ ہو رہی ہے خالی آنا ہوگا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور بڑبڑانے لگے۔ ”ہر ایک نے لوٹ مچا رکھی ہے، کیا ہوگا اس ملک کا۔“ رکشا ابھی کچھ ہی دور گیا تھا کہ دو بائیک سواروں نے انہیں روک لیا۔ پستول دکھا کر ان کے پرس اور موبائل چھین لیے ان دونوں نے اپنے خریداروں کو لوٹا تھا، رکشا والے نے سی این جی کی بندش کے بہانے ان کو لوٹا اور ڈاکوؤں نے سرِ راہ ان تینوں کو ہر چیز سے محروم کر دیا۔ جو جیسے آیا تھا ویسے ہی چلا گیا۔
بالکل یہی کچھ تو ہو رہا ہے پھر ہم کہتے ہیں کہ ملک بھر میں لوٹ مچی ہوئی ہے لیکن اپنا احتساب نہیں کرتے کہ اس لوٹ کا ذمہ دار کون ہے؟

معراج رسول

عکسِ داستان

مغربی پنجاب کا ضلع گورداس پور مسلم اکثریتی ضلع تھا اس ضلع میں ایک قدیم تاریخی شہر ہے بٹالہ جس کے چپے چپے سے مسلم تاریخ کے آثار جھلکتے دکھاتے تھے۔ یہاں آباد تمام کے تمام خاندان اپنی ایک تاریخ رکھتے تھے۔ انہی خاندان میں ایک خاندان مفتیوں کا بھی تھا۔ شہنشاہی کے دور میں اس خاندان کے کسی بزرگ کو مفتی کا خطاب عطا ہوا تھا تب سے یہ لاحقہ اس خاندان کے لیے ضروری ہو گیا تھا۔ اسی خاندان میں 12 ستمبر 1905ء میں اس نے جنم لیا۔ گھرانہ پرانی اقدار کا پجاری تھا۔ ماضی میں جینے والے لوگ تھے۔ گھر کا ہر فرد ”پدرم سلطان بود“ کی رٹ لگا کر تیر و بنائے ہوئے تھا۔ اس کے دادا کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا تھا۔ اس لیے اس کے والد کی پرورش اس کے دادا نے کی۔ باپ اور دادا کی پرورش کے انداز میں ایک نمایاں فرق آجانا ضروری ہے۔ والد کے پرداخت میں کڑا احتساب ضروری ہے جب کہ دادا کے انداز پرورش میں رحم و درگزر کا جذبہ غالب رہتا ہے۔ یہی اس کے والد کے ساتھ ہوا۔ دادا نے درگزر کا فیاضانہ رویہ اختیار کیا جس کی وجہ سے والد کے مزاج میں رنگینی کا عنصر کچھ زیادہ ہی در آیا۔ رنگ روپ کی محفلوں میں وقت گزرتا مگر انتہائی احتیاط کے ساتھ یہ راز کسی پر آشکار نہ ہو جائے اس کا خاص خیال رکھا جاتا۔ بیوی گھر میں راہ تکتی رہتی۔ ان حالات میں وہ پیدا ہوا۔ 1905ء میں اس کی ولادت ہوئی تھی اور 1910ء تک وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو محسوس کرنے لگا تھا۔ احساس کے آئینے میں اپنا تجزیہ کرنے پر قادر ہو گیا تھا۔ تب تک وہ گھر میں رہتے ہوئے بھی خود کو گھر سے دور محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کی نظروں میں گھر وہ تھا جہاں اس کے والد اور بچی امی رہتی تھیں۔ وہ تو اپنی ماں اور بڑی بہن کے ساتھ باہر بنے کمروں میں سے ایک میں رہتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا بن گیا تھا۔ گلی میں ہم عمر بچوں کی فوج چیخم دھاڑ مچائے رکھتی، طرح طرح کے کھیل کھیلتی لیکن یہ ان میں شامل نہ ہوتا، گلی میں جاتا تو دور کنارے ضرورت کے علاوہ اندرون خانہ بھی نہ جاتا۔ والد گورنمنٹ ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس لیے اسے بھی وہیں داخل کیا گیا تھا۔ پڑھنے میں بھی زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مارے باندھے پاس نمبر لیتا ہوا میٹرک تک جا پہنچا۔ میٹرک کے بعد اسے اسلامیہ کالج لاہور بھیجا گیا۔ وہاں بھی فطرت میں چھپی ازلی جھجک آڑے آئی۔ وہاں سے انبالہ کے بی ڈی پی ایم کالج اور اس کے بعد ہندو مہا سبھا کالج امرتسر چلا آیا۔ 1927ء میں وہ پھر سے اسلامیہ کالج لاہور آگیا۔ تھرڈ ایئر مکمل کرنے کے لیے 1929ء میں اس نے بی اے کر لیا۔ تعلیم سے فارغ ہوا تو پہلی جنگِ عظیم کا سانحہ ایک نئے روپ میں پھن کاڑھے سامنے کھڑا تھا۔ پوری دنیا مالی انحطاط کے زد میں آئی ہوئی تھی۔ دفتروں میں تخفیف کا کلہاڑا چل رہا تھا۔ نئی نوکریاں ناپید تھیں۔ وہ اسٹینوگرافر کی حیثیت سے کمشنر راولپنڈی کے دفتر میں لگ گیا لیکن یہ ملازمت بغیر تنخواہ والی تھی۔ تنخواہ والی ملازمت کے لیے اس نے سینٹرل ٹریننگ کالج میں داخلہ لے لیا۔ اس دوران اس نے مطالعہ میں بھی دلچسپی لینا شروع کر دی۔ ادب کی رنگینی پسند نہ آئی تو سنجیدہ مضامین میں دلچسپی لی۔ برٹرینڈ رسل، ہالڈین، نطشے، برگساں، فرائیڈ کو خوب پڑھا۔ 1931ء میں سینٹرل ٹریننگ کالج سے فارغ ہوا تو انحطاط کا عفریت مزید بھیانک ہو چکا تھا۔ پروفیسر کی تنخواہ 65 سے 120 روپے تک گر چکی تھی۔ پھر بھی اس نے تدریس کو پیشہ بنائے رکھا۔ انہی دنوں اس کی دوستی نذر محمد راشد سے ہوئی۔ راشد نخلستان نامی جریدہ مرتب کر رہے تھے اور ن م راشد کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے اس سے کچھ لکھنے کی فرمائش کی اس نے فرمائش کا تدنظر رکھتے ہوئے اردو نظم و لینن پر فطریہ مضمون لکھا۔ وہ مضمون ہیڈ ماسٹر کی نظروں سے گزرا تو انہوں نے گوجرہ ہائی اسکول کے سالنامے کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ بس اس نے گھر کے موضوع پر افسانہ ”جھاؤ“ لکھ دیا۔ ادبی دنیا ایک معروف جریدہ تھا اس کے ایڈیٹر کی نظروں سے افسانہ گزرا تو اس نے افسانے کی فرمائش کریں۔ 1936ء میں پہلا افسانہ ”جھکی جھکی آنکھیں“ چھپا۔ اس زمانے میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، غلام محمود بیدی کے افسانے خوب چھپ رہے تھے۔ منٹو روسی افسانوں میں ڈبکیاں لگا رہے تھے۔ غلام عباس گاہے گاہے لکھتے تھے اور یہ سب ادب برائے ادب کے قائل تھے۔ پھر ترقی پسندی کا شہرہ ہوا۔ تاثیر، حسن عسکری، احمد عباس، اپیندر ناتھ اشک میدان میں آگئے۔ اسی دوران چوہدری برکت علی نے اس کا پہلا مجموعہ ”ان کہی“ شائع کیا۔ اسے اتنا پسند کیا گیا کہ پے در پے چار مجموعے طبع ہوئے۔ 1945ء میں اس نے محکمۂ تعلیم چھوڑ دیا اور ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ 1947ء میں اپنی فلمی کہانی ”سلطانہ رضیہ“ لکھانے بمبئی چلا گیا مگر تقسیم کی وجہ سے واپس آگیا۔ کبھی فوج میں کبھی ریڈیو آزاد کشمیر میں تو کبھی محکمۂ اطلاعات میں نوکری کرتا رہا۔ اسی دوران میں اس نے اپنا معرکۃ الآرا ناول علی پور کا ایلی پیش کر دیا۔ جی ہاں یہ اسی ممتاز مفتی کی داستان ہے جسے علی پور کا ایلی نے امر کر دیا ہے۔ جو کچھ حد تک خود اس کی داستان کا عکس بھی ہے۔

شہر خیال

☆ عبدالجبار رومی انصاری نے لاہور سے لکھا ہے۔ ”اور تمہارے بس میں کر دیا جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کچھ غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (القرآن)۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں بہت سی نشانیاں رکھی ہیں جو بے حد پُراسرار بھی ہیں اور نہایت دلچسپ بھی اور ایسی نشانیاں کسی نہ کسی واقعہ یا کسی اتفاق کی صورت میں سامنے آتی رہتی ہیں اور ایسی پُراسرار اور دلچسپ چیزیں ہمیشہ ہی تجسس اور بے چینی میں مبتلا رکھتی ہیں ہر مذہب معاشرہ اور ہر تہذیب میں کسی نہ کسی طرح غیر مرئی وجود سے متعلق کوئی نہ کوئی تصور ضرور موجود ہوتا ہے اور انسان کا ایسی چیزوں سے سخت خوف زدہ ہونا ایک فطری عمل ہے لیکن اس کے باوجود ان سب کے بارے میں، جو بھی پُراسراریت قائم کرتی ہے، کے بارے میں جاننے کی خواہش سے انسان کبھی بھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا۔ آج کے دور میں بھی ایسے واقعات وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں کہ جنہیں سن کر دیکھ کر ہی پتا پانی ہو جائے۔ سرگزشت کا پُراسرار نمبر بھی بھرپور معلومات، واقعات اور مناظر قارئین کے ذہنوں میں انمٹ نقوش چھوڑ جائے گی۔ کاشف زبیر کی کہانی ”سراب“ تو پہلے ہی بہت پُراسرار ہے جو ایسے جانوروں، لوگوں کے درمیان گھومتی زبردست تحریر ہے جس کے واقعات پڑھ کے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ روشین سیاح جس ”نادیدہ عفریت“ کی بھینٹ چڑھے وہ بھی ایک پُراسرار معما ہی بن گئے کہ جن کی موت کا سبب معلوم کرنے والوں کی عقل نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا۔ ایسا ہی ایک واقعہ میں نے پڑھا تھا جس میں تین سو سال پرانی ممی کی تحقیق کرنے سات افراد جاتے ہیں اور وہ سب کے سب خوف ناک موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسری سچ بیانی بھی ٹھیک رہی۔ معمولی سی سرسراہٹ نے ذہن میں وہ جو پراسرار اور خوفناک فلمیں دیکھ رکھی تھیں انہی کا ڈر جگا دیا اور سویرا بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ تیسری سچ بیانی ”خواب یا سچائی“ بھی کافی دلچسپ رہی۔ ضلع قصور میں ایک مسجد واقع ہے جو جنوں والی مسجد کہلاتی ہے اس کے متعلق بھی کافی پراسرار باتیں مشہور ہیں۔ ”انسان نما“ بھی یاتی کو سمجھنے کے بے شمار واقعات ملتے ہیں لیکن کبھی میں یہی کہا گیا کہ وہ ریچھ یا گوریلا بن مانس کی طرح کا کوئی جانور ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا۔ ”خون آشام“ واقعی عجیب قصہ تھا جس کو پڑھ کے ہی جھرجھری سی آنے لگی۔ بھیڑیوں نے دو انسانی بچوں کو پالا اور پھر ان میں بھی ویسی ہی اپنی جیسی جبلت بھر دی کہ وہ خون آشام بن گئے۔ ”ننھے شیطان“ بھی کافی حیران کن تحریر تھی۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس طرح کے چھوٹے بچوں میں ایسی کون سی قوت ہوتی ہے جس کی بنا پر انہیں ماضی یا مستقبل کے واقعات کا علم ہو جاتا ہے اور یہی باتیں بڑوں کو حیران کن خوف میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ ”خوف ناک فلمیں“ تو کہانیاں پڑھنے سے بھی زیادہ ڈر خوف پیدا کرتی ہیں ایسے ایسے سین کہ دل دہل جائے اور کمزور دل حضرات تو اس کی تاب بھی نہیں لا سکتے۔ ”پردۂ اسرار“ میں خواجہ شمس الدین عظیمی سے متعلق بیش بہا معلومات پڑھنے کو ملیں جو کائنات کے اسرار پر بھی ایسی گہری نظر رکھتے تھے کہ ان کے دیے ہوئے فارمولے سائنس اور روحانیت کو یکجا کرتے نظر آتے۔ بے شک وہ ایک بڑی شخصیت تھے جن کا فیض آج بھی روحانی اور شعور قلندر کی صورت میں جاری ہے۔ ”توہم پرستی“ واقعی لایعنی ہے۔ فضول سے اعتقاد بنے ہوتے ہیں لیکن سمجھ نہیں آتا جب کوا بولتا ہے گھر کی منڈیر پر تو پھر مہمان کیوں آ جاتے ہیں۔ ”زومبی“ صرف خوف اور دہشت کی علامت، جن کا ہمارے ہاں کوئی وجود ہی نہیں صرف فلموں کی حد تک ایک تفریح ہے۔ ”مقامات خوف“ بھی عمدہ تحریر تھی ایسے مقامات تو ہر شہر، قصبہ اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ خود ہمارے ساتھ ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں، دلچسپی کے لیے ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک دفعہ میں اور چھوٹا بھائی شام کے وقت ریل کی پٹری پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ بہت دور سے ایک روشن نقطہ نظر آیا جو آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا تھا اور قریب آ رہا تھا۔ وہ ایک ویران جگہ تھی اور تھوڑی دور ہماری فیکٹری کا گیٹ تھا جہاں ہم کام کرتے تھے، ہم نے سمجھا شاید ٹرین آ رہی ہے لیکن وہ، جس طرح قریب آ رہا تھا اور بڑا ہو رہا تھا اس

نے ہمارے رونگٹے کھڑے کر دیے کیونکہ وہ ایک بڑے شعلے کا روپ دھار چکا تھا اور سیدھا ہماری طرف آ رہا تھا۔ بس پھر ہمارے تو پسینے چھوٹ گئے اور بھاگم بھاگ فیکٹری گیٹ پر جا کے دم لیا اور پیچھے مڑ کے دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ سرگزشت کا یہ پُراسرار نمبر پڑھا بہت ہی اچھا لگا جو مدتوں یاد رہے گا۔ منظر امام کے مطابق ایسے دلچسپ اور پُراسرار مقام تو تقریباً ہر جگہ ہی ہوتے ہیں اکثر سنی سنائی باتوں پر جانے کی بجائے ہم خود بھی اس پر غور و فکر اور تحقیق کریں تو بہت سے غیر معمولی انکشافات ہم پر وا ہو سکتے ہیں اور کسی بھی چیز کی کھوج کرنا ایک دلچسپ عمل ہے اور ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی ملتی ہے۔ اللہ ہم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔“

☆ اعجاز حسین سنھار کی آمد نور پور تھل سے۔ ”پُراسرار نمبر دیکھ اور پڑھ کر اس کے مضامین اور کہانیوں کا حصہ بن گئے۔ ہر سلسلہ تحیر میں ڈوبا ہوا۔ کچھ دنوں تک شاید یہ کیفیت ہر قاری پر طاری رہے۔ بہت ہی عمدہ رہا۔ حسب روایت ”جنوری کی شخصیات“ خاصے کی چیز رہی۔ اس بار منٹو، ذوالفقار علی بھٹو، خان عبدالغفار، چوہدری شجاعت، سلطان راہی، ظفر اللہ جمالی، ایدھی، واصف علی، پیر پگارا اور قرۃ العین حیدر کے متعلق پڑھ کر کئی نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ ”نانگا پربت کا عقاب“ یہ سلسلہ بڑا مزہ دے رہا ہے۔ ”سراب“ کے بارے میں صرف اتنا عرض ہے کہ اسے تسلسل اور روانی سے جاری رکھا جائے تو اعتراضات خود بخود دم توڑ جائیں گے اور کہانی کی مقبولیت بڑھے گی۔ اب سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ ”چھوٹا سا کام“ ایک بڑے کام کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور رابعہ کی زندگی کی مشکل آسان ہوئی اور اسے گویا منزل مل گئی دگرنہ ارشاد ایک نادیدہ بلا کی طرح اس کے وجود سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ ”سرسراہٹ“ جیسی کیفیت زندگی کے کسی لمحے ہر انسان کی ہو جاتی ہے۔ وہم کے ساتھ حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ حالت عارضی اور لمحوں پر محیط ہوتی ہے اس سے نکلنے کے لیے کلام الٰہی کی جو آیت یاد ہو یا درود اور کلمہ شریف کا ورد شروع کر دیا جائے تو میں یقین سے کہتا ہوں، دلی سکون حاصل ہوگا۔ ”خواب یا سچائی“ میں اس بحث میں نہیں جاتے کہ حقیقت کیا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ندیم کسی بڑے نقصان سے بچ گئے۔ ”خانہ خالی“ خوش گوار احساس پیدا کرنے والی کہانی ہے۔ ”دہشت کدہ“ طویل، دہشت ناک ہونے کے ساتھ دلچسپ روداد ہے۔ تسلسل اور روانی اچھا کو چھو رہی ہے۔ انسان کبھی ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے کہ بے بسی اور لاچارگی میں اذیت ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں لوگوں کے لیے تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔ سب دوستوں کو سلام اور نیا سال مبارک ہو۔ عمران خان ڈھیلی نامدار ضلع بھکر سے التماس ہے کہ وہ اپنی حاضری یقینی بنائیں۔ یوسف سانول کہاں کھو گئے ہو۔“

☆ محمد سلیم قیصر نے سینٹرل جیل ملتان سے لکھا ہے۔ ”معراج رسول صاحب آپ کی باتیں ہر پڑھنے والے کو افسردہ کرتی ہیں۔ آپ نے درست فرمایا شاید اسی سلسلے کی کڑی ہو، ہر تیسرے چوتھے روز خبر پڑھنے کو ملتی ہے کہ فلاں شہر میں فلاں جگہ زلزلے کے جھٹکے محسوس کیے گئے۔ اللہ امت مسلمہ کو کامل ہدایت بخشے، ہماری غلطیوں کو درگزر فرمائے، اللہ ہم سے راضی ہو۔ ”شہنشاہ اسرار“ بہت خوبصورت لگی۔ ”شہر خیال“ میں کرسی صدارت پر براجمان ناصر حسین رند کا انداز خوب بھایا۔ مبارک ہو جناب۔ تبصروں میں شمولیت ناصر حسین رند، فلک شیر ملک، ایم عمران جونانی، صائمہ نور، اویس شیخ، مرزا طاہر الدین بیگ، نذیر احمد رونجیوت، بہن سدرہ بانو ناگوری، عبدالحکیم شرر، آفتاب احمد نصیرا شرفی، احمد خان توحیدی، شاہد جہانگیر، بہن سلمیٰ اعوان، نزاہت انشال، بہن نجمی رحمن، وکیل الرحمن، عامر کریم، انور عباس شاہ، خالد محمود، عبدالباسط سومرو، عارف شیخ اور اکبر بخاری کے تبصرے بہت اچھے لگے۔ محترمہ سمیرا ساجد کا تبصرہ اور باتیں بہت پسند آئیں۔ محترمہ نجمی رحمن آپ نے پردیس میں بیٹھ کر ہمارے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا بہت شکریہ، اللہ آپ کو سلامت رکھے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے بھاگتے بھاگتے حاضری لگوائی کچھ تو اور بھی لکھا ہوتا۔ پہلی بار ”شہر خیال“ کا حصہ بننے والے معزز بھائیوں، بہنوں اور بڑوں سے اپیل کروں گا کہ لکھتے رہا کریں کیونکہ آپ سب قارئین بہت اچھے ہیں، اچھے خیالات کے مالک ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ محترمہ سمیرا ساجد کے تبصرے میں ایک لفظ مجھے ایسا اچھا لگا کہ مجھے میرا ماضی یاد آ گیا۔ اس بار جناب غنی عزیز اور قابل عزت باجی گل اور بہن بشریٰ افضل غیر حاضر ہیں اللہ کرے سب خیر ہو۔ ڈاکٹر قرۃ العین صاحبہ لگتا ہے روٹھ چکی ہیں انہیں منانے کا Task باجی گل کے سپرد۔“

☆ فلک شیر ملک کی آمد شاہ گڑھ رحیم یار خان سے۔ ”جاسوسی پبلی کیشنز سے میرا ایسا رشتہ ہے جیسے جسم و روح کا۔ عرصہ تیس سال سے رسائل پڑھ رہا ہوں اور اب خط اور تحریریں لکھنی شروع کی ہیں مجھے تو اپنے خط میں کوئی خاص کمی نظر نہیں آتی۔ شمارے کی ہر تحریر کی ایک ایک سطر پڑھ کر تبصرہ لکھتا ہوں مگر جانے کیوں کرسی صدارت پر جگہ نہیں ملی اور نہ کوئی تحریر چھپی۔ (ہر بار کے پہلے خط کو بغور پڑھیں، اہم بات ضرور نظر آ جائے گی۔ پہلا خط نسبتاً مختصر مگر جامع الفاظ کی ندرت کا حامل ہوتا ہے)۔ دسمبر کے سرگزشت میں میرے خط کے جواب میں کہا گیا تھا کہ میری دو تحریریں چھپی ہیں مگر نظر تو کہیں نہیں آئیں۔ کس رسالے میں شائع ہوئی ہیں اور کون سی

ہیں پلیز وضاحت کر دیجیے گا (سہواً ڈاکٹر بشر ملک کا جواب آپ کے خط میں شامل ہو گیا)۔ پُراسرار نمبر تقریباً بہتر ہی رہا۔ معلومات کے لحاظ سے زبردست تھا۔ باقی رہی بات پُراسرار کہانیوں کی تو وہ کچھ ماٹھی تھیں۔ ماسوائے سچ بیانیوں کے آخر دونوں سچ بیانیاں خوب تھیں۔ صائمہ نور بہاول پور کی ہیں یا ملتان کی پتا نہیں چلا کیونکہ ان کے نام کے ساتھ بہاول پور ملتان لکھا ہوا تھا۔ (بہاولپور روڈ ملتان، روڈ رہ گیا) موصوفہ نے لکھا ہے۔ ''میں کون ہوں'' تو صائمہ صاحبہ مجھے پتا ہے کہ آپ کون ہیں جس طرح میرے اور ڈاکٹر کاشف کے خیالات مماثلت رکھتے ہیں۔ اسی طرح آپ کی اور جائی کی تحریروں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس دفعہ بائیس نئے حضرات نے اس محفل میں شرکت کی، بڑی خوش آیند بات ہے۔ زیادہ تر نئے چہرے تھے، انہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔ کمال احمد رضوی کی وفات دل چیر گئی۔ تاریک بین، پردۂ اسرار، توہم پرستی، جنوری کی شخصیات، خبردار اور مقامات خوف بڑی اچھی معلوماتی تحریریں تھیں۔ ''ہارر فلمیں ڈرامے'' انور فرہاد نے پُراسرار اور ہارر فلموں اور ڈراموں کے متعلق بہت سی معلومات دیں۔ مریم کے خان کی ''نادیدہ عفریت'' میں جس پُراسرار مخلوق کا تذکرہ ہوا ہے حیرت انگیز ہے۔ اتنا بڑا اور چوڑا پاؤں کسی انسان کا ہو بھی سکتا ہے کیونکہ کچھ لوگوں کے قد اور ہاتھ پاؤں بڑے بھی ہوتے ہیں (ایک ڈیڑھ فٹ لمبے پاؤں؟) پانچوں سچ بیانیاں اچھے انداز میں تحریر کی گئی تھیں مگر ''خانہ خالی'' اور ''دہشت کدہ'' ٹاپ پر رہیں کیونکہ ''خانہ خالی'' میں دونوں لڑکیاں پُراسرار تھیں اور سنسان حویلی میں جو واقعہ بیان ہوا زبردست تھا اور ''دہشت کدہ'' میں قرآن کریم یعنی سورۃ بقرہ کی فضیلت سے وہ جن نما درندہ معصوم بچی مریم کی جان چھوڑ گیا۔ نیازی صاحب جیسے مسیحا آج بھی موجود ہیں مگر ملتے کم کم ہیں کیونکہ ڈبہ پیروں اور جعلی لٹیروں نے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے۔''

☆سدرہ بانو ناگوری کا تجزیہ کراچی سے۔ ''سال نو کا نیا شمارہ ذرا لیٹ ملا۔ سرورق مناسب تھا۔ اداریہ پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔ پیارے نبیؐ نے بیٹیوں کو رحمت کہا تھا لیکن آج اسی رحمت کو ظلم زیادتی اور ہوس کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں تو صرف اسے زندہ دفن کیا جاتا تھا لیکن آج کے جدید دور کے شریف زادوں نے اس کا تماشا بنا کر رکھ دیا۔ ''شہنشاہِ اسرار'' میں شیخ سعدی کی سعادت مندی کے کیا کہنے۔ ''معبر خیال'' میں ناصر حسین نے ہمارے خطوط کو سراہا، بہت شکریہ جی۔ شاہد جہانگیر ہم نے تو سنا تھا کہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا، آپ نے وہ گانا نہیں سنا ''دل تو بچہ ہے جی تھوڑا کچا ہے جی''۔ سلیم قیصر مایوس نہ ہوا کریں آپ کے لفظوں سے تو ہمیں حوصلہ ملتا ہے۔ مجی رحمٰن ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ کمال احمد رضوی کو دیکھ کر ہمیں علی سفیان آفاقی کی شدت سے یاد آئی۔ 27 جنوری 2015ء سے 27 جنوری 2016ء تک کوئی شمارہ ایسا نہیں تھا جب ہم نے ان کو یاد نہ کیا ہو۔ ''پردۂ اسرار'' پڑھ کر روح اندر تک سرشار ہو گئی۔ ''جنوری کی شخصیات'' میں واصف علی واصف ہماری پسندیدہ شخصیت ہیں۔ تین چار سال پہلے ہم نے فرمائش کی تھی کہ ان پر مکمل زندگی نامہ لکھا جائے۔ ''ننھے شیطان'' دلچسپ سروے ہے۔ شکوک و شبہات کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بچے من کے سچے ہوتے ہیں۔ منظر امام نے کراچی کے خوفناک مقامات سے خبردار کر کے ڈرا ہی دیا۔ ''خوفناک فلموں'' کا تذکرہ بھی خوب تھا گو کہ فلمیں بہت پسند کی جاتی ہیں مگر کچے ذہنوں میں ان ڈراموں اور فلموں کے ذریعے جو ڈر اور خوف بٹھایا جا رہا ہے ان کا مداوا کون کرے گا؟ ''خون آشام'' ناقابل فراموش حقیقت ہے۔ عقل حیران ہے کہ واقعی یہ سب ممکن ہے۔ ''توہم پرستی'' دلچسپ انداز میں لکھی گئی، یہ وراثت کی طرح لگتی ہے جو نسل در نسل چلتی جا رہی ہے۔ ہمارے ہاں تو توہم پرستی عام ہے لیکن تعلیم یافتہ اور مہذب مغرب بھی اس سے اپنا دامن بچا نہ پائے۔ ابن کبیر کے ''مقامات خوف'' کسی بھی کمزور دل شخص کو خوف زدہ کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ خوف ایک فطری عمل ہے لیکن کیسا عجیب بھی ہے کہ پیدا ہونے والی چیزوں کا خوف تو دلوں میں ہے مگر پیدا کرنے والی ذات کا کوئی خوف نہیں۔ ''ناٹکا پربت'' کی دلکشی میں ایسا کھوئے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا اور جاری ہے کے چمکتے لفظوں نے حقیقت کی دنیا میں واپس لا پٹخا۔ پہلی سچ بیانی ''چھوٹا سا کام'' میں مصنفہ بہت بڑا کام کر گئی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ اس کی یہ نیکی آسمانوں کے دریچے اچانک وا کر جائے گی۔ ''سرسراہٹ'' سنسنی خیز رہی ایک ذرا سی غفلت نے اتنی بڑی مصیبت پیدا کر دی۔ آخری سچ بیانی میں کیا کچھ نہیں تھا۔ دکھ، اذیت، تکلیف، ڈر کہ پڑھ کر دل دہل گیا۔ مریم پر جو کچھ گزری ان اذیت ناک لمحوں کا تصور ہی پلکیں بھگو گیا۔ آخر میں آپ کا آپ کی پوری ٹیم اور تمام لکھنے والوں کا بے حد شکریہ کہ ہمارے لیے اتنا مکمل اور بہترین نمبر ترتیب دیا۔''

☆صائمہ نور نے ملتان سے لکھا ہے۔ ''سال نو کا سرگزشت ملا۔ ٹائٹل نے گرویدہ بنا لیا۔ پُراسراریت ہی پُراسراریت، سال نو کی مبارک باد وصول کرتی اداریہ میں قدم جمائے۔ معراج رسول صاحب نے فعل قبیح کی سزا سنائی بتائی ہے۔ اب تو مسلمان کا لفظ بھی شرمندہ کر دیتا ہے۔ مغرب کی تمام برائیاں مشرق والوں نے اپنا لی ہیں۔ آزاد خیالی نے فحاشی، عریانی کو طول دیا ہے۔ بے پردگی اور غیر اخلاقی فلموں کا سر عام مل جانا، برائیوں کی طرف دھکیل رہی ہے۔ مقام عبرت ہے۔ مسلمان بڑی بڑی کتب کا حوالہ تو دیتے ہیں لیکن عمل نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ اخبارات اور بے تحاشا چینلز نے بے حیائی کو عام کیا ہے۔ ''شہنشاہِ اسرار'' شیخ سعدی کمال

شخصیت کے مالک ہیں۔ مجھے ان کی شخصیت پر لکھی کتابیں پسند ہیں۔ ''معبر خیال'' میں ناصر حسین رند کا معلوماتی خط جامع اور جاندار تھا۔ فلک شیر ملک کبھی رحیم یار خان سے کبھی شاہ گڑھ سے آتے ہیں۔ اصل مقام کون سا ہے؟ تبصرہ جاندار تھا۔ محمد سلیم قیصر اللہ تعالیٰ آپ کو روحانی عطا فرمائے آمین۔ ایم عمران جونانی، اویس شیخ، مرزا طاہر الدین، نذیر احمد راجپوت، سدرہ بانو ناگوری، عبدالحکیم شرر، آفتاب احمد نصیر اشرفی، احمد خان توحید کو سلام، شاہد جہانگیر شاہد، اللہ تعالیٰ صحت عطا فرمائے، آمین۔ وکیل الرحمٰن، انور عباس شاہ، خالد محمود، عبدالباسط سومرو، عارف شیخ، اکبر بخاری، ''معبر خیال'' میں تبصرے سے سرگزشت کو رونق بخشے ہوئے تھے۔ کمال احمد رضوی کے بارے میں تذکرہ خوب رہا۔ ''خون آشام'' صداقت حسین ساجد نے خوب صورت جملوں میں تحریر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ''سرسراہٹ'' اپنے سحر میں قید نہ کر سکی البتہ ''خواب یا سچائی'' نے اپنے سحر میں قید کر لیا۔ سادھو کو ٹھیک سزا ملی تھی۔ سرورق کہانی خوب رہی۔ ''ناٹکا پربت کا عقاب'' کمال کا تھا۔ ''ننھے شیطان'' پڑھ کر مزہ آ گیا۔ ''جنوری کی شخصیات'' سے تعارف اچھا رہا۔ خبردار نے خبردار ہی کر دیا۔ مقامات خوف، مذہبی، توہم پرستی، پردۂ اسرار، تاریک بین، انسان نما، نادیدہ عفریت نے پُراسراریت سے نکلنے نہیں دیا اور اگر پورے سرگزشت کی بات کی جائے تو پُراسرار نمبر، شاندار، جاندار اور معلوماتی مواد کے ساتھ بہت پسند آیا۔ میری طرف سے مبارک باد۔''

☆انور عباس شاہ کا خلوص نامہ بھکر سے۔ ''نئے سال کا پہلا شمارہ پُراسرار نمبر کی صورت میں ہم تک پہنچ چکا ہے۔ یہ شمارہ بھی پہلے والے نمبروں کی طرح لاجواب تھا۔ تمام بہن بھائیوں کے خطوط بے حد شاندار تھے نئے آنے والوں کو خوش آمدید اور آتے رہنے کی تاکید۔ منظر امام کا مضمون ''خبردار'' ہمارے حساب سے اس شمارے کی نمبرون تحریر تھی۔ اس میں شامل عمارتوں کے متعلق معلومات اور پیش آنے والے واقعات نے ہمارے بھی رونگٹے کھڑے کر دیے۔ ابن کبیر کی تحریر ''مقامات خوف'' کی تعریف کے لیے نہ تو ہمارے پاس الفاظ ہیں اور نہ ہی کوئی فیصلہ کیونکہ اس تحریر نے ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی منجمد کر دی۔ اس میں شامل شیطانی تکون کے متعلق مضمون ہم پچھلے پُراسرار نمبروں میں تفصیل سے پڑھ چکے ہیں نہ جانے کیوں اس مضمون کو بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ تصویروں نے دلکشی میں اضافہ کر دیا کیا یہ تصویریں اصلی تھیں یا فرضی (مضمون کے ساتھ اصل تصویر ہی دی جاتی ہے) اب پُراسرار نمبر کی تشنگی تو کسی حد تک ہماری دور ہو چکی ہے اگر ہو سکے تو اگست 2016ء کا شمارہ بطور آزادی نمبر نکالیں تو مہربانی ہوگی اسی نمبر میں ان حالات و واقعات کو اجاگر کریں جو کہ 1947ء میں آزادی کے وقت ہمارے بزرگوں کے ساتھ پیش آئے تھے۔ ایک مشورہ اور کہ علمی آزمائش کا جواب دیتے وقت آپ اس شمارے کا حوالہ بھی دے دیا کریں جس میں اتنی شخصیت کا تذکرہ شائع ہوا تھا (نمبر شمار جواب کے ساتھ درج ہوتے ہیں)۔''

☆اویس شیخ کی خیال آفرینی اس بار رحیم یار خان سے۔ ''سمیرا ساجد کا نام ہی کافی ہے۔ انہوں نے جس طرح اپنے دکھ، کرب اور مستقبل کے اندیشے ظاہر کیے۔ حب الوطنی کا بہترین مظاہرہ تھا۔ ہمارے معاشرے میں حقیقی معنوں میں عورت کے احترام کو اہمیت ہی نہیں دی جاتی جب کہ ہمارے مذہب میں عورتوں کے تقدس کو کس قدر اہمیت دی جاتی ہے، اس کا اندازہ ایک سکھ رہنما کے بیان سے لگانا چاہیے۔ وہ لکھتے ہیں جب میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے اسلام صرف عورتوں اور مظلوموں کے لیے بنا ہے۔ جب رات کے آخری پہروں میں فکری اور اخلاقی تربیت کا دامن نہ چھوٹے تو پھر ''شہنشاہ اسرار'' جیسے ہی پیدا ہوں گے۔ تحریر کا انداز بیان خوب تھا۔ ''معبر خیال'' میں انٹری دی۔ آغاز میں ہی خط کی چوتھی سطر میں آپ نے لکھا۔ ''سرگزشت کا ہر شمارہ خاص ہوتا ہے۔'' نہیں! بالکل نہیں۔ بلکہ اویس شیخ کے لیے ہر شمارہ ایک دستاویز ہے۔ اس دستاویز کا ایک شاہکار ''بینا نابینا نمبر'' تھا۔ اب تک پتا نہیں کتنی بار پڑھ چکا ہوں مگر تشنگی ابھی باقی ہے۔ عمران جونانی میرے روبرو حاضر تھے۔ اچھا لگا۔ سدرہ صاحبہ کے خطوں میں پختگی کے آثار نظر آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ عبدالحکیم شرر کے خیالات سے سو فی صد متفق ہوں کہ انسان جس شخص کو دھوکا دے کر ایسی بے ہودہ حرکات کا ارتکاب کرتا ہے اعتراف بھی اسی کے سامنے کرنا چاہیے۔ شاہد جہانگیر صاحب صحت اچھی ہو، زندگی میں سکون ہو تو میرا خیال ہے اس کے بعد کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مجی رحمٰن کی سات سمندر پار سے آمد سرگزشت سے والہانہ محبت کا ثبوت ہے۔ اس بار شمارے میں صرف پانچ سچ بیانیاں تھیں۔ اتنی کم کیوں تھیں؟ حالانکہ خاص نمبر تھا (خاص نمبر میں سچ بیانیاں کم رکھ کر معلوماتی تحریر زیادہ دی جاتی ہے۔ سرگزشت معلومات کو اہمیت دیتا ہے)۔ پہلی سچ بیانی ''چھوٹا سا کام'' جس طرح پہاڑ کو چکنا چور کرنے کے لیے ذروں کو سرکانا ضروری ہوتا ہے اسی طرح بڑے کاموں کی تکمیل کے لیے چھوٹے چھوٹے کام نمٹانا ضروری ہوتے ہیں۔ ''سرسراہٹ'' پسند نہیں آئی۔ ''خواب یا سچائی'' کو حقیقت میں پرکھا جا سکتا ہے۔ ''خالی خانہ'' بھی کسی تجربے یا عجوبے سے خالی کہانی نہیں تھی۔ اظہار محبت کا معاملہ دلچسپی سے خالی نہیں تھا۔ ''دہشت کدہ'' تو کسی ہارر مووی کا اسکرپٹ لگ رہی تھی مگر اس کہانی کے صفحہ 289 پر ایک جملہ تھا'' بے

پناہ قصہ اور جنون میں انہوں نے یہ کام کر دکھایا" مگر ایسی صورتِ حال کے لیے ایک دانشور نے لکھاریوں کے جہاں میں منٹوں اور لمحوں کے اندر انقلاب آجاتا ہے۔ بس اسے جوش دلانے اور حوصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس انقلاب کی چنگاری سے فرد، معاشرہ اور قوم کے انقلاب وابستہ ہیں۔"

☆ بشریٰ افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ "نا مکمل واقعی پُراسرار ہی تھا۔ خوف و دہشت کی علامت۔ انکل کا تجزیہ پڑھا ان کی باتوں میں واقعی وزن ہے اس کے بعد "شہنشاہِ اسرار" پڑھا۔ ایک ہی صفحے میں معلومات کا ذخیرہ موجود تھا۔ "عشیرِ خیال" میں داخل ہوئے ناصر حسین رند۔ سالانہ رپورٹ کے ساتھ موجود تھے۔ پرانے لکھنے والے ساتھی کہاں غائب ہو گئے اب تو نئے لوگ بھی آرہے ہیں اور اچھا لکھ رہے ہیں۔ مرزا طاہر الدین، سدرہ بانو نا گوری، آفتاب احمد نصیر اشرفی کے تجزیے پسند آئے۔ عابد دلت کو تو ساتھیوں نے بھلا ہی دیا۔ ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کریں گے اس "عشیرِ خیال" کے باسی! کمال احمد رضوی کی وفات کا پڑھ کر دکھ ہوا ان کے بارے میں مختلف آرا لوگوں کی سنیں۔ "خواب یا سچائی" پڑھا مجھے تو خواب ہی لگ رہا تھا انہونیاں بھی تو دنیا ہی میں ہوتی ہیں نا۔ "سرسراہٹ" میں سویرا اگر ڈراؤنی اور خوف ناک کہانیاں اور فلمیں نہ دیکھتی تو کیوں ڈرتی۔ اسی وجہ سے خوف اس پر غالب آگیا۔ "جنوری کی شخصیات" سے مکمل اور جامع معلومات حاصل ہوئیں۔ "توہم پرستی" بھی تحریر پسند آئی۔ "خون آشام" کہانی کا ٹمپو تیز تھا اس کہانی نے تو رونگٹے کھڑے کر دیے جانوروں میں بھی ممتا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ "نانگا پربت کا عقاب" بہت پسند آئی۔"

☆ خالد محمود ملتان کینٹ سے لکھتے ہیں۔ "محترم معراج رسول السلام علیکم! اس دفعہ رسالہ 4 جنوری 2016ء کو ملا۔ کافی انتظار کرنا پڑا۔ ایک وجہ تو اپنے خط کا انتظار تھا۔ دوسرا خیال تھا کہ سالنامہ ہوگا اور تیسرا خیال تھا "سراب" کی جگہ کسی نئی داستان کا۔ رسالہ پڑھنا شروع کیا اور تین روز بعد رسالہ ختم۔ اس میں ماسوائے ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر کے تمام رسالہ کی ورق گردانی میں گزر گیا۔ تھوڑا سا رسالہ جنوری کی شخصیات نے مہیا کیا اور باقی سب کچھ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا مگر کامیابی نہ دار دو۔ بے حد مایوسی ہوئی۔ جتنی خوشی پچھلے ماہ ہوئی تھی اتنی ہی بے زاری اور افسوس جنوری 2016ء کا پرچہ دیکھ کر ہوئی (جب کہ مارکیٹ رپورٹ بہت زیادہ اچھی آئی۔ وقت سے بہت پہلے اضافی پرچے بھی کم پڑ گئے دراصل ہر ایک کی پسند جدا بھی تو ہوتی ہے)۔ خدا کے لیے اپنے رسالہ سرگزشت میں نئے تجربے نہ کریں اور اس کو اس کی اصل اور بنیادی شکل میں رہنے دیں (سرگزشت کا خاصہ بھی ہے کہ یہ اپنے بنیادی ڈھانچے، معلومات کی ترسیل پر ہنوز قائم ہے۔ اس کا ہر خاص نمبر اہمیت کا حامل ہوتا ہے لیکن معلومات کو فوقیت دی جاتی ہے)۔"

☆ فرزانہ نگہت کا خلوص نامہ اسلام آباد سے۔ "میرا نام شاید آپ کے لیے اجنبی نہ ہو۔ ایک افسانہ اور دو خط پاکیزہ میں چھپے تھے۔ میں جس طرح پاکیزہ کی پُرجوش قاری چلی آرہی ہوں اسی طرح سرگزشت کی بھی ہوں۔ یہ ہمہ صفت رسالہ اپنے پہلے شمارے سے ہی دل میں ایسا گھر کیے ہوئے ہے کہ کوئی اس کا مدِمقابل نہیں دکھائی دیتا۔ نہ اس کی طرح میری طرف سے پسندیدگی اور محبوبیت کی سند حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔ اس کی ہر چیز اپنی جگہ بے مثال ہے۔ معلوماتی مضامین، پُروقار تراجم، تحقیقاتی کام، اعلیٰ ترین اور دلچسپ ترین سلسلہ وار کہانیاں، انتہائی متاثر کن سچی داستانیں، مذہبی شخصیات تک پر مضامین۔ تعریف کے الفاظ نہیں دل جو سا کچھ محسوس کرتا ہے وہ زبان قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔ عرصہ سے تمنا تھی کہ میں بھی اس انتہائی پُروقار رسالے میں جگہ پا لوں۔ اس کے مزاج، رنج اور روپے کو دیکھتے ہوئے میں نے یہ دو تحریریں تیار کی ہیں۔ آپ پڑھیے، رائے دیجیے (جلد پڑھ کر مطلع کر دیا جائے گا)۔"

☆ احسان سحر کا میانوالی سے نامۂ خاص۔ "ہر کسی کے دل میں ایک خاص چیز کا مقام ضرور ہوتا ہے۔ ہمارے دل میں بھی ہے جسے سرگزشت کہتے ہیں جو ہر ماہ ہم سے ضرور ملتا ہے۔ یہ ہمارے دل میں ایسے بسا ہے جیسے رات کے دل میں چاند ہے اور جیسے پھول کے وجود میں خوشبو۔ خاص انسان ہو یا خاص چیز اس کا کبھی کو انتظار رہتا ہے۔ بعد انتظار سرگزشت کا خاص شمارہ آیا۔ معراج انکل سے آغاز کیا۔ ایسے واقعات اب روز کا معمول بننے لگے ہیں معاشرے کے بے حس اور گم انسانوں کے بیچ ایسے قبیح واقعات جاری و ساری رہیں گے کیونکہ ہوس روپے کی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ "شاہِ اسرار" میں شیخ سعدی کے حوالے سے مضمون بہت پسند آیا۔ انسان چاہے تو کیا نہیں کرسکتا بس بات چاہنے کی ہے۔ اپنے دوستوں کے درمیان پہنچے تو پہلی ملاقات ناصر حسین سے ہوئی۔ چیدہ چیدہ پُراسراریت کے حوالے سے مضامین کی یادآوری کرتے نظر آئے۔ ایم عمران جونانی آپ کے نانا جان کا سن کر بے حد افسوس

ہوا۔ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔ سدرہ بانو بہت اچھا لگا کہ آپ نے طاہرہ گلزار کی باتوں کو دل پر نہیں لیا۔ اچھے انسانوں کی یہی خوبیاں انہیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں۔ عشی عزیز مئے آپ نے ہمیں دل سے یاد کیا اور ہم حاضر ہیں۔ باقی سب دوستوں کے محبت نامے بھی اچھے تھے۔ باقی دوستوں جن میں رضوان تنولی، طاہرہ گلزار، مرزا طاہر الدین بیگ، انور عباس شاہ، شاہد جہانگیر آپ کے لیے دل سے دعائیں ہیں، اللہ پاک آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے، آمین۔ ڈاکٹر قرۃ العین حیدر، ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری سب کو سلام۔ آپ سب میرے دل میں دھڑکن کی طرح ہو پہلا مضمون تاریک جن اور ایک سیاہ اور بدکار انسان کا احوال ملاحظہ کیا۔ شروع میں اپنے بھائی کی موت پر جذباتی ہونے والا آگے جاکر ابلیس صفت نکلا۔ توہم پرستی کے حوالے سے اسماء صدیقی مختصر مگر معلوماتی مضمون لائیں مگر حیرت مجھے اس وقت ہوتی ہے جب پرندوں کے علاوہ ہم انسان اپنے جیسے انسانوں کو بھی منحوس قرار دیتے ہیں۔ فلاں شخص سے راستے میں سامنا ہوا اب تو سفر اچھا نہیں گزرے گا۔ کیسی کیسی سوچیں ہمیں اپنے نرغے میں لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ "جنوری کی شخصیات" بہت ہی خوب صورت سلسلہ ہے۔ سعادت حسن منٹو، احمد فراز، عبدالستار ایدھی، سلطان راہی، احمد حسن دانی، ضیاء سرحدی، قرۃ العین حیدر، حکیم سعید، عارفہ کریم، اصغر خان، جی ایم سید جیسے نایاب لوگ ہمارا سرمایہ ہیں اور رہیں گے۔ "زومبی" ایک فضول بے ہودہ خیال پر مبنی مضمون تھا۔ پسند نہیں آیا۔ "ننھے شیطان" مضمون کے حوالے سے مضمون کا نام جچ نہیں پایا۔ شیطانوں والی بات یہاں نظر تو نہیں آئی۔ قدرت کی طرف سے چھوٹے بچوں کو جو ملاحیت اور معصومیت دی گئی ہے اسے شیطانیت سے منسوب کرنا غلط ہے۔ "خبردار" خاص خاص مقامات کے حوالوں سے مضمون اچھا لگا۔ جہاں کہیں کسی کے دیکھے جانے اور آوازوں کا سلسلہ جڑا رہا ایک دو مقامات پر خود مصنف کی گواہی دینا اچھا لگا۔ "مقاماتِ خوف" خوب صورت اور معلوماتی مضمون رہا۔ ہارر فلموں اور ڈراموں کے حوالے سے معاف کیجیے گا لگتا ہے انور فرہاد نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ کچھ بھی تفصیل سے نہیں لکھا جلدی جلدی ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ کچھ نہ کچھ تفصیل تو لکھنی چاہیے تھی۔ نادیدہ عفریت کے حوالے سے محض پیش گوئیاں کی جارہی ہیں کوئی قابلِ ذکر بات سامنے نہیں آئی۔ اسرار کے پردے میں گم ہے یہ حادثہ ابھی تک۔ "انسان نما" بھی نادیدہ عفریت سے کافی حد تک ملتا جلتا مضمون رہا۔ فرق صرف پائے جانے میں ہے۔ غیر ممالک کے سیاحوں اور دوسرے شوقین حضرات کی کتابوں سے پیش گوئیاں معلوماتی رہیں۔ دوسروں کو بھی محض اس لیے رد کر دیا گیا کہ انہوں نے ذکر تو کیا پر ثبوت نہ دے پائے یہ بھلا کیا بات ہوئی۔ "سراب" اختتام کی جانب گامزن ہے۔ سیدھی بوچھیں تو اب بوریت ہونے لگی ہے ہر قسط میں جنگ کا پڑھ پڑھ کر۔ پہلی سچ بیانی سے آغاز کیا۔ پر اس بات سے میں متفق ہوں کہ زندگی میں انسان کو اگر کامیاب ہونا ہے تو وہ چھوٹے چھوٹے کام سرانجام دے جو دیکھنے میں بہت پیچیدہ نظر آتے ہوں۔ آسانی سے چل کر منزل کی جانب پہنچنے والوں کو منزل کی صحیح طرح سے قدر کا احساس نہیں ہوتا۔ "سرسراہٹ" دوسری سچ بیانی جو حقیقت کے قریب لگی۔ واقعی باہر سے زیادہ ڈر انسان کے اپنے اندر موجود ہوتا ہے جو کبھی چھوٹی سی چیزوں اور کبھی بڑی چیزوں یا واقعات کے وقوع پذیر ہونے پر ہمارے اندر اچھل اچھل کر اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ "خواب یا سچائی" سبق اور آگاہی دلاتا واقعہ تھا۔ مسلمان قوم جنات اتنی بھی ظالم نہیں ہوتی انسانوں کی طرح ان میں بھی اچھے اور برے جنات ہوتے ہیں لیکن اپنے اصولوں کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے۔ "خانہ خالی" ہم نے بھی پڑھتے وقت نہ اس میں دلچسپی کو مدِنظر رکھا اور نہ ہی کسی اچھے سبق کی توقع۔ بس عام سے انداز میں اس کو لیا جیسے دو تین دوستوں کے درمیان مکالمے بازی شروع ہو اور واقعی ایسا ہی ہوا اور اینڈ تک کوئی قابلِ ذکر بات دیکھنے کو اور پڑھنے کو نہ ملی۔ "پردۂ اسرار" زبردست رہا۔ سید محمد اعظم کے حوالے سے مضمون نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ "نانگا پربت کا عقاب" بہت ہی خوب صورت سلسلہ ہے۔ سچ معنوں میں اپنے ملک کی خوب صورتی اور کچھ جاننے کا موقع۔ وہ بھی اتنے خوب صورت الفاظ، شیریں لہجے کے ساتھ پہلی دفعہ پڑھنے کو مل رہا ہے۔ اللہ کرے یہ سلسلہ خاصا طویل ہو اور اگر طویل نہ ہو تو موصوف کے سفرنامے وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہیں۔ اُمید کرتا ہوں مجھے بلکہ قارئین سرگزشت کو مایوس نہیں کیا جائے گا۔ لیجنڈ اداکار کمال احمد رضوی کے حوالے سے مختصر مضمون آگاہی کے لیے کافی تھا۔ ایسے لوگ ہمارے ملک کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ پر افسوس یہاں پر سرمایوں کی قدر نہیں کی جاتی۔"

☆ سعید احمد چاند کا نامہ خلوص کراچی سے۔ "چار پانچ ماہ کے وقفے سے "عشیرِ خیال" میں داخل ہو رہا ہوں۔ کیا خبر داخلہ نہ ملے۔ ایک دو باتوں کی معلومات چاہتا ہوں رسالہ کس تاریخ کو مارکیٹ میں آتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ "عشیرِ خیال" میں داخلہ کی آخری تاریخ کیا ہے تاکہ ہم ان باتوں کو ذہن میں رکھیں۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ "عشیرِ خیال" میں لکھنے کی یا تو میں تاریخ سے لیٹ ہو جاتا ہوں یا محکمہ ڈاک والے کی کوئی شرارت ہے (اب یہی دیکھیں 3 دسمبر کا خط آج 19 جنوری کو ملا) میں رسالہ باقاعدگی سے پڑھتا ہوں اب تو دو تین سال سے سسپنس بھی باقاعدگی سے خریدتا ہوں۔ اس دفعہ رسالہ کا سرورق بہت شاندار تھا۔

سوچ میں ڈوبی حسینہ اچھی لگی۔ معراج رسول کا اواریہ پڑھا جو موقع محل کے لحاظ سے ٹھیک تھا۔ انور فرہاد نے بابا عالم سیاہ پوش پر اچھا مضمون لکھا تھا۔ ان کو میری طرف سے مبارک باد پہنچادیں۔ ممتاز شاہی اور منور سلطانہ پر بھی محنت کریں اور ان کی زندگی کے بارے میں لکھیں (ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آخری کاپی پریس میں جانے تک آنے والے خطوط شامل کرلیے جائیں یعنی 18،17 تک خط موصول ہوجائے)۔

☆ محمد خلیل چودھری دینہ ضلع جہلم سے رقم طراز ہیں۔ ”اپنے پیارے سرگزشت سے رشتہ تو پیار کا ہے جب سے اس نے جنم لیا ہے مفت میں پڑھ رہا ہوں آپ حیران ہوں گے کہ یہ صاحب مفت میں پڑھ رہے ہیں۔ ابتداء سے اب تک جتنے سرگزشت کے شمارے شائع ہوئے ہیں تقریباً 300 سے زائد ہوچکے ہیں۔ میرے پاس اس وقت 222 شمارے جمع ہوچکے ہیں۔ مجھ سے بڑے بھائی محمد جمیل چودھری کو راولپنڈی میں رہتے ہوئے سرگزشت کا ابتدائی شمارہ ہاتھ لگ گیا۔ انہیں یہ بے حد پسند آیا پھر کیا تھا۔ راولپنڈی اسلام آباد کے اولڈ بک شاپ سے اور اتوار کو راولپنڈی صدر میں کتابوں کے جمعہ بازار سے سرگزشت خریدنے شروع کردیئے۔ مہینے ڈیڑھ بعد جب گھر آتے تو سرگزشت کے نئے پرانے لے آتے۔ جنہیں میں پڑھتا پھر ذاتی لائبریری میں رکھ دیتا۔ اکتوبر 1999ء میں ان کی شادی ہوئی تو معلوم ہوا کہ بھابی بھی سرگزشت کی قاری رہی ہیں۔ پھر کیا تھا بھائی جان ہر ماہ سرگزشت خریدتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ اب ان کی تعداد 222 ہوچکی ہے۔ جنوری کا شمارہ پُراسرار نمبر ابھی سرسری دیکھا ہے جس چیز نے سرگزشت خریدنے اور پہلی دفعہ خط لکھنے پر مجبور کیا وہ محترمہ صائمہ اقبال کا بے حد معلومات افزا اور تحقیقی مضمون یعنی سلسلہ ہر ماہ کی شخصیات ہے۔ سرگزشت مارکیٹ میں دستیاب ماہناموں سے امتیاز کیوں ہے اس کا منفرد انداز، تحقیقی مضامین اور شخصیات کی سوانحی حالات آپ بیتیاں اور جگ بیتیاں جو کسی اور رسالے میں اکٹھی نہیں ملتیں۔ مجھے خود شخصیات کے حالات زندگی پڑھنے اور جمع کرنے کا شوق بھی ہے۔ کتب بینی کا شوق تو بچپن سے ہے مگر باقاعدہ خرید کردہ کتب کا ریکارڈ یکم جنوری 1997ء سے ہے۔ میرے پاس سرگزشت کا پہلا شمارہ جلد نمبر 1 شمارہ نمبر 5 مارچ 1991ء کا صدام حسین نمبر ہے۔ دوسری شادی نمبر (اگست 1991ء)، خودکشی نمبر (نومبر 1991ء)، جیل نمبر (مارچ 1993ء)، سالگرہ نمبر (جنوری 1996ء)، ورلڈ کپ مارچ (1996ء)۔ ایک ڈائجسٹ میں، میں نے جنوری 2013ء میں ماہ رواں کی شخصیات (پیدائش، وفات) کا ایک سلسلہ مرتب کیا تھا۔ اکتوبر، نومبر، دسمبر 2012ء پھر جولائی 2013ء تک 9 ماہ کی شخصیات مرتب کی تھیں۔ نمونے کے لیے فوٹو کاپی ارسال ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو اس سلسلے کو سرگزشت میں شائع کیا جاسکتا ہے (کوئی اور سلسلہ بتائیں یا پھر الگ الگ مضمون بھیجیں)۔ ایک مضمون موسمیات سے متعلق ”موسم کا طلسم“ ارسال خدمت ہے۔ اگر سرگزشت کے معیار پر پورا اترے تو شائع فرما کر مشکور فرمائیے گا۔ ایک درخواست عرصے سے کرنا چاہ رہا تھا کہ ”عکس خیال“ سے قبل ایک بجی شخصیات والا سلسلہ اگر ممکن ہو تو کتابی شکل میں شائع فرمائیں۔ آپ کا عظیم احسان ہوگا۔ یہ سرگزشت کا کمال ہے کہ ایک صفحہ پر کسی شخصیت کی تمام زندگی کا احاطہ کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اگر شائع شدہ شماروں سے مرتب کرکے شائع کردیا جائے تو بے حد پسند کیا جائے گا۔ ایک اور خیال ذہن میں آیا ہے اگر آپ کتابی شکل میں شائع نہیں کرنا چاہتے تو پھر آپ ماہنامہ سرگزشت کا خاص نمبر بعنوان ”شخصیات نمبر“ جس میں ایک سو شخصیات یعنی سو صفحات شائع کرکے خاص نمبر مرتب کرکے شائع کرسکتے ہیں۔ ”عکس خیال“ میں شامل ہونے والے سب ایک خاندان کی طرح ہیں۔ نوک جھونک مزیدار ہوتی ہے۔ بعض حضرات تو بہت معلوماتی اور تحقیقی باتیں لکھتے ہیں جو بے حد پسند آتی ہیں۔“

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ”4 جنوری کی شام اپنا محبوب سوہنا سا سرگزشت ملا کیوں کہ پُراسرار نمبر کا کب سے انتظار تھا۔ نیا سال کا پہلا مہینا ہی ہمارے پسندیدہ رائٹرز کی پیدائش کا مہینا 2 جنوری محمد فاروق انجم اور تین جنوری کاشف زبیر کی پیدائش کا ہے۔ اللہ دونوں کو بہت خوشیاں اور کامیابیاں عطا کرے، آمین ثم آمین۔ معراج رسول انکل آپ کی دل سوز باتیں سر آنکھوں پر لیکن عورت ذات تو ازل سے ظلم سہتی آرہی ہے مرد کے ہاتھوں ذلیل وخوار ہورہی ہے۔ یک سطری میں شہنشاہ اسرار شیخ سعدی کے بارے میں اتنی مختصر لیکن اتنی مکمل تحریر پڑھنے کو ملی کہ محاورتاً سمندر کو کوزے میں بند کرنا حقیقت نظر آیا۔ ”عکس خیال“ میں کہ کس کس نے اس ناچیز کو یاد رکھا ہے۔ واہ پہلے نمبر پر ناصر حسین آئے ہیں مبارکاں واقعی بھائی آپ کا یہ خط تو ریکارڈ میں رکھنے کے قابل ہے۔ ناصر بھائی میں نے ہمیشہ 20 فیصد مردوں کی تعریف کی ہے لیکن وہ آپ لوگوں کو نظر نہیں آتا۔ فلک شیر ملک بھائی کا خط بھی لاجواب رہا مبارک ہو۔ سیرا ساجد ماضی کی سیرا انجم اس بار حاضر تھی لیکن بڑے سوز دل کے ساتھ۔ سیرا ڈیئر اگر ہم مسلمان خاص کر پاکستانی اگر اس مٹی کے ساتھ پُرخلوص ہوجائیں تو یہ ملک پاکستان پہلا اسلامی سپر پاور ملک بن جائے لیکن صد افسوس ویسے سیرا ڈیئر ملک کے خوب صورت جگہوں میں پھرنا کتنا اچھا لگتا ہے۔ کبھی اسد بھائی کے ساتھ کے پی کے آئی ہو؟ محمد سلیم قیصر بھائی میری اللہ سے دعا ہے کہ وہ اپنے

محبوب کے صدقے آپ کو رہائی دے۔ عمران جونانی بھی اپنے لاجواب اور مخصوص انداز تحریر کے ساتھ حاضر تھے۔ صائمہ نور بھی اچھے خوب صورت خط کے ساتھ حاضر تھی یاد رکھنے کا شکریہ نوازش۔ اویس شیخ مجھے اور جونانی بھائی کو یاد کرنے کا شکریہ خط اچھا رہا۔ مرزا اطاہر الدین بیگ اپنے مختصر تبصرے کے ساتھ حاضر تھے بھائی یاد رکھنے کا شکریہ۔ نذیر احمد راجپوت بہت خوب صورت تبصرہ لے کر حاضر تھے۔ پہلی کاوش زبردست رہی۔ ڈیئر سسٹر سدرہ بانو بھی زبردست تبصرے کے ساتھ حاضر تھی۔ خط کے شروع میں وطن عزیز کے دکھ پر دکھی نظر آئی۔ سات خوب صورت چیزوں کے مرکب سے بنی ہوئی عورت ہوں عام جذباتی انسان ہوں مجھے 90 فیصد لوگوں نے دکھ دے دے کر نفرت اور درگزر نہ کرنے پر مجبور کیا ہے۔“

☆ عبداللہ شجاع سندھی لاڑکانہ سے لکھتے ہیں۔ ”آپ حسبِ معمول وطن عزیز میں ہونے والی انسانیت سوز سماجی ناہمواریوں اور ناسازیوں کی ناپسندیدہ روایات کا ناقدانہ جائزہ پیش کرتے ہوئے ان خرابیوں سے مستعدانہ خطوط پر نجات کا راستہ بھی دکھا رہے تھے۔ اس ابتدائی گفتگو میں آپ جس زاویے سے ہمارے بیمار معاشرے کی نبض پر شفا بخش ہاتھ رکھ کر جو علاج تجویز کرتے ہیں وہ ایک ایسی خیر مندانہ صلاحیت ہے جو آپ کو سماجی حاذق وحکیم کے ارفع درجے پر استوار کرتی ہے۔ جب سرگزشت کے پُراسرار نمبر کا عندیہ دیا گیا تھا اس وقت سے مذکورہ نمبر کے متعلق خوشگوار توقعات لگائے بیٹھے تھے کہ اس کے صفحات روایت کے برعکس بڑھا دیے جائیں گے لیکن جب وہ نمبر اشاعت پذیر ہوا تو اس کے صفحات وہیں کے وہیں دیکھ کر ہماری توقعات کی چینی کے اوپر پانی پڑ گیا۔ چینی اپنا وجود کھو کر اس پانی میں تحلیل ہوگئی لیکن اس حالت میں بھی ہماری پُرتجسس اور پُراسرار معلومات کی مطالعاتی توقعات بڑی حد تک ضرور پوری ہوگئیں۔ وہ اس لیے کہ چینی جب پانی میں تحلیل ہوجاتی ہے تو پانی میں اپنی مٹھاس والی خاصیت چھوڑ جاتی ہے اور یہی خاصیت ہمارے اسرار پسند ذوقِ علم کی تسکین کشائی میں مددگار ثابت ہوئی۔ اس مرتبہ علم وحکمت پرور شخصیت ڈاکٹر ساجد امجد، پُراسرار قوتوں کو غیر تعمیری اور منفی طور پر استعمال کرنے والی روسی نژاد شخصیت گریگوری راسپوٹین کی سیاہ سرگزشت کو محنت سے قلمبند کرکے آشکار ہوئے۔ علم وادب کی باریکیوں کے شارح محترم کاشف زبیر ”پردۂ اسرار“ کے عنوان سے عروس البلاد کراچی سے وابستہ روحانی اسرار کی مظہر شخصیت حضرت محمد عظیم بالمعروف قلندر بابا اولیا کا روح افزا مفصل ذکر خاص حاضر سرگزشت ہوئے جسے پڑھ کر علم پرور انکشاف ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی دوسری مجموعی مخلوقات کے مقابلے میں حضرت انسان کو بے شمار ظاہری اور باطنی صلاحیتوں سے معمور ومشرف کیا ہے لیکن مذکورہ صلاحیتیں ذہنی ہوں یا جسمانی تحقیق جستجو ریاضت وانکشاف پسندی کے میلانات کے سوا حاصل نہیں ہوسکتیں۔ مذکورہ سرگزشت سے معلوم ہوا کہ قلندر بابا نے دینی احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے دین ودنیا دونوں میں ربانی سرخروئی کو حاصل کرنا ضروری سمجھا اور وہ بفضل خدا اس مقصد سعید کو حاصل کرنے میں کامیاب وکامران ہوگئے۔ اسماء صدیقی کی کاوش ”توہم پرستی“ منفی انداز فکر کو اجاگر کرنے والی اصلاح پسند تنقیدی تحریر تھی۔ لیفل ظفر کی تحریر ”زومبی“ جس کا نکتہ ماسکہ یہ تھا کہ یورپ وامریکا کا اس بات پر پختہ اعتقاد ہے کہ مستقبل میں انسانی زندہ لاشیں، عجیب بات ہے لاشیں اور وہ بھی زندہ! انسانی آبادیوں پر حملہ کریں گی اور اس حملے سے نمٹنے کے لیے ان لوگوں نے پیشگی دفاعی تیاریاں کررکھی ہیں۔ دانیہ کی تحریر ”ننھے شیطان“ میں چھوٹے بچوں کی مستقبل میں جھانک لینے کی حسیات کو جس عبرتناک پیرائے میں بیان کیا گیا ہے انہیں اتفاقی یا حادثاتی نظر سے تو دیکھا جاسکتا ہے لیکن ایسے بچوں کی مافوق الفطرت گفتگو جو مستقبل میں ہونے والے واقعات اور حوادث کا عملی ثبوت منظر عام پر مشہور کردے تو ایسے بچوں کی مستقبل بین پُراسرار صلاحیت کو سمجھنے کے لیے دو نظریات پیدا ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی مستقبل شناس گفتگو سے مطابقت رکھنے والے واقعات وحوادث کو صرف اتفاقی سمجھا جائے جب کہ اس ضمن میں دوسرا نظریہ یہ اختیار کیا جاسکتا ہے کہ ایسے خصوصی بچے اپنے وجود میں پُراسرار حقیقت، بدوش اور مستقبل بین اوصاف لیے پیدا ہوتے ہیں۔ ”ناکارہ بت کا عتاب“ کا سلسلہ بے حد دلچسپ اور معلومات افزا ہے۔ ہمارا اپنا وطن کتنا خوب صورت اور نیچرل ہے اس کی تصویر کشی کے لیے ضروری ہے کہ اس کی سیر کی جائے۔ مذکورہ سلسلہ سفرنامے کی ضرورت بھی پوری کردیتا ہے۔ آصف ملک کی ”انسان نما“ اور مریم کے خان کی ”نادیدہ مخلوق“ دونوں تحاریر دنیا کے اسرار ورموز سے مؤثر طور پر آشنا کررہی تھیں۔ سرگزشت کے پُراسرار نمبر کے لیے مزید اسرار بیانی کی ضرورت پھر بھی تشنہ رہی۔“

تاخیر سے موصول خطوط:

ارشد نیاز، چیچہ وطنی۔ نصرت یاسمین، دینہ جہلم۔ فردوس حسن، لاہور۔ ابرار علی سید، مہوش ممتاز، فہد حسن صدیقی، اسلام آباد۔ کلیم اللہ، پشاور۔ نعمان بشیر، ٹیکسلا۔ کاظم علی کاظمی، کوئٹہ۔ نیاز احمد، ڈی آئی خان۔ انیس حیدر، پیواڑ پارا چنار۔ زاہد فاروقی، حیدرآباد۔ نگار حسن، ایبٹ آباد۔ سلیم نیازی، شیخوپورہ۔ انیس نیاز وٹو، میرپور آزاد کشمیر۔

تجزیاتی جائزہ برائے سال 2015ء

وحید ریاست بھلی

"اوراقی جائزہ"

مدیرانِ رسائل نے گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی سوئی ڈوری کے طیب پہ مسلسل پارہ مائل رنگ دی اور اپنے جادو اثر قلم سے "پارہ" عدد ثابت کر انگیز اداریے مرقوم فرمائے اور حسبِ حال بہترین اشعار کا انتخاب سونے پہ سہاگا کام کر گیا۔

"یک صفحی سرگزشت"

یک صفحی سرگزشت قارئین سرگزشت کے لیے "کوزے میں دریا" کا درجہ رکھتی ہے، اور قارئین کی معلومات میں ایک خوبصورت اضافہ کا باعث ہوتی ہے، ایک صفحی میں ایک شخصیت کے حالاتِ زندگی کو بیان کرنا سرگزشت کا ہی خاصہ ہے، سال 2015ء میں کچھ اس ترتیب سے "یک صفحی سرگزشت" کی ٹیکٹیاں تقاضا کی گئی۔

1۔ "سائنسدان پاکستان" (سرفراز خان نیازی)
2۔ "بابائے فاری" (پروفیسر سید حسن رضوی) 3۔ "تربیت کار" (سید احمد حسن) 4۔ "قوبِ آدمی" (شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی) 5۔ "استاد اردو" (عبدالحق بابائی) 6۔ "پیکرِ طبیب" (واسی حسینی) 7۔ "پاکمالی" (شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی) 8۔ "مشہور صحفی ثمن" (جباب آبرو آبادی) 9۔ "ہمارا ہیرو" (سیرون لیزلی ڈنکوٹ) 10۔ "فکار" (خواجہ احمد عباس) 11۔ "باکمال کرکٹر" (عبدالحفیظ کاردار) 12۔ "مدبر مورخ" (شاہد احمد دہلوی)۔

"شہر خیال"

جنوری 2015ء سے دسمبر 2015ء تک "شہرِ خیال" میں بسنے والوں کے خاتم شدہ خطوط و ای میلز کی تعداد "236" رہی، جن میں "203" مرحومات اور "33" محترم خواتین شامل تھیں، سب سے زیادہ محترمی "انور جمال شاہ" کے "11" خطوط شاملِ اشاعت ہوئے دوسرے نمبر پہ "10" خطوط کے ساتھ سرفراز ظفر پھر تیسرے "سردہ بانو ہاشمی" اور محترم "مشی مزمز" رہے جبکہ تیسرے نمبر پہ "9" خطوط کے ساتھ تیسرے "شاہد جمال شاہد" رہے، پہلا وحدتاً "20" خطوط شاملِ ہوئے "158" خطوط ایسے تھے جو دو سے زیادہ مسلسل ہونے کی وجہ سے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

اردو صحافت پر تاثر چھوڑنے والوں کا احوال کچھ اس طرح رہا۔ 01۔ "شاہد جمال شاہد" (پشاور۔ خودی، اکتوبر) 02۔ "سرفراز ظفر" (مظفر گڑھ) 03۔ "شوکت رحمان خٹک" (پشاور) 04۔ "سردہ بانو ہاشمی" (کراچی۔ ایرم، نومبر) 05۔ "ارس شیخ" (نیو یارک۔ سنگم) 06۔ "انور حسین سلہاری" (انور پورٹل) 07۔ "جاوید جمالی" (ملتان) 08۔ "بشریٰ فضل" (پیارہ پور) 09۔ "منظر علی خان" (لاہور) 10۔ "شاہد جمال شاہد" (پشاور۔ اکتوبر) 11۔ "مشی مزمز" (لقمان وارثی)۔

دلچسپ بات یہ کہ اس سال کوئی بھی پورا مسائل شوشیلا کو رفیق نہ بخش سکا، کیلکی آٹھ حرف اور دو خواتین یہ اعلیٰ ترین اعزاز حاصل کرنے میں کامیاب رہیں، محترمی شاہد جمال شاہد اور سردہ بانو ہاشمی کو دو خوش بخت ہیں جنہیں یہ اعزاز دو مرتبہ حاصل ہوا جبکہ سال کا سب سے بہترین خط شوکت رحمان خٹک صاحب (پشاور) کا رہا، جو مرحوم "یحییٰ سفیان آفاق" کی خوبصورت یادوں کو زندہ کرنے کے حوالے سے تھا۔

"علمی و ادبی جائزہ"

"ڈاکٹر ساجد امجد صاحب۔ بارہ شہر یاری"

ڈاکٹر ساجد امجد کے عرصہ قلم سے لکھے گئے مقالات ایک وتصاویر کا دربہ رکھتے ہیں، گزشتہ دو سال عشروں سے ماہنامہ سرگزشت کے لیے سلاگ ہے تین سو سے زائد نہایت اعلیٰ پائے کے مقالات صفحۂ قرطاس پہ بکھیر چکے ہیں، سال 2015ء کے لیے بھی انہوں نے بہت خوبصورت بیرائے میں بارہ عدد شہ پارے تحریر فرمائے جس پر انہیں جتنا بھی سراہا جائے کم ہے۔

1۔ "مظفر بخش" (شہر شکوہ آبادی) 2۔ "باکمال" (آئن اسٹائن) 3۔ "استاد ادب" (ڈاکٹر ابوالليث صدیقی)

4۔ "خاشاس" (آرنک نیخوں) 5۔ "ظفی" (افلاطون) 6۔ "امیر بلٹ" (حضرت حامی امداد اللہ مہاجر مکی) 7۔ "بلند اقبال" (پروفیسر میاں اقبال عظیم) 08۔ "شاہد داغ" (لارڈ کلائیو) 9۔ "احسن الکلام" (احسن مارہروی) 10۔ "محسن الملک" (نواب محسن الملک) 11۔ "اقبالی" (لیون فرانکلن) 12۔ "جھد بق" (ڈاکٹر فقیر جیبلانی برق)۔

یوں تو ڈاکٹر صاحب کا ہر ایک مقالہ اسم کلام کا وجد رکھتا ہے، مگر ہم تاجِ زر کی راست میں، ماہ جون کا مقالہ جو کہ پختہ صاحبِ سلسلے کے معروف بزرگ "حضرت حامی امداد اللہ مہاجر مکی" کے متعلق تھا، تمام مقالات پر برتری لیے ہوئے نظر آیا۔

"انور قمر بدہ۔ دس شہر یارے"

معروف علمی محاذ کے مضبوط سپاہی جناب انور فرہاد نے شعبہ علم کے حوالے سے قارئین سرگزشت کو چھ برادگار تحاریر سے مستفید فرمایا۔

1۔ "خون کے آنسو" (نادرات) 2۔ "میتا کمال" (داستان میتا کماری و کمال امروہوی) 3۔ "سندباد" (شہناد بیگم) 4۔ "ابوگریس" (رویا تنہا) 5۔ "پلک حسینہ" (روزینہ) 6۔ "گلدستہ واکس" (طلعت حسین) 7۔ "ملا حسنا" (احوال عالم) 8۔ "کیف شعلی" (اسکندر) 9۔ "پر" (عشرت سلطانہ) 10۔ "مس ذف" (یاعلم کی بیٹی)۔

شہر یاری انور فرہاد صاحب کی تحریر تک رسائی دوڑ میں شامل نے والے علمی محققین کی تحریر "سندباد جہازی" کو سنہری آواز "شہناد بیگم" کے متعلق علمی و تحقیقی کی ایک بڑی تعداد نے نہایت دلچسپی سے پڑھا۔

"منظر امام۔ سات شہر یارے"

ادبی مزمز کے ماہر ورادار نگار اور مصنف جناب منظر امام صاحب ماہنامہ سرگزشت کے لیے لازم و ملزوم ہیں، وہ کئی پُر مغز مضامین سے شائقینِ سرگزشت کے دل جیتنے میں کامیاب نظر ہے۔

01۔ "کیسے کیسے لوگ" (تذکرہ شخصیات) 02۔ "پوشاکِ سچ" (تذکرہ کتب) 03۔ "خزانہ" (مدفون خزانے) 04۔ "دیواریں" (مشہور دیواریں) 05۔ "کھیل" (عجیب و غریب کھیل) 06۔ "پورے" (معلومات) 07۔ "تاریخ عالم" (تاریخ عالم کا جائزہ چھ حصے۔ جولائی تا دسمبر)

محترمی منظر صاحب کا کمال ہے یہ کہ قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہیں خصوصیت رکھتے ہیں، ان کی ہر تحریر قابلِ تعریف و تحسین تھی، مگر میرے خیال میں ان کی تحریر "پوشاکِ سچ" قارئین کی بھرپور توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔

"شیراز خان۔ چھ شہ پارے"

گزشتہ سال "خاتمہ" لکھنی لازماً تحریر سے شہرت حاصل کرنے والے جناب شیراز خان صاحب کا قلم پورے جوبن پر نظر آیا۔ 01۔ "آسمجھیات" (مجرائی یاں) 02۔ "شہر محرکماں" (خطرناک شہر) 03۔ "خواب" (دنیے کے خواب) 04۔ "اسرار" (تذکرہ مردان نیب) 05۔ "کیسے کیسے لوگ" (معروف افراد کا تذکرہ) 06۔ "پرندے" (معلومات)

شیراز خان کی ہر تحریر پڑھنے کے بعد جس تحریر کو قارئین نے سند قبولیت بخشی وہ "خواب" تھی، مشہور عالم افراد کے خوابوں اور ان کی تعبیرات پہنچ پر مرتب ایک شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔

"مریم کے خان۔ چھ شہ پارے"

مختصر مریم کے خان فن حسن تحریر سے خوبی آگاہ ہیں، اور اس بات کو بہت اہمیت دیتی ہیں کہ قاری کیسے الفاظ کے ازدہن کھولے پر بغیر کسی رکاوٹ منزلِ مقصود تک پہنچا ہے۔ 01۔ "درست فیصلہ" (تاریخ) 02۔ "پرندہ اور قانون" (زندگی نامہ) 03۔ "بھندا" (تاریخ جرائم) 04۔ "انقابی" (زندگی نامہ) 05۔ "نیسٹ نام" (امریکی مشاہیر) 06۔ "کیف عمری" (کرکٹ)۔

مریم کے خان صاحبہ کی تمام تحریریں پر اثر ہونے کی وجہ سے پڑھی جاتی ہیں، مگر ان کی سال بھر کی عمدہ تحریر "کیف عمری" تھی۔

"حسن رزاقی۔ چھ شہ پارے"

ماہر ورادار جناب حسن رزاقی صاحب دوران پرواز جن جن صحافت کے لیے عازم سفر ہوئے، اور اس سفر میں انہیں جو جو مشاہدات و تجربات حاصل ہوئے انہوں نے اپنے مشاہدات و تجربات کو ایک دلچسپ سفرنامے کی شکل دے کر قارئین کے لیے پیش کر دیا، بنارہا، جو کہ "اوداع" کے نام سے شائع ہوا، ہر ماہ کی طرح رزاقی صاحب نے کچھ تحاریر نذرِ قارئین کی تھیں۔ 01۔ "اوداع" (سفرنامہ۔ اگست 2014ء سے مارچ 2015ء تک) 02۔ "مہمل انگلی جنس" (علم جدید) 03۔ "کیپٹر کا سفر" (سائنسی معلومات) 04۔ "کالا چھپرا" (تاریخ) "بھکارن" "میں

کون ہوں"

حسن زیدی صاحب کی تحریر جاذبِ نظر تھی، مگر ان کی سائنسی نقطہ نظر سے ملفوظی تحریر "کیپٹن کاسمز" کو نوجوان نسل اور علم دوست قارئین نے بہت پسند فرمایا۔

"ابن کبیر۔ پانچ شہ پارے"

ابن کبیر ماہنامہ سرگزشت کے ان معزز لکھاریوں میں سے ایک ہیں، جن کی تحریر پڑھنے کے لیے قارئین بڑا سینہ بڑی بے تابی سے منتظر رہتے ہیں، ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک حرف داد و تحسین کا حق رکھتا ہے، گزشتہ برس ان کبیر کی یادداشتوں پر مشتمل سرگزشت بنیں، اب کی بار کچھ انہوں نے قلم کار کبیر جس موضوع پر لکھا اسے انتخاب کر دیا۔ 01- "پُراسرار گشتی قلی" (روداد گشتی قلی) 02- "ظاہر نما"، 03- "ایمان افروز تذکرہ" 04- "عکس العما" (زندگی نامہ) 05- "صوفی" (خراجِ تحسین) 06- "خدا شناس" (خراجِ تحسین)۔

ان کی ہر تحریر نے قلب و روح پر گہرے نقوش مرتب فرمائے، وہ "خلائی آواز" تھی۔

"محمد ایاز راہی۔ پانچ شہ پارے"

محمد ایاز راہی صاحب ملک کے بہترین محققین میں شمار ہوتے ہیں، گزشتہ سال کی ماندہ اس سال بھی ان کی خامہ فرسائی نے خوب جوہر دکھائے، راہی صاحب کی ماہنامہ سرگزشت کے لیے ہر سطر مرصع و مزین ہوتی ہیں۔

01- "سی مکریٹ" (علم و ادب) 02- "شک" (سستی آموز کتھا) 03- "ماہ پیکر" (سیر یا کستان) 04- "شاعرات" (اردو ادب) 05- "مخنور" (قدیم ادب عالیہ)۔

ایاز راہی کی ہر تحریر آسان پیمانے ستاروں کی مانند تھی مگر جس تحریر نے بازی مات دی وہ "مخنور" تھی۔

"سلیم الحق فاروقی۔ پانچ شہ پارے"

قابلِ احترام مصنف سلیم الحق فاروقی نے ماہنامہ سرگزشت کو سال 2015ء میں چھ یادگار تحریروں سے یادگار بنا دیا، پانچ تحریریں ان کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ 01- "ماہ موسم بہار" (شخصیات عالم) 02- "ماہ نمائی" 03- "ماہ جون" 04- "جولائی" 05- "اگست کی شخصیات"۔

محترم سلیم الحق فاروقی نے ایک ہی موضوع پر قابلِ قدر یادگاری قارئین سرگزشت کے قلوب و اذہان میں نقش فرمائی، اس لیے ان کی کسی بھی تحریر کو دوسری پر فوقیت دینا مناسب نہیں۔

"صائمہ اقبال۔ پانچ شہ پارے"

محترمہ صائمہ اقبال صاحبہ جس موضوع پر بھی لکھتی ہیں، "حق تحریر" ادا کر دیتی ہیں، سال 2015ء کی ماندہ اس سال بھی ان کے قلم کا جادو ہر صفحہ پر کروٹ لیتا رہا، ان کی تحریر پر علمی و فکری پیاس بجھاتی ہوئی کچھ اس ترتیب سے نوازتا رہا ہوں۔

01- "احسان" (سبق آموز کتھا) 02- "تہمیر کی شخصیات" (شخصیات عالم) 03- "اکتوبر کی شخصیات" 04- "نہر کی شخصیات" 05- "تہمیر کی شخصیات"۔

محترمہ صائمہ صاحبہ نے ایک بہت طویل سلسلے کو جاری و ساری رکھا ہوا ہے، مگر ان کی تحریر "احسان" مدتوں یاد رہ جائے گی، وہ ایک تحریر ہے۔

"طارق عزیز خان۔ پانچ شہ پارے"

نئے دور کی طارق عزیز خان نے گزشتہ برس کی نسبت اس برس کو کم لکھا، مگر جتنا لکھا خوب لکھا۔

01- "نئی دنیا" (معلوماتِ عالم) 02- "زادِ رون کاسمز" (سائنسی معلومات) 03- "صحرائے اعظم" (سفر نامہ) 04- "سلطنت افا" (جام جہاں نما) 05- "کے ٹو" (تحقیق)۔

محترم طارق صاحب کی تمام تحاریر ذوقِ مطالعہ کا باعث تھیں، مگر جس تحریر پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہا، وہ "صحرائے اعظم" تھی۔

"کشمالہ حسن۔ چار شہ پارے"

یہ ماہنامہ سرگزشت کا اعزاز ہے کہ جہاں اسے محترم خواتین کی ایک بڑی تعداد زیرِ مطالعہ رکھتی ہے، وہیں اس ماہنامہ کے معزز لکھاریوں میں ایسی خاصی تعداد خواتین کی بھی ہے، ان محترم خواتین میں سے ایک نام "کشمالہ حسن" کا بھی ہے۔

01- "عزیز جہاں" (خراجِ تحسین) 02- "پُر اسرار کب" (جام جہاں نما) 03- "داستان کرب" از کشمالہ حسن و دانیہ صدیقی" (اذیت کوش) 04- "بھنگیڑا" (دہشت پسندی)۔

یوں تو محترمہ کشمالہ صاحبہ کی ہر تحریر ہی جاذبِ نظر تھی،

مگر ان کی سال کے آخری ماہ میں لکھی گئی تحریر "بھنگیڑا" قارئین کو بیحد پسند آئے گی۔

"اے، آر، رحمانیات۔ تین شہ پارے"

01- "اولوالعزما کا آدم خور" (شکار کتھا) 02- "دیوتا رحمی کا آدم خور" (شکار کتھا) 03- "چالاک پیتا" (شکار کتھا)

جناب اے آر رحمانیت صاحب کی تحریر "چالاک پیتا" نمایاں ترین تحریر تھی۔

"ڈاکٹر عبدالرب بھٹی۔ تین شہ پارے"

محترمی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب نے اس سال بہت کم نثر فرسائی فرمائی، صرف تین تحریریں ان کی نمائندگی نہیں کر سکتیں۔

01- "پُراسرار قلی" (نادیدنی قلی) 02- "گمنام جاسوس" (جاسوسی کتھا) 03- "الوکھا گھر" (خبری معلومات)

ڈاکٹر بھٹی کی تینوں تحریریں یقیناً دلچسپی اور شائقین کے زمرے میں آتی ہیں، مگر ترکِ علیقہ کے قلی پر ان کی تحریر "پُر اسرار قلی" ایک قابلِ تعریف تحریر تھی، جسے تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ثقہ سند کہا جا سکتا ہے۔

"سلمیٰ اعوان صاحبہ۔ تین شہ پارے"

محترمہ سلمیٰ اعوان صاحبہ نے بھی اپنے قلم سے صفحاتِ سرگزشت کو رنگا رنگی بخشی۔

01- "کھلاڑی کہانی" (دلچسپ کتھا) 02- "یار ساحر" (زندگی نامہ) 03- "شمع آسیہ جبا" (عزم و حوصلہ)۔

محترمہ سلمیٰ اعوان صاحبہ کی تحریر "یارِ ساحر" قارئین سرگزشت کی کافی بڑی تعداد نے پسند فرمائی۔

"سیدزین مہدی۔ دو شہ پارے"

سیدزین مہدی کا شمار ان لکھاریوں میں ہوتا ہے جو لفظوں سے کھیلنے کا فن بخوبی جانتے ہیں، اس سال ان کی صرف دو تحریریں اشاعت پذیر ہو سکیں۔

01- "فن سے بڑا" (شہنشاہِ موسیقی) 02- "شاعر غزل ہوا" (اردو ادب)۔

سیدزین مہدی صاحب کی تحریر "فن سے بڑا" جو کہ شہنشاہِ موسیقی استاد بڑے غلام علی خان صاحب کے حوالے سے تھی، شائقینِ سرگزشت کو دنوں یاد رہے گی۔

"خالدہ قریشی۔ دو شہ پارے"

محترمی خالدہ قریشی صاحب گم لکھنے والوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی درج بالا دو تحریریں اس سال شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

01- "۲ اکتوبر" (عادتاً کتھا) 02- "معبد پورا پیتا" (شکاریات)

"اعجم فاروق سالمی۔ دو شہ پارے"

اعجم فاروق سالمی، مشہور فلم رائٹر مرحوم سعید ساحل کے بھتیجا فرزند محمد ہیں۔ گزشتہ سال کی نسبت گو انہوں نے کم لکھا، مگر جس قدر لکھا خوب لکھا، ان کی یہ دو تحریریں سند پسندیدگی پانے میں سرِفہرست رہیں۔

01- "لاس" (معاشرتی معلومات) 02- "آدم خور" (شکاریات)۔

جناب سالمی صاحب کی آخالذکر تحریر "آدم خور" اعلیٰ پائے کی تحریر تھی۔

"احمد رئیس۔ دو شہ پارے"

احمد رئیس بھی بجا ہے آسمان سرگزشت کی زینت بنے رہتے ہیں، اس سال 2015ء میں ان کی یہ دو تحریریں نمایاں رہیں۔

01- "لی مان" (کھیل کھلاڑی) 02- "شقی القلب" (جرم و سزا)

"ثناء ثاقب۔ دو شہ پارے"

ثناء ثاقب نے اس سال قارئین سرگزشت کی مطالعاتی ضیافت کو مقدور بھر سجائے ہوئے، اپنی دو تحریروں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کیا، جن کی ترتیب یکچھ یوں تھی۔

01- "وہم" (نفسیات) 02- "مسلمانانِ ہند" (معاشرتی تفہیمی)

"شکیل صدیقی۔ دو شہ پارے"

خود ہی شکیل صدیقی صاحب اس سال کچھ زیادہ جو ہر قلم نہ دکھا پائے۔

01- "چار روحوں والا" (زندگی نامہ) 02- "رہنمائے سیاست" (سیاسی کتھا)۔

"عقیل عباس جعفری۔ دو شہ پارے"

ملکہ عزیز کے باصور ترین تحقیق تھی عقیل عباس جعفری صاحب نے ذوقِ مطالعہ و ذوقِ تحقیق کے حامل قارئین کے لیے اس سال مندرجہ ذیل دو سدا بہار تحریریں یادگار چھوڑیں۔

01- ''لفظ پاکستان'' (تحریک پاکستان) 02- ''مشرقی پاکستانی قلمیں'' (فلمی تحقیق)۔

قابلِ صد احترام جناب عقیل عباس جعفری کی دونوں تحریریں اپنے دامن میں ''سمندر تحقیق'' سموئے ہوئے تھیں، یہ فیصلہ کرنا خاصہ دشوار ہے کہ زیادہ بہتر تحریر کسے قرار دیا جائے؟ میری دانست میں ان کی اوّل الذکر تحریر ''لفظ پاکستان'' ہر محب وطن قاری کے لیے توشۂ خاص تھی۔

''ایک مصنف ایک تحریر''

اب ہم ان معزز قلمکاروں کی دلفریب تحاریر کا جائزہ لیتے ہیں، جنہوں نے اپنی ایک تحریر سے ''آسمان سرگزشت'' کو ستاروں جیسی ضیاء بخشی۔

01- ''اے رئیس'' (اشتہار اجل۔جنوری) 02- ''شکیل ادریس'' (ہم پلہ۔جنوری) 03- ''مشتاق عطاری'' (سمندری بھیڑیے۔فروری) 04- ''سید احتشام'' (عیار اعظم۔فروری) 05- ''عائشہ جو نیجو'' (سمندر کے بھید۔فروری) 06- ''منیر خان'' (چندا ماموں۔اپریل) 07- ''غلام حسین میمن'' (سالگرہ کے دن۔مئی) 08- ''محمد ساجد'' (سامری۔مئی) 09- ''زویا اعجاز'' (تین کھلاڑی۔مئی) 10- ''شبیر بلوچ'' (مست توکلی۔جون) 11- ''ابن عنقا'' (رنگون کا سفر۔جون) 12- ''الطاف شیخ'' (ہانگ کانگ۔جولائی) 13- ''رخسانہ خالد'' (مضبوط قوت ارادی۔جولائی) 14- ''آصف ملک'' (سایۂ اجل۔جولائی) 15- ''اختر بلوچ'' (مٹی نہیں گیتا۔ستمبر) 16- ''ذرہ حیدر آبادی'' (شاعر کوئی اور ہے۔ستمبر) 17- ''امین بھایانی'' (نیند اور خواب۔اکتوبر) 18- ''حسن'' (نگی۔اکتوبر) 19- ''عبداللہ محمد حسن'' (کراچی کراچی۔اکتوبر)۔

سال 2015ء میں معزز مصنفین نے انتہائی عرق ریزی اور انتھک محنت و تحقیق کے بعد جو تحاریر نذر قارئین سرگزشت کیں، وہ اپنی جگہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں، ہر تحریر، ہر سطر، ہر لفظ اور ہر حرف کو قارئین نے موتی سمجھ کر چنا اور اپنے دامن علم و آگہی کو مزین فرمایا، ان تمام تحاریر میں سے کسی ایک کا انتخاب بہت مشکل مرحلہ ہے، مگر یہ مرحلہ طے کیے بغیر بھی کوئی چارہ نہیں، سال 2015ء میں دو تحریریں ایسی ہیں جن پر قارئین بے اختیار داد دیتے ہوئے نظر آئے، پہلی تحریر جسے بے حد سراہا گیا وہ غلام حسین میمن کی ''سالگرہ کے دن'' اور دوسری پسند کی جانے والی تحریر محقق علم و ادب جناب ''ذرہ حیدر آبادی'' کی ''شاعر کوئی اور ہے'' ہے، ہر دو مصنفین اپنے تحقیقی میدان میں عروج پہ نظر آئے مگر وہی آخری بات کہ بازی کس کے سر رہی؟ تو قارئین گرامی قدر بازی سر کی محترمی و مکرمی جناب ''ذرہ حیدر آبادی'' نے، وہ اشعار کے حوالے سے ایک اہم ترین تحقیق سے یہ بات ٹھوس شواہد کے ساتھ ثابت کرنے میں کامیاب رہے کہ اصل شعر کس شاعر کا ہے؟

''مستقل سلسلے''

ہمارے محبوب سرگزشت میں جہاں قارئین کے لیے رنگارنگ موضوعات کے متعلق بہت سا مواد مہیا کیا جاتا ہے، وہیں ان کی دلچسپی کو دوام بخشنے کے لیے ''مستقل سلسلے'' بھی بڑی شد و مد سے نذر قارئین کیے جاتے ہیں۔

''فلمی الف لیلہ۔علی سفیان آفاقی مرحوم'' ملک کی معروف فلمی و علمی شخصیت جناب علی سفیان آفاقی نے ابتدائی شمارے سے جس فلمی داستان کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا، بالآخر اس کا اختتام مارچ 2015ء کو ان کی وفات کی وجہ سے ہوا، دو سو پینتیس ماہ تک جاری رہنے والا یہ سلسلہ نہ صرف ملک بلکہ بیرونِ ملک بھی ہر ماہ باقاعدگی سے پڑھا جاتا تھا، اس سال جنوری تا مارچ جن موضوعات و شخصیات پر لکھا گیا وہ یہ تھے حبیب جالب، ذوالفقار علی بھٹو، قبرستان، باغ، لاہور کے مختلف گلی کوچے، قسم اس وقت کی، ظہور راجا، عبدالحفیظ کاردار، مشرقی پاکستان میں فلمسازی، لسانی و تمدنی معلومات، شیکسپیئر، کرکٹر فضل محمود، پرو چانڈ یو اور کلاسیکل استادانِ موسیقی۔

''الوداع از حسن رزاقی'' ملک کے مشہور ہوا باز جناب حسن رزاقی نے دورانِ پرواز اپنے مشاہدات و تجربات کو سفر نامے کی صورت میں تحریر فرمایا ہے، انکے تجربات و مشاہدات جو کہ ''الوداع'' کے نام سے اگست 2014ء سے جاری و ساری تھے، ان کا اختتام مارچ 2015ء میں ہوا، جن کو قارئین کی اچھی خاصی تعداد نہایت ذوق و شوق سے مطالعہ کرتی نظر آئی۔

''سفر امریکا از علیم شاہد'' اس سال ایک نئے لکھاری میدان سرگزشت میں وارد ہوئے اور وہ بھی ایک مستقل سلسلے کی کڑی سفرنامے کے ساتھ، جس کا نام ''سفر امریکا'' ہے، قابل قدر مصنف نے بڑی جانفشانی اور محنت سے ترقی یافتہ ملک کی تعمیر و ترقی، رہن سہن اور ان کی اعلیٰ اقدار پر بہت خوبصورت پیرائے میں روشنی ڈالی ہے۔

''نانگا پربت کا عتاب۔ندیم اقبال'' دیار غیر سے محترمی ندیم اقبال کا یہ سفر قارئین سرگزشت کی علمی و تفریحی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا نظر آرہا ہے، مصنف کا انداز تحریر سامانِ دلچسپی سے بھرپور نظر آتا ہے۔

''سراب از کاشف زبیر'' ماہنامہ سرگزشت کے مستقل سلسلوں میں سب سے مقبول سلسلہ جسے محترمی کاشف زبیر تحریر کرتے ہیں، زندگی کی مشکل ترین راہوں پر سفر کرتا یہ سلسلہ اپنے طویل سفر پر نہایت کامیابی سے جاری و ساری ہے، اس سال اس کی 93 سے 104 تک بارہ اقساط بلاناغہ پیش کی گئیں، جسے قارئین سرگزشت نے بہت پسند کیا، اور اس حوالے سے محترم کاشف زبیر کی تعریف نہ کرنا بہت بڑی زیادتی ہوگی۔

ماہنامہ ''سرگزشت'' کے مقبول شعری سلسلے ''بیت بازی'' پہ اک نگاہ ڈال لیجیے، آپ کو ماننا پڑے گا کہ قارئین سرگزشت کا شعری مذاق کس سطح کا ہے؟ ہر ماہ انتخاب شعر میں ہر قاری ایک سے بڑھ کر ایک شعر پیش کرتا ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ جوابی شعر لطف شاعری کو دو آتشہ بنا دیتا ہے، گزشتہ سال کی مانند اس سال بھی قارئین سرگزشت کی ایک اچھی خاصی تعداد نے ''بیت بازی'' کی محفل کو گرمانے کے لیے ''445'' اشعار ترتیب دیئے، جن کو صاحبین شعر و شاعری نے بے حد سراہا۔

''علمی آزمائش۔ایک جائزہ'' منتظمین سرگزشت نے اپنے قارئین کی علمی جانچ کرنے کے لیے مدت سے ایک سلسلہ ''علمی آزمائش'' کے نام سے شروع کر رکھا ہے، جس میں اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک سے بہت بڑی تعداد میں قارئین شریک ہوتے ہیں۔اس سال علمی آزمائش کی 110 سے 121 تک بارہ اقساط پیش کی گئیں، درست جواب دینے والوں کی تعداد ''3351'' رہی، اندرون ملک سے درست جواب ارسال کرنے والوں کی تعداد ''3259'' اور بیرون ملک سے درست جواب دینے والوں کی تعداد ''92'' رہی، ہر ماہ اوسطاً ''279'' قارئین نے درست جواب ارسال فرمائے۔

''سچ بیانیاں۔ایک جائزہ'' ماہنامہ سرگزشت نے ہر ماہ معاشرے کی اونچ نیچ اور اچھی بری رسومات کی نشاندہی کرنے کے لیے ''سچ بیانیاں'' کے نام سے ایک دلچسپ اور سبق آموز سلسلہ شروع کر رکھا ہے، جس میں معاشرے کا عام سے خاص، اور ہر شعبے کا فرد حصہ لے سکتا ہے، ماہنامہ سرگزشت کے ماہر ترین لکھاری کسی بھی سچ بیانی کو اعلیٰ ترین معاشرتی رنگ میں کہانی کو تحریر کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں، جنہیں پڑھ کر ہر صاحب دل عبرت حاصل کر سکتا ہے، گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی ایک سو آٹھ (108) سچ بیانیاں سرگزشت کے صفحات کی زینت بنیں۔میری دانست میں سال 2015ء کی سب سے زیادہ پسند کی جانے والی سچ بیانی ''بن باس'' (سائرہ۔کراچی۔اگست) تھی، دوسرے نمبر پر آنے والی سچ بیانی ''تکمیل عشق'' (دانیہ صدیقی۔کراچی۔نومبر) تھی، اور تیسرے نمبر پر آنے والی سچ بیانی ''فاصلوں کا کرب'' (زویا اعجاز۔لاہور۔جنوری) تھی، دلچسپ ترین بات یہ کہ یہ تینوں سچ بیانیاں محترم خواتین کی بیان اور تحریر کردہ تھیں، جنہیں قارئین کی ایک بڑی تعداد نے بے حد پسند فرمایا۔

''پارچہ جاتی جائزہ'' سال 2015ء کے لیے قارئین سرگزشت نے ''183'' نہایت اعلیٰ پائے کے پارچے ارسال فرمائے، جو مختلف موضوعات کے متعلق تھے، ان پارچہ جات سے قارئین کی ترجیحات جانچنے کا موقع بھی میسر آتا ہے، سال 2015ء کا سب سے بہترین پارچہ محترم جناب ''محمد ایاز راہی صاحب'' ماہ دسمبر (صفحہ نمبر 151۔150) کا تھا۔

سچ بیانیاں

سچ بیانیوں کے مصنفین کا مکمل جائزہ نہیں لیا گیا ہے کہ بہت کم مصنفین کی تحریر دوبارہ لگتی ہے۔

''مفید آراء، تنقید اور تجاویز'' ماہنامہ سرگزشت کا معیار بین الاقوامی سطح کا ہے مگر اب بھی بہتری کی گنجائش موجود ہے اس سال 2015ء میں ایک بات بڑے تسلسل کے ساتھ دیکھنے میں آئی کہ ایک ہی موضوع پر کئی محترم مصنفین طبع آزمائی فرماتے نظر آئے، مثال کے طور پر ''جناب منظر امام صاحب'' کا مضمون ''کیسے کیسے لوگ۔جنوری'' ''محترمہ'' ''صائمہ اقبال صاحبہ'' کے مضامین ''ستمبر، اکتوبر، نومبر اور دسمبر کی شخصیات'' اور جناب ''سلیم الحق فاروقی صاحب'' کا مضمون ''اگست کی شخصیات'' اس سے یکسانیت پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، جو ایسے بین الاقوامی معیار کے ڈائجسٹ کے لیے کسی بھی صورت مناسب نہیں۔ایک اور چیز کہ ''تکرار عنوان'' بھی کوئی اچھی روایت نہیں، مثال کے طور پر محترم جناب ''منظر امام صاحب'' کی تحریر ''کیسے کیسے لوگ۔جنوری'' اور محترم جناب ''شیراز خان صاحب'' کی تحریر ''کیسے کیسے لوگ۔جون'' اور یک علمی سرگزشت میں ''باکمال۔شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔جولائی'' جبکہ اسی نام سے محترمی جناب ''ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کا مضمون ''باکمال۔آئن اسٹائن۔فروری'' پیش کیے جا سکتے ہیں۔

ندائے اردو

ڈاکٹر ساجد امجد۔

وہ ایک گیلے کاغذ کی طرح آتش غم میں خود ہی جلتا بجھتا رہا مگر سعی مسلسل سے کنارہ کش نہ ہوا۔ قدم قدم پر ناسازیٔ طبع، کھانسی بنائے رہے اور وہ چٹان بنا اپنی جگہ جما رہا کہ بر سر میں دھڑکتا ہے' ہر ٹال میں رہتا ہے۔ پھر اس نے پیہم مسلسل و گہری تحقیق سے وہ نکات سامنے لائے کہ اردو ادب، کی تاریخ کا رخ ہی بدل گیا۔ جو لوگ، کہتے نہیں تھکتے تھے کہ اردو دہلی میں پیدا ہوئی، ان کی زبان پر قفل لگ گیا جب اس نے ثابت کیا کہ اردو تو پنجاب میں جنمی ہے۔ ایک بہی خواں تحقیق کی سمندر میں غوطے لگا لگا کر اس نے ایسے ایسے گہر آبدار دریافت کیے کہ اردو ادب کا خزینہ لبالب بھر گیا لیکن افسوس صد افسوس اس محسنِ ادب اردو کو ہم بھولتے جارہے ہیں۔

وہ محسنِ ادب اردو جسے وقت کی گرد چھپا رہی ہے

طفیلی اردو مسوی نے انگڑائی لی اور کناروں کو توڑ کر اپنی جولانی کا جوہر آزمانے مچل پڑی۔ کچھ دیر تو وہ زمین کے خالی حصے پر بہلتی رہی اور پھر شہری ملاقات میں بستی تک پہنچ گئی۔ اس کی آمد کی خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ کھلنڈری بولی تھی جس کا جس طرف مزاج اٹھا بھاگ کھڑا ہوا لیکن کچھ لوگوں کو سہلت نہ مل سکی اور سیلاب کی نذر ہو گئے۔ اس میں صاحبِ مسند ارشاد حاجی سید شاہ عنایت اللہ قتیلی بھی تھے۔ ان کے گھر کا کوئی فرد بھی سیلاب سے باہر قدم نہ نکال سکا۔ سب کے سب مع سید شاہ عنایت غرقِ آب ہو گئے۔

شاہ عنایت کے بیٹے سید غلام محمد شاہ قادری اہل و عیال کے ساتھ "پرمنی" گئے ہوئے تھے اس لیے وہ اس بڑی تباہی سے بچ گئے۔ اللہ تعالیٰ کو نسل تاریخ بعض بھی اس لیے غلام محمد شاہ کو بچا لیا۔ غلام محمد شاہ قادری صبح صفوں میں مشائخ خاندان کے فرد تھے۔ انہوں نے اپنے سلسلے کی پیری مریدی کی روایت کو بھی برقرار رکھا تھا اور تبلیغی مساعی میں بھی کوتاہی نہیں کی تھی۔ مختلف محلوں میں اکثر ان کا وعظ ہوا کرتا تھا جس میں ان کے سیکڑوں معتقدین شرکت کرتے تھے۔ وہ شاعر بھی تھے اور رزم نظمیں کیا کرتے تھے۔ ریاستی عوام کی تہذیبی اور اخلاقی اصلاح کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا لیا تھا۔

غلام محمد شاہ "پرمنی" سے واپس آئے تو رود مسوی کا غصہ کم ہو چکا تھا لیکن جو کچھ وہ اپنے ساتھ جا کر لے جا چکا تھا اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی گود میں دبکے ہوئے بچے کی طرف دیکھا اور اس طرح دیکھا جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ تیز آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سرخ و سپید چہرہ۔ اپنے اجداد کی جسم نمائی ہو بہو دادا کی تصویر۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ بیوی سے مخاطب ہوئے۔

"ہمارا کردار اس کیا کرایا ہے۔"

"اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔"

بچوں میں بھی جانتا ہوں۔ میں نے یہ سوچ کر آبدیدہ ہو گیا تھا کہ اگر "رود مسوی" مجھے بھی نگل چکی ہوتی تو اس بچے کو کون بتاتا کہ یہ کس باکمرہ خاندان کا فرد ہے۔ اس کا سلسلہ نسب قطب الاقطاب سید گیسو دراز احمد نامی تک پہنچتا ہے۔

ہمارے جدامجد سید ابراہیم یہ سالار عبدالحق میں وارد دکن ہوئے تھے۔ ایک بہت بڑا اسلامک سلطان محمد قلی قطب کے دور میں اہم جس نے انتظامی امور پر گہرائی رکھنے کی غرض سے دیوگڑھ یادوراب آباد کو اپنا پایۂ تخت بنانے کا ارادہ کیا اور عجب اتفاق سے یہی شاہ ذریان جاری ہوا کہ تمام عمال، فوجی افسران اور متعلقین دنی سے روانہ آباد (دکن) ہجرت کر جائیں۔ ایسے میں اپنی دنی سے رشتہ ستوار کیا جائے اور دکن کی راہ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دنی ویران اور دکن کے لگے کر ہے آباد ہو گئے۔ سید ابراہیم حضرت نظام الدین اولیا کے خلیفہ محبت سے مستفید ہوئے تھے اور اسی وجہ سے اپنے نسبی شیخ کا لقب عطا ہوا تھا۔ وہ بھی اس تہذیبی قافلے کے ساتھ دکن آئے اور یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

محمد قلی کا یہ منصوبہ ناکام رہا بلکہ میں تغلق نے واپسی کا حکم جاری کر دیا لیکن ان میں سے کئی ایک دنی واپس لوٹنے کی بجائے دہیں آباد ہو گئے۔ سید ابراہیم بھی وہیں نہیں گئے۔ یہیں انتقال کیا۔ آج بھی آپ کا مزار زیارت گاہ خاص و عام بنا ہوا ہے۔

سید ابراہیم کی اولاد میں بہت سے صاحبان سند و ارشاد گزرے ہیں۔ ان میں سید علی ساکنہ مشکل آسان، سید شاہ برہان الدین، شاہ جلال الدین رفاعی اور بدیع الدین رفاعی المعروف عالی ذکر ہیں۔ ان پانچ بزرگوں میں ایک میرے والد شاہ عنایت حسین تھے جو اس سیلاب کی نذر ہوئے۔ اب میں ہوں اور یہ بچی کی الدین قادری، اللہ ہم دونوں کی حفاظت کرے۔

"آپ کیوں اداس ہوتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو میرا محی الدین آپ کا نام روشن کرے گا۔"

"انہوں تو مگر فخر ہے۔ میں انہیں کب ہوں۔ میرے پیر مرشد نے اپنے کا نام محی الدین رکھا ہے جس کے معنی دین کو زندگی بخشنے والا ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس کے کارناموں سے پورا دکن گونج اٹھے گا۔ شاہ فتح (ایک خلد) میں کون ہوگا جو اس کی برابری کر سکے گا۔"

غلام محمد شاہ کا صدمہ ہم کو بھی ہوا تو وہ بھی الدین قادری کو لے کر اپنے پیر طریقت محدث عبدالوہاب متقی بندری کی خدمت میں پہنچے۔

"حضرت، محی الدین کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میرے خاندان پر کیا گزری ہے اس سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ اس کے حق میں دعا فرمائیں۔"

پیر صاحب نے ایک نظر اس کے مسکراتے ہوئے چہرے پر ڈالی اور یوں گویا ہوئے۔ "اس لڑکے کی پیشانی پر غلام مخلص پائے جاتے ہیں۔ یہ لڑکا خاندان کا نام روشن کرے گا۔"

غلام محمد شاہ اس وقت بقید حیات تھے ہوں گے کہ ان کا بیٹا غلام علی روایات کو برقرار رکھنے کے ساتھ تصوف پر حلوہ فرما ہوگا۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ یہ بچہ پڑھ لکھ کر ادب و تحقیق کا کوہ گراں بنے گا۔ ذاکر محی الدین قادری زور کے نام سے مشہور ہوگا۔ یہ نہ تو دنی کے لگا تھا نہ علم و ادب کے مردہ دلی بازوں کو۔ اس کی تحریروں سے قدیم شاعروں اور ادیبوں کے فن پارے منظر عام پر آئیں گے۔ وہ تاریخ ادب کے ایک بڑے محقق کو جنم دے گا۔ بہت سے میرے جو صدیوں کے گرد و غبار میں دب کر رہ گئے ہیں انہیں ڈھونڈ نکالے گا۔ دکن کی ادبی تاریخ کو شمالی ہندوستان پر برتری دلائے گا۔ وہ محقق، ماہر لسانیات، ادیب اور شاعر بنے گا۔

محی الدین قادری زور جدامجد تو ہیں ہی پر حقیقت یہی تھا کہ اس کے دادھیال ہی نہیں ننھیال بھی قابل فخر ہے۔ اس کی والدہ بیٹر الشاء بیگم فضیلت جنگ کی رشتے دار تھیں۔ فضیلت جنگ، حیدرآباد کے چیف سکریٹری ہیر جوب ملی کے دور میں سررشتہ امور مذہبی کے ذمے دار الملی تھے۔ بچے کے پرنانا بورھن (کاغذ نگر) ضلع نظام آباد کے نامور خطیب اور صلحی بزرگ تھے۔ نانا محمد ذاکر علی ان کا شمار اپنے وقت کے جید عالموں میں ہوتا تھا۔ محمد وقار الدین کے والد محمد محسن بھی ادیب و شاعر تھے۔

کئی پشتوں کے علم و ادب کے چرچوں نے جب اس گھر میں آنکھ کھولی تو محی الدین قادری کا بچپن اسی مجموعے میں گھلنے لگا۔ اس خاندان میں خدا پرستی، وضع داری اور انسان دوستی کو متعدد حیات جمعا جاتا تھا۔ محی الدین قادری کے لیے بھی یہی جذبہ جزوِ زندگی بنے گا۔

والد کی ابتدائی تعلیم کے لیے اس کے سامنے کتابیں کھول کر رکھیں تو اس کی ذہانت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ چند ابتدائی قاعدوں کے بعد ہی اسے "مدرسہ دارالعلوم" میں داخل کرا دیا گیا۔ یہ بچی ذہانت یہاں بھی کسی سے پیچھے نہ رہ سکی۔ اساتذہ نے اس کے والد کو بلایا اور اس کی آئندہ ترقی سے انہیں آگاہ کیا۔

"ہم نے بہت سے بچوں کو پڑھایا ہے لیکن ایسا بچہ ہم پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہیں۔ حافظہ اس غضب کا ہے کہ ایک

بات نہیں بھولتا ہے۔ یہ بھی کوئی ایسی بات نہیں لیکن یہ اپنی عمر سے بڑی باتیں کرتا ہے۔ لفظوں کے جوڑ توڑ سے سوالات اٹھاتا ہے۔ یہ باتیں ابھی اسے سمجھانے کی نہیں لیکن ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور ضرور کرتی ہیں۔"

"یہ باتیں آپ مجھے کیا بتا رہے ہیں۔ میں پہلے ہی واقف ہوں۔"

"آپ سے صرف یہ کہنا ہے کہ اس بچے کی صلاحیت کو پہچانیے۔ یہ دکن کا سرمایہ ثابت ہوگا۔ اگر اسے صحیح تعلیم و تربیت میسر ہو تو یہ کسی بڑے کارنامہ انجام دے گا۔"

والد نے فکر مندی سے کہا کہ گھر کا ماحول بتا دیا۔ اس کی کوئی شکایت تو سامنے نہیں آئی تھی لیکن جب وہ گھر پہنچے تو والد نے کہا کہ مدرسہ میں اس کی تعریفوں کے پل بندھے ہوئے ہیں۔ والدہ کا خوش ہونا فطری تھا۔ وہ اس روز مدرسہ سے واپس آیا تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ماں نے بلائیں لیں اور بیٹے سے چاؤ سے اسے گلا لگایا۔

مدرسہ کا سرانجام نے چہرہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اب اسے حیدرآباد کے نئی مالی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کے لیے یہ دنیا ہی نئی تھی۔ اس کے شعور نے آنکھیں کھول لی تھیں۔ اب وہ اردو کے ابتدائی قاعدوں سے گزر کر نصاب میں شامل نظموں تک پہنچ گیا تھا۔ ان نظموں کا اگر اسے سخت ستانا ترکر تھا۔ وہ ابھی شعر کو سمجھنے پر قدرت نہیں رکھتا تھا لیکن اس کا بھی جانتا تھا کہ وہ بھی ایسی نظمیں لکھے۔

حیدرآباد مصروفیتوں کا سرکار کہا جاتا ہے۔ لیکم بلا ملاپی، جلیل مانک پوری، امجد حیدرآبادی، وحید الدین سلیم، علی اختر صدق جائسی اور فانی بدایونی جیسے شعرا یہاں موجود تھے۔ کثرت سے مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ اس ماحول میں شاعر بن جانا کوئی تعجب خیز بات تھا۔ اسی نے چھوٹی چھوٹی نظمیں لکھنا شروع کر دیں۔ جب وہ اسکول سے نکل کر جامعہ عثمانیہ پہنچا تو یہاں کی علم پرور فضاؤں نے اس کی شاعری کو مہمیز دے دی۔ اسی نے اپنا تخلص "زور" تجویز کیا اور باقاعدگی سے شاعری کرنے لگا۔

حیدرآباد میں جہاں حیدرآباد کا آخری شاعر داغ خاموش ہو چکا تھا۔ اب یہاں کی ادبی فضا میں جدید شاعری کے ترانے گونج رہے تھے اور ترقی کی منازل کے متوسط شعرا کے دل میں بھی مچلنے لگی تھی اور اپنے وطن کی سرزمین کا عشق شعرا کے لہو میں دوڑنے لگا تھا۔ اپنی ثقافت کے تحفظ کا خیال اور اس پر گزرنے کا جذبہ جوانوں کے دلوں میں گھر کر چکا تھا۔ یہ

تھا۔ جامعہ عثمانیہ کا قیام انگریزی تعلیم اور انگریزوں کی بھلی و تہذیبی برتری کے خلاف ایک مثبت عملی اقدام بھی تھا۔ وہ بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح اپنے مستقبل سے بڑا پُر امید تھا۔

اس کے ہر فقرے کو اشک آفتاب اب دیکھیے عشقِ ملکِ دکن کو بے تاب اب دیکھیے ہمت کشتی کا سہارا اب دیکھیے دیکھیے ہاں دیکھیے یہ انقلاب اب دیکھیے داغ اپنے منتہ اختیار دھرتے جائیں گے نونہالانِ چمن شاداب ہوتے جائیں گے اس زمانے میں اس نے بھی نظمیں لکھیں ان میں ایک انگریز کے ہندوستانی کی ذہنی عکاسی تو ملتی ہے، وطن کی جذبات کی ترجمانی تو ہے لیکن ندرت فکر اور رفعت تخیل نہیں۔ فطری طور پر عشقِ جذبات کی فراوانی ہے۔

نہیں ایسا ہوش کہ تو جو سے بے گانہ تھا دل نہ غمزے کا عشوے سے نہ دلچسپی انداز سے کچھ مطلب خوش کی ہے نہ ناز نہ راحت جان بنا وہ روٹھ کے من جانا وہ من کے بگڑ جانا وہ شوق کا اکسانا وہ نور کی کرنوں کا بھرے سے چھک جانا وہ وقت فراق ان کے اعضا کا چھک جانا مخمور سی آنکھیں وہ بجوب کی باتیں وہ محبوب ادائیں وہ رفتار وہ متانہ

اس وقت کی موضوعات ان شعرا میں نہ روایت اور مادرِ ایت کے لیے جذبات کا نفوذ ہوتا جارہا تھا۔ زور بھی اس اثر سے بچ نہ سکے۔ کسی بھی شاعر کا ابتدائی دور تقلیدی دور ہوتا ہے۔ وہ بھی دیگر کے انداز میں نظمیں لکھنے لگا۔ اس نے ایک نظم جاگرفی لکھی۔

پھر ذکر وہ رات شبِ مہتاب آگیا ساماں وحشتِ دل بے تاب آگیا موسم وہی فضا وہی کہسار بھی وہی اے کاش دل سے نکلے تمہ یار بھی وہی ہو گا یونہی فلک پہ صدا ماہ ضوفشاں وہ جلوے ہیں ترا چاند ہے وہ چاندنی کہاں

وہ شاعری کی دنیا کسی اور سمت تھا۔ کہتے ہیں جوانی میں ہر آدمی شاعر ہوتا ہے اس کا حال بھی یہی تھا۔ اس نے بہت

جلد اتنا شعری سرمایہ جمع کرلیا کہ ایک دیوان شائع ہو سکتا تھا لیکن اس کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔

ایک روز وہ اپنے ایک دوست سید محمد کے ساتھ ایک کتب خانے میں چلا گیا۔ فہرست دیکھی تو اس کی نظر چند قلمی نسخوں پر پڑی۔ اسے دلچسپی ہوئی کہ پرانے لوگوں کا "خط" دیکھے۔ اس زمانے کا کاغذ دیکھے۔ یہ دیکھے کہ آج کی اور برسوں پہلے کی زبان میں کیا فرق آگیا۔ کس لفظ کو وہ کس طرح لکھتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ اس نے ایک "مخطوطہ" نکلوا لیا۔ بڑے شوق سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کاغذ کی کہنگی، زبان کی اجنبیت اور خط کی قدامت نے اسے لاجواب کردیا۔ اس نسخے کی کتابت بھی اس کے لیے اجنبی تھی۔ حروف ایک دوسرے میں اتنے گتھے ہوئے اور ایک لفظ دوسرے لفظ سے اتنے پیوست تھے کہ پڑھنا مشکل تھا۔ وہ بڑی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ چند الفاظ اندازے سے پڑھ لیے ورنہ سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ سید محمد نے بھی کوشش کی لیکن جلد ہی اکتا گیا اور کوئی مطبوعہ کتاب پڑھنے بیٹھ گیا لیکن محی الدین برابر کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح یہ "معمے" حل کرلے اور بالآخر تھک ہار کر دونوں باہر نکل آئے۔

"یہ کیا پاگل پن ہے۔" سید محمد نے کہا۔

"کیسا پاگل پن۔"

"یہ کہ تم قلمی نسخے لے کر بیٹھ گئے اور ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔"

"یار یہ قلمی نسخے ہیرے کی کانوں کی طرح ہیں۔ محنت کے بغیر یہ ہیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ یہ ایسا گورستان ہے جس میں ہماری تہذیب دفن ہے۔ حیدرآبادی ہونے کے ناتے ہم پر یہ قرض ہے کہ ہم اس تہذیب کو دریافت کریں اور دنیا کے سامنے پیش کریں۔ شمالی ہندوستان آج اپنی برتری ثابت کررہا ہے۔ یہ قلمی نسخے انہیں بتاسکتے ہیں کہ انہوں نے دنیا کے ادب میں کبھی کیسے کیسے پھول کھلائے تھے۔ خاص طور پر قطب شاہوں نے ادب میں کیسے کیسے اضافے کیے تھے۔"

"یہ سب تو اس وقت ہوگا جب تم یہ نسخے پڑھ سکو گے۔"

"ہاں یار، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان کا پڑھنا اتنا مشکل ہوگا لیکن مجھے امید ہے کہ مسلسل مشق کے بعد میں ان کو پڑھنے لگوں گا اور ان شعرا کو بازیاب کرلوں گا جنہیں زمانے کی دھول نے گم نام کررکھا ہے۔ جن کے ڈنکے بجتے ہوں گے۔ آج انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ چھت پر چڑھنے کے لیے سیڑھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ مخطوطات سیڑھیاں ہیں۔ ہم ان پر چڑھے بغیر چھت پر نہیں پہنچ سکتے۔ ان مخطوطات کو اگر نہیں پڑھا گیا تو ہماری تاریخ ادھوری رہ گئی۔ حیدرآبادی تاریخ کا اصل چہرہ ان نسخوں میں پوشیدہ ہے۔"

"میری جان! اگر یہ کام اتنا آسان ہوتا تو بہت سے محققین پہلے ہی کرچکے ہوتے۔"

"اگر کسی نے نہیں کیا تو کیا ہم بھی نہ کریں۔"

یہی باتیں کرتے ہوئے وہ اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

اب اس نے روز کا معمول بنالیا تھا۔ شام ہوتے ہی وہ کسی ایسے کتب خانے میں چلا جاتا جہاں مخطوطات مل سکتے تھے اور انہیں پڑھنے کی کوشش میں مصروف ہوجاتا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہورہی تھی کہ اب وہ ان مخطوطات کی عبارت کو تھوڑا بہت پڑھنے لگا تھا۔

اسی زمانے میں مولوی عبدالحق نے بھی دکنی مخطوطات سے دلچسپی لی لیکن دکنیات سے انہیں وہ دلی وابستگی نہیں ہوسکتی تھی جو محی الدین زور کو دکنی ہونے کی وجہ سے تھی۔ قطب شاہی دور وہ دور تھا جس میں اس کا تخیل سانس لیتا تھا۔ اس عہد پر کام کرنے کے لیے جس ہمدردانہ رویے کی ضرورت تھی وہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

وہ ان مخطوطات میں ایسا منہمک ہوا کہ شاعری کی طرف سے تقریباً لاتعلق ہوگیا۔ حیدرآباد کے جن بزرگ شعرا نے اس سے توقعات وابستہ کرلی تھیں انہیں سخت مایوسی ہوئی کہ کیسا ابھرتا ہوا شاعر کس طرح ڈوب رہا ہے۔ تخلص جان سے لپٹا ہوا تھا لیکن شاعری ترک کردی تھی۔ یار دوست اس پر پھبتیاں کستے تھے۔ "شاعر تخلص" کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے تھے لیکن اب اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ قافیے جوڑنے میں ضائع کرتا رہے۔ اس کے استاد وحیدالدین سلیم نے اس کا ذوقِ تحقیق دیکھ کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"میاں حیدرآباد میں شاعروں کی کمی نہیں۔ تم تو کوئی ایسا کام کرڈالو کہ مادرِ جامعہ کا نام روشن ہو۔ تمہارے لیے تحقیق و تنقید کا میدان کھلا ہوا ہے۔"

محی الدین زور نے اس نصیحت پر پوری طرح عمل کیا اور شاعری سے دور ہوتا چلا گیا۔ اس کے دوستوں کو مایوسی ضرور ہوئی لیکن زور کے لیے نئے آسمان کھلے ہوئے تھے۔

ایم اے کا امتحان ہوا۔ اس نے اس امتحان میں امتیازی کامیابی حاصل کی۔ اچانک اس کی صلاحیتیں حکومتِ حیدرآباد کی نظروں میں آگئیں۔ متعدد اساتذہ کی سفارشات بھی اس کے حق میں تھیں۔ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر نے اسے حیدرآباد کا سرمایہ قرار دے کر سفارش کی کہ اسے بیرونِ ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجا جائے۔

وہ ابھی اپنے لیے کسی راہ کی تلاش کرہی رہا تھا کہ اس کے نام خط آگیا۔ اسے سرکاری وظیفے پر انگلستان بھیجا جارہا تھا۔ اس نے فوراً ہامی بھرلی اور تیاری کرنے لگا۔

اس نے والدین کی دعائیں سمیٹیں اور لندن روانگی کے لیے بمبئی پہنچ گیا جہاں اطالوی جہاز "کرکویا" اس کا منتظر تھا۔ یہ منظر اس کے لیے دلچسپ بھی تھا اور نیا بھی۔ ظاہر ہے اس سے پہلے اس نے بحری سفر نہیں کیا تھا۔

لندن پہنچنے کے بعد دوسرے دن وہ یونیورسٹی پہنچا اور داخلے کی کارروائی مکمل کی اور ان اساتذہ سے ملاقات کی جن کے مشوروں اور نگرانی میں اسے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کرنا تھا۔

کچھ دن کے آرام کے بعد جب وہ لندن کی سیر کو نکلا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ان لوگوں نے کتنی ترقی کرلی ہے یہ دیکھ کر اسے حیرانی ہوئی تھی۔

جب مقالے کی تیاری کا کام شروع ہوا تو اس کا بیشتر وقت برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کی لائبریری میں گزرنے لگا۔ برٹش میوزیم میں اس کا من پسند خزانہ مخطوطات کی شکل میں مل گیا۔ انڈیا آفس لائبریری کا ذخیرہ تو ایک خزانہ تھا جسے دیکھ کر محققین اور طلبہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی تھیں۔ اس نے کچھ دن بعد پرانی کتابوں کی ایک دکان تلاش کرلی جہاں سے وہ کتابیں خریدتا رہا۔

اس نے دو سال کی مدت میں اپنا مقالہ مکمل کرکے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلی۔ اس کا مقالہ اردو کے آغاز و ارتقا سے متعلق تھا۔

تحقیق کے سلسلے میں اس کی ملاقات پروفیسر ٹرنر سے ہوئی۔ انہوں نے ہند آریائی زبانوں کی تحقیق میں اپنی عمر گزاری تھی۔ یہ وہ استاد تھے جن کے سامنے آدمی کو اپنی حیثیت کا پتا چل جاتا تھا۔ اس نے ابتدائی سنسکرت اور لسانیت کی تعلیم پروفیسر ٹرنر سے اور صوتیات کی تعلیم لارڈ جیمس سے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز لندن میں حاصل کی۔

اس وقت تک جدید لسانیات کی طرف بھارت اور پاکستان میں کوئی خاص توجہ یا دلچسپی نہیں تھی۔ ڈاکٹر زور غالباً پہلے آدمی تھے جو لسانیات کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

انگلستان میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پیرس پہنچے اور صوتیات کی تحصیل کے لیے یونیورسٹی کالج میں پروفیسر ڈینیل جونس اور ای آرمسٹرانگ کے شاگرد رہے اور ہندوستانی فونیٹکس پر مقالہ مکمل کیا۔ تحصیلِ علم کی پیاس پھر بھی نہیں بجھی تو سوربون یونیورسٹی پیرس میں نگرانی پر پروفیسر جے بلوک کی نگرانی میں کام شروع کردیا۔

اب واپسی کا سفر شروع ہوگیا تھا۔ جنیوا سے روم اور پھر کولمبو پہنچے۔ کولمبو سے مدراس آئے اور یہاں سے اپنے وطن حیدرآباد پہنچ گئے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وہی بارعب اور سرخ و سفید چہرہ، بھاری بھرکم جسم، ہونٹوں پر پان کی سرخی۔ پاٹ دار آواز، پاؤں میں سلیم شاہی، چکن کے ڈیزائن کی شیروانی، ڈھیلا پاجامہ، سر پر شیروانی کے کپڑے سے تیار کی ہوئی ٹوپی۔

تقریباً پانچ سال کی طویل غیرحاضری کے بعد وہ اپنی مادرِ علمی جامعہ عثمانیہ پہنچے۔ اس کی ترقی دیکھ کر خوش تو ہوئے لیکن یورپ کی یونیورسٹیوں سے اس کا موازنہ کیا تو انہیں مایوسی بھی ہوئی اور دل میں تہیہ کرلیا کہ اگر موقع ملا تو اس جامعہ کے لیے بہت کچھ کریں گے۔

1884ء میں ریاست حیدرآباد نے فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان کی حیثیت عطا کی تھی۔ سالار جنگ نے ریاست کے نظم و نسق کو بہتر بنانے کے لیے شمال سے قابل اور باصلاحیت افراد کو دکن مدعو کیا اور انہیں ذمہ دار عہدوں پر فائز کرکے ان کی صلاحیتوں سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شمال سے جوق در جوق اہلِ علم حیدرآباد کا رخ کرنے لگے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں اپنے اہلِ زبان ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ دکنیوں کی بول چال پر اعتراض کرتے اور ان کے قدیم ادبی سرمائے کی حقیقی قدر و قیمت سے ناواقف تھے اس صورتِ حال نے حیدرآباد کو ایک طرح کے احساس کم تری میں مبتلا کردیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اس صورتِ حال کو محسوس کیا اور ارادہ کرلیا کہ وہ اس احساس کم تری کو دور کریں گے اور ثابت کریں گے کہ اہلِ دکن بھی علم و ادب میں کسی سے پیچھے نہیں بلکہ دو قدم آگے ہیں۔ دکنی مخطوطات کو منظر عام پر لاکر اس کی قدامت ثابت کریں گے اور ثابت کریں گے کہ شمال میں جب کوئی اردو لکھتا بھی نہیں تھا اہلِ

دکن اردو میں دیوان مرتب کرے ہے تھے، نثری ادب کا ذخیرہ جمع کرے ہے تھے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ریڈر کی جگہ خالی تھی۔ ڈاکٹر زور کو ان کی علمی لیاقتوں اور قابلیت کی بنا پر عثمانیہ یونیورسٹی نے ریڈر کی حیثیت سے ماموز کردیا۔

وہ ابتدا ہی سے اس بات پر زور دے رہے تھے کہ اردو کی ادبی شخصیات کو ایک سرکاری پرچم کیا جائے تاکہ سب مل کر ذکی ادب کے فروغ کے لیے کوشاں ہو جائیں۔ پوسٹ جانے سے پہلے انہ تھے ان کی آواز ایک طالب علم کی آواز تھی لیکن جب وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں ریڈر ہو گئے تو ان کی آواز میں وزن پیدا ہو گیا۔ سوا جی بھی فراہم تھے۔ انہوں نے متعدد علوم پر اردو زبان کو تصنیف کرنے کے مقصد کے تحت ایک علمی انجمن کی بنیاد رکھی جس میں ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے۔ مختلف موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے، کلام سنائے جاتے اور مباحثے ہوتے۔

جب بھی اس قسم کی انجمنیں بنتی ہیں تو نوجوان سب سے پہلے آگے آتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ حیدرآباد کے خوش فکر نوجوان کثرت سے شرکت کرنے لگے۔ ہفتہ وار محفلیں سجنے لگیں۔ بزرگ شعرا بھی اس سے دور دور رہے۔

جب اس انجمن کی شہرت ہونے لگی تو اس کے مخالفین بھی پیدا ہو گئے۔ انہوں نے وزیر اعظم سر اکبر حیدری کو یہ باور کرایا کہ یہ انجمن ریاست دشمن ہے۔ یہاں نوجوان جمع ہوتے ہیں وہ ادب کے پردے میں سیاسی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ ریاست کے خلاف بغاوت کے مقصد پر بنائے جارہے ہیں۔ اس وقت اردو ادب میں ترقی پسند رجحانات تیزی سے فروغ پا رہے تھے۔ خود ڈاکٹر زور اس بارے میں کوئی تعصب نہیں برت رہے تھے۔ ترقی پسندی کے بارے میں ان کے نظریات نہایت متوازن تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

''اپنے خاندانی یا سیوری مزاج کے مطابق دونوں خوبیاں دیکھتا ہوں۔ روایداری اور مرجبا مرجع طرز زندگی میرے مجھے میں آئی ہے۔ غالباً آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میری میں دوسال بہت اچھی باتے کے کیونکہ انجمن اتحاد کے ساتھ رہا ہوں اور اب بھی سجاد ظہیر جیسے ترقی پسند ادیبوں کے شار میرے خصوص دوستوں میں ہے۔ میں کام کی قدر و قیمت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں دیکھتا کہ کس گروہ یا کس مذہب اور مسلک کے ادیب و شاعر کی تخلیق اور کاوشوں کا ثمر ہے۔''

ڈاکٹر زور کی اسی حوصلہ افزائی کے باعث بیشتر ترقی پسند نوجوان بھی اس انجمن میں شامل ہو گئے تھے۔ مخالفین کو اچھا موقع مل گیا اور انہوں نے سر اکبر حیدری کو یہ باور کرا دیا کہ کمیونسٹ خیالات رکھنے والے نوجوان یہاں جمع ہوتے ہیں اور حکومت کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ رہائی ماحول میں یہ شاید کبھی برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی ریاست کے خلاف باتیں کرے۔ سر اکبر حیدری نے انجمن میں شرکت کرنے والے نوجوانوں کو اپنے پر عتاب کا شکار کیا اور فرداً فرداً ان سے باز پرس کی۔ ان نوجوانوں نے برجستہ انکار کیا اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ سیاست سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں اور اس انجمن میں ادبی موضوعات پر مباحثے ہوتے ہیں لیکن سر اکبر حیدری کو اپنی معلومات پر اتنا یقین تھا کہ ان سے سچ اگلوانے پر مصر رہے۔ یہ ملاقات بدمزگی پر ختم ہوئی۔ نوجوانوں نے اس خوف سے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو اس انجمن کے جلسوں میں آنا چھوڑ دیا اور یہ ادارہ تحلیل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زور اتنی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ یہ انجمن تو انہوں نے محض آغاز کے لیے بنائی تھی۔ ان کے عزائم تو اس سے بڑے تھے۔ وہ کوئی ایسا ٹھوس کام کرنا چاہتے تھے جس سے ادب کی خدمت ہو۔ انہوں نے نصیر الدین ہاشمی، عبدالحق اور سروری اور عبدالحی عبد لطیفی کے تعاون سے ''ادارہ ادبیات اردو'' کے قیام کا اعلان کر دیا۔

اس ادارے کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

1۔ اردو زبان کے فروغ و اشاعت کے کام کو آگے بڑھانا۔

2۔ اردو شعر و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنا۔

3۔ شعرا اور مصنفین کی حوصلہ افزائی کرنا اور تصنیف و تالیف کی سہولتیں بہم پہنچانا۔

4۔ ملک کی تاریخ سے دلچسپی پیدا کرنا، قدیم آثار اور تاریخ و ادب کے شہ پاروں کی حفاظت کرنا۔

5۔ ایک سہولت بخش کتب خانے کا انتظام۔

انہوں نے اعلان تو کر دیا تھا۔ اس کے قیام کے مقاصد بھی سب کو معلوم ہو گئے تھے لیکن آغاز ہی میں بڑے پیمانے پر اس کی مخالفت شروع ہو گئی۔ مخالفت بھی سرپرآوردہ لوگوں کی طرف سے تھی۔ ایک ادبی گروہ نے اسے انجمن ترقی اردو کا مدمقابل سمجھ لیا تھا اور اس ادارے کو غیر ضروری سمجھنے لگے۔ کالی داس یہ مخالفت جاری رہی اور پھر بالآخر دم توڑ گئی۔

ڈاکٹر زور نے مخالفت کی پروا نہ کرتے ہوئے کام کو نہ صرف جاری رکھا بلکہ کام کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ۔ ان کے ساتھ شامل ہو جائیں۔ انہوں نے اداروں ادبیات کی باڑھ شاخیں بنائیں اور اپنے دوست واحباب کو ان مختلف شاخوں کی دیکھ بھال پر مامور کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے شیدائیوں کو اپنے گرد اکٹھا کرلیا۔

''شعبہ زبان ہے'' اس وقت کے نامور اہل قلم وادبا تھے۔ قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر یوسف حسین، عبدالقادر سروری اور خود ڈاکٹر زور شعبہ زبان کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان ادیبوں نے زبان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا، لفظوں کی تذکیر و تانیث، ان کے خصوصی محل استعمال، کہاوتوں اور محاوروں کو جمع کیا۔ کبھی اصلاحات کا جائزہ لیا جو دفاتر میں استعمال کی جارہی تھیں۔

ادارے نے اپنا تحقیقی پرچہ ''سب رس'' جاری کیا جس میں یہ اصلاحات شائع کی جاتی تھیں۔

شعبہ تحقیق کے ذمے یہ کام رکھا گیا کہ وہ مصنفین میں تنقیدی شعور پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ انگریزی ادب سے گہری واقفیت رکھنے والے اردو داں حضرات کو انگریزی تنقید کے اصولوں اور طریقہ عمل سے واقف کروانا تھا۔ اس کے لیے بھی ''سب رس'' کے صفحات استعمال کیے گئے اور تنقیدی مضامین شائع کر کے تنقیدی ذوق کی آبیاری کی گئی۔

اس وقت بڑا ضروری تھا کہ غیر ملکی شہ پاروں کے تراجم شائع کیے جائیں تاکہ اردو داں طبقہ اعلیٰ ادب سے واقف ہو اور ان میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہو۔

اس شعبے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تاریخ داں حضرات سے ایسی کتابیں لکھوائی جائیں جو رکن کی تاریخ و ثقافت کا احاطہ کر سکیں۔

تاریخی حفظ کے لیے اس شعبے نے بار ہا رجوع کیا اور کتابات کے چرچے ادارے میں محفوظ کر دیے گئے۔ اس طرح رکن کے تاریخی آثار کو بچانے کی جدوجہد میں اس شعبے نے نمایاں کارنامے انجام دیے۔

ادارے کے ایک شعبے نے کتابیں چھاپنے کا اہتمام کیا جس سے شعرا اور مصنفین کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ تاریخ ادب اردو کی تدوین کی گئی۔ اس میں شامل بیشتر سوانح ڈاکٹر

زور کا سرہانہ مدت تھا۔

ڈاکٹر زور کی آنکھیں دور تک دیکھ رہی تھیں۔ وہ صرف ادب و شعر تک محدود نہیں رہے۔ انہوں نے موجودہ ضرورتوں اور تقاضوں کو پوری طرح ناظر رکھتے ہوئے شعبہ سائنس قائم کیا۔ اس وقت تک اردو میں طبعی علوم سے متعلق کتابوں کی تعداد بہت کم تھی۔ اس شعبے نے سائنسی علوم کی معلومات کو عام فہم انداز میں عوام تک پہنچایا۔ ان کتابوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی خصوصاً جامعہ عثمانیہ کے طلبہ کو اس سے بہت فائدہ پہنچا کیونکہ وہاں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔

ادارہ ادبیات اردو ایسے مثبت اور ٹھوس کام کر رہا تھا کہ کوئی انگلی نہ اٹھا سکے۔ آہستہ آہستہ مخالفت کا زور مدھم پڑ گیا۔ مخالفین بھی اس ادارے کے اشاعتی پروگرام کے تحت اپنی کتابیں شائع کرنے کے خواہاں ہو گئے۔ اب تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کا ہر شاعر ہر ادیب ڈاکٹر زور کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھا ہے اور ان کی علمی (انتظامی) صلاحیتوں کا معترف ہے۔ ڈاکٹر زور کی تحقیقی سرگرمیاں جاری ہیں۔ تحقیقات پڑھنے میں انہیں کمال حاصل ہو گیا تھا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے مشق فرما رہے تھے۔ اور سچ یہ تھا کہ اساتذہ کی تعلیم حاصل کی تھی لہٰذا ان تحقیقات کو وہ اتنی آسانی سے پڑھتے تھے جیسے کوئی عام کتاب پڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے قدیم قلمی نسخوں کو تلاش کیا اور انہیں پڑھ کر اپنی فہم کو سوا درجہ اور بڑھا لیا جس کے نتیجے میں کئی قدیم شعراء کے دواین سامنے آئے۔ کئی ادب کالاسی ادبی سرمایہ سے بھرنے لگا۔

ان کا مقصد صرف قدیم ادب کو منظر عام پر لانا نہیں تھا بلکہ موجودہ دور کے لئے ان قلمی خزانوں کو اہمیت دینا بھی تھا۔ ان کا مشاہدہ یہ تھا کہ دکن کی مشہورات میں بھی علمی ذوق بھرپور ہے لیکن پردے کی مجبوری انہیں مردوں کے برابر لانے میں حائل ہے۔ وہ مردوں کی طرح سٹاروں میں آنے سے بھی معذور ہیں اگر انہیں پلیٹ فارم میسر آ جائے تو ان کی صلاحیتیں دوگنی ہو جائیں۔ انہوں نے نہایت کڑی کاوش کے بعد صاحب علم خواتین کی نشاندہی کی، ان سے رابطہ کیا اور اپنے ادارے کے تحت ان کی تصانیف شائع کیں۔ اس عمل سے ان کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ انہوں نے اس مقصد کو مزید فعال بنانے کے لیے ادارہ ادبیات اردو کے تحت شعبہ خواتین قائم کیا۔ اس شعبے کا تمام کام خواتین کے ہاتھ میں تھا۔ بالمرہ خواتین ہی سے رجوع کرتی تھیں اور اپنی تخلیقات کی اشاعت کا بندوبست کرتی تھیں۔

ڈاکٹر زور نے ایک جامع انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ بنایا۔ وہ کام شروع کر چکے تھے اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتے لیکن یہ منصوبہ آگے نہ بڑھ سکا۔ یہ اتنا عظیم کام تھا کہ اسے پورا کرنے کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت تھی۔ پھر بھی اسے پایۂ تکمیل تک ضرور پہنچاتے تھے لیکن یہ منصوبہ آگے نہ بڑھ سکا۔ حکومت کی امداد کے بغیر صرف ارکان کے عطیات ناکافی تھے لہٰذا یہ منصوبہ ادھورا ہی رہ گیا۔ اٹھانے سے پہلے ہی ہاتھ کھینچنا پڑا اور پھر کبھی اتنی فرصت نہ مل سکی اس انسائیکلوپیڈیا کی۔

ڈاکٹر زور کے ذہن میں کئی اور منصوبے بھی کروٹیں لے رہے تھے لیکن ان کی خواہشیں ہر جگہ آڑے آ رہی تھیں۔ ادارے کی بڑھتی ہوئی عمارت نے انہیں مالیات کا کوئی وسیلہ ادارے کی کارروائیوں کے لیے اپنے گھر کا ایک حصہ وقف کر دیا تھا۔ اردو کے بھی خواہاں پھرنے سے ہمیں بھی رنج ہوتا تھا۔ علمی کمی ہوتی محسوس ہوتی تھی۔ مصروف بہت تھے، چندہ جمع ہوتا تھا۔ تصنیفات شائع ہوتی تھیں۔

کام پھیلتا جا رہا تھا۔ جاری و ساری پیش رفت جاری تھی۔ انہوں نے بھرپور کام کیا اور اپنے پیچھے سے مکمل چند چھوٹے کمرے تعمیر کروا گئے مختلف شعبوں کے لیے مختص کر دیے۔ ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں بڑے بڑے نوبل آتے تھے۔ ایک روز ایک علمی عہدے دار خانم کم تشریف لائے۔ یہ صدر الجہام خاتم کے ذخیرہ دار عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے اس دفتر کا معائنہ کیا اور اس کے تحت جو کام ہو رہے تھے ان کی رپورٹ دیکھی تو سخت برہم ہو گئے۔

”حکومت پر بار نہ بنیے بلکہ آپ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔“ انہوں نے ڈاکٹر زور سے کہا۔

”انہوں نے قبیلی ہے کہ حکومت کوئی مدد نہیں کر رہی ہے۔“

”آپ خود کام کر رہے ہیں جو حکومت کی سرخروئی کا باعث ہے۔ اسے آپ کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔“

”ہم حکومت سے کئی بار درخواست کر چکے ہیں مگر شنوائی نہیں ہوئی۔“

”میں جتنی کوشش کر سکتا ہوں ضرور کروں گا۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔“

نظام محبوب نے سرکاری عہدیداروں کی طرح محض وعدہ نہیں کیا بلکہ خصوصی دلچسپی لی اور حکومت نے اس ادارے کے لیے گرانٹ منظور کر دی۔

بیگم زور نے اپنے کمپاؤنڈ میں ایک پلاٹ طلبہ حلیہ عنایت کر دیا۔

محرمہ زور نے ادارے کے لیے علیحدہ بلڈنگ کی ضرورت محسوس کی جاری تھی۔ حکومت کو درخواست بھی پیش کی گئی تھی جس پر حکومت نے ایک مشت نو ہزار روپے کی منظوری کر دی تھی۔ جب عمارت کے لیے سالانہ گرانٹ منظور کروائی جائے۔ جب عمارت زور نے پلاٹ عنایت کر دیا تو حکومت سے یہ رقم حاصل کر لی گئی۔

یہ کوئی معمول کا سوال نہیں تھا۔ اسے غیر معمولی بنانے کے لیے فیاض الدین آرمیکٹیکٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ فیاض الدین بخوبی جانتے تھے کہ انہوں نے بھی جتنی ادا کر دیا۔ نہایت خوب صورت نقشہ تیار کیا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں محل اور نقیب شاہی طرز تعمیر کا امتزاج تمام نظر آتا تھا۔

یہ عمارت پچیس روز میں تعمیر ہو کر شروع ہوئی۔ حسن نظامی نے ایوان اردو تمام کروا لیا۔ یہ عمارت آج بھی اپنی دلکشی اور وقار کے ساتھ موجود ہے اور ڈاکٹر زور کی بے لوث خدمت گزاری کی داستان سنا رہی ہے۔

اب اس عمارت میں اتنی جگہ تھی کہ باب کتابیں سلیقے سے رکھی جا سکیں۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ نادر اشیاء، قدیم قلمی جات اور ادیبوں کے خطوط کو رکھا نیا خطوط اور قدیم فرامین و دستاویزات جمع ہونے لگے۔ اس عمارت میں موجود کتب خانہ ایک میوزیم بن گیا جس میں دکن کی ثقافت کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹر زور کو جدید آبادی تہذیب سے جو خطرہ تھا اس عمارت کو انہوں نے اس کی شاندار روایت میں داخل ہو گئے میں یادگار بنا دیا۔ اور داخل ہونے ہی عمارت ہونا تھا ہم قدیمہ شاہی دور میں داخل ہو گئے ہیں یا ماضی شاہی دور کی سیر کو نکلے ہیں یہ ہمارا پیچھا چھوڑ ہمارے سامنے ہے۔

☆.....☆

دکن کے عوام اپنی روایات کا تسلسل قطب شاہوں سے کو لکنڈے میں ملاتی کرتے تھے۔ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر کا سہرا ”ولی“ کے سر سجایا جاتا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس سے بہت پہلے قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ دیوان مرتب کر چکا تھا۔ تہذیبی اور ادبی روایات کا سلسلہ گولکنڈہ تک جاتا تھا۔ قلی قطب کا دیوان ہی یہ بتانے کو دلالتا ہے کہ گولکنڈہ کی تہذیب کیا تھی لیکن یہ دیوان دنیا کی نظروں سے اوجھل تھا۔

دکھنیوں کو قطب شاہی تہذیب سے اس لیے مساوات اور عقیدت تھی کہ یہ تہذیب ان کی سماجی زندگی کا ایک جزو

ماہنامہ
پاکیزہ
ہیں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ ماتمی پہاڑ و فرزاں کی پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔
تو قارئین آج ہی فروری کا
ماہنامہ پاکیزہ
ایسے بار کے بک کر والیں

بن چکی تھی اور اس کا نفسیاتی اثر۔ سال ہا سال سے یہاں برابر یہ تاثر تھا جس نقاشی وحدت کو کبھی تہذیب کہا گیا ہے وہ دراصل مشکل تہذیب سے دوری اور قلب شاعری تہذیب کی روایات کی پاسداری کے رجحانات کے تہ نشاں تھی۔

ڈاکٹر زور کے ادبی شعور کی نشوونما بھی اسی دکنی تہذیب میں رہتے ہوئے ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے فطری طور پر اس تہذیب کو جو قطب شاہی سیر چشمیوں سے سیراب ہوئی تھی اور جس کی ترجمان دکنی زبان تھی اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔

اس تہذیب کا شائستہ دور ختم ہو جانے کے بعد ان پر لازم آگیا تھا کہ وہ اردو کے قدیم کی بازیافت کریں اور وہ اس کوشش میں مصروف رہے۔

اس کا عقیدہ تھا کہ شمال میں جس زبان کو "اُردو لیٹر" کہا جاتا ہے وہ علم و ادب کے اصول خوانوں سے مالا مال ہے۔ اس زبان کے ایسے شاعر اور ادیب پیدا ہو چکے ہیں جن کی تخلیقات نے اردو ادب کو سربلند و سرفراز کر دیا تھا لیکن زبانی کوتاہی مانتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ان ادب پاروں کو تلاش کیا جائے۔ ان شخصیات کی قبروں کو ڈھونڈا جائے، ماضی کو سینہ چاک کر کے فراموش شاعری کو نکالا جائے۔

ڈاکٹر زور نے اسی جذبے کے تحت تحقیق کی دنیا میں قدم رکھ دیا۔

انہوں نے سنسکرت جھیلیں اور راستے کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے آباد، بیجاپور، گلبرگہ، بیدر اور حیدرآباد کے دوسرے معاملات میں گھومتے پھرے اور بہت سے بیرے جو سنی و شاکاف میں دب گئے تھے ڈھونڈ نکالے۔ شعراء کے ادبی خواب گاہوں تک کو ڈھونڈ نکالا۔

کئی قبروں کی تلاش میں کامیابی ہو چکی تھی۔ دکن کے ایک مشہور شاعر سید نصیر الدین نصیر کا نام قدیم تذکروں میں پڑھ چکے تھے لیکن اس کے مدفن کا نشان نہیں مل رہا تھا۔ بڑی تلاش و تحقیق کے بعد لال دروازے کے پاس گورستان کا پتا چلایا جہاں خیال تھا کہ نصیر مدفون ہیں۔ وہ اسی گورستان میں پہنچ گئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ شکستہ قبریں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ سنی اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کسی کی قبر کو نیش کی قبر کہا جاتا ہے؟ انہوں نے چند مقامی لوگوں سے دریافت کیا۔ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ کئی روز برابر اس گورستان میں جاتے رہے اور مقامی لوگوں سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ اس پوچھ گچھ کے دوران ان کی ملاقات ایک بوڑھے آدمی سے ہوئی جس کی عمر نوّے سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ انہوں نے نصیر کی قبر کے بارے میں دریافت کیا۔ اس شخص کو جو ان جانی ہی ہو نہ تھا کہ اس شخص کو ایسی پرانی قبر کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔

"میرے خود دادہ وہ کیا تمہارے عزیز ہے۔"

"میرے عزیز تو نہیں البتہ میری برادری کے ضرور تھے۔ وہ بھی شاعر تھے میں بھی شاعر ہوں۔"

"ہمیں ان کی قبر کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔"

"میں اس قبر پر دری کا انتظام کروں گا جنیرہ مرمت کراؤں گا تاکہ وہ محفوظ ہو جائے۔"

"مگر کیوں؟"

"وہ بہت بڑے شاعر تھے۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم حیدرآباد والے کس قدر گرے ہیں۔"

"حضرت آپ کیسے معلوم ہوا کہ وہ بہت بڑے شاعر تھے۔"

"میں نے ان کا دیوان دریافت کر لیا ہے۔"

"پھر تو آپ بہرے بھی سمن ہوئے۔" اس بوڑھے نے کہا۔ "میں اللہ دتی نیش ہوں ہمارے عزیز داروں میں تھے اس لیے میں نے اپنے بزرگوں کی زبانی اس کہ نیش کی تعریف اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا ہے۔ آیئے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔" ان بزرگ نے کہا۔ "میں ایک صاف ستھری قبر کے نزدیک لے جا کر کھڑا کر دیا۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی کہ دوسری قبروں کی بہ نسبت یہ قبر صاف ستھری کیوں ہے۔ اس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے۔ اسے نیش ہی کا ایک مخلص شعر مل گیا۔

سہیجہ یاد بہار چنتان بہشت
مشہد نیش پہ جاروب کشی کرتا ہے

انہوں نے اس بات کی پھر پور کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ دکنی شعراء اور ادیبوں کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکالیں اور زیادہ سے زیادہ دکنی تخلیقات کو روشناس کرایا جائے اور دکنی ادب کی عظمت کا سکہ ہر دو دل جلنے کے دلوں پر بٹھایا اور جما دیا جائے۔ دکنی مخطوطات کی فراہمی ان کے لیے مشکل نہیں تھی۔ ان کے گھر کی زبان دکنی کا جدید روپ تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یورپ جا کر سائنٹیفک کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اس لیے جدید بہ جدید تدبیلوں اور لسانی تغیرات کو سمجھنا دشوار نہیں تھا۔ انہوں نے قدیم متون کا مطالعہ کیا اور اردو کی ادبی و لسانی روایات کو شدت سے مربوط کر دیا۔ ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑ دیا۔

"گولکنڈہ کے ہیرے" اور "میر گولکنڈہ" بھی تصانیف پیش کر کے انہوں نے وہ خصوص فضا پیدا کر دی جس میں رہتے ہوئے دوسرے لوگ بھی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی کوششوں سے یوم ولی منایا گیا اور اس سلسلے میں مخطوطات کی ایک فہرست بھی مرتب کی۔

جب نواب سالار جنگ نے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"اس اہم اور دلچسپ کام کو اس تعریب کے ساتھ ختم نہ ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں اس سے بہتر کوئی کام نہیں کہ ولی کے معاصرین اور اس سے پہلے کے شاعروں اور ان صاحبان تصانیف کی اردو کتابیں مرتب اور شائع کی جائیں۔ اس اہم کام کی تکمیل کے لیے ایک جماعت منتخب کرنی چاہیے۔"

اس تجویز پر عمل کیا گیا اور ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ ڈاکٹر زور اس کمیٹی کے ۱۰ سال صدر مقرر ہوئے۔ تمام ادب پاروں کی ترتیب و تدوین کے لیے قابل ترین افراد کا تعاون حاصل کر کے تحقیق و تدوین کا کام شروع کر دیا گیا۔

کلیات قلی قطب شاہ، دی ایڈیٹنگ کا کام ڈاکٹر زور کے سپرد ہوا۔ ڈاکٹر زور "سلسلہ یوسفی" کی دوسری تصانیف کی ترتیب و تدوین میں محققین کی رہنمائی کرتے رہے۔ ان کی کوششوں سے کئی قدیم دکنی شعراء پر تحقیقی مقالے شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔

کلیات قلی قطب شاہ، تذکرہ مخطوطات، گلزار ابراہیم، گزشتہ حاتم، ذخیرہ تحقیق میں ڈاکٹر زور کی تحقیق و نکتہ رسی کی شاہد رشاہیں ثابت ہوئیں۔

"اردو شہ پارے" ان کی املی تصنیف تھی جس نے محققین کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ قدیم ادب کے بارے میں لوگوں کی معلومات محدود تھیں۔ ڈاکٹر زور نے نہ صرف ہندوستان میں موجود قدیم مخطوطات کا مطالعہ کر کے ادب کا دوبارہ لکھا بلکہ یورپ اور لندن کے کتب خانوں میں بھی اس کتاب کی زینت بنایا اور دوسرے محققین کو ایسے اشارے فراہم کر دیئے جن کے ذریعے وہ ان میں مزید اضافے کر سکیں۔ اردو تحقیق کے ذریعے انہوں نے بہت سی راسخ غلط فہمیوں کو دور کیا اور تاریخ ادب کا غلط درست کیا۔ میر اور غالب کو دوبارہ پڑھا اور خواجہ بندہ نواز کو پہلے مصنف کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ ڈاکٹر زور کی تحقیق کے مطابق نہ امیر خسرو اردو کے پہلے شاعر تھے نہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اردو کے پہلے مصنف۔

ڈاکٹر زور نے مسعود کی شاعری کو طاش کیا۔ ڈاکٹر زور نے مسعود کا زمانہ پانچویں صدی بتایا اور یہ بتایا کہ وہ شاہ ابراہیم بن مسعود حاکم لاہور تھا اور سلطان ابراہیم کے زمانے کا شاعر تھا اور محمد عوفی نے تذکرے "لباب الالباب" کے حوالے سے لکھا کہ اس نے تین دیوان مرتب کیے تھے جن میں سے ایک ہندی میں تھا۔ وہ اس کے بارے میں رائے ظاہر کرتے پر مجبور ہوئے کہ اس نے جو کچھ بھی لکھا ہوگا وہ غیر ہندی اب زبان میں ہوگا جو جنوب میں بولی جاتی تھی اور وہ زبان مکمل نہ کہ اردو کی بالکل ابتدائی صورت میں رہی ہو گی۔

مسعود سعد سلمان کا دیوان دریافت نہ ہو سکا اور نہ ڈاکٹر زور کی بات میں مزید زور پیدا ہو جاتا۔ ڈاکٹر زور کو خود بھی یہ احساس تھا کہ مسعود کی زبان کے بارے میں قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا۔ یہی حکم انہوں نے امیر خسرو پر بھی صادر کیا۔

"مسعود کی طرح خسرو کی زبان بھی مشتبہ ہے۔"

کے بعض شعر اس وقت موجود ہیں مگر یہ کچھ زیادہ معتبر نہیں۔"

اس کے بعد ڈاکٹر زور نے لکھا کہ امیر خسرو کو "خالق باری" کا مصنف سمجھا جاتا ہے لیکن محمود شیرانی کی تحقیق سے یہ بات ہو چکا ہے کہ یہ بعد کے زمانے کی کتاب ہے اور زمانہ حال کے مصنفین نے اس کو خسرو سے منسوب کر دیا ہے۔

اس کتاب کے باب اوّل میں اردو ادب کے ابتدائی نمونوں پر تبصرہ کیا جو شمال ہند، گجرات اور دکن کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس دور کے مصنفین کے حالات زندگی بھی بیان کیے تھے۔

دوسرے باب میں بیجاپور سے تعلق رکھنے والے شعرا اور ادیبوں کے نام گنائے اور ان کے ادبی کارناموں پر تبصرہ کیا۔ باب سوم گولکنڈہ کے اہل ادب سے متعلق رکھتا تھا۔ باب چہارم مکمل دور کے دکنی شعراء سے متعلق رکھتا تھا۔ دکن اور گجرات میں اس وقت جو شعرا موجود تھے ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی اور اہل ادب پر یہ بھی آشکارا کیا کہ یورپ اور انگلستان کے مختلف کتب خانوں میں ان کی یادگاریں محفوظ ہیں۔

ڈاکٹر زور کی یہ تصنیف "اردو شہ پارے" اردو زبان کی ادبی تاریخ کو طوالت بخشنے اور اردو کی قدامت اور

بڑی کام کرنے میں معاون ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر زور نے اپنی تحقیق سے ان شعرا کے نام اور کلام کو منظر نکالا جن سے دنیا ابھی واقف نہیں تھی یا بعض نام سے واقف تھی حالات سے بے خبر تھی۔ ڈاکٹر زور نے ان کے نام اور حالات سامنے لا کر اہل علم کو داد دی کہ وہ ان اہم ہیروں اور شاعروں کے بارے میں مزید تحقیق کر کے اس کام کو آگے بڑھائیں گے۔

"جب بیرونِ ملک تعلیم کے لیے گئے تھے تو آکسفورڈ اور کیمبرج میں عربی میزم اور انڈیا آفس لائبریری میں بہت سی ہاتھ کی لکھی ہوئی اردو کتابیں دیکھی تھیں۔ ان میں سے بعض ایسی نایاب تھیں کہ خود ہندوستان میں ان کے نسخے موجود نہیں تھے۔ انہوں نے اس زمانے میں اردو داں طبقے کو ان مخطوطات سے واقف کرانے کا منصوبہ بنایا تھا چنانچہ واپسی میں انہوں نے اپنے اس منصوبے کو کئی حد تک پورا کر دیا۔ یہ کام بڑا پائے دار ہے۔"

انہوں نے صرف دستیاب شدہ قلمی نسخے نہیں لکھے بلکہ تحقیق کی دنیا میں قدم رکھا اور آگے بڑھایا۔ جو مطبوعات انہیں ملیں سے فراہم ہوئیں اس کی تفصیل کی چھان بین میں لگ گئے۔ اصل تک کیسے پہنچے۔ اسے تنقیدی نظر سے دیکھا اور ایڈیٹ کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ ان کی ایسی ہی ایک کاوش "تذکرہ گلزار ابراہیم" تھا۔ انہوں نے کہیں اس تذکرے کا کام پڑھا تھا۔ پھر وہ اس کی تلاش میں مشغول ہو گئے اور بالآخر کامیاب ہوئے۔ اس تذکرے کو اپنے تبصرے کے ساتھ شائع کیا۔

"یا لعموم تذکرہ نویس کلام کے سمندروں پر زیادہ زور دیتے ہیں اور شاعر کے حالاتِ زندگی کی تحقیق پر کم توجہ دیتے ہیں لیکن علی ابراہیم کا تذکرہ ان معدودے چند تذکروں میں سے ہے جن میں شعرا کے حالات اور واقعاتِ حیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔"

مزید لکھا: "یہ واقعی اردو شاعروں کی بدقسمتی ہے کہ کسی نے بھی ایک مبسوط سوانح عمری کرانے کے حالات کو قلم بند نہیں کیا لیکن اگر اس طرح کی کوشش بھی ہوتی تو وہ صرف علی ابراہیم کا تذکرہ ہوتا جو اگرچہ مبسوط تاریخی نقطہ نظر سے نہیں لکھا گیا تاہم اس لحاظ سے اردو کے سب تذکروں سے بہتر ہے۔"

تذکرہ نگاری کی بھیڑ میں ادبی تاریخیں مرتب کرنے کی تحریکیں نہیں ہوئیں۔ ڈاکٹر زور کے عہد میں مخصوص موضوعات پر ادبی تاریخیں لکھی جاری تھیں جیسے پنجاب میں اردو اور دکن میں اردو وغیرہ۔ ڈاکٹر زور نے ان دائرے کو وسیع کیا اور اردو کی بجائے اردو ادب کو پیش نظر رکھتے ہوئے دکن ادب کی تاریخ رقم کی جس میں اردو کے قدیم مراکزوں گلبرگہ، بیدر، بیجاپور، گولکنڈہ اور اورنگ آباد کے شاعروں، نثر نگاروں کی ادبی خدمات کی تاریخ پیش کی۔ یہ تاریخ کم و بیش چار سو سال کے عرصے پر محیط تھی۔ انہوں نے اس تصنیف کو چھ ابواب میں تقسیم کر کے دکن کے مختلف ادبی مراکزوں کا جائزہ لیا۔ لیکن تفصیل کی بجائے اجمال سے کام لیا۔ دکن کی بیاض ملکوں کے قیام پر روشنی ڈالتے ہوئے ہر سلطنت کے شعرا اور نثر نگاروں کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اس جائزے سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ ہر سلطنت سے وابستہ شعرا کے نام سامنے آ گئے اور ان کی تصنیفات سے واقفیت ہو گئی۔

انہیں سرزمین دکن سے والہانہ وابستگی تھی۔ اس وابستگی نے انہیں قدیم مراکز کے ادب پاروں پر گہری نظر کی طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے پوری توجہ کھلی اور عادل شاہی دور کی ادبی شخصیتوں کو سمجھ کوشش کی۔ ان سے باہر نکالا لیکن ڈاکٹر زور کی بہترین تحقیقی صلاحیتیں ان ادبی تحقیقات میں نظر آئیں جو قطب شاہی دور سے متعلق تھیں۔ اس لیے وہ اپنی تبحر ہتی روایات کو گولکنڈہ میں متحرک کرتے تھے۔ انہوں نے انہیں تحقیقی کاموں کی طرف توجہ دلائی۔

"بھی بادشاہوں کے جانشینوں میں شاہانی تخلیہ کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ ان کی شیرۂ آفاق دولت و ثروت تعمیر کاری اور علم و ادب کی سرپرستی ہمیشہ یاد رہے گی اور اردو زبان اور ادب نے بھی ان کے عہد میں غیر معمولی ترقی کی۔"

انہوں نے قطب شاہی دور کو تین ادوار میں تقسیم کیا۔ زوال سلطنت اور سقوط گولکنڈہ تک کی ادبی تخصیصات کا حال بیان کیا۔ جو شعرا اس دور میں موجود تھے ان کے ناموں اور کارناموں کو جمع کیا۔

دکنی ادب کی تاریخ کا آغاز باب سب سے اہم ہے جس میں انہوں نے دریائے کرشنا کو دکنی ادب شمالی ہند کا مخزن ہے۔ اور گجرات کے کچ تک کو دکن کے عہد جب علاقے، خطے سلطنت میں ضم ہو گیا تو دکن اور شمال کی راہیں کھل گئیں۔ شعرا اور اہل علم کو زبانوں کے اختلاف کا احساس ہوا۔" دکن کے اس ادبی سرمائے سے روشناس ہوئے جو ہر صنف

سخن کے تابع فرمسخوں پر مشتمل تھا۔ اس کے برخلاف شمال میں ریختہ پر اہل پال کی زبان تھی۔ اسے علمی و ادبی زبان کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ اردو شاعری کی ابتدا کا مرکز دلی کا کلام اور دکن کے ادبی ورثے سے اثر پذیری کا نتیجہ تھا۔

انہوں نے حیدرآباد سے تعلق رکھنے والے دو معروف شعرا کے کلام اور تعارف کی ایک سیریز مرتب اور شائع کر کے ادب کی گرانقدر خدمت کی۔ کیف، مرثیہ، مرثیہ، فیض سخن، بادشاہ سخن اور متاع سخن، اس سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ کیف سخن میر علی الدین حسن کیفی کا تعارف اور کلام شائع کیا گیا تھا۔ بادشاہ سخن میر احمد حسین امجد کی انتخاب پیش کیا تھا۔ میں دو راغ اور اس کے معرکوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔ مرثیہ سخن کا مقصد بھی دکن کے ایک خوش گو شاعر کے کلام کو عوام میں متعارف کرانا مقصود تھا۔

انہوں نے عموماً کیا کہ قطب شاہی عہد سے تعلق رکھنے والے شعرا کے حالات پر تفصیل سے تذکرے اور تصانیف موجود ہیں لیکن عہد آصف جاہی کے فن پاروں پر کوئی مستقل اور مبسوط کتاب موجود نہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے مرثیہ سخن و جلد میں یہ مرکبی کی۔

اس کتاب کی افادیت یہ ہے کہ اس سے مختلف شعرا کا حال مختلف مصنفین سے لکھوایا گیا تھا اور یہ تمام مصنفین جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل تھے۔

اس کتاب کے ذریعے ڈاکٹر زور نے ان نقادوں اور محققین کے لیے اہم مواد فراہم کر دیا جو حیدرآباد میں اردو ادب کی نشوونما کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔

"تاریخ سخن" نواب عزیز جنگ عزیز کے کلام کا انتخاب تھا۔ عزیز دراصل شہر کے شاگرد اور حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر تھے۔

آصف جاہی شعرا پر ان تبصروں کے بعد دکن کے نگہرانِ سیر بخاں علی خاں کی ادب دوستی کی داد تحسین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ وہ یہ دیکھ رہے تھے قطب شاہی سلاطین اور نگھنو کے علم دوست حکمرانوں کے عہد میں بھی اردو کی ادبی رونق کی وجہ سے ان کے عہد میں ہوئی۔ ان کی فیاضانہ سرپرستی کی وجہ سے ایک قلیل عرصے میں چار ہزار سے زیادہ کتابیں مرتب ہو کر منظر عام پر آ گئیں۔

ان کی ایسی فیاضانہ سرپرستی کی داستان سنانے کے لیے انہوں نے "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" کا ہی کتاب لکھی۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں انہوں نے میر بخاں علی خان کی اردو دوستی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ریاست کی مختلف انجمنوں اور اداروں کی انہوں نے کس طرح اور کس قدر حوصلہ افزائی کی۔ رسائل و اخبارات کی امداد ہو یا جامعہ عثمانیہ اور دارالترجمہ کا قیام، سب ان کی علم دوستی کی زندہ مثالیں ہیں۔

اس کتاب میں انہوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے بارے میں چند نظریات پیش کر دوران کی کوشش کی۔ ولی کو اردو شاعری کا بانی آدم سمجھا جاتا تھا اور ولی سے قبل ادبی مساعی کی طرف کسی کا خیال ذہن میں نہیں گیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے ایک محقق کا حق ادا کیا اور تحقیق سے ثابت کیا کہ یہ نظریہ غلط ہے کہ اردو برج بھاشا سے نکلی۔ اسی کتاب میں انہوں نے مشہور نظریہ پیش کیا کہ اردو دیہاتی مسلمانوں کے قتل دلی سے بیشتر پنجاب میں تیار ہو رہا تھا۔ یہ برج بھاشا سے اخذ نہیں کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شاہ میراں سے پہلے دکن موجود تھی اور اس میں بیسیوں شاعر پیدا ہو چکے تھے۔

اس انگریز آدمی نے "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" لکھ کر دراصل حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی مکمل تاریخ رقم کر دی۔

محمد قلی قطب شاہ کو گولکنڈہ کا جلیل القدر بادشاہ ضرور مانتے لیکن اردو میں اس کی بادشاہت کو ڈاکٹر زور کی کوششوں سے تسلیم کیا گیا۔

کلیات قلی قطب شاہ تو شائع ہو چکی تھی لیکن ڈاکٹر زور اگر اس کا مقدمہ تحریر نہ کرتے تو قلی قطب شاہ کو بادشاہ سخن کوئی بھی تسلیم نہ کرتا۔ انہوں نے اس مقدمے میں صرف قطب شاہ کے حالات اور اس کے کلام پر روشنی نہیں ڈالی۔ یہ کام تو کوئی بھی کر سکتا تھا۔ انہوں نے اس دور کی تاریخ، تہذیب، رسم و رواج، طرز معاشرت، عمارات، محلات کو اور تقاریب کو زندہ کر دیا۔ چلتی پھرتی تصویر تحریر کر دی۔

ڈاکٹر زور کی تحریر سے پہلے سلطان محمد قلی قطب شاہ کے عہد، تہوار اور اس کی ذاتی تعمیرات کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں۔ ولی کو اردو کا پہلا شاعر سمجھا جاتا تھا (صاحب دیوان شاعر) مولوی عبدالحق نے قلی قطب شاہ کے بارے میں "ایک مضمون لکھا ضرور تھا لیکن اس انگلش شاعر کے مکمل حالات زندگی تحریر کر کے عوام سے روشناس کرانے کا اہم کام ڈاکٹر زور نے انجام دیا۔

کتب خانہ سالار جنگ میں" کلیات قلی قطب شاہ" کے دو نسخے موجود تھے۔ ڈاکٹر زور نے دونوں نسخوں کو سامنے رکھا اور نہایت عالمانہ اسے داخلی و خارجی شہادتوں کی مدد سے صرف مستند اشعار کو شاملِ کلیات کیا۔ مختلف موضوعات پر لکھی گئی نظموں کو ترتیب دینے میں بے ترتیبی سے ادھر اُدھر بکھری پڑی ہوئی غزلیں یکجا کر کے انہیں سرخیوں سے مزین کیا۔ اس ترتیب نے پڑھنے والوں کے لیے بہت سہولت پیدا کر دی۔ شاذ و نادر کلیات کے متعلق قیمتی ایک جگہ کر دیے۔ یہ ذہنی تقاریب، تہذیب سے متعلق، تقریبات ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ پائی۔

قلی قطب شاہ کی بارہ ہزار پر مشتمل بہت مشہور تھیں۔ ان اس کے نظمیں بھی لکھی گئیں۔ ڈاکٹر زور نے انہیں ایک جگہ اکٹھا کر کے ان کی حیات سماجی کے زندہ تصویریں پیش کر دیں۔

اس سب سے قطع نظر اس پر مرتبہ مقدمہ لکھا گیا وہ ڈاکٹر زور کا ایک عظیم تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ کام آسان بھی ہو سکتا تھا لیکن ڈاکٹر زور نے آسانی کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے تحقیق کا حق ادا کیا۔ انہوں نے یہ مقدمہ لکھنے کے لیے نوعلمی اور مترجمہ مطبوعہ اور تاریخ سے معلومات حاصل کیں۔

اس کے مقدمے میں ڈاکٹر زور نے نہ صرف شاعر کے حالاتِ زندگی کے تمام گوشوں پر جو بڑی پرتوں ڈالی بلکہ حیدرآبادی قدیم ثقافت کا بھی ایک بے نظیر اثر پیش کیا۔

انہوں نے ایک اور اہم تحقیقی کام سرانجام دیا۔ انہوں نے قدیم الفاظ کی فرہنگ بھی تالیف کر دی۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قلی قطب شاہ کی زبان جارسو سال سے زیادہ قدیم تھی۔ بڑی تعداد ان الفاظ کی تھی جو سن سنگرت سے ماخوذ تھے۔ قاری کو ان الفاظ کے معنی معلوم ہوئے بغیر کلام سے لطف اندوز ہونا مشکل تھا۔ ہر ایک میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ ان الفاظ کے معنی تلاش کرے۔ ڈاکٹر زور نے ایسے الفاظ کے معنی لکھ کر یہ سہولت پیدا کر دی۔

ڈاکٹر زور نے کلیاتِ قلی قطب شاہ کے متعدد ے علاوہ اس اہم شاعر کے حالاتِ زندگی پر ایک الگ کتاب بھی تصنیف کی" حیاتِ محمد قلی قطب شاہ"۔

قلی قطب شاہ کے حالاتِ زندگی کی چھان بین کرتے ہوئے ان کی نظر ایک اور شاعر میر محمد مومن پر پڑی۔ یہ شاعر پیشۂ سلطنت قطب شاہیہ تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کے وزیرِ اعظم کی حیثیت سے اس نے شہر حیدرآباد کی تعمیر اور تہذیبی منصوبہ بندی کا کام انجام دیا تھا۔ یہ خاص عالم بھی تھا۔

زادہ" کے مطالعے کا موقع ملا۔ یہ نسخہ شاعر کے 1179ء میں مرتب کیا تھا۔ اس دیوان کے مطالعے کے دوران انہیں پتا چلا کہ یہ حسین آزاد نے حاتم کے حالاتِ زندگی اور مومنہ کلام کو پیش کیا تھا اور اس کے بعد حسرت موہانی نے "اردوئے معلیٰ" میں حاتم کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی غزلوں کا انتخاب کیا تھا۔ ڈاکٹر زور نے محسوس کیا کہ حاتم پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ تحقیق سے خالی اور ناکافی ہے نتیجے پر پہنچے جسے کہ حاتم شاعر ہندکے وہ اوّلین شاعر ہیں جنہوں نے دیوانِ ولی کے مطالعے کے بعد فارسی کوئی ترک کر کے اردو زبان میں طبع آزمائی کی تھی اور اس کے بعد دو تین نسخے اردو میں لکھے گئے۔

ڈاکٹر زور کو حاتم کے حالاتِ زندگی سے متعلق مواد بھی پوری طرح نہیں ملا۔ لندن اور پیرس کے قیام کے دوران انہوں نے ان کوائف پر مشتمل ایک مضمون لکھا اور ہندوستان آنے کے بعد اس مضمون کو رسالہ "ہندوستان" میں شائع کر دیا۔ اس میں کچھ ایسی نئی اور غیر معلومات تھیں کہ ملک کے نامور ادیبوں نے اس کی تعریف کی اور ان سے فرمائش کی کہ وہ دیوانِ حاتم کو ترتیب دے کر شائع کریں اور اس کا "مقدمہ" تحریر کریں۔ ڈاکٹر تارا چند اور اصغر گونڈوی کے اصرار پر انہوں نے اس کی ہامی بھر لی اور دو چار صفحے لکھے بھی گئے۔ انہیں حاتم کے حالاتِ زندگی سے متعلق مواد ہر جگہ سے دستیاب ہو گیا تھا لہٰذا اس مواد کو بنیاد بنایا اور جلد از جلد کام کو مکمل کر دینے کی ٹھان لی۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے دیوانِ زادہ کی ایک ایسی غزل پیش کی جو دیگر نسخوں میں نہیں تھی گئی۔ "دیوانِ زادہ" کے دیباچے میں حاتم نے اپنے تخلص کے بارے میں لکھا تھا۔

"رشحہ خامۂ بلاغت سامۂ اصائب و دررِ بحرِ نکتہ یابی و ادراکِ اسرارِ کردہ در ہر دور استادی دانند" حاتم ولی کو اپنا استاد تصور کرتے تھے۔

حاتم کا دلی کی زمینوں میں تیرہ غزلیں کہنا ولی سے اثر پذیری کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر زور نے حاتم کی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے مختلف تذکروں کی تائید و تردید میں دلائل ثبوت فراہم کیے اور تحقیق کا حق ادا کیا۔ انہوں نے تو یہ تک دعویٰ کیا" آبِ حیات کے مصنف محمد حسین آزاد کی نظر سے حاتم کا دیوان زادہ نہ گزرا کوئی اور دیوان میں نہیں

کفن بہ دوش
اپنی جڑ سے ترے اے نصیبِ کہن جہل زندگی قدم ہر قدم رقص عمل دیکھیے
جو ہے آخری صفحہ پر ڈاکٹر عبدالربِ بھٹی کا ناں اعزاز
سلطانہ
ماضی کے کم شدہ لمحات کا ایک سحر انگیز دستاویز
اثر کہانی۔ ڈاکٹر ساحد امجد کے قلم کی روانی
شیش محل
(اسما قادری کے قلم سے نیلی نیلی جھیلیں، رنگ برنگی، دلوں کی دھڑکن تیز کرتی زندگی کے بے شمار رنگوں کو موتی ایک دلربا داستان
ماروی
دیہم و گمان سے ،روداد واقعات کا تسلسل..... محی الدین نواب
کے خیالات کی پرواز..... عروج و خوبی اور بدلتی کی کشمکش

گزرا تھا۔"

☆.....☆

ادارہ ادبیات اردو کے قیام کے ساتھ ہی اور پھر اس ادارے کی اپنی عمارت قائم ہو جانے کے بعد یہ ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی تھی کہ مخطوطات اور کتابیں بڑے پیمانے پر جمع ہوں۔ ڈاکٹر زور کی انتظامی صلاحیتوں یہاں بھی بار آور ثابت ہوئیں۔ ان کی متعدد ایسی بھی ہدایات ثابت ہوئی۔ لوگوں کو ان کے خلوص پر اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے جب ذی علم شخصیات سے رابطہ کیا تو انہیں مایوسی نہیں ہوئی۔ حیدرآباد میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جن کے ذاتی کتب خانوں میں نادر مخطوطات موجود تھے۔ انہوں نے قدم مخطوطات اس ادارے کے حوالے کر دیئے اور ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا۔

یہ اتنا اہم بھی ڈاکٹر زور کی علمی خدمات میں ایک اہم قدم تھا۔ جو یاس اور گمی کتابیں ذاتی کتب خانوں میں پڑی پڑی خراب ہو جاتیں یا اہل علم تحقیق کے ان تک پہنچنے میں مشکل ہوتی۔ انہوں نے انہیں محفوظ کر دیا۔ یہاں ان کے خلاصے بھی نکالے جانے تھے۔

جب ان کی ذاتی لائبریری کا مقام اتنا وسیع ہو گیا تو ضرورت پیش آئی کہ ان کی وضاحتی فہرست تیار کی جائے۔ فہرست امکمل ہو کر بھی کئی جلدوں میں شائع ہوئی۔ فہرست کے ذریعے جمع معلومات اور اس کے شائع ہو جانے سے مصنف اور نفس مضمون دونوں سے بخوبی واقفیت ہو جاتی ہے۔ کتاب کا نام، مصنف کا نام، سن اشاعت، کاتب کا نام یا نسخہ کا مکمل یا نامکمل ہونا، کاغذ، روشنائی، جلد، سن کتابت، کاتب کا نام، مصنف کا مختصر حال، نسخہ کی ابتدا اور آخر کے چند الفاظ، نسخہ کی خصوصیات اور مکمل معروضہ، یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو کسی کتاب کی تاریخی و تنقیدی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ حیدرآباد کی نمود، یہاں کے محلوں اور باغات وغیرہ کے بارے میں تحقیق کے مزید معلومات فراہم کیں۔

حیدرآباد کے علوم اس عمارت کتابوں اور باغات کو دیکھ کر ضرور رہے تھے لیکن میں نے بارے میں تاریخی طور پر زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے علوم الناس کو ان کی تاریخی و تنقیدی اہمیت سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر زور نے اس کتاب کے بارے میں خود تحریر کیا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد بادشاہت اور مطلق العنان حکمرانی کے سائے اور اثر تلے دونوں کا مکمل مرکز رہا ہے۔ علم و ہنر، فضل و کمال اور حسن لطیفہ کی قدر دانی اور نشو و نما کے لیے گزشتہ ایک صدی میں جا بجا اور خواہ مخواہ نے جو خدمات انجام دی ہیں اس پر ہندوستان بھی نہ بھلا سکے گا۔ اگر آج مدہ سلطنتی کی بدگمانی سے شخصی حکومتیں نہ ہوتیں اور صاحبان کمال کی قدر افزائی نہ کرتیں تو گزشتہ سو دو سال کے مغربی تسلط میں مشرق کے بچے کھچے فنون لطیفہ بھی بالکل ناپید ہو جاتے۔

فرخندہ بنیاد حیدرآباد بھی کتابوں کی وجہ سے آنے والی نسلیں حیدرآباد کے قدیم علم کدے رہ دشاں ہو سکیں گی۔"

☆.....☆

اس دور ذاکر زور رات کو دیر تک لکھ کر ادارہ ادبیات اردو کے لیے ہاتھ سے لکھا ہے یا کس پر اس کے دستخط موجود ہیں کتابیں تلاش کرتے اور نئی کتابیں ان کے ذخیرے میں شامل ہوتی رہتیں۔ فہرست میں یہ بھی وضاحت کر دی گئی ہے مصنف یا شاعر کس علاقے سے تعلق رکھتا ہے اگر وہ جنوبی ہند سے تعلق نہیں رکھتا کسی دور دراز مقام سے تعلق رکھتا ہے تو کیا وہ اہم پورے سے متعلق ہے تو فہرست میں بھی شامل کیا گیا ہے کہ اس کا ٹھکانہ کہاں تک پہنچا۔ فہرست میں عہد دبعہد دیگر ہندوستان کے اصولوں کی فہرستوں کو شامل کر کے انہیں ہمیشہ کے لیے تاریخ کا حصہ بنا دیا۔

☆.....☆

ڈاکٹر زور نے نہ صرف قدیم ادب کو دنیا سے روشناس کرایا بلکہ حیدرآباد کے تمدن کی بھی تحقیق کی اور عمارات و باغات کا تجزیہ کر کے "فرخندہ بنیاد" حیدرآباد" نامی کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں انہوں نے شہر حیدرآباد کی تعمیر اور اس کی آبادی پر روشنی ڈالی اور اس عہد کی قدیم عمارات مثلاً چار مینار، روضات شاہ علی، پتھر محل، چوک محل، ماہل محل۔ خلعت محل، بارہ دری اور محل خورد بزرگ وغیرہ پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ ان کی تاریخی و تنقیدی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ حیدرآباد کی نمود، یہاں کے محلوں اور باغات وغیرہ کے بارے میں تحقیق کر کے مزید معلومات فراہم کیں۔

حیدرآباد کے علوم اس عمارات کتابوں اور باغات کو دیکھ کر ضرور رہے تھے لیکن میں نے بارے میں تاریخی طور پر زیادہ نہیں جانتے تھے۔ ڈاکٹر زور نے علوم الناس کو ان کی تاریخی و تنقیدی اہمیت سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر زور نے اس کتاب کے بارے میں خود تحریر کیا۔ "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ حیدرآباد بادشاہت اور مطلق العنان حکمرانی کے سائے اور اثر تلے دونوں کا مکمل مرکز رہا ہے۔ علم و ہنر، فضل و کمال اور حسن لطیفہ کی قدر دانی اور نشو و نما کے لیے گزشتہ ایک صدی میں جا بجا اور خواہ مخواہ نے جو خدمات انجام دی ہیں اس پر ہندوستان بھی نہ بھلا سکے گا۔ اگر آج مدہ سلطنتی کی بدگمانی سے شخصی حکومتیں نہ ہوتیں اور صاحبان کمال کی قدر افزائی نہ کرتیں تو گزشتہ سو دو سال کے مغربی تسلط میں مشرق کے بچے کھچے فنون لطیفہ بھی بالکل ناپید ہو جاتے۔

فرخندہ بنیاد حیدرآباد بھی کتابوں کی وجہ سے آنے والی نسلیں حیدرآباد کے قدیم علم کدے رہ دشاں ہو سکیں گی۔"

☆.....☆

اس دور ذاکر زور رات کو دیر تک لکھ کر ادارہ ادبیات

کے دفتر میں کام کرتے رہتے تھے۔ مخطوطات کی فہرست پر کام کرتے ہوئے انہیں وقت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ ہوا یہی تو اس وقت جب ان کے ہاتھ میں تیسری "طالب موسیٰ" کا خاکہ آیا۔ انہیں یاد آیا کہ ایسا ہی ایک نسخہ انہوں نے انڈیا آفس لائبریری میں بھی دیکھا تھا۔ اس وقت طالب علمی کا دور تھا۔ لہٰذا اہمیت کا اندازہ نہیں ہوا تھا لیکن اب جو اسے دیکھا اور تذکروں میں اس شعوری کے شاعر سید محمد والہ کے حالات پڑھے تو انہیں اس شاعر سے دلچسپی ہوئی۔ انہوں نے اس شہ پارے کو صدیوں کے غبار سے نکال کر اردو دان طبقے سے متعارف کرانے کا بیڑہ اٹھایا جو حالات متن کے اس کا خاصہ ہے۔

☆.....☆

سید محمد والہ، سید محمد باقر موسوی کے فرزند تھے۔ والد کی وفات کے بعد اپنے ماموں "مہر" کو تخت داؤد اور لاہور سے ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ اس وقت یہاں شاہ عالم سریر آرائے سلطنت تھا۔ اس نے والہ کو بڑے تجمل سے متاثر ہو کر انہیں شاہی منصب داروں میں شامل کر لیا۔ جب نظام الملک آصف جاہ سے ان کا ربط بڑھا تو انہوں نے والہ کو اپنا رفیق بنا لیا اور اپنے ساتھ دکن لے آئے جب ذوالفقار الدین خاں شہامت جنگ کو آصف جاہ نے حیدرآباد کا حاکم مقرر کیا تو والہ ان کا رفیق متعین کیا گیا اور کچھ ہی عطا کی اور جب محمد علی خاں والا جاہ کو انہوں نے کرناٹک کی حکومت تفویض کی تو والہ ان کے ساتھ مقرر کر دیئے گئے اور ترچناپلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔

طالب موسیٰ کا قصہ سید محمد والہ نے مہاراشٹر کے تاریخی شہر "پرنڈہ" میں سنا تھا اور اس داستان عشق سے متاثر ہو کر انہوں نے اسے رقم بھی نہیں کیا تھا۔

نصیر الدین ہاشمی نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ قصہ میر نے والد کی اس مثنوی سے متاثر ہو کر مثنوی "قصۂ گلچیں" لکھی ہے۔ شمالی ہند کے قیام کے دوران والہ نے اردو سے بھی لگی رہی اور کچھ اگر کوئی زبان سے بھی واقفیت حاصل کر لی تھی لیکن دکن کا ماحول اسے اردو فارسی اور دکنی کو ملا کر ایک نیا اسلوب اختیار کیا اور قصہ طالب و موسیٰ لکھ دیا۔ یہی اس مثنوی کی سب سے بڑی اور اساسی اہمیت ہے۔

☆.....☆

تحقیق کوئی بھی ہو اس کا تاذہ ہونا ضروری ہے۔ جب وہ کوئی چیز تحقیق کرتا ہے تو سب سے پہلے اسے تنقیدی اصولوں پر پرکھتا ہے۔ وہ کوئی تنقیدی کتاب لکھے بانہ لکھے اس کے اندر ایک ناقد چھپا ضرور ہوتا ہے۔ ڈاکٹر زور ایک محقق کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے لیکن وہ تنقید نگار پہلے تھے۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے تنقیدی اصولوں پر مبنی کتاب "روح تنقید" اس وقت لکھی جب وہ طالب علم تھے اور یورپ میں تھے۔

روح تنقید اردو کی ان اولین کتابوں میں سے ہے جن کی بدولت اردو میں ادبی طبقہ مغربی اصول تنقید سے آشنا ہوا۔ ان کے ایک ہم عصر نیاز فتح پوری "انتقاد اور انتقاد" میں لکھا تھا۔

ہماری زبان میں اصول تنقید پر کوئی کتاب نہیں تھی اس خدمت کو نظام قائم کرنے کا سہرا ڈاکٹر زور کے انجام دہ ہے میں یورپ کے مقالے تنقید کے انکار و خیالات درج کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زور نے اپنے قیام یورپ کے زمانے میں مغربی مصنفین کے مختلف تصورات و نظریات سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ روح تنقید میں انہوں نے انہی مغربی مصنفین کے تصورات کی خوشہ چینی کی۔ تنقید کی تعریف اور اس کے اصولوں کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے اکثر کچھ مغربی مصنفین کے حوالے دیے۔ اس لیے ان پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ان کی تنقیدوں میں استنادی قدر زیادہ ہے اور ابتخ کی کمی پائی جاتی ہے۔

تنقید نگار کے فرائض کی ترجمانی کرتے ہوئے ڈاکٹر زور نے ذہن خیالات کا اظہار کیا وہ خاصے خیال انگیز تھے اور اردو میں پہلی بار اتنی صراحت و وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے تھے لیکن ان سب پر مغربی رنگ غالب تھا۔ اپنے خیالات کو ثابت کرنے کے لیے مغرب کے خادموں کے حوالے سے کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دراصل وہ چاہتے ہیں کہ کوئی تنقید انگریزی کے تنقیدی اصولوں کے مطابق پرکھی جائے۔

جس زمانے میں "روح تنقید" لکھی گئی اردو میں تنقید نگاری کا فن اپنے عہد طفولیت میں تھا اور اردو والوں کو اس قسم کی تصانیف کی ضرورت بھی تھی جن میں تنقید سے متعلق مسائل کا تجزیہ کیا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خامیوں کے باوجود اس کتاب کی پذیرائی ہوئی۔

روح تنقید ان اولین کتابوں میں سے تھی جنہوں نے بعد کی نسل کے نقادوں کو راستہ دکھایا اور مغربی تنقید کے اصولوں سے انہیں روشناس کیا۔ روح تنقید میں غور و فکر کی

ہو سکتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اصول تنقید پر یہ پہلی کتاب تھی۔

ڈاکٹر زور کا اس انچھوتے موضوع پر اظہار خیال کرنا ایک چونکا دینے والی بات تھی۔

اس کتاب کے بعد اپنے نتائج فکر کردہ اصولوں کے مطابق عملی تنقید پر مبنی انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور شاعروں کو ایک جدید اور ترقی یافتہ تنقیدی اصولوں کے ترازو میں تولا۔ روح بطن، نیچر شاعر، جواہر سخن، ادبی تاثرات، اور ادبی تجزیہ ایسی ہی کتابیں ہیں۔

☆.....☆

سرزمین دکن کو یہ فخر حاصل تھا کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ اسی خاک سے اٹھا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اردو کا پہلا باضابطہ لسانیات ہونے کا اعتبار بھی اس خاک کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ اعزاز خود ان سے منسوب تھا، وہ اردو کے پہلے باضابطہ لسانیات کے ماہر تھے۔

لندن یونیورسٹی سے اپنا کام مکمل کر کے وہ خرانس چلے گئے اور اسا رابون یونیورسٹی میں ہندگو یائی کی مشہور شخصیت پروفیسر جیولس بلوں سے وابستہ ہو گئے تھے اور اردو زبان کے صوتیاتی پہلو پر تحقیقاتی کام شروع کر دیا تھا۔ انہوں نے اردو کی وقفی نقطہ اور لب دیکھے پر توجہ مرکوز کی۔ انہوں نے صوتی آلات کی مدد سے "اصوات" کا مطالعہ کر کے جو تاریخ مرتب کی اسے "ہندوستانی فونیٹس" کے نام سے موسوم کر کے ایک کتاب کی شکل دے دی۔ اس زمانے سے لے کر اب تک اس کی مقبولیت کم نہیں ہوئی اور ماہرین لسانیات اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ اس کتاب نے اردو کے صوتیاتی پہلو پر تحقیقی کام کرنے والوں میں ڈاکٹر زور کی انفرادیت مسلم کر دی۔

اس کتاب کی افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر جیولس نے لکھا تھا۔

"ایسی کتابیں بہت کم تعداد میں ہیں جن میں ہندوستانی زبانوں کا صوتیاتی جائزہ لیا گیا ہے۔"

ڈاکٹر زور کی تاسیسی فراموش تصنیف "ہندوستانی لسانیات" میں دنیا کی مختلف زبانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کے اہم خدوخال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اردو کے آغاز سے بحث کرتے ہوئے اس وقت تک اس کے بارے میں ماہرین لسانیات جو نظریات پیش کیے تھے ان کا تجزیہ کر کے اردو کے آغاز کے بارے میں مفصل معلومات بہم پہنچائی تھیں اور اپنا ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ ان کا نظریہ یہ تھا۔

"اردو نہ تو پنجابی ہے، شستہ ہے اور نہ کھڑی بولی سے بلکہ اس زبان سے ہے جو ان دونوں کا سرچشمہ تھی۔ اردو اس زبان سے مشتق ہے جو برہانپور سے بہتر آبادی دور میں اس صحت ملک میں بولی جاتی تھی جس کے ایک طرف عہد حاضر کا شمال مغربی صوبہ ہے اور دوسری طرف الہ آباد۔"

ڈاکٹر زور نے اپنے سے تمام عالم مشتق نہ ہو سکے۔ سلیمان ندوی نے سندھ کو اردو کی جنم بھومی قرار دیا۔ انہوں نے تاریخی شواہد پیش کیے لیکن لسانی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ گیوڈ خرانی نے پنجاب کو اردو کا گہوارہ بتایا۔ مگر ہم یہ بھی اس خیال سے متفق نہیں ہیں۔ پھر اور لوگوں نے یہ کہا اردو مغربی ہندی کی ایک بولی ہے اور اس کا حلقۂ اثر دہلی سے میرٹھ تک پھیلا ہوا ہے۔

ان نظریات میں ڈاکٹر زور کا یہ نظریہ عملی اہمیت رکھتا ہے کہ اردو کا سنگ بنیاد دراصل مسلمانوں کے فتح دہلی سے بہت پہلے رکھا جا چکا تھا۔

اس کتاب کے دوسرے حصے میں اودی بولیوں گہرواٹی، رکھی اور شال، ہندی بولیوں کی تفصیل پیش کی گئی تھی اور ان کا تقابلی مطالعہ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ صوتی اختلافات کی وضاحت بھی کر دی گئی تھی۔ بعد کے ابواب میں ڈاکٹر زور نے شمالی ہند میں اردو کی نشوونما کا حال قلم بند کرتے ہوئے مقامی زبان جانوں کی لسانی خصوصیات، وقفی عنصر کے زوال ہونے اور اس کی جگہ فارسی لفظیات اور اسالیب کے رونما ہونے کو اسباب پر روشنی ڈالی تھی۔

عربی اور ترکی گہرائی اور وسعت کی وجہ سے یہ بھی تصور کیا جاتا تھا ڈاکٹر زور نے ان میں صوتی اور لسانی بنیادوں پر امتیاز قائم کیا اور ان کی خصوصیات کی تشریح کی۔

☆.....☆

ڈاکٹر زور عثمانیہ یونیورسٹی سے وابستہ تھے کہ 1950ء میں وارانعلوم اور چارمینار گھاٹ کالج کا انضمام عمل میں آیا۔ اس وقت تک ڈاکٹر زور کی تالیف کا سکہ دلوں کو خیرہ کیے تھا۔ بہ طرف ان کے کارناموں کی دھوم کی تلذلان کے سوا کسی اور کا نام سامنے آسکتا ہے تھا۔ انہیں اس کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔

یہ ان کے لیے نہیں اس کالج کے لیے اعزاز تھا کہ ڈاکٹر زور اس کے پرنسپل بنا دیے گئے۔

ادارہ ادبیات ان کی نگرانی میں کام کر رہا تھا۔ سیکڑوں کتابیں شائع کر چکا تھا۔ ایوان اردو کی تعمیر و ڈاکٹر زور کی فتوحات کی داستان ساتھ ہی ختم ہو گئی کہ انہوں نے ایک ادارہ کا ہیڑہ اٹھایا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے بعد انہیں خیال آیا کہ اس عظیم شخصیت کی یاد قائم کی جائے۔ یادگار کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی مجسمہ کھڑا کر دیا جائے بلکہ کوئی ایسا ادارہ ہو جس کے تحت ریسرچ اسکالروں سے تحقیق کام کرایا جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ اس کی تکمیل کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جیتے جی دوست حضرات جمع کر ان کی خدمت میں یہ عہد کر لیا۔ اس کے لیے انہوں نے کئی سفر کیے ڈاکٹر زور صاحب، ڈاکٹر نارنگ، ڈاکٹر شارلی ان، مہدی نواز جنگ وغیرہ کو اس ادارے کا فائونڈر ممبر بنایا۔ ان کوششوں کے نتیجے میں "اقبال اکادمی آندھرا پردیش اسٹیٹ" کا قیام عمل میں آگیا۔

اس ادارے کا مقصد تھا یہ تھا کہ فلسفۂ لغات اور مختلف زبانوں میں تحقیق کے کام کی رفتار تیز کی جائے۔

ابتدا میں اس کا دائرہ ایوان اردو کی عمارت کے ایک حصے میں تھا کہ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ "باغ عالم" کی عمارت میں منتقل ہو جائے گا۔

ڈاکٹر زور چارمینار گھاٹ کالج سے 1960ء میں بخیلہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔

اس عرصے میں انہوں نے کئی تکلیف دہ تجربے و فراز دیکھ لیے تھے۔ یہ ہم سفر کا ہر مرحلہ کٹھا تھا۔ ہندو مسلم فسادات کا منظر دیکھا تھا۔ جس میں ہندو مسلم اتحاد کا مظہر زبانوں میں تلاش کیا تھا اسے ٹھوکر تے و تعصبات کو آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جس وطن کے ترانے گائے تھے اسے غیروں کے قبضے میں جاتے دیکھا تھا۔ جس مگہر کی حفاظت کی قسم اس پر سفر کی رنگ ڈھنگ دیکھے ہوئے دیکھا تھا۔ جس زبان پر ناز تھا اب اس میں انگریزی کی آمیزش ہو رہی تھی۔ تو ابی حضور ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ لندن اور پیرس میں بھی ان کا دل لبھاتی تھی لہٰذا اب ان کا جانا و تصویر ہونا سے آیا تو اس پیشکش کو انہوں نے فوراً قبول کر لیا اور تصویر دانہ رہ گئے۔ ڈاکٹر زور تصویر کیوں چلے گئے؟ وہ کون سے حالات تھے جنہوں نے ان کو اس دور ابے پر کھڑا کر دیا؟ دوست، احباب عزیز و اقارب کا خیال بھی نہیں آتا؟ ماں چھوڑ دیا جس کی تصویر میں ان کا خون جگر صرف ہوا تھا مگر کیوں؟ اردو زبان کی خدمت کا جذبہ ہے یا کچھ اور؟ بہت سے سوالات تھے جو ان کے جانے کے بعد عرصے تک گونجتے رہے۔ ان سوالوں کا جواب نہ ان کے پاس تھا نہ کوئی اور طالش کر کے بھی ایک جواب آجس سے ان کے کرب کا اندازہ ہو سکتا تھا۔ کشمیر پہنچ کر ان کی شاعری کے دوسرے دور کا آغاز ہو گیا۔ سب جانتے ہیں شاعری کسی جذبہ ان کرب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ غالباً یہ وطن سے دوری کا احساس تھا جس نے شاعری کا روپ دھارلیا۔ درد کی دوا نے درد کو بڑھا دیا۔ وطن کی یاد ستانی اور اس کا سویا ہوا شاعر جاگ اٹھا۔

انہوں نے شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی میں کیا تھا۔ مگر یہ شاعری تحقیقی سرگرمیوں کی نذر ہو گئی تھی۔ انہوں نے شاعری ترک کر دی تھی صرف لکھی رہ گیا تھا جو اکثر ہی ساتھ چلا آیا تھا۔ شاید یہ نکلی کشمیر کے لیے اٹھا کر لائے وطن سے دوری تھی کہ شاعری میں ڈھلتی گئی۔

وہ وطن چھوڑ نے والوں کی آدمی تھی اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سرزمین کشمیر کے دلفریب نظاروں نے انہیں شعر گوئی پر اکسایا۔ اسی لیے ان کے اشعار میں مقامی نہیں ایک شخص کا دکھ سکھ کا احساس ہوتا ہے۔

ہم اپنی فکری سوز دروں سے سجے اٹھے
خوشا کہ صبح شب جنوں سے سجے اٹھے
یہ باز طبع بلند و پہ رنگم خود نگہی
زمانہ سازی دنیائے دوں سے سجے اٹھے

☆

بتوں ایسے بھی انسان روزگار میں ہیں
کبھی سحر کے کبھی شب کے اختیار میں ہیں
یہ راہ سوچ سمجھ کر ہی اختیار کریں
وہ سوئے راہ چلے ہیں جو کوئے یار میں ہیں
کچھ ایسے لوگ ابھی تک چمن میں ہیں شاید
قریب خورده خزاں میں نہ خوش بہار میں ہیں
یہ تیل سوزدروں اور بطرز اہل جنوں
وہی ہے منزل نیلی کہ جس دیار میں ہیں

☆

فروری آپ دکھی کے نظاروں کا شوق ہے
چشموں کا رنگ و بو کا بہاروں کا شوق ہے
انسانیت کے رستے ہوئے زخم چھوڑ کر
واپس وروں کو چاہ ستاروں کا شوق ہے
ہستی کی تمنیاں جو گوارا نہ ہو سکیں

زندوں سے ہے نغمہ ہزاروں کا شوق ہے

☆

سوچتا ہوں کہ کہیں تم تو نہیں آ نکلے
ایک آہٹ سی کہیں دل کے قریب
اپنی کوتاہی دانش کا گلہ کس سے کیجئے
بارہا ہم بھی گئے تھے دور زمانوں کے قریب

☆

زندگی سانس لیتی رہے گی یوں ہی
زندہ دل ہنستے ہنستے گزر جائیں گے

کشمیر یونیورسٹی میں ان کا تقرر بطور صدر شعبہ اردو اور ڈین فیکلٹی میں آیا۔ یہاں آتے ہی ان کی جلت لوٹ آئی۔ کچھ دان دشمن سے دوری کی اور کچھ دلی میں نظر بند رہنے کے بعد انہوں نے وادی کشمیر کو یہ نظر خود دیکھا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کشمیر میں اردو کی ترقی کے وسائل تو کافی ہیں لیکن کوشش کی جائے تو مستقل میں یہاں اردو کے لیے سازگار ماحول پیدا ہو سکتا ہے۔

گورنمنٹ ہیتاپور اور اردو گھ آباد کا قائم اب کشمیر کی فتح کی تیاری کر رہا تھا۔ انہوں نے اپنی فتوحات کی تکمیل کے لیے اہل کشمیر کے علمی کارناموں اور فنون لطیفہ کے نادر نمونوں کو پیار نظر سے دیکھنے کے لیے تحقیق کا آغاز کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اتنا مواد اکٹھا ہو گیا کہ انہوں نے ''داستان ادب کشمیر'' کے عنوان سے کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ کشمیری زبان سے واقفیت حاصل کریں۔ اس کے لیے انہوں نے باضابطہ کوشش شروع کر دی۔ کشمیری زبان سے واقفیت ان کے لیے زیادہ مشکل نہیں تھی کیونکہ ان کی یار باش طبیعت نے کشمیر پہنچتے ہی اہل علم طبقے کے دلوں میں اپنے لیے جگہ بنا لی تھی۔ کشمیر کے شعراء، ادباء اور افسانہ نگاروں کی ٹولیاں برج ہوتے اور ڈاکٹر صاحب کے حلقوں سے فیض یاب ہوتے۔ ان کشمیری احباب سے وہ کشمیری زبان کے قصے بھی سنتے رہے۔

کشمیر کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی تھی اس لیے ڈاکٹر زور کی تمنا تھی کہ یہاں کے اہل علم حضرات زبان کی اس حیثیت سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔ ان کی تمنا یہ بھی تھی کہ کشمیر کے ادیبوں کی کتابیں شائع ہوں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں تک پہنچیں چنانچہ کشمیری افسانہ نگار محمود حسین کی مجموعہ ''تیل کمل سکائے'' انہوں نے ادارہ ادبیات حیدرآباد کے تحت شائع کروایا اور اس پر دیباچہ تحریر کیا۔

انہوں نے کشمیری شعراء اور ادباء کی حوصلہ افزائی کے لیے ادارہ ادبیات حیدرآباد میں ایک شعبہ مطبوعات کشمیر قائم کیا جس کے تحت کشمیری نوجوانوں کی کتابیں شائع ہونے لگیں۔

یونیورسٹی کی سطح پر بھی انہوں نے کئی انتظامی تبدیلیاں کیں۔ ایم اے کے طلبہ کے لیے فارسی اور سنسکرت پڑھانے کا بندوبست ہوا۔ نصاب میں بھی انہوں نے کئی خوشگوار تبدیلیاں کیں۔ وہ کشمیر یونیورسٹی میں ایوارڈ کا نصاب شروع کروانا چاہتے تھے۔

سری نگر کے قیام کے دوران انہوں نے یہاں کے علم دادب کی اشاعت وترقی کے لیے ایک بہت بڑا منصوبہ تیار کر لیا تھا اور اسے اردو اکادمی سے موسوم کیا تھا۔ اس ادارے کے تحت وہ کشمیر کے قدیم فنکاروں اور ان کے ادبی اکتشافات پر تحقیق کام کا سلسلہ شروع کرنے کے خواہش مند تھے لیکن اس اکیڈمی کو قائم ہونا تھا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ کشمیر میں پہلے ہی ''کچھ اکیڈمی'' موجود تھی جس کا دائرہ عمل وسیع تھا۔

حیدرآباد میں جب ادارہ ادبیات اردو کا قیام عمل میں آیا تھا تو اس کی مخالفت بھی اس لیے کی گئی تھی کہ انجمن ترقی اردو پہلے سے موجود تھی لیکن وہ حیدرآباد تھا اور ڈاکٹر زور کی نوجوانی تھی۔ وہ مخالفت کے باوجود اپنا ادارہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے لیکن یہ کشمیر تھا اور وہ بڑھاپے کی منزل میں تھے۔ تن بہ تقدیر تھے۔ اس وقت مقاتلہ وہ یہاں کئی مشکلات پر غالب آ جاتے لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔ کشمیر آئے ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے کہ 23 ستمبر 1962ء کو ان کے قلب پر حملہ ہوا۔ یہ دورہ اتنا شدید تھا کہ 24 ستمبر کی رات کو اپنے کئی منصوبے ادھورے چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

انہوں نے خانقاہ عنایت اللہ حیدرآباد میں اپنے لے تعمیر کرایا تھا لیکن یہاں دفن ہونا نصیب نہ ہوا۔

عاشق حیدرآباد وادی کشمیر میں دفن ہوا۔

موت سے بھی مر گئے نہیں زور ہم
زندگی میں جو کام کر جائیں گے

ماخذ: ڈاکٹر زور
پروفیسر سیدہ جعفر

پوسٹ بکس کے رنگ

محمد ابراہیم جمالی

لوگ ملکوں ملکوں گھومتے ہیں۔ وہاں کے رنگ روپ کو اپنے اپنے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مسمنے تو یہی ایک خط کے ذریعے دلچسپ انداز میں شہر کی سیر کراتی ہے۔ اتنے دلچسپ انداز میں احوالِ شہر بیان کیا ہے کہ تعریف کرتے کو دل چاہتا ہے۔

آئیے آپ کی جاسی میں ہوا ایک خط

لندن میں مقیم پنجابی شاعرہ رجیت چندن:

کیا تم نے قسم کھا رکھی ہے کہ تم خود خط لکھو گے وہ تمہاری قلم سے بڑا ہرگز نہ ہوگا۔ اسی لیے کچھ بدھ ساتھیوں نے ''پکچر پوسٹ کارڈ'' بنا کر تمہاری اس کوشش میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ مطلب یہ کہ تمہارا پکچر پوسٹ کارڈ ملا، پڑھ کر دل کباب ہو گیا۔

خدا کے بندے! دو سطور کو خط لکھا کرو تو پکچر پوسٹ کارڈ کے وجود کو بھول جایا کرو اور میری طرح سفید کاغذ کے

کئی صفحات سیاہ کردیا کرو۔ اب تم وقت کا رونا رونے لگو گے ..... تو وقت پر ایک شعر سنو

وقت کی ڈور کو تھامے رہو مضبوطی سے
اور جب چھوٹی تو افسوس بھی اس کا نہ ہوا

سو وقت کے بارے میں کچھ بے مہرے ہو جاؤ۔ اگر وقت کو حد سے زیادہ اہمیت دو گے تو یہ تمہارے سر پر سوار ہو جائے گا طبلہ بجائے گا، تب تم کیا کرلو گے؟ جہاں تک تمہارے یہاں آنے کی بات ہے، جب چاہو آجاؤ۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ویسے اگر تم میرا پروگرام جاننا چاہتے ہو تو وہ یہ ہے کہ شاید مئی میں جانا پڑے۔ فی الحال کنفرم نہیں ہے۔ بہرحال تم اپریل تک آسکتے ہو۔ تب یہاں رنگوں کی بہار ہوگی۔ پچھلی بار تم آئے تھے تو سردیاں تھیں اور صرف دو ہی رنگ تھے۔ کالا اور سفید۔ میں یہ نہیں کہتا کہ صرف دو رنگ خوب صورت نہیں ہو سکتے لیکن اگر رنگ ہی دیکھنے ہیں تو یہاں پت جھڑ کے موسم میں آؤ۔ جب طویل جاڑوں کے بعد پیڑوں میں نئے پھول اور پتے نکلتے ہیں۔

تم نے تو دیکھا ہی ہے کہ بڈاپسٹ شاید یورپ کا واحد دارالسلطنت ہے جو اپنے پہاڑوں کے دامن میں جنگلوں کے وسیع و عریض ٹکڑے چھپائے ہوئے ہے۔ شاید یہ بھی قدیم تہذیب کی ہی دین ہے۔ ورنہ بڈاپسٹ بھی لندن ہوتا۔ حالت یہ ہوتی کہ پارکوں کے علاوہ جہاں کہیں بھی مسطح قطعہ زمین ہوتا، وہاں عمارتیں کھڑی ہو چکی ہوتیں۔

میں نے پچھلے پت جھڑ کے موسم میں خاصا وقت بڈاپسٹ اور اس کے اردگرد پھیلے ہوئے جنگلوں میں گزارا تھا۔ تم زیادہ بے چین نہ ہو جاؤ، اس لیے یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ تمام وقت میں نے تنہا ہی گزارا تھا۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پت جھڑ کا موسم اداسی بھرا ہوتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی نظر نہ آنے والا فنکار ہے..... شاید ہوا، جو اپنے ہاتھوں میں رنگوں کا طشت اٹھائے ایک ایک پتی اور ایک ایک پھول کو ایسے رنگوں سے سجا رہی ہے جس کا تصور بھی محال ہے۔ ایک ایک پتی پر رنگوں کی ایسی گھناؤ دیکھنے کو ملی کہ بیان سے باہر ہے۔

جنگل میں پیڑوں کے بدلتے ہوئے رنگ۔ دور یا پہاڑ کے اوپر سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہو جیسے حیرت انگیز اور دلکش رنگوں کا بہت بڑا کینوس ہو۔ رنگوں، ان کے شیڈ اور بدلتے ہوئے تاثر کو کاغذ پر لکھنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

ہمارے سفارت خانہ کے سیکنڈ سیکریٹری کے بھائی ان دنوں یہاں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے اس قدرتی حسن کو اظہار دینے کا ایک طریقہ کھوج نکالا تھا۔ وہ رنگوں کی گھٹا کو دیکھ کر کہتے تھے۔

"ارے یہاں گلزار جی ہوتے تو دسیوں اشعار لکھ دیتے۔ یہاں نرالا ہوتے تو نہ جانے کتنی حسیناؤں کی داستان تخلیق ہو جاتی۔"

بلو کی یہ بات مجھے بہت پسند آئی تھی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شہر کے اتنا اندر فطرت کا یہ حسین امتزاج کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ پیڑوں کے رنگ کالے، اودے، نیلے، جنبشی، گہرے سبز، پیلے، نارنجی، سرخ، کاسنی، گلابی ہو جاتے ہیں۔ اکثر ایک ہی درخت کی پتیاں نیچے کی ڈالیوں پر اودی دکھائی دیتی ہیں اور بالائی حصے میں لال۔ کچھ پیڑوں میں تو ایک ہی پتے پر تین تین، چار چار طرح کے رنگ آپس میں ملتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی تو ایک شجر میں ہوا کے رخ پر ایک رنگ دکھائی پڑتا ہے اور اس کے مخالف سمت میں کوئی اور رنگ ہوتا ہے۔ پھول عام طور پر نہیں رہتے لیکن پتیاں پھولوں سے زیادہ خوب صورت ہو جاتی ہیں۔ پیڑوں اور پتوں کے ان بدلتے ہوئے رنگوں کو مدنظر رکھ کر ہی شاید جنگلوں میں ایسی شجرکاری کی جاتی ہے جو طرح طرح کا رنگین منظر پیش کرتے ہوں۔ بہار کے موسم میں جو رنگ اترتے ہیں انہیں اگر "کنونشنل" کہا جاسکتا ہے تو پت جھڑ کے رنگ "نان کنونشنل" ہوتے ہیں۔ ایسے رنگ جو شاید تخلیق کار اور فن کاروں کے تخیل میں ہوں تو ہوں، کہیں اور نہیں دیکھے جاسکتے۔ جنگل کے ان رنگوں میں پیلا رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ خاص طور پر جب تم جنگل کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہو تو دور تک پیلے رنگ کا گویا فرش بچھا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ پیلے پتوں والے پیڑوں کے جنگل کے نیچے دھوپ اس طرح اترتی ہے کہ وہ پیلے پتے کچھ نارنجی ہو جاتے ہیں، چمکنے لگتے ہیں اور دھوپ کی آڑھی ترچھی کرنیں پتوں کے جھرمٹ کو چیرتی ہوئی نیچے تک آجاتی ہے۔ تب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے تم ریت میں لپٹے ہوئے کسی پیلے غار میں چلے جا رہے ہو۔ پت جھڑ کے موسم میں اس طرح کے بے شمار چمتکار ہوتے ہیں۔ پیڑوں کے پتوں کا

رنگ گہرا سبز اور کھتئی ہے، اچانک کسی موڑ پر ایک ایسا درخت مل جاتا ہے جس کے پتوں کا رنگ بالکل سرخ ہے۔ آتشی سرخ!

جہاں تک شہر کا سوال ہے، تم خود دیکھ چکے ہو لیکن میری آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ میں لگ بھگ تین سال سے اس شہر میں ہوں۔ اس دوران لندن، پیرس، ویانا وغیرہ گھومنے اور دیکھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر یورپ میں شہر ہیں تو بڈاپسٹ اور پراگ!

پراگ دیکھنے سے قبل میری ایک دوست سے بات ہوئی تو اس نے کہا تھا۔ "پراگ ضرور آؤ یہ شہر نہیں جادو ہے۔"

پراگ جادوگری ہے تو بڈاپسٹ بھی کسی سحرانگیز بستی سے کم نہیں۔ دنیا کے کئی شہروں کے درمیان ندیاں بہتی ہیں لیکن بڈاپسٹ کے بیچوں بیچ بہنے والی ڈونا ندی کی بات ہی کچھ اور ہے جیسے

اگرچہ شیخ نے داڑھی بڑھائی سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

ڈونا ندی شہر کا ایک ایسا حصہ بن چکی ہے کہ آپ شہر میں کہیں بھی جائیں وہ آپ کے ساتھ ساتھ رہے گی۔ اس کی ایک جانب اونچے سرسبز پہاڑوں کے درمیان سے جھانکتے مکان دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف میدان میں بسا ہوا شہر پسٹ ہے۔ تقریباً سو سال دریائے ڈونا کے دونوں کناروں پر آباد، یعنی پہاڑوں پر بسا بڈا اور میدانی علاقے میں پسٹ دو الگ الگ شہر تھے لیکن 1872ء میں ان دو شہروں کی شادی ہو گئی یعنی درمیان میں بھی مکانات بنتے گئے اور اتصال ہو گیا۔ اس طرح بڈاپسٹ کا جنم ہوا تھا لیکن اب تک ندی کے کنارے پہاڑوں پر بسے شہر کو بڈا اور دوسری طرف آباد شہر کو پسٹ کہا جاتا ہے۔ درمیان میں ڈونا ندی بل کھاتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اس کے دونوں طرف دو دو سڑکیں اور ٹرام کی لائنیں ہیں۔ ڈونا اس قدر قریب معلوم ہوتی ہے کہ تم آسانی سے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہہ سکتے ہو۔

ڈونا مجھے عجیب پُراسرار سی ندی لگتی ہے۔ اتنے رنگ بدلتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ کبھی ایک دم نیلی ہو جاتی ہے، کبھی نیالی سی اور کبھی کچھ سرخ سی..... کبھی نہایت پُرسکون تھکی تھکی سی معلوم ہوتی ہے تو کبھی چنچل اور بے چین۔ رات میں اس کے دونوں کناروں پر لگی روشنیاں جگمگا اٹھتی ہیں اور ساتھ ہی روشن عمارتوں کا عکس ڈونا میں اس طرح نظر آتا ہے جیسے ڈونا کے اندر بھی ایک شہر بسا ہو۔ دن میں بھی شاندار عمارتیں ڈونا کے اندر سے جھانکتی دکھائی دیتی ہیں۔

ہنگرین لوگ گیتوں میں ڈونا کی اپنی ایک اہمیت ہے۔ جو گیت میں نے سنے ہیں ان میں کہیں اس کو نرم ہواؤں کی محبوبہ قرار دیا گیا ہے اور کہیں کوئی عاشق اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے ڈونا میں کود جاتا ہے اور اسے پار کر کے وصال کے لمحوں سے سیراب ہوتا ہے۔ لیکن اب تو دریا پار کرنے کے لیے ساتھ عدد پل موجود ہیں جیسا کہ تم نے دیکھا ہے کہ یہ پل لندن کے پلوں کی طرح کم بلند ہرگز نہیں ہیں۔ لندن کے صرف ایک پل "ٹاور برج" کو چھوڑ کر باقی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے انہیں ہمارے دیسی انجینئرز نے بنایا ہے۔

بڈاپسٹ میں ڈونا پر بنے ساتوں پلوں کی الگ الگ شناخت اور تاریخ ہے۔ ان پر ہنگرین شاعروں نے اشعار کہے ہیں۔ یہ پل شہر اور لوگوں کی زندگی کا اہم حصہ ہیں۔ "چین برج" جس پر رات میں روشنیاں ہوتی ہیں۔ اس کے بارے میں یہاں ایک دلچسپ کہانی سنائی جاتی ہے۔ تم بھی سنو...... لیکن کہانی سننے سے پہلے یہ بتادوں یا شاید تم نے دیکھا ہی ہو کہ پل کے دونوں طرف پتھر کے دو شیر دھاڑنے کے انداز میں منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ پلوں کے آغاز پر ایسے پتھر کے شیر کھڑے کرنا یا بٹھانا شاید یورپین کی پرانی روایت رہی ہے کیونکہ میں نے اپنے ملک میں بھی کچھ پرانے پلوں میں ایسے شیر دیکھے ہیں۔ خیر، اب کہانی سنئے۔

کہتے ہیں کہ جس آرکیٹکٹ انجینئر نے وہ پل ڈیزائن کیا تھا، اس کا دعوا تھا کہ پل کا ڈیزائن اس قدر پرفیکٹ ہے کہ کوئی اس میں کسی قسم کی کمی یا نقص نہیں نکال سکتا یعنی آرکیٹکٹ صاحب خود ستائشی میں اس قدر پھول کر کپا ہو گئے کہ بس ایک چھوٹی سی پن کی ضرورت تھی ان کی ہوا نکالنے کے لیے۔ یہ کام کیا ایک بچے نے۔ وہ اپنی ماں کی انگلی پکڑے پل پر سے گزر رہا تھا۔ اس نے منہ کھولے، دھاڑتے ہوئے شیر کو دیکھا اور ماں سے کہا۔

"دیکھو، دیکھو اس شیر کے منہ میں زبان ہی نہیں ہے۔"

کہتے ہیں کہ ایک بچے کی طرف سے نکالی جانے والی غلطی یا نقص کا سن کر آرکیٹکٹ صاحب نے پل سے ڈونا میں کود کر خودکشی کر لی تھی۔

ویسے ڈوبا جانیں بھی خوب لیتی ہے۔ مگرمچھ میں خودکشی کا تناسب بہت زیادہ ہے کیوں ہے؟ ہے تو کوئی باہر کی مخلوق ہی نا سکتا ہے جن کی یہاں بھی کمی نہیں ہے مگر ان بے بستی کے شکار نہیں ہوں، خیر یہاں پر ہے ڈوبا کی وجہ کر جان دیتا ہے۔ یہاں خودکشی کرنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ ڈوبا پر ہے ایک پل "مارگریٹ برج" ہے مگرمچھ میں شاعر پارش ارنے (1716-1762ء) کی مشہور نظم "پل کا افتتاح" کا بھی موضوع ہے کہ جن لوگوں نے ڈوبا میں کود کر خودکشی کرلی تھی، ان لوگوں کی روحیں یہیں پر منڈلاتی رہتی ہیں۔

ایک بھی خودکشی روکنے والے نے آج تک بھی کمر نہیں کسی ہے۔ ایک دوسرا پل جسے "ٹریلم برج" کہتے ہیں، اس پر آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ خودکشی کے ارادے سے کچھ لوگ اس پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور پہنچ کر ان کا حوصلہ جواب دے جاتا ہے۔ وہ خود کو اتنی بلندی پر موجود پاکر خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔ تڑپ کر وہ کود کر خودکشی کرپاتے ہیں اور نہ ہی اس پل سے نیچے اتر پاتے ہیں پھر وہ چیختے چلاتے رہتے ہیں۔ تب فائر بریگیڈ کی گاڑی آتی ہے اور انہیں نکال کر زمین پر لے آتے ہیں۔ اتارا جاتا ہے۔ اچھا خاصا تماشا ہوجاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں کے قانون میں خودکشی کرنا جرم نہیں ہے۔

جرمانہ، جیل یا کسی شاعر کو سزا بھی نہیں ہوتی، جیسا کہ تم جانتے ہی ہو کہ سنگاپور کا کوڑے مارنے کی سزا کی گود میں اٹھلاتی، مچلتی اور ادائیں دکھاتی رہتی ہے۔ کبھی روٹھتی ہے۔ کبھی مان جاتی ہے اور محبوب اسے بہلاتا رہتا ہے۔ کبھی محبوبہ اسے سہلاتی ہے اور شوہر اس کی آنکھوں میں پانی عکس دیکھتا ہے۔

میں ان الفاظ کو اشعار کے روپ میں نہیں ڈھال سکتا لیکن محبوب اور محبوبہ کے ذکر پر یاد آیا کہ کسی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بڑا پیسہ کے عام ماحول میں ایسی کیا چیز ہے جو مجھے پسند آئی، پسند تو نہیں کیا کیا آیا لیکن میں نے بتایا کہ مجھے سب سے زیادہ یہ پسند آیا کہ یہاں کے عوامی مقامات، بسوں، ٹراموں، ٹیکسی اور پارکوں میں جب محبوب اور محبوبہ ساتھ ساتھ دکھائی دیتے ہیں تو عام طور پر لڑکیاں اپنے محبوب کی تعریف معمول کا حصہ ہوتی ہیں۔

فرض کیجیے کہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی بس میں ساتھ ساتھ بیٹھے ہیں تو آپ دیکھیں گے کہ لڑکی بس میں بیٹھی نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہی ہے، اسے چھو رہی ہے، اس کے بال سنوار رہی ہے۔ اس کے لباس کی سلوٹیں درست کر رہی ہے

اور پھر لڑکا کمر کی سے باہر کے مناظر میں کھویا ہوا ہے۔ ہمارے ہاں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی وجہ.....؟ دو معاشروں کے درمیان جو فرق ہے، وہی ہے۔

مگرمچھ میں لڑکیاں کس قدر حسین ہوتی ہیں، ہم دیکھ چکے ہیں۔ تم نے کہا تھا کہ اگر مغربی یورپ میں لڑکیاں عام طور پر ہیں "ان اور ہاٹ ایبل" معلوم ہوتی ہیں جبکہ مگرمچھ میں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسی لگتی ہیں، مگرمچھ میں لڑکیوں کی خوب صورتی کا راز تمہیں تو یہ بتایا گیا ہے کہ مگرمچھ میں لوگ بنیادی طور پر ایشین ہیں۔ دسویں صدی میں یہ لوگ وسطی ایشیا میں کہیں سے یہاں آئے تھے۔ ہر رنگ کے لوگ تھے۔ ایک زبردست تھا کہ مغربی یورپ کے گلیشائوں میں یہ دوڑا بھاگا جاتی تھی کہ اسے خدا جانے مگرمچھ میں لوگوں کے تیوروں سے محفوظ رکھ۔ اب وہ زمانہ بیت گیا۔ اپنے بادشاہ اشتوان (1038ء) کے عیسائی ہونے کے بعد سے تمام ٹوٹ کی عیسائی ہوگئے پھر یہ ملک ترکوں کے قبضے میں آگیا۔ مطلب یہ کہ ایشیائی اور یورپی اختلاط سے مگرمچھ میں نسل کو وجود پایا۔ یہ تو تھیوری شدہ حقیقت ہے کہ جب دو رنگ ملتے ہیں تب ہی اچھا رنگ سامنے آتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کے روپوں اور رنگ کی بھی ہے۔ یہاں کی ہر لڑکی کا خواب امیر ہونا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کا بھی کافی اثر ہے لیکن خاندانی رشتے مغربی یورپ اور امریکہ کے مقابلے میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

لیکن پیارے دوست مگرمچھ میں لڑکیوں اور عورتوں کی زندگی ظاہری طور پر جتنی آزاد اور پُرکشش دکھائی دیتی ہے اتنی ہے نہیں۔ میں یہاں بتاتا ہوں کہ مگرمچھ میں عورت تو جوانی میں مرد کرتی ہے (عموماً گلی بار) پھر شادی، ایک بار دو بچے..... پھر طلاق..... اس کے بعد پوری زندگی تنہائی کی نذر۔ یعنی عمر بڑھنے کے باعث کسی عاشق کے ملنے کا سوال ہی نہیں، شوہر پہلے ہی الگ ہو چکا ہے۔ بچے بھی اپنے لیے روتا ہے کہ کہیں نکل جاتے ہیں باقی بچتی ہے دکھتی عمر اور تنہائی۔

ایک دوست نے مگرمچھ میں عورتوں پر ایک لطیفہ سنایا تھا۔

"اگر تم اشارہ میں برس کی لڑکی سے کہو کہ تم اس کے لائق ایک لڑکے کو جانتے ہو تو وہ پہلا سوال کرے گی، دھلے میں کیسا ہے؟ اگر تم یہی بات پچیس سال کی لڑکی سے کہو تو وہ دریافت کرے گی، اس کے پاس دولت کتنی ہے؟ اور اگر یہی تم چالیس سال کی عورت سے کہو گے تو فوراً پوچھے گی کہاں ہے؟"

یہاں کے معاشرے پر بھی ایک طرح سے مردوں ہی کی حکمرانی ہے۔ اعلیٰ حال ہی میں ایک مگرمچھ نیوز دوست نے کہا تھا کہ ان کے ملک کی ایک عورت سفیر بن گئی ہے پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ہمارے ملک میں عورتیں اس طرح کے عہدے پر پہنچ پاتی ہیں۔

کچھ تفتیش اور مطالعے کے بعد میں یہ جان پایا ہوں کہ اس ملک میں عورتوں کو اہم عہدے نہیں مل پاتے۔ انہیں چھوٹے چھوٹے اور معمولی کام ہی دیے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی گہرے نقد کی کہانیاں بھی سامنے آتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان تفریق کے حوالے سے یہاں ایک محاورہ مشہور ہے "شیطان سے تھوڑا ہی کم ہے لیکن یہ تو آدمی ہے۔"

شیطان صاحب یہاں بھی زندہ ہیں۔ بھیجل حکومت نے مشرقِ شیطان کے کام کو مزید آسان بنانے کا قانونی شکل دے دی ہے۔ اب یہاں مرد وزن کے بے جا میل جول اور تعلقات پر کوئی قانونی روک ٹوک نہیں ہے۔ شیطان کی ذکریں اور تاپ لیب بار کثرت سے نظر آنے کے لگی ہیں۔ رات کو یہاں کا کلب ایریا جنوں اور انسانوں سے بھرے زمینی الخلقہ کے زندہ لوگوں کو اپنی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے لیکن فی الحال یہ ہے راوی دس درہے کو ہیں بچتی ہے ہنسی بچتی ہے۔

ہڑاپہ ایک معنوں میں رات کا شہر ہے۔ جب تم آئے تھے تو موسم سرما کی وجہ سے یہاں کی راتیں سرد تھیں۔ اگر گرمیوں میں آؤ تو دیکھ سکتے ہو کہ رات کے دو ڈھائی طرف کی لائٹیں، خاص طور پر بڑا پیلز پر بے حد چہل پہل اور گلوں کی جگمگاہٹ ضمیر کچھ اس طرح کا پُرسحر منظر پیش کرتی ہے جیسے سیاہ آسمان پر ایک چمکتا ہوا طلسمی شہر اُتر تا چلا جارہا ہے۔ یہ منظر بڑا ہی دلکش اور پُرسحر ہوتا ہے اور یہ دریائے ڈوبا کے کنارے والے سب سے بڑے پہاڑ "گولڈ ہل" پر چڑھ کر دیکھو تو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے شہر پر ہلکا سا خمار دکھائی دیتا ہے۔

گولڈ ہل کا بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ جب مگرمچھ میں عیسائی مشنری آئے تھے تو بہت سے عیسائی مشنری یہاں عیسائیت کا پرچار کرنے اور ان کو مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دینے کے لیے آئے تھے۔ ان ہی میں گولیت نام کا ایک عیسائی مبلغ بھی تھا۔ اس نے بتایا کہ ان کا خدا بہت طاقت ور ہے، فیر وہ فیر ہے پھر کہا کہ مگرمچھ میں لوگوں کو چاہیے کہ وہ ان کے خدا کو مانیں۔ مگرمچھ میں نہ تسلیم کیا۔ "اگر تمہارا خدا اتنا طاقت ور ہے تو ہم اسے مان لیں گے؟ اس کی عبادت کریں گے لیکن ہم اس کا ثبوت چاہتے ہیں۔"

"کس قسم کا ثبوت؟" مبلغ گولیت نے نرم لہجے میں پوچھا۔

قارئین صنوجہ بڑی
پرچا نہیں ملتا
ہم مرے ہے بعض مقامات سے یہ شکایت مل رہی ہیں کہ زیادہ تلاش کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔
☆ انجمن کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے متعدد بار یہ معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ ایک اعلان کنندہ یہاں پر چاہیے جو کتاب بھی پڑھے۔
☆ ہمارا موٹو ہے "آگے آگے"
☆ کسی بھی ریک اعلان کنندہ PTCL کا نمبر آن لائن نمبر
رابطہ اور مزید معلومات کے لیے
نصر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
G-6 ☎ 111-11-11 ☎ 35168021 ☎ 35168022 ☎ 35168023
مندرجہ ذیل ممالک میں ہماری ایجنسی کے ذریعے بھی خرید سکتے ہیں
35802552-35386783-35804200
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

''ہم لوگ تمہیں لکڑی کے ایک بڑے سے ڈرم میں بند کر کے پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکا دیں گے اگر تمہارا خدا سب کچھ کر سکتا ہے تو تمہیں بچا لے گا۔ یہ ثبوت ہمارے لیے کافی ہوگا اور ہم عیسائی ہو جائیں گے اور اگر ایسا نہیں ہوا، تم مر گئے تو ہم عیسائی ہرگز نہیں ہوں گے۔''

یہ تو نہیں معلوم کہ عیسائی مبلغ گولیت اس امتحان کے لیے تیار ہوا تھا یا نہیں لیکن اس زمانے کے بربر ہنگرین لوگوں نے جیسا کہا تھا ویسا ہی کیا۔ مبلغ گولیت کی نہایت درد ناک موت واقع ہوگئی۔ ہنگرین عیسائی نہیں ہوئے لیکن بادشاہ کے عیسائی ہونے کے بعد پورا ملک عیسائی ہوگیا تو اس پہاڑ کا نام ''گولیت پہاڑ'' رکھ دیا گیا جس پر سے مبلغ کو لڑھکایا گیا تھا۔ آج اس پہاڑ پر گولیت کا ایک بڑا سا مجسمہ دیکھا جا سکتا ہے۔ رات میں اس پر روشنی کی جاتی ہے۔ آپ شہر کے ایک بڑے حصے سے اس مجسمے کو دیکھ سکتے ہیں۔

رات میں شہر کا حسن اس لیے بھی دوبالا ہو جاتا ہے کہ سڑکوں پر رات کو دیر تک چہل پہل رہتی ہے۔ حسین اور نوجوان لڑکیاں تنہا اور بے فکری سے چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ جہاں تک ''لا اینڈ آرڈر'' کا سوال ہے اب تک یعنی سرمایہ داری کے دور کے دوران بھی اسے بہتر کہا جا سکتا ہے لیکن اسے پرانی تہذیب کا اثر ہی کہہ سکتے ہیں جو رفتہ رفتہ اپنی وقعت کھو رہا ہے۔ اب جرائم میں اضافہ ہونے لگا ہے لیکن ویسا نہیں جیسے تمہارے اور میرے دیس میں ہے۔ یہاں کے اخبارات میں چھپتا رہتا ہے کہ ہنگری میں ''انڈر ورلڈ'' اور جرائم کی دنیا مضبوط ہو رہی ہے لیکن وہ تمام لوگ روسی ہیں۔ کچھ اخبارات میں طنزیہ انداز میں چھپنے والے مضامین میں یہ بھی کہا گیا ہے۔

''دیکھیے، ہم ہنگرین لوگ کیسے ہیں ہمارے جرائم پیشہ لوگ اپنے ملک میں جرائم کی دنیا آباد کرنے کے بھی اہل نہیں ہیں جس کے لیے میدان کھلا ہے۔''

ہنگری، بڈاپسٹ میں سوشلزم کے دوران جرائم کے خلاف جو سخت اقدامات اٹھائے گئے، اس نے جرائم کا صفایا کر دیا تھا۔ اب در آمد ہو رہے ہیں۔ اگر تم مجھے قسم دے کر بھی پوچھو تو میں یہی کہوں گا کہ ہنگرین بہت سیدھے اور شریف لوگ ہیں۔ عام ہنگرین دھوکا دینا تک نہیں جانتے، یہ ایماندار لوگ ہیں۔ کچھ ''ریزرو'' سے معلوم ہو سکتے ہیں لیکن تعارف کے بعد یہ تاثر ختم ہو جاتا ہے۔ مجھے یہاں ایک بار بینک میں چار سو ڈالر حساب سے زیادہ دے دیے گئے پھر مجھے فون کیا گیا کہ آپ کو چار سو ڈالر فالتو دے دیے گئے ہیں، آپ لوٹا دیجیے۔''

سیدھے پن اور شرافت کے باوجود میں نے ہنگرین لوگوں اور یہاں کے معاشرے میں پنپتی ہوئی نفرت کو بھی واضح طور پر محسوس کیا ہے اور یہ نفرت یہودیوں کے خلاف ہے اور کیوں ہے؟ میں نے اپنے طور پر اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

سنو..... کہنا یہ ہے کہ یہودی اس قدر منظم اور ایک دوسرے کا اتنا خیال رکھنے والے ہیں کہ اکثر درست فیصلے نہیں ہو پاتے۔ بتایا جاتا ہے کہ اگر کسی ادارے میں کوئی یہودی اعلیٰ پوسٹ پر ہوتا ہے تو وہ پورے ادارے میں یہودیوں کو بھر دیتا ہے۔ یہ کام اس قدر دھڑلے سے ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اہانت محسوس کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ہنگرین میڈیا اور کاروباری دنیا پر بھی یہودیوں کا قبضہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی جتنی سہولیات یہودیوں کو حاصل ہیں اتنی مقامی ہنگرین کو بھی حاصل نہیں ہیں۔

یہی اسباب ہیں کہ میں نے یہاں اکثر لوگوں کو یہودیوں کا مخالف پایا ہے۔ کچھ لوگ اس حد تک جا چکے ہیں کہ اب وہ مطالبہ کرنے لگے ہیں کہ یہودیوں کو ہنگری سے نکال دیا جائے۔ اس پر بعض لوگوں کی رائے ہے کہ اگر ہنگری سے یہودیوں کو نکال دیا گیا تو یہاں کی اکانومی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ ہنگری میں کاروباری دنیا ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔

مقامی لوگ یہودیوں کے خلاف نہیں بلکہ یہاں جپسیوں، عربوں اور چینیوں کے لیے بھی کچھ ایسی ہی فضا قائم ہو رہی ہے۔ یہاں اتنی قوم پرست قوتیں موجود نہیں جتنی دیگر ملکوں میں ہیں لیکن پھر بھی ابھر کر سامنے آ رہی ہیں۔ عوام اور حکومتی ایوانوں میں ان کی آہٹیں سنی جا سکتی ہیں۔

میں نے یہاں آباد اپنے دیسی لوگوں اور جپسیوں سے ملنے، انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا احوال آئندہ کسی خط میں تحریر کروں گا۔ اب مزید لکھنے کو دل نہیں چاہ رہا کیونکہ پڑوس کے کسی فلیٹ سے کتے کے رونے اور چلانے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ کوئی اپنے کتے کو فلیٹ میں بند کر کے چلا گیا ہے۔ کتا زور، زور سے رو رہا ہے۔ ویسے عام طور پر یہاں کتوں کے ساتھ انسانی رویہ رکھنے کی روایت ہے۔''

انوکھے امراض

کشمالہ حسن

یہ خاک کا پتلا خاکی جسم پر کتنا اتراتا ہے، گھمنڈ کرتا ہے جب کہ یہ جسم بیماریوں کا مسکن ہے۔ ہر روز ایک نئی بیماری سامنے آتی ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ میڈیکل سائنس ایک بیماری کا علاج دریافت کرتی ہے تو دوسری اس سے بھی زیادہ خطرناک بیماری سر اٹھا لیتی ہے۔ آج سے ڈھائی سو سال قبل بخار سب سے خطرناک مرض کہلاتا تھا۔ اس کا علاج دریافت ہوا تو ٹی بی دق سامنے آگیا جسے موت کی گھنٹی کہا جانے لگا۔ ٹی بی پر قابو پا گیا تو کینسر نے پھن گاڑھ لیا۔ کینسر کو دبانے کی کوشش ہو ہی رہی تھی کہ ایڈز نے جنم لے لیا۔ ایڈز کا علاج دریافت کرنے کی کوشش جاری تھی کہ ای بولا ''موت کا ہرکارہ بن کر سامنے آگیا۔ ان کے علاوہ بھی چند پُراسرار مرض بڑی تیزی سے پھیل رہے ہیں جو کہ موت کے پیامبر نہ سہی لیکن جسم کے مدافعتی نظام کو ضرور نقصان پہنچا کر بڑے مرض کی راہ ہموار کر رہے ہیں

دنیا بھر میں پھیل رہے کچھ انوکھے امراض کا تذکرہ

آپ نے تو سنا ہی ہوگا مرضِ عشق پہ رحمت خدا کی، دیا بے دام ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے۔ یا اس قسم کا کوئی اور شعر۔ انسان اور اس کے ساتھ لگی ہوئی بیماریوں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔

ہر دور میں بیماریاں آتی رہی ہیں اور ان کا علاج دریافت ہوتا رہا ہے۔ بڑے بڑے اطبا، کیمسٹ، فزیشن ہر جتن انسان کو بیماریوں سے محفوظ کرنے کے جتن کرتے رہے ہیں۔

ایسا لگتا ہے جیسے دو فرشتے ہیں۔ دونوں کے پاس بڑے بڑے صندوق ہیں۔ ایک فرشتہ کسی مرض کے علاج کی پرچی دنیا میں پھینکتا ہے اور دوسرا فرشتہ فوراً ہی کوئی دوسرا مرض دنیا میں پھینک دیتا ہے اور یہ کشمکش ازل سے جاری ہے۔

جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے ایسی ایسی بیماریوں کے نام سامنے آئے ہیں جو ہمارے اجداد نے بھی نہ سنے ہوں گے۔

کینسر، شوگر، ہیپاٹائٹس (دو اس کی دو ذیلی اقسام)، ایڈز، ٹیٹنس یا لاک جیو اور اسپرز سنڈروم اور نہ جانے کون کون سی بیماریاں حضرت انسان کو گھیرے ہوئی ہوئی ہیں۔

بیماریوں کی وجوہات بے شمار ہو سکتی ہیں۔ ناقص خوراک، صفائی کا فقدان، ماحول کی آلودگی، یہ قطعاً ہی غرض یہ کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

بہت سے امراض ایسے ہیں جن کا تعلق کسی خاص گھرانے، جغرافیہ سے ہوتا ہے۔ زرد بخار، کالا موتیا، ملیریا وغیرہ افریقہ سے آئے ہیں۔ ڈینگی بھی اسی نہج پر ہے۔

میں نے خود جغرافیائی تبدیلیوں کے ساتھ امراض کی نوعیت تبدیل ہوتے دیکھی ہے۔ میں نے ہندوستان اور بنگلہ دیش میں ٹیلی پیتھی سے (وہ مرض جس میں پاؤں ہاتھی کے پیر جیسے موٹے ہو جاتے ہیں)۔ جب کہ اس قسم کا مرض اس طرف کو دیکھنے میں آتا ہے۔

جب کہ شوگر، کینسر اور پس وغیرہ میں نے اس طرف بہت دیکھے ہیں اور ان علاقوں میں بہت کم ہوتے ہیں۔

بہت سی بیماریاں موروثی ہوتی ہیں۔ خنزر کے ساتھ سفر کرتی ہوئی ایک نسل سے دوسری کو منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

بہت سی بیماریاں عالمی وبائی حیثیت رکھتی ہیں۔ جیسی پوری دنیا میں ہوتی ہیں اور بہت سی خاص خطے سے تعلق رکھتی ہیں۔

بہت سی معاشرتی بیماریاں ہوتی ہیں۔ بہت سی بیماریوں کا تعلق اپنے مزاج اور رویے سے ہوتا ہے۔ جیسے حسد و جلن، نفرت وغیرہ وغیرہ جیسے بیغوں، بالغیر ٹینشن اور ڈپریشن ہو جاتا ہے۔ غذائی بیماریاں بھی بیماریوں کا سبب بنتی ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ بہت سے لوگ کھانے پینے کے معاملات میں اعتدال سے کام نہیں لیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب دل بھی رہا ہے تو کیوں نہ کھا جائے لیکن تمام طبعی اشیاء غرض یہ کہ جو دل چاہے وہ کھا لیجئے ہیں۔

نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ شوگر اور دل کی بیماریاں ان کا مقدر بن جاتی ہیں۔

یہ صورت حال بہت خطرناک ہے۔

اس مضمون میں ایسی چند بیماریوں کا تعارف کروایا گیا ہے جو اپنی جغرافیائی حدود میں رہتے ہوئے کسی اور جگہ پھیلائی جاتی ہیں۔

ان بیماریوں کا تعلق کسی خاص خطے یا شخص سے ہوتا ہے۔

یہ پُراسرار بیماریاں کہلاتی ہیں۔ ان کا علاج بھی ہوتا ہے لیکن علاج سے زیادہ ماحول اور رویے میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

آیئے ایسی کچھ پُراسرار اور انوکھی بیماریاں دیکھتے ہیں۔

ریٹائرڈ شوہروں کا سنڈروم

یہ وہ معاشرہ ہے جہاں کام کو عبادت سمجھا جاتا ہے۔

کام، کام اور صرف کام۔ جہاں کام کے علاوہ کسی اور طرف دیکھنے کی سہولت نہیں ملتی۔ ہر تر فی یافتہ اور تیز رفتار معاشرے کے اخراجاتی طریقہ کار کام سے ہی طے کرتے ہیں۔

یہ ہر جگہ نہیں ہوتا ہے اور ہر جگہ اس طرح پر خواتین اس کی زیادہ شکار ہوتی ہیں۔ یہ کوئی ایک مرض نہیں ہوتا بلکہ اس کے سبب کئی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔

جب شادی ہوتی ہے، تو شادی کے دوسرے ہی دن سے مرد کی مصروفیات شروع ہو جاتی ہیں۔ فلٹر کا فرق غرض یہ کہ جہاں بھی اس کی جاب ہو۔

یہی حال عورت کا ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی طرح مصروف ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا وقت نہیں ملتا۔ آپس کی ملاقات بھی ذرا دیر کے لیے ہوا کرتی ہے۔

اس وقت بھی دونوں پر کی طرح تھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھر کے دیگر مسائل بھی ہوتے ہیں۔

جاپان میں یہ سنڈروم اس وجہ سے اپنے عروج کو پہنچا ہوا ہے (ویسے تیز رفتار زندگی کی وجہ سے ایسی صورت حال ہمارے یہاں بھی بڑھ رہی ہے) لیکن اسی صورت حال یا کسی اور صورت حال جاپان جیسی خراب نہیں ہوتی ہے۔

ایک عرصہ اس طرح ازدواجی زندگی گزارنے کے بعد جب شوہر ریٹائر ہوتا ہے تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔

اب وہ زیادہ وقت گھر پر رہنے لگتا ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کو الجھی طرح جاننے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مزاج سے واقف ہونے لگتے ہیں۔

ایک دوسرے کے مزاج اور فطرت کی خوبیاں سامنے آنے لگتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان تکھیاں شروع ہو جاتی ہیں اور تکھیاں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ طلاق تک کی نوبت آجاتی ہے۔

ایک اندازے کے مطابق جاپان میں طلاق کی شرح شوہروں کے ریٹائرمنٹ کے بعد زیادہ ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے۔

اب جو صورت حال بنتی ہے وہ کچھ یوں ہے کہ یا تو عورت طلاق لے لیتی ہے اگر ایسا نہ کر سکے تو پھر ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو کر مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے، بے خوابی اور سر بھی کبھی تو قوت گویائی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

جاپان میں ماہرین اب اس طرف توجہ دینے لگے ہیں لیکن ابھی اس کی گتھی نہیں سلجھ آیا کہ اس کے علاوہ اور کیا کرنے کی ضرورت ہے کہ ایسے شوہروں کو معمول پر لایا جا سکے۔ ریٹائر ہونے کے بعد گھر پر اپنا مکمل اختیار جتانے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ اب تک اس گھر کو آپ کی بیوی دیکھتی بھالتی آئی ہے۔ وہ شاید آپ کا یہ انکا رویہ پسند نہ کرے۔

نیورولیکسٹنڈ روم

یہ بھی معذوری انجیز، قدرے معاشرے کا مرض ہے۔

اس سنڈروم کا تعلق بنیادی طور پر لائف اسٹائل سے ہے۔ یہ اب اور امراض کی بہ نسبت بڑا عام ہے۔

طرز زندگی نے عورتوں، یہاں اور مردوں کو دوڑی وی، ایکسرین اور ڈیجیٹل کیمرہ کے سامنے لا کر کھڑا دیا ہے۔ ان کے پاس وقت گزارنے کا کسی کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ وہ دوڑی وی دیکھتے رہیں اور کھانے رہیں کھاتے چلے جائیں۔

جو بھی دل چاہے دیوا بھر کے کھٹے ڈوڑ، مٹر پنیر اور نہ جانے کیا کیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بہت بڑی طرح موٹاپے کا شکار ہو رہے ہیں۔

امریکا میں آپ ایک سے بڑھ کر ایک کاسمیٹک تھم کے موٹاپے دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں عورت، مرد اور بچے وغیرہ کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔

سروے کے مطابق پوری دنیا کے تین فی صد موٹے صرف امریکا میں ہیں اور اس سے تمام تر مسائل وہ کے نتیجے میں آتے ہیں۔ ان مسائل میں ایک بڑا مسئلہ ذیابیطس یا شوگر کا ہے۔ یہ بڑا موذی مرض ہے۔ جیسے دل کے امراض، شوگر، بلڈ پریشر، سانسوں کا پھولنا وغیرہ۔ اس پر تفاصیل بتانے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے لائف اسٹائل کو بدلا جائے۔

Latah (اضعاب)

یہ ایک پُراسرار بیماری ہے اور ملائیشیا میں بہت عام ہے۔

اس مرض میں اضعاب بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اس کا شکار خواتین زیادہ ہوتی ہیں۔ جب کہ مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ کسی بھی شخص کے لوگوں کو ہوتا ہے۔

اس میں ہوتا یہ ہے کہ اضعاب ذرا سی بلند آواز یا شور سے واقعت ہوتے ہیں کہ اچانک۔ خوف ان کے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو جاتی ہے اور پھر اس کا اثر سیدھی طرح محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ وہ نفسیاتی مریض بن کر رہ گئے۔ انہی انتا بھی ہوش کھو بیٹھتے ہیں اور کر بیٹھتے ہیں۔

ایسا ہی ایک کیس دیکھا گیا کہ ایک عورت کو ایک ریسٹ ہے کہ کہا گیا کہ یہ اس کا بچہ ہے اور بھوک سے بے تاب ہو رہا ہے۔ وہ فوراً ہی بہت زور دودھ پلانے کی کوشش کرنے لگی۔

سوال یہ ہے کہ شوہر کو بھی دنیا کا مسئلہ ہے۔ ہر جگہ شور ہی شور ہے۔ پھر یہ عرض صرف ملائیشیا میں کیوں ہے۔

ماہرین اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش تو کر رہے ہیں لیکن ابھی تک اس کی وجوہات سامنے نہیں آسکی ہیں۔

مرض آتش

Fire sickness

کوریا کی زبان میں

Hwrbyung-

یہ مرض کوریا کا منفرد مرض ہے۔ سر یعنی کے سینے میں اچانک آگ سی جلنے لگتی ہے یا اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے (ویسے حادثے یہاں بھی لوگ کہتے ہیں کہ ان کا سینہ جل رہا ہے۔

یہ بھی ایک نفسیاتی اذیت و ضرر کی صورت ہے۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ (ویسے ہمارے یہاں بھی لوگ کہتے ہیں کہ ان کا سینہ جل رہا ہے)۔

لیکن کوریا کی جو علامات سامنے آئی ہیں وہ ہو جاتی ہیں۔

اچانک سے ہوش، چکرا کر گر جانا، ہڑبڑاہٹ، یہ فوری طور پر ہوا کرتا ہے۔ بعد میں وہ مختلف امراض کا شکار ہو جاتی ہیں۔

دھڑکن بھی، بدن میں ہر وقت درد، بے خوابی، ہاتھ کروں کے بے تحاشی، ہیجان میں وہ مبتلا پائی اور وغیرہ۔

اس کی وجوہات مکمل طور پر سامنے نہ آسکی ہیں۔

لیکن ایک خیال یہ ہے کہ بے جا غصہ کو ضبط کرنے پر برداشت کرنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ماہرین فیصلہ اسے خاندانی مرض قرار دیتے ہیں۔

ویسے یہ بیماری معلوم ہونے لگتا ہے کہ غصہ ہی آگ ہے جو انسان کو اندر سے جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

مٹی سنڈروم

یہ عرض بھی صغیر کی دین کا ہے۔

یعنی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال وغیرہ میں بہت عام ہے۔

اس کی بھی شہر انفسیاتی وجوہات لگتی ہیں۔ نہ جب سے دوری، بے بسی، بے چینی، وجوہات پر شاید کوئی بند ہو سکتا۔

اس مرض میں مبتلا نوجوان کی ند کسی وجہ سے اپنے مادہ منویہ کی کمی کا شکار ہو جاتے ہیں اور جب یہ جوہر حیات ختم یا کم ہو جائے تو اس کے بعد بہت سی ذہنی اور جسمانی بیماریاں ان کا مقدر ہو جاتی ہیں۔

ان کی بھوک ختم ہو جاتی ہے، آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے

لگتے ہیں، سو نہیں پاتے۔ کمزوری اتنی ہوتی ہے کہ دو قدم بھی چلنا محال ہو جاتا ہے۔ سانسیں پھولنے لگتی ہیں۔ اعصاب مرجھا کر رہ جاتے ہیں۔ زندگی سے دل چسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے تدارک کے لیے مذہبی اور نفسیاتی معالجوں کو اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

Paleng اور Pafeng

یہ دو بیماریاں ہیں لیکن ایک ہی سلسلے کی ہیں۔ ایک کے بعد دوسری بیماری بھی ہو جاتی ہے۔ یہ مرض چینی باشندوں کا ہے۔ یہ بھی اپنی نوعیت کا انوکھا مرض ہے۔

پالینگ سخت ترین سردی کا احساس اور پافینگ انتہائی شدید ہواؤں کا خوف۔

یہ مرض اچانک حملہ کرتا ہے اور ذرا سی دیر میں مریض کو بے حال کر کے رکھ دیتا ہے۔ چین میں کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص Yin اور Yan میں مبتلا ہو گیا ہے۔

مریض کو بے پناہ سر درد ہوتا ہے۔ پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ چکر آتا ہے اور بے تحاشا کھانسی ہونے لگتی ہے۔

اچانک موت

یہ مرض ساؤتھ ایسٹ ایشیا میں بہت عام ہے۔

یہ بھی ایک پُراسرار مرض ہے۔ جس کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ رات میں سوئے اور صبح تک مر گئے یعنی بستر پر پڑے پڑے۔

جب ایسے مریض میں ہارٹ اٹیک کی بھی کوئی علامت نہیں پائی جاتی اور ویسے بھی عام طور پر ایسے افراد کی عمومی صحت ٹھیک ہی ہوتی ہے۔ پھر بھی وہ اس پُراسرار موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ان علاقوں کی روایات اور کہانیوں کے مطابق اس قسم کی اموات ایک پُراسرار روح کی وجہ سے ہوتی ہے۔

وہ روح رات بھر بھٹکتی ہے۔ گھروں میں جھانک کر دیکھتی ہے اور اپنے مرض اور پسند سے کسی کو بھی اپنا شکار بنا لیتی ہے۔

جاپان میں اس بدروح کو Pök-Kuri، ویتنام اور لاؤس میں Tsab-Tsung اور فلپائن میں Bati-bat کہا جاتا ہے۔

اس سے بچنے کی کوئی احتیاطی تدبیر بھی نہیں ہو سکتی۔

منیلا میں ہونے والے ایک سروے کے مطابق 1948ء سے 1982ء تک اس قسم کی اموات کی شرح بہت زیادہ تھیں۔

یعنی بہت لوگ ان برسوں میں اس پُراسرار موت کا شکار ہوئے۔

اس کے شکار زیادہ تر لوگ 30 سے 37 برس کے تھے۔

یعنی بڑھاپے کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ زیادہ تر اموات تین بجے صبح کے وقت ہوئیں، دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں ہوئیں۔

کیا خیال ہے۔ یہ ہے پُراسرار مرض۔

Tabanka

ٹریڈاڈ کا مرض

اس علاقے کا یہ ایک عام مرض ہے اور اس کی وجوہات بھی ابھی تک سامنے نہیں آ سکی ہیں۔ اس علاقے میں ہر طرح اور ہر جنس کے لوگ اس مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ویسے بہت سے لوگ ہمارے یہاں بھی اس قسم کے مرض کا شکار ہو چکے ہیں۔

یہ اچانک بغیر کسی سبب کے بے پناہ اداسی کا مرض ہے۔

ہمارے ایک شاعر نے تو اس کا علاج بتا دیا ہے۔ غبار دل پہ بہت چھا گیا ہے دھو لیں آج۔ کھلی فضا میں کہیں دور جا کے رو لیں آج۔

لیکن اس علاقے میں ایسا کوئی علاج نہیں بتایا جا سکا ہے۔

اس میں ہوتا یہ ہے کہ اچانک ہی دنیا سے دل چسپی ختم ہو جاتی ہے۔ مریض کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کیفیت سے بچنے اور اپنے آپ کو بھلا دینے کے لیے بے پناہ شراب نوشی کرنے لگتا ہے۔

اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ جاتا ہے۔ مردم بےزار ہو جاتا ہے۔ خودکشی تک کر لیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی وجوہات نفسیاتی ہوں۔ لیکن کیا ہیں اور اس کا علاج کیا ہے۔ یہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

تو آپ نے دیکھ لیا کہ یہ دنیا کیسے کیسے امراض سے بھری ہوئی ہے۔ نہ سمجھ میں آنے والے امراض اور اگر گہری نگاہوں سے دیکھا جائے تو زیادہ تر امراض نفسیاتی ہیں یا بے راہ روی کی وجہ سے ہیں، یہ بے راہ روی جنسی بھی ہو سکتی ہے اور جسمانی بھی۔

نانگا پربت کا عقاب

ندیم اقبال

ارضِ پاک کو خدا نے بے شمار نعمتیں عطا کر رکھی ہیں۔ قدرتی حسن سے اس طرح مالا مال کر رکھا ہے کہ اس کی نظیر کسی اور ملک میں نہیں ملتی جو لوگ سوئٹزر لینڈ کے قدرتی حسن پر رطب اللسان رہتے ہیں انہیں سوات و مری و نتھیا گلی دیکھنا چاہیے جو سہارا ڈیزرٹ کی خاموشی کی تعریف کیا کرتے ہیں انہیں چولستان دیکھنا چاہیے جو نیپال کے ہمالیائی حسن کے گن گاتے ہیں انہیں بلتستان کی سیر ضرور کرنا چاہیے۔ اسی خیال کے تحت ''سیرِ پاکستان'' کے سلسلے کو شروع کیا گیا تھا لیکن اس سلسلے میں اب تک جتنی بھی تحریر شامل ہوئیں یہ تحریر ان سے ذرا مختلف ہے کیونکہ ندیم اقبال عالمی پیمانے کے عکاس ہیں۔ قدرتی حسن کی فوٹو گرافی میں ان کی شہرت بہت زیادہ ہے لیکن اب جب انہوں نے اپنے سیر کی روداد قلمبند کی تو ایک اور خوبی سامنے آئی کہ وہ منجھے ہوئے قلمکار بھی ہیں۔ نہایت پُرلطف انداز میں لفظوں سے عکاسی کرتے ہیں۔

عالمی شہرت یافتہ فوٹو گرافر کے قلم کا شاہکار ایک پراثر روداد سفر کا تیسرا حصہ

پروگرام یہ تھا کہ بجست فورڈ دیکھ کر استف فورڈ جائیں گے۔ شاہ جی بج بن کر تیار ہو گئے تھے۔ بوسکی کی قمیص اور سفید لٹھے کی شلوار میں وہ جیسے عید کی نماز کے لیے تیار ہوئے تھے۔ اشفاق نے آ کر بتایا کہ وہ ہلکے ہلکے گنگنا بھی رہے ہیں۔ ہم سب دیکھ رہے تھے کہ وہ بڑے خوشگوار موڈ میں تھے۔ کیونکہ انہیں یہ خبر نہ تھی کہ فورٹ میں ان پر کون سی افتاد ٹوٹنے والی ہے۔ وہ خوش خوش ہمارے ساتھ چل پڑے۔

ہم بازار سے گزر کر ایک عمودی بلندی والے راستے

پر پہنچے پھر اوپر چڑھتے چلے گئے۔ ہانپتے کانپتے فورٹ کی جانب بڑھنے لگے۔ جب ہم اس کے سامنے پہنچے تو انتہائی خطرناک بلندی پر ایک بالکونی نظر آئی، جسے دو لمبے شہتیروں نے تھاما ہوا تھا اور وہ شہتیر بلندی سے زمین تک آئے تھے۔ یہ مکمل طور پر بدھ اسٹائل کی عمارت تھی۔ اُسے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر ایسے تعمیر کی گئی ہے کہ اس چوٹی کی کوئی جگہ خالی نہ رہ سکی۔ جیسے کسی نے اس کو بنا کر بڑی احتیاط سے چوٹی پر رکھ دیا ہو۔

ایک بار میں نے اسے پیچھے کی جانب سے دیکھا تھا تو دل دھک سے رہ گیا۔ خوف کی سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی چلی گئی تھی۔ پچھلی جانب سے نوے کے زاویے پر ہزاروں فٹ کی بلندی پر قلعے کی دیواریں اس طرح چوٹی پر ایستادہ تھیں کہ اگر کوئی چیز قلعے کی کھڑکی سے باہر پھینکیں تو وہ بلا روک ٹوک سیدھی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں جا گرے۔

قلعے کا نام لو تو ذہن میں شاہی قلعے کا نقشہ ابھرتا ہے۔ جیسے کوئی وسیع و عریض قلعہ، اونچی اونچی برجیاں، بڑے بڑے چوبارے، وسیع و عریض بادشاہ کے محلات، فوج بمعہ اپنے ہاتھیوں اور گھوڑوں کے اس میں با آسانی سما سکتی ہو گر یہ قلعہ وہ نہیں ہے۔ یہ بس نام کا ہی قلعہ ہے۔ یہ کسی جانے مانے قلعے کا بچہ نہیں بلکہ پوتا یا پڑپوتا بھی نہیں اس کی خوب صورتی کی وجوہات صرف تین ہیں ایک یہ کہ یہ عمارت کسی بلند چٹان پر ایستادہ ہے دوسری یہ کہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے اور تیسری و آخری وجہ یہ ہے کہ یہ ہنزہ میں ہے اور یہاں سے کریم آباد اور راکاپوشی کا نظارہ قابلِ دید ہے۔

اس میں کچھ چھوٹے اور کچھ بڑے کمرے تھے۔ جن کو اب میوزیم بنا دیا گیا ہے۔ پرانی تصویریں، روزانہ کی ضرورتوں کا سامان، مارخور کے سینگ، موسیقی کے آلات، کھانے کے برتن جو زیادہ تر چینی اسٹائل کے تھے۔ چھتوں پر بھی نقش و نگار تھے۔ روشنی کے لیے دیواروں میں درزیں بنی ہوئی تھیں۔ اوپر نیچے کمرے، جن کو لکڑی کی ساختہ وہ سیڑھیاں آپس میں ملاتی ہیں۔ ہم ان سیڑھیوں پر احتیاط سے قدم رکھتے کہ کہیں یہ زمین بوس نہ ہو جائیں۔ سیڑھیاں تو زمین بوس نہ ہوئیں مگر شاہ جی کی چیخ ضرور گونج گئی۔ وہ اوپر پہنچنے کی جلدی میں توازن کھو بیٹھے۔ پیر رپٹا اور نیچے گرتے چلے گئے۔ شاہد پیچھے تھا اس نے کمال پھرتی سے انہیں سنبھال لیا۔ وہ گرتے گرتے پانچویں سیڑھی پر سنبھل گئے تھے۔ میں اس اچانک حادثے پر ڈر سا گیا تھا مگر جب یہ دیکھا کہ وہ صحیح و سلامت ہیں تو میں ذرا پُرسکون ہوا۔ وہ اب شاہد کا سہارا لے کر کھڑے ہوئے اور خفت مٹانے کے لیے معصوم انداز میں بولے۔ ”میں دیکھنا چاہتا تھا کہ حکام کسی غریب مزارے کو اوپر سے دھکا دیتے ہوں گے تو وہ کیسے گرتا ہوگا۔“

اس جواب نے سب کے ہونٹوں پر ہنسی کی لکیر کھینچ دی۔ میں نے کہا۔ ”شاہ جی یہ غلطی نانگا پربت پر چڑھ کر مت دہرانا ورنہ......“

جواب میں قہقہہ گونج اٹھا۔ اس لیے کہ کسی کو مستقبل میں جھانکنے کی قوت جو نہیں ہے۔

اشفاق بولا۔ ”حکام سیڑھیوں سے نہیں بلکہ بالکونیوں سے نیچے پھینکتے تھے۔“

اس بات پر شاہ جی بگڑ گئے۔ ”تو کیا میں اپنے آپ کو بالکونی سے نیچے گرا دوں۔“

اشفاق نے انہیں ناراض ہوتے دیکھ منت کر کے منا لیا۔ یہ شاہ جی کی خاصیت و شفافیت ہے کہ وہ دل کے صاف، طبیعت کے معصوم اور حد درجہ نرم دل و دوسروں کا خیال رکھنے والے ہیں۔ وہ کسی سے ناراض رہ ہی نہیں سکتے اور نہ کوئی ان سے ناراض رہ سکتا ہے۔ کوئی بات بری لگی تو فوراً کہہ دینے والوں میں ہیں۔ ناراض شخص کو منا بھی لیتے ہیں۔

ہم انہیں سہارا دے کر اوپر بڑھے۔ کچھ کوٹھڑیاں قیدیوں کے لیے تھیں۔ جس پر شاہ جی کو اعتراض یہ تھا کہ گھر کے اندر قیدی رکھے ہوئے تھے، کیا کوئی پردہ داری نہیں تھی۔ گھر کی سو باتیں ہوتی ہیں۔ بادشاہ کبھی ملکہ سے چہلیں بھی کرتا ہوگا تب یہ قیدی بھی دیکھتے ہوں گے۔ شاہ جی کو یہ رنج بھی تھا کہ بادشاہ واقعی بادشاہ لوگ تھے جو اس کال کوٹھری میں رہتے تھے۔ بس ایک فائدہ تھا کہ اوپر بیٹھ کر پورے ہنزہ پر نظر رکھتے ہوں گے۔

”یار شاہد ایک بات تو بتاؤ۔“ شاہ جی نے سانس لے کر کہا۔

”جی فرمائیں!“

”بادشاہ سلامت کا تخت کہاں گیا؟“

”ان کا کوئی تخت نہیں تھا۔“ شاہد نے جواب دیا۔

”اسی لیے تختہ ہو گیا۔“ کہتے ہوئے انہوں نے قدم بڑھا دیے۔

شاہ جی ہلکے سے لنگڑا رہے تھے۔ اپنی چوٹ کا انہیں کوئی درد نہ تھا۔ بس رنج یہ تھا کہ بوسکی کی قمیص پر سلوٹیں آ گئی تھیں، رگڑنے کریز خراب کر دی تھی۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ بادشاہ کا اتنا سامان پڑا ہے۔ اشفاق سے پوچھ کر بتاؤ اس میں کوئی استری ہے یا نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”خدا کا خوف کرو شاہ جی..... وہ بادشاہ تھے کوئی دھوبی نہیں تھے۔“ کچھ توقف کے بعد خود ہی بولے۔ ”دھوبی ہوتے تو اچھا تھا۔ ایسا کچا اور گرتا گھر نہ ہوتا۔“ پھر ڈیرا کے ان دھوبیوں کا ذکر کرنے لگے جنہوں نے کاروبار بڑھا کر پکے گھر بنوا لیے تھے۔

جب ہم سیڑھیاں چڑھتے اوپر بالکونی میں آئے تو کریم آباد کے ساتھ ساتھ راکاپوشی تک کا علاقہ ہمارے قدموں تلے تھا۔ قلعے کا پچھلا حصہ، ایک عمودی گہرائی میں گرتا جاتا تھا۔ ہزاروں فٹ گہری کھائی کے کنارے بنی دیواریں، کچھ دیر کے لیے دیکھنے والے کو لرزہ دیتی ہیں۔

مجھے ڈیرہ اسماعیل خان کے ساتھ، چار ہزار فٹ بلند شیخ بدین کے پہاڑ پر بنا ڈاک بنگلا یاد آ گیا، جو ایسی ہی ایک کھائی کے کنارے بنا ہوا ہے، جس کے نیچے جھانک کر دیکھیں تو درہ پیزو کے خشک پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا نظر آتا ہے۔ انگریزوں کے بنائے اس سمر کیمپ کے کھنڈر میں گزارے تین دن میری زندگی کے اہم لمحات تھے، جب میں ایک اجڑے دیار میں کسی روح کی طرح اکیلا پھرتا تھا۔ میں بادلوں اور ٹھنڈ میں تھا، نیچے گرمی کی حدت سے لوگ پریشان حال تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے کھولتے اور تپتے موسموں سے چالیس میل دور، میں ٹھنڈی ہواؤں اور جھومتی گھٹاؤں میں بادلوں کے سنگ گھومتا تھا۔ اس ڈاک بنگلے میں انگریزوں کا فرنیچر، کراکری، سب اصلی حالت میں موجود تھی۔ چوکیدار کھانا بناتا اور میں ان ویران کھنڈر میں گھومتا یا کسی بادام کے پیڑ تلے ٹھنڈی ہواؤں کا لطف اٹھاتا۔ میرے ساتھی جو اس سفر میں ہمرکاب تھے۔ ڈار سے بچھڑی کونجوں کی طرح اکیلے ہو کر گھوم رہے ہوتے۔ پہاڑ کی دوسری جانب ایک چھوٹا سا قبرستان تھا، جہاں انگریزوں کی قبریں اور قبروں پر ان کے نام کندہ تھے۔ رات کو آگ کے گرد، چاندنی رات میں، میرے ساتھی دیوانہ وار رقص کرتے اور میں جنگلی بوٹیوں کی مہک سونگھتا۔ بغیر چھتوں کی دیواریں، اپنے شاندار ماضی کو یاد کرتی نظر آتی تھیں۔ کئی عمارتوں کی چھتیں زمین بوس ہو چکی تھیں اور کھنڈر ہمیں حیرت سے دیکھتے تھے کہ یہ کون ہے جو ہماری تنہائی میں مخل ہے۔ یہ کھنڈر شاید عرصے بعد کوئی انسانی شکل دیکھ رہی تھیں۔

میں کریم آباد میں بلتت قلعے کی چھت پر کھڑا شیخ بدین کے پہاڑ کو یاد کر رہا تھا اور ہوا کے زور سے ڈر رہا تھا کہ کہیں یہ مجھے اٹھا کر وادی میں پٹخ نہ دے۔ میں نے ذرا پیچھے ہو کر ہنزہ سے پرے راکاپوشی کو دیکھا جہاں سورج کی چمک سے نظریں نہیں ٹھہرتی تھیں۔ سب کہتے ہیں کہ ہنزہ میں سب سے شاندار منظر بلتت فورٹ کا ہے اور میرا خیال ہے کہ بلتت فورٹ سے ہنزہ کا نظر آتا سب سے شاندار منظر نظر آتا ہے۔ پوری وادی آپ کے قدموں تلے بچھی نظر آتی ہے۔ دور دور تک کھیت کھلیان ہیں اور داہنی طرف بلند و بالا پہاڑ اور ان پر پڑی برف جس سے بادل لپٹے نظر آتے ہیں۔ ہم بالکونی سے یہ نظارہ دیکھتے تھے اور شاہ جی ذرا پیچھے ہٹ کر کریم آباد کا نظارہ کر رہے تھے۔

اب ہمیں التت فورٹ جانا تھا۔ شاہ جی ہلکے ہلکے لنگڑا رہے تھے۔ قلعہ میں آتے ہی ان پر یہ افتاد پڑی تھی۔ کمر میں خاصی چوٹ آئی ہوگی لیکن وہ ظاہر نہیں کر رہے تھے اور خود کو ہشاش بشاش ثابت کرنے کے لیے چلتے چلے جا رہے تھے اور مجھے اندازہ تھا کہ یہ وقتی چوٹ ہے اور شاہ جی کچھ دیر میں جیسے اس حادثے کو بھولیں گے تو ٹھیک ہو جائیں گے۔

یہاں سے چند کلو میٹر دور گنیش کے آس پاس، دریائے ہنزہ کے کنارے ایک بلند اور عمودی چٹان پر ہزار سال سے زائد پرانا، التت فورٹ ایک بوسیدہ سی عمارت۔ جسے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ اگلے ہی لمحے یہ زمین بوس ہو جائے گی۔ اس کو دیکھنے میں، اس کے زمین بوس ہونے کا اندیشہ ہمیشہ شامل ہوتا ہے اور یہی اس کا حسن ہے۔ پہلے یہاں میر رہتے تھے پھر یہاں سے وہ قدرے نئے قلعے بلتت فورٹ منتقل ہو گئے۔ التت فورٹ پرانے سلک روڈ پر عقاب کی سی نظریں گاڑے پتھریلی چٹان پر قائم ہے۔ ہم سب اس نئے سفر پر نکل پڑے۔ لہراتی راہ گزر سے ہوتی ہوئی ہماری گاڑی تنگ گلیوں میں اخروٹوں کے درختوں کو چھوتی ایک پرانے گیٹ سے گزرتی ایک گھنے درخت کے نیچے جا رکی۔ گاڑی رکتے ہی کود کر میں نیچے اترا۔ جسم کو جھکولے دے کر پہاڑ کی بلندی پر قائم قلعے کو دیکھا اور شاہ جی کے منہ سے، ماراوے کی بجائے ایک گالی سی نکلی۔ آواز دبی دبی سی تھی اس لیے مفہوم سمجھ نہ آیا۔

نیز سے انکا قلعہ تھا کہ کسی دیو کی پناہ گاہ، کیونکہ کوئی اڑ کر ہی وہاں پہنچ سکتا تھا۔ ہم مٹی میں اَٹی ہوئی

سیڑھیاں چڑھتے جاتے تھے۔ اس دعا کے ساتھ کہ واپس صحیح سلامت گاڑی تک پہنچ جائیں۔ ایک آسمانی بلندی پر بنگلے نے لیے قلعے میں پہلا قدم رکھنے کے لیے ہر کوئی ایک دوسرے کی جانب دیکھتا تھا۔ جانے کون پہلے قدم رکھے تاکہ سب جگہ جانا ٹھیک ہے مگر یہاں آنے کی آخر وجہ کیا ہے؟ جن کو یہ جاپا جا رہا ہے وہ بھی اسے بھول گئے ہوں گے۔ نہ وہ اس کی مرمت کروانے آئے ہیں اور نہ اسے دیکھنے آتے ہیں۔ معلوم نہیں تم یہاں کیا دیکھنے آگئے ہو۔ میں شاہ جی کی باتیں سنتا کہ رستا رہا اور وہ قلعہ دیکھنے کے بہت عرصے میں کوئی اسی طرح کی ودد کرتے رہے۔ گرتی دیواریں، بھربھری چھتیں، سنورش یا لگونیاں، گرتے ہوئے ابواور ریلنگ۔ اس جگہ کی خوبصورتی دیکھنی نہیں تھی بلکہ یہاں سے دریا، ہنزہ کا منظر بڑی تھا یہاں سے دریا، سنگ روڈ اور قراقرم کے پہاڑ مزید حسین نظر آتے تھے۔

ہزاروں فٹ نیچے بہتا دریا اور اس کے پار چٹانوں سے بنی سنگ روڈ، جسے ان پرانے دور میں لے آئی جب میرے یہاں سے اس گزرگاہ پر نظر رکھے آتے جاتے قافلوں سے بیس وصول کرنے ہوتی تھے۔ یہیں کے کنارے شاہی قلعہ تھی اور ہمسے دوری۔ یہاں کوئی ایک انوکھی دنیا آباد تھی جو پاکستان بننے سے پہلے، پاکستان سے آشنا تھی۔ یہاں نہ پاکستان سوسائٹی کی آواز آتی تھی۔ نہ کسی مسلم لیگی رہنما نے اور تو جہ دی۔ ہندو میں کیا ہوا ہے اس کی خبر بھی یہاں کے مسلمانوں کو نہیں۔ صرف ایک دودھی۔ اسلام کی دو جس نے انہیں بھی کے مسلمانوں سے باندھ رکھا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب پاکستان بنا تو ان دنوں میں کے باسی پاکستان سے الحاق کے لیے مشیری راجاؤں سے الجھ پڑے۔ ہر وقت ہنزہ کا گورنر قراقرم اجاڑ سے چھٹنا اور پاکستان کی جھولی میں ڈال دیا۔

آزادی کسی کو تحفے میں ملی اور کسی ایک علاقوں نے ہاتھ بڑھا کر آزادی کو اپنے ہاتھوں سے چھینا۔ ان لوگوں نے بھی چھین کر آزادی لی اس لیے میرے لیے محترم ہیں۔ پاکستان کے دیگر علاقوں کی عوام سے زیادہ محترم۔ میں ایک بالکونی سے نیچے گرتی چٹانی گہرائی کو دیکھ کر لرز رہا تھا اور گائیڈ مجھے تاڑ رہا تھا کہ میرا پاؤں پھسلا تو میرے ہاتھ پھینک کر موت کی سزا دے دیتے۔ یہ بوسیدہ، لرزتے در و دیوار کن کن واقعات کے چشم دید ہوں گے؟ میں یہ غم تصور سے ان واقعات کو دیکھ رہا تھا، مجھے خیالوں میں

صبح دیر تک سوتے رہے۔ میری آنکھ کھلی تو ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ آج واپس نکلنا جانا ہے۔ شاہ جی سے کل دعدہ کیا تھا کہ ہم ہنزہ دوبارہ ضرور آئیں گے مگر دل کہہ رہا تھا کل تو کل آج یا نہ آئے، آج جی بھی ایک اور دن کے لیے رک جائے ہیں۔ یہ میری خواہش تھی اگر میں اکیلا ہوتا تو ایک نہیں کئی دن کے لیے یہاں رک جاتا مگر میں تنہا کسی کو اپنے ساتھ باندھ کر کب سکتا تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد، میں اکیلا ہوٹل کی دھوپ میں چہل قدمی کرتا ہوا نکلا۔ پورا منظر میرے سامنے تھا۔ وقار راکا چوٹی کا نظارہ، جس سے میں گھر رہا تھا۔ نہ جانے اب کب آؤں گا۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے تو جانے کس انداز میں مجھے بلائے گے، جو میں دوبارہ یہاں پہ آسکوں۔ دو سال بعد میں شمال کا سفر کرنے مستنصر حسین تارڑ صاحب کے ساتھ یہاں آیا۔ ہنزہ تک شاید اور استغفار تو تھے مگر شاہ جی نہ تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

ایسا ہی ہوا ہے ایک بار جو ہنزہ آتا ہے پھر وہاں جانہ سکا۔ اب تو میں پاکستان سے آتا رہا ہوں۔ چند دنوں کے لیے وطن جاتا تو ہوتا ہے مگر اس کے سفر کا خیال بس خیال بن کر رہ جاتا ہے۔ محرابِ التٹ ارادہ بندھتا ہے تو اُمید بھی بندھ جاتی ہے کہ یہ سفر دوبارہ شروع ہوگا اور التٹ اللہ گورنمنٹ کے تاریخی بھی اس سفر میں ساتھ ہوں گے میری گورنر کے ہمرکاب۔

رات دیر تک ہنزہ میں ہوٹل کی چہت پر کھل تنہائی میں دیر تک ستارے دیکھتا رہا۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی قلعہ کریمہ سے باہر نکل آیا۔ شاہ جی سو رہے تھے۔ کریم آباد کے گھروں سے دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں اکیلا دور تک چلتا چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو سب میرا انتظار کر رہے تھے اور اسی وجہ سے ہنزہ سے نکلنے میں دیر ہوگئی تھی۔ ایک ایک کر کے سب گاڑی میں بیٹھے اور ہنزہ سے سفر شروع ہو گیا۔ راکا پوشی کے سامنے سے گزرے اور جب میں الوداعی نظروں سے اس کے عیاں حسن کو دیکھ رہا تھا، تمام لمحوں میں میرے تمام ساتھی حزے سے خراٹے لیتے خواب میں ہو رہے تھے۔

ہم گلگت پہنچے تو سورج بلندی سے مغرب کی جانب جھکا جا رہا تھا اور میر ہارڈ، اپنے چہرے پر کسی اجنبی کو بجائے تشویش لیے، ہوٹل کے باہر ٹہل رہا تھا۔ ہوٹل کے اندر سے شور سُنا تو اندر گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔ "اللہ خیر کرے! کچھ ہوا ضرور ہے۔ کوئی چھپا تو نہیں ہے؟"

میں نے شاہ جی کی طرف غور سے دیکھا تو وہ خاموش ہو گئے۔

شیر بانو نے ہم کو دیکھا تو اس کے چہرے پر سکون کی ایک لہر اپنی دائمی مسکراہٹ کے ساتھ پھیلتی چلی گئی۔ "جلدی سے کھانا کھائیں اور پھر چلتے ہیں۔ شیر بانو کھاتے ہوئے بولا۔

"پھر کہاں چلتے ہیں۔" شاہ جی تشویش بھرے انداز میں بولے۔ ان کے ذہن میں نہ جانے یہ کیسے آگیا تھا کہ ہر ہوٹل میں چھاپا مارنے پڑتا ہے۔

اپنی کلاشی پر بندوق کھڑی میں جام دیکھتے ہوئے شیر بانو نے کہا۔ "میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی ہمیں طور جانا ہے اسی لیے آپ کا انتظار ہو رہا تھا۔"

"کیا ٹورسٹ رولز آگئے ہیں؟" شاہ جی ابھی تک چھاپے والی پریشانی سے باہر نہیں نکلے تھے۔

"نہیں۔ آپ کی یونیورسٹی سے اسٹوڈنٹس ابھی ہیں سو ابھی پہنچے ہیں اور کل شاید نکلیں گے۔ شیر بانو کے جواب پہ میں چونک پڑا۔

"تجھے اسٹوڈنٹس میں اور تجھ کو ان سے؟"

اس سے پہلے کہ شیر باز جواب دیتا، ہمارے فارمیسی کلینکل کا چہرا اسی سمت، ہوٹل کے گیٹ سے باہر آتا اور جھک کر سلام کیا اور اپنی عین عاجزی کے تحت میرے گھٹنے چھونے

کے لیے جھکا۔ میں نے راستے میں ہی اسے تمام کر لگے لگا لیا۔

وہ جانتا تھا کہ فارسی کے تین اسٹوڈنٹس ہیں اور ظاہر سلیم صاحب انہیں لے کر مجذوب جا رہے ہیں۔ نجانے ظاہر سلیم سے توقع بھی کیوں۔ وہ کوئل یونیورسٹی کی کوئی ایک پرانی سی بس لے کر بھی بیٹھ سکتے تھے اور کھٹارا بس کیا کم تھی کہ اس میں بھی ایک اور کھٹارا بس جوڑ دی گئی۔ میں نے شیر باز کو باہر چھوڑا اور محبوب کے ساتھ ہو لی کہ اندر اپنے دوست ظاہر سلیم اور اسٹوڈنٹس سے ملنے کے لیے آگیا۔ دیکھا کہ ظاہر سلیم صاحب ایک شہنشاہ کی مانند صوفے پر بیٹھے ہیں اور تمام اسٹوڈنٹس ان کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان میں کچھ بیٹھے اور کچھ کھڑے ہیں، کل کے مجذوب پاس کے پروفیسر بنا ہی کر رہے ہیں، سیٹھ رحمان سے ملنے کے بعد وہ رام کا تھا۔ مجھے دیکھ کر سب بہت خوش ہوئے۔ میں بھی شاد ہوا کیونکہ اتنی دور اچانک میرے اپنے میرے سامنے بیٹھے تھے۔

ظاہر سلیم مجھے مجذوب پاس لے جانا چاہتے تھے مگر آدھے اسٹوڈنٹس میرے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ ایک دلچسپ صورت حال بن گئی۔ اسٹوڈنٹس کو جب معلوم ہوا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں تو بہت سے میرے ساتھ تھمنے ہونے کے لیے بے تاب ہو گئے۔ میں نے اسٹوڈنٹس کو اکٹھا کر دیا کہ جس کے ساتھ آنا چاہے، اپنی گاڑی لائے اور ہمارے پاس بیٹھے بھی ایسے نہیں ہیں۔ (کافی دنوں بعد انہی اسٹوڈنٹس کے ساتھ لمبی گپ شپ میں انہوں نے بتایا تھا کہ ہم نے بھی ایک دوسرے کی چوری پکڑنے کی کوشش کی تھی۔)

محبوب، آخر کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ ٹھہر جائے گا۔ بہانہ اس نے یہ بنایا کہ اسے سانس کی تکلیف ہے اور مجذوب کی آب و ہوا اسے راس آئے گی۔ آخر قصہ یہ ہوا کہ صرف محبوب ہمارے ساتھ ٹھہر گیا۔ محبوب خوشی سے اڑا جا رہا تھا۔ محبوب بہت زیادہ بولنے والا مگر سادہ لوح اور بہت خدمت گزار انسان ہے۔ برداشت و رواداری کو دیکھتا رہتا اور بار بار پرچتا کہ کوئی کام ہے۔ میرے آفس میں گریڈ فور کا ملازم تھا اور اسے اپنے بھائیوں کی طرح دیکھتا تھا اور اس کی ضرورتوں کا خیال رکھتا تھا۔ نجانے میں سب اس کا خیال رکھتے تھے۔

اب ہماری ہم جماعتی۔ شاہد، اشتیاق، محبوب، شاہ جی، شیر باز اور ظاہر سلیم جو ہائے جانے والی ہم کا حصہ تھے۔ شاہد کی محبوب کو لے کر بھاگم بھاگ، بازار سے کھانا بنانے کا سامان لینے چلے گئے۔ واپسی پر گھی، چینی، چائے، دودھ، چاول، گوشت، پھل، ڈبل روٹیاں، انڈے اور بہت کچھ تھیلوں میں بھر کر جیپ میں ٹھونس لائے۔ میں نے اپنے کے جائزہ لیا، جس میں زندگی میں پہلی بار سونا تھا۔ سلیپنگ بیگ اور دوسرے سامان کو یک کیا۔ شاہد جی نے "گے ڈے" کہہ کر سامان، جو پیڈی سے خریدا تھا، وہ بھی ساتھ رکھ لیا۔ جن میں اونی ٹوپیاں، برفانی دستانے، اونی جرابیں، گم شیکٹ اور بھی بہت کچھ جو ہمارے لیے ضروری پایا گیا۔ جب ہم آخر میں نیری سیڈ سے واپس آئے تو شام ہی نے اپنا سارا یا سامان مفت میں ہوٹل کے بیروں میں بانٹ دیا تھا۔ میرے پوچھنے پر فرمایا تھا کہ سامان ہوگا اور دے کر کیا کرنا ہے۔ سی ٹی ڈی نہ سے کھا اس اور نہ ہے گی باہر ہی۔ ایران کا قرض تو مثل تھا اور نہ بعد میں وہ نیری سیڈ کو یاد کرتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔

ہماری جیپ جنگل روڈ پار پے ہلی سے گزر رہی تھی تو سورج کی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر پھیلی پڑ رہی تھیں۔ بلند و بالا پہاڑ سدیوں سے اپنی جگہ مستقل جڑا ہوا سے ایستادہ مدد اٹھائے، سینہ تانے کھڑے تھے اور ہماری جیپ ایک چیونٹی کی مانند ان کے بیچوں بیچ گزر رہی تھی۔ فولی کے بلوں کے پیلے سے گھنی پیلی جڑ رہی تھی۔ جیری اور خوبانی کا موسم ختم ہو رہا تھا اور سیب پکنے کے قریب تھے۔ ہم اس سبک زدہ ماحول میں، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اپنے چہروں پر محسوس کرتے، وادی نیل کا حسن دیکھتے رہے۔

شفاف سمندر سے دس ہزار فٹ کی بلندیوں پر خنکی، برفانی چوٹیوں میں گھری، سرسبز اور حسین خطہ وادی ہر ایک کو اپنے حسن کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ شفاف پانیوں کے بہتے دھارے، بیلگوں اور سبز چھلیں، آبشاریں اور گلیشئرز سال پرانے درختوں سے مزین جنگلات، ایک مختلف حسن لیے ہوئے ہیں جس نے ایک بار نظر دیکھا، اس کی خوبصورتی ہمیشہ کے لیے دل پر نقش ہو گئی۔

جیپ ہائیں جانب ایک درّے کو موڑی اور میں اسی لمحے، درے کے بار پہاڑوں نے لیا، شاہراہ ریشم کا سایہ فتہ دیکھ رہا تھا۔ جیپ جیسے ہی تنگ درے میں داخل ہوئی تو شور کرتے پانیوں کی گونج ہماری سماعت سے ٹکرائی۔ علتر کے پہاڑوں کا ذخیرہ لیے ایک نالہ تیزی سے نیچے اترتا دریائے ہنزہ کی جانب دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

درّے میں سائے لمبے ہوتے چلے گئے اور چوٹیوں پر خنکی کرنیں گلابی ہونے لگیں اور ان میں سرخ رنگ گھلنے لگا تھا۔

ہائیں جانب علتر نالہ کے پانی ایک گہری گونج سے پیچھے آرہے تھے۔ محبوب جو اب تک مسلسل بولے جا رہا تھا، ایک گہرے سکوت کے پیچھے، تجسّس نظروں سے پانیوں کو دیکھتے ہوئے کانپ رہا تھا۔ ایک جھٹکے کے کنارے رک کر ہم نے اس کا ٹھنڈا ٹھار پانی پیا۔ محبوب کو کچھ دلاسا دیا۔ میں این لحات کو اپنی روح میں اترتا محسوس کر رہا تھا اور اپنی کم مائگی کا احساس ہو رہا تھا کہ میرے پاس وہ الفاظ کیوں نہیں ہیں، میرے قلم میں وہ طاقت کیوں نہیں ہے جو ان لمحات کو قابو پر بیان کر سکے۔ میں زبان میں ایک عجز سا محسوس کر رہا تھا۔ "انہائی دلا ربا کہنا ہاں۔"

ہماری جیپ دریا بہ دوڑنے لگی۔ ایک موڑ کا ہی تھا کہ اچانک پہاڑی دامن، بلندیوں سے لے کر پتھریوں تک، ایک عجیب انداز میں ایک عجیب ہی ڈوبتی چلی گئی۔ تاریکی کسی کالی آندھی کی طرح، صرف ایک موڑ کا نتیجہ تھا، نازل ہو گئی۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ دنوں طرف کھڑے بلند و بالا پہاڑوں نے سورج کی باقی ماندہ روشنی روک کر اندھیرے کی چادر پھیلا دی تھی۔ شاہ جی اور محبوب اس اچانک اندھیرے سے گھبرا گئے۔ شاید مدت بعد ہی اس طرح آئی ہو۔ آپ زندگی کے سفر کا کوئی موڑ کاٹیں اور اسی طرح کی گھپ اندھیرے میں ڈوبتے چلے جائیں۔ اس گھپ اندھیرے میں، صرف ظاہر سلیم کے سفید جھاگ اڑاتے بال نظر آرہے تھے جو ہاتھوں کی طرح ہمکا رتے، ہماری جانب لپک رہے تھے۔ یہ بھی کہو کہ ہم ہی اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اندر کمرے کے پہاڑ آسیبوں کی مانند ہماری جیپ پر نظر رکھے تھے۔ سڑک آہستہ آہستہ، بلند ہو رہی تھی۔ جیپ میں مکمل خاموشی تھی، ماسوائے انجن کی مسلسل گھرگھراہٹ کے۔ میں بھی دھیرے دھیرے خوف زدہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ شاید میں بھی ہمارے چہروں کو دیکھنے کی کوشش کرتے اور جب کچھ نظر نہ آتا تو شاکی نظروں سے میری جانب گھورتے۔ انہیں سڑک کا صرف وہ حصہ نظر آرہا تھا جو ہیڈ لائٹ کی زد میں تھا۔ کم از کمی خطرہ کہ موڑ کاٹے، کوئی تکشف اور جان لیوا پتھر گر جائے۔ ان کی ہوا کا کی اندازہ ہمیں دوسرے دن ہوا جب ہم واپس اسی راستے سے گلگت جا رہے تھے۔ وہاں ہم سے ظاہر کی ماہرانہ ڈرائیونگ کی بہت تعریف کی۔

ہم ایک مقام میں داخل ہوئے جہاں دور اور پہاڑوں کی دھلوانوں سے کہیں کہیں روشنی، کوئی قمقمہ جلتا، دکھائی دیتا تھا۔ اس سے ہمیں یہ تسلی ہوئی کہ ہم کسی ویرانے میں نہیں بلکہ کسی آبادی کے قریب ہیں۔ شیر باز بولا کہ یہ علتر کا گاؤں ہے۔

ہماری جیپ کسی سیدھی علاقے سے گزر رہی تھی۔ آگے دائیں جانب ایک روشنی دکھائی دی تو ہم اس کے قریب جا رکے۔ وہ ایک کھوکھا سا ہوٹل تھا جو شاید کسی ٹرک ڈرائیور کا ہی ہوگا۔ شیر باز اس سے اپنی مقامی زبان میں کوئی معلومات لیتا رہا۔ وہاں سے ہمیں تھوڑے فاصلے پر جانا تھا۔ ہم اطراف میں مکمل اندھیرے میں کھڑے تھے۔ چند قدم ہی بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم کچا مٹیالی آبادی کے نیچے کھڑے، کھیک ساٹھ کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

وہاں سے ہم کو راستہ ملے گا۔ ہم نے ایک عدی کنارے جا رکے۔ پر کرام ہائی ناک کے قریب ہمیں لگا تھا۔ مارچ کے روشنیوں میں بھی ہم ہر قدم پھونک کر رکھ رہے تھے۔ عدی کے پانیوں کا بہاؤ ہمیں سنائی دے رہا تھا۔ میں نے عدی کے ٹھنڈے پانیوں سے منہ دھویا۔ محبوب نے ان پانیوں میں کپک کی بوتلیں رکھ دیں، جو کچھ ہی دیر میں ٹھنڈی ٹھار ہو گئیں۔

ساتھی پہاڑوں کی جانب بلند کی اطلاع کی دیوار تھی۔ اس دیوار کی آڑ میں محبوب اور شاہ جی چولہا بنانے میں جت گئے۔ ظاہر اور شیر باز جیپ کے قریب گئے اور اندر سے ایک کھلونے نالے اور گھپ اندھیرے جنگل سے لکڑیاں لانے لگے۔ اشتاق اور شاہد بھی نالے میں مصروف تھے۔ ہر ایک کچھ نہ کچھ کر رہا تھا، سوائے میرے جو چولہا بنانے کے بعد، عدی کے اور کر دمٹی اڑا رہا تھا۔ آسمان پر بلکے بادل تھے، اور کہیں کہیں ستارے بھی نظر آرہے تھے۔

لکڑیاں آگ لیتی تو ہم نے ان کو ایک باجس کی تیلی دکھائی اور وہ بھڑک اٹھیں۔ کچھ دیر میں وہاں پر بڑا سا تیار ہو رہا تھا اور ہم آگ کے اردگرد بیٹھے خوش اور خوش ہو رہے تھے۔

کھلے آسمان تلے خلاؤں میں ہمارے قہقہے تھے اور جب قہقہے تو عدی کے پتے بولنے لگتے۔ میں ذرا دیر کے لیے اٹھا، سکوت اور اندھیرے میں ٹہلتا ہوا، آگ سے فاصلے پر ایک درخت سے ٹیک لگا کہ کھڑا ہو گیا۔ یہاں مکمل خاموشی تھی اور چار جانب گھپ اندھیرا تھا اور دور ایک الاؤ

روشن تھا، جہاں سے کبھی کبھار کوئی قافلہ تیتر ہوا میرے جانب آتا تھا۔ میں ایک اور دنیا میں گم، اس تنہائی اور خاموشی میں مکمل غرق ہو چکا تھا۔

اچانک ایک چٹکلہ نما آواز ہوا کے دوش پر تیرتی میری جانب آئی۔ میں چونکہ اٹھا۔ دوبارہ وہی آواز آئی۔ کسی کے لیے گوش پر آواز ہونے جیسا معلوم ہوا کہ محبوب حنادی کمرہ اٹھا کر کھانا تیار ہے اور سب بیٹھ چکا ہیں۔ پہاڑوں میں آواز کی بازگشت نے محبوب کی آواز کو دوچند کر دی تھی۔ محبوب کو آرڈر دے رکھے تھے۔ اس کی پکار جہاں دیکھنے والی تھیں، جیسے کسی دیس کے شہزادی ہے۔ بھائی دور دراز علاقوں میں، جہاں سے آئے تھے، ہمارے آنے تک پہنچ گئے ہوں گے۔ ہم کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں، کچھ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ ہم کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں، کچھ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ ہم کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں، کچھ بھی نہیں جانتے ہوں گے۔

ہم ہنسی خوشی لیے لائے تھے۔ چودہ تیتروں میں سے ساتھ تھے مگر ساتھ کھانا نہ کھانا محبوب کے صورت حال بھانپ لی شاید ذہن پڑھنا جانتا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ جیپ میں سوئے گا، کسے ہی اکیلا ایک گدا، مکمل اور بھرے لے کر جیپ میں گھس گیا۔ ظاہر ہے اس کے لیے چین فولاد کر دیں۔

میں اپنے خیمے میں رینگتا ہوا داخل ہوا تو ایک نئے تجربے سے روشناس ہوا۔ اس تجربے سے گزرنے کا موقع بھی تھا۔ میں اور شادی بخش دو ہی تھے۔ کوئی بھی تجربہ اگر اپنے دل کے لیے تاجر آگہی و شعور ہوتا ہے۔

میں نے پہلے ہمزاد بچھایا اور پھر اس پر سلیپنگ بیگ کھول کر رکھا۔ اس کے ..... بعد اندر اپنے قدم بڑا پھیلا کر ڈنگری پہن رہا ہوں۔ سر کے نیچے تکیہ نما بیگ رکھا اور سیدھا لیٹ کر خیمے کی چھت گھورنے لگی۔ اندر باہر کی نسبت سردی کا احساس کم تھا۔ سر کے نیچے بیگ میں اولاد ہوا بھری تھی، جس کی مسلسل تک تک مجھے بے آرام نہیں کرتی تھی۔ میں بچپن سے اس تک تک کا عادی تھا۔ میرے مرحوم والد صاحب ہمیشہ سرہانے کھڑی رکھتے تھے اور اس کی بالوں کو آواز میری نیندوں کی ساتھی بن جاتی تھی۔ شاہ بخش دونوں ہاتھ سر تلے رکھے کسی گہری سوچوں میں گم تھے۔ ایک خیمے کی چھت تلے ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں کے سمندر میں ڈوب ابھر رہے تھے اور پھر ہم اسی خاموشی میں نیند کی وادیوں میں اترتے چلے گئے۔

رات بھر ہوا سیٹیاں بجاتی، ہمارے خیمے پر دستک دیتی رہی۔ ساتھ بہتی ندی کے پانیوں کا بہاؤ اور اس کی مترنم آواز کانوں میں آتی رہی۔

موذکر ہم پھر باتوں میں لگ گئے۔

ہم باتوں کی روشنی میں بے فکر جیتے، ظاہر ہے غمال ہی کے ان طاقوں کے قصے سن رہے تھے، جہاں چراغ سحر کر چکا تھا۔ وہ اس ماحول کا عادی تھا جو اذیت دہ تھا مگر اس کے لیے مانوس تھا۔ ہم کہاں پہنچے، یہ واقعات کس رخ پر چلے، جن کا محبوب پر اہمی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ہم ایک انجانی جگہ بیٹھے تھے مگر آسانوں پر نظریں اٹھائے تاروں سے بھرے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ شاید یہاں پہر نہیں آتا مگر آنے کو تکلف فضا اور ماحول میں ہوا ہوگا۔

ہم نہیں جیسے لائے تھے۔ چودہ تیتروں میں سے ساتھ تھے مگر ساتھ کھانا نہ کھانا محبوب کے صورت حال بھانپ لی شاید ذہن پڑھنا جانتا تھا۔ اس نے اعلان کر دیا کہ وہ جیپ میں سوئے گا، کسے ہی اکیلا ایک گدا، مکمل اور بھرے لے کر جیپ میں گھس گیا۔ ظاہر ہے اس کے لیے چین فولاد کر دیں۔

میں اپنے خیمے میں رینگتا ہوا داخل ہوا تو ایک نئے تجربے سے روشناس ہوا۔ اس تجربے سے گزرنے کا موقع بھی تھا۔ میں اور شادی بخش دو ہی تھے۔ کوئی بھی تجربہ اگر اپنے دل کے لیے تاجر آگہی و شعور ہوتا ہے۔

میں نے پہلے ہمزاد بچھایا اور پھر اس پر سلیپنگ بیگ کھول کر رکھا۔ اس کے ..... بعد اندر اپنے قدم بڑا پھیلا کر ڈنگری پہن رہا ہوں۔ سر کے نیچے تکیہ نما بیگ رکھا اور سیدھا لیٹ کر خیمے کی چھت گھورنے لگی۔ اندر باہر کی نسبت سردی کا احساس کم تھا۔ سر کے نیچے بیگ میں اولاد ہوا بھری تھی، جس کی مسلسل تک تک مجھے بے آرام نہیں کرتی تھی۔ میں بچپن سے اس تک تک کا عادی تھا۔ میرے مرحوم والد صاحب ہمیشہ سرہانے کھڑی رکھتے تھے اور اس کی بالوں کو آواز میری نیندوں کی ساتھی بن جاتی تھی۔ شاہ بخش دونوں ہاتھ سر تلے رکھے کسی گہری سوچوں میں گم تھے۔ ایک خیمے کی چھت تلے ہم دونوں اپنی اپنی سوچوں کے سمندر میں ڈوب ابھر رہے تھے اور پھر ہم اسی خاموشی میں نیند کی وادیوں میں اترتے چلے گئے۔

رات بھر ہوا سیٹیاں بجاتی، ہمارے خیمے پر دستک دیتی رہی۔ ساتھ بہتی ندی کے پانیوں کا بہاؤ اور اس کی مترنم آواز کانوں میں آتی رہی۔

تقریباً تین بجے گئے سویا ہوا ہوں گا کہ آنکھ کھل گئی۔ شادی بخش اپنے خیمے کے پردے بند کر رہے تھے۔ میں سمجھ رہی تھی لیٹا رہا۔ سوچوں میں گم رہا کہ انسان کوئی ارادہ باندھ لے تو رب کی مرضی شامل حال ہو جاتی ہے۔ میں نے ایک سفر نامہ پڑھا اور پھر اس کی تقلید میں کہاں سے کہاں آ گئے۔ آوارگی تو پہلے بھی میرے اندر تھی۔ بس مجھے کوئی راستہ چاہیے تھا۔ یہ راستہ مجھے تارڑ صاحب کے سفر ناموں نے دیا تھا اور اب میں کہ رستے والا بن گیا۔

سوچوں نے خیمہ کا راستہ روکا تو میں آہستگی سے سلیپنگ بیگ کی قید سے باہر نکلا، ٹارچ جلا کر جوتے پہنے اور خیمے کی زپ کھول کر باہر نکل آیا۔ میں حال ہی آنے کا منظر دیکھنا چاہتا تھا اور یہ بھی خواہش تھی کہ کسی جلدی میں ہو کے طلوع ہوتے سورج کو دیکھوں۔ باہر نکلا تو سرد ہواؤں نے میرا استقبال کیا اور گویا گلے ملی۔ پورے وادی اندھیرے میں ڈوبی تھی مگر بلند پہاڑوں کی چوٹیاں ہلکی سنہری تھیں۔ ایک سناٹے اور خاموشی، جہاں صرف ہواؤں کے جھلے کا ہی سرسر اور تاروں کا بھرپور احساس، دل سے روح کے سفر میں اترتا چلا گیا۔ سچ کہا گیا کہ سفر جیسا بھی ہو، تازہ دم کرتا ہے، خلاف ہوا ہیں، ساز و رگ نوک خار جانب تیری پکارتی ہیں۔

یہ سناٹا قریبی رات میں اندھیرے کی وجہ سے نہیں، دیکھ سکا تھا۔ میرے نیچے کی وادیں جانب ایک سیاہ، گھنا جنگل تھا جو وادی کے بہتا چوتھی تک پھیلا ہوا گیا تھا۔ یہیں سے کل رات ظاہر اور شیر باز لکڑیاں کاٹ کر لائے تھے۔ میرے داہنے گرجتے پانیوں کی چوٹی چوٹی نہ ایں تھیں، جو متزم، میں بھی بہتی ندی بھی تھیں۔ میرے بائیں ایک بلند پہاڑ تھا اور اس کی چوٹیوں پر برف سفید برف، ہلکی سنہری بھی۔ پوری وادی میں سفید اور پیلے پھول در تک پھیلے تھے۔ دور پہاڑ کی بلند، سرکش ڈھلوانوں پر برف گرتی رہی تھی جسے ابھی تہ جمنے لگے تھے۔ میں نے کل رات بھر ہوا میں سائیں سائیں کی آواز سنی تھی، جیسے وہ پہنے ابھی اپنی اڑان بھریں گے۔

میں بھٹکا ہوا جنگل میں چلا گیا۔ یہاں اندھیر نزدیادہ تھا اور پرندے، اپنی اپنی بولیوں میں ایک دوسرے کو بیدار کرتے تھے۔ میں پہاڑ پر چڑھتا چلا گیا۔ جنگل میں سائیوں اور روشنی نے مل کر مجھ سا ں باندھ رکھا تھا۔ بلند اور حد درجہ بلند چناروں کے درختوں کے اوپر سے نیلگوں شفاف آسمان کی چادر تنی تھی۔ اب سورج بلند ہو کر اپنی کرنیں آہستہ آہستہ زمین پر پھینکتا چلا جا رہا تھا۔ ہوائیں درختوں کے خوں سے لیف لیٹ کر چل رہی تھیں۔ تنہائی نے ایک ضمد ار پیدا کر دیا تھا۔ ایک چھوٹی ندی میرے بیروں سے آرام اور سرمستی سے بہہ رہی تھی۔ میں اس پورے منظر میں اکیلا تھا مگر پھر ایک جرواہا مل ہوا، جو اپنی بھیڑ بکریوں کو اور کسی چرا گاہ کی طرف لیے جا رہا تھا۔ میری ان بکریوں کے ساتھ کی تصویر اتنے برسوں بعد میرے سامنے رہی ہے اور مجھے ماضی میں لے جاتی ہے۔ وہی مناظر وہی پہاڑ پہ لگے ہیں، شادی بخش اور دیگر دوستوں کی یاد دلاتے ہیں۔

اس منج کا ذہب کا ستاری منظر اور نظر آیا تھا۔ ایسا منظر اس سے پہلے میں نے نہیں دیکھا تھا۔ برف پوش چوٹی آبادی کا شہر بلا آنے کا تھا کہ وجود خدا وندی کے لیے نصوص سوچ کا ذاتی ہے۔

وہ حسین منظر دھیرے دھیرے صاف ہوتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بلند پہاڑوں کی چوٹیاں مکمل سنہری ہو گئیں۔ میں واپس اترا تو کیمپوں کی آبادی تک آرام آرام سے دیکھا کہ محبوب ایک دیگچے میں پانی بھر رہا ہے جو چولہے پر گرم کرنے کے لیے رکھ رہا ہے۔ اے آس پاس کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے ہم سب اس سے خوش ہوں۔ مجھے اس سے ہمدردی کے ساتھ پیار بھی تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ایسا کرے، مگر اس کو یہ سب کرنے سے روکنا دھیرے دھیرے میں بھی نہیں چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ سب لوگ نیندوں سے بیدار ہونے لگے۔ ہر ایک باہر نکل کر ایک لمبی انگڑائی لیتا اور پھر اسی منظر میں گم ہو جاتا۔ شادی، اپنے مردانی لباس میں نیند نکلے۔ جاڑوں جیکٹ پہنے کر پہاڑوں کو دیکھا۔ چند قدم ہی پر گلگت گرم ہو گیا تھا۔ "مارا ہے"

وہ بلند یوں، پھولوں، نیلے آسمان سے بہت متاثر دکھائی دیتے تھے۔ ایک وسیع و عریض سبز وزار میں ان کے لیے کوئی خطرہ نہ تھا۔ نہ کوئی کھائی اور نہ کوئی بلندیوں کو جاتا راستہ اور نہ کوئی خطرناک مقام ان کے ماروے کا سلسلہ جاری رہا جب تک محبوب نے ناشتا تیار ہونے کا داد یا نہیں کیا۔

ناشتے میں انڈے اٹھے، ڈبل روٹی کے سلائس، ساتھ میں جام اور مکھن تھا۔ اس ناشتے سے مجھے اتنی توانائی ملی کہ میں کہہ سکتی ہوں کہ آسانی سے مکمل چک چاند پانچ کھنے چل کر جا سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد سامان لپیٹا گیا، محبوب اور طاہر نے جیپ کو چمکایا اور ہم خوش و خرم، ملتر جھیل کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ انسان مستقبل میں جھانک نہیں سکتا۔ ہم بھی مستقبل کے واقعات سے بے خبر ملتر کی طرف بڑھنے لگے۔ ملتر کی دو جھیلیں مشہور ہیں۔ ایک بلند پہاڑوں کے دامن میں، ملتر نالے سے جڑی ہوئی اور دوسری اس سے تقریباً ایک گھنٹے کی پیدل مسافت پر ہے۔ نالے کے قریب جھیل اوپر والی سے چھوٹی ہے اور پانی اس کے حیران کن حد تک سبز جھلک دیتے ہیں۔ اوپر بڑی اور نیلے رنگ کے پانیوں کی جھیل ہے، جیسے کسی نے بہت سا نیل اس میں گھول دیا ہو۔ ہم صرف سبز جھیل تک جا رہے تھے کیونکہ آج رات ہی ہمیں واپس گلگت پہنچنا تھا۔

ہم ملتر وادی سے قدرے نیچے اترے اور اب ہم ملتر نالے کی بائیں جانب ہچکولے لیتی جیپ میں سفر کر رہے تھے۔ جہاں تک جیپ جا سکتی تھی، وہاں جیپ پر جانا تھا اور آگے تک کا سفر ہمیں پیدل طے کرنا تھا۔ کچھ دیر میں ہم نے لکڑی کا بنا ایک انتہائی مخدوش پل پار کیا اور اب نالہ بڑے سکون سے ہماری بائیں جانب بہنے لگا۔ ہم پتھریلے راستے پر چل رہے تھے جس کے دونوں جانب پتھروں سے بنی ایک دیوار تھی جو پار کے منظر کو چھپاتی تھی۔ جب کبھی دیوار کی بلندی کم ہوتی تو پار سر سبز لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔ پتھریلی سڑک کے باعث ہم اچھل اچھل کر ایک دوسرے سے ٹکراتے اور قدرے بے آرام ہو رہے تھے۔

جیپ کے تمام مسافر خاموش تھے، سوائے محبوب کے۔ وہ جیپ کے پیچھے لٹکا لگاتار بول رہا تھا۔ نہ ہم نے غور کیا کہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ اس نے ضرورت محسوس کی کہ ہمیں یہ بتائے کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ پر ہمیں یہ معلوم تھا کہ اس کا موضوع نہ تو یہ لہلہاتے کھیت تھے، نہ بہتے جھرنے اور نہ آسمان کی بلندیوں کو چھوتے چنار کے درخت، جو دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ وہ ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا، جو دن رات ایک کر کے اپنے اور اپنے بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں۔ نہ بہار کے کھلتے پھول ان کا دل لبھاتے ہیں اور نہ ساون کی بارش اس کے احساسات میں کوئی خوشی لاتی ہے۔ نہ آسمان پر بکھرے رنگ ان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور نہ پرندوں کی بولیاں ان کے دل کو گدگداتی ہیں۔ یہ لوگ زندگی کے راستے پر اپنی لاش اپنے کاندھے پر رکھے گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی وقت آ پڑے تو مدد طلب نظروں سے دوسرے کی جانب دیکھتے ہیں۔

ایک بار محبوب کی ٹانگ ایکسیڈنٹ میں ٹوٹ گئی۔ میں اس کے گھر عیادت کے لیے گیا۔ کچی مٹی سے بنا ایک کمرا جس میں وہ چارپائی پر پڑا تھا۔ اس کا پورا کنبہ کچے صحن کے کونے میں بنے ایک کچے چولہے کے نزدیک بنی کچی چار دیواری میں دبکا، مجھے آسمان سے اترے فرشتے کی طرح دیکھ رہا تھا۔ محبوب کی آنکھوں میں آنسو میرے بہتے آنسوؤں سے کم پڑ گئے۔ میں اپنے آنسو چھپانے کے لیے اس سے لپٹ گیا اور اس کے منہ سے میرے لیے دعاؤں کا ایک دھارا نکلا جو تھمتا نہیں تھا اور نہ میں تھمنے دیتا تھا۔ وہ منظر آج بھی میری نظروں میں مجمد ہے اس وقت جیپ میں بیٹھے محبوب کے چہرے کو دیکھ کر اس کا وہ چہرہ نظروں میں گھوم گیا تھا۔ میں نے جلدی سے نظریں موڑیں اور جیپ سے باہر دیکھنے لگا۔

ہماری جیپ اب بلندی پر جا رہی تھی۔ ہواؤں میں خنکی بڑھ رہی تھی۔ نالہ اب پھر سے بہت شور کرنے لگا تھا۔ اس کے پانی ہمیں یہ بتلاتے تھے کہ ہم کس بلندی سے گر رہے ہیں۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا گیا، ویسے ہی ہم بھی سطح سمندر سے بلند ہوتے گئے۔ کچھ دیر میں ہماری جیپ ایک بھربھرے، بلند اور چٹان سے لپٹے راستے پر رینگ رہی تھی۔ ٹائروں تلے آتے کنکر سید صاحب نیچے بہتے نالے میں گر رہے تھے۔ وہ خطرناک مقامات تھے، جہاں سے ہم گزر رہے تھے۔ آگے کوئی خطرہ ہوتا تو ہمیں قبل از وقت اس کا پتا چل جاتا تھا، کیونکہ محبوب کی بولتی بند ہو جاتی تھی اور وہ لرزنے لگتا تھا۔ اس راستے پر چھوٹے، بڑے پتھر لاتعداد بکھرے پڑے تھے۔ ہم ارد گرد کے نظاروں کو نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ پتھروں کی وجہ سے جیپ اچھل کود کر رہی تھی اور ہم جم کر بیٹھ ہی نہیں سکتے تھے۔ میں نالے کی طرف کھڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں ملتر نالے کے تند و تیز پانیوں کے اوپر پرواز کر رہا ہوں۔ تبھی اچانک ہی ایک بڑا پتھر جیپ کے ٹائر تلے آیا اور جیپ ایک لمحے کو زمین سے بلند ہوئی۔ میں نے سیٹ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جیپ واپس زمین سے ٹکرائی۔ میں نے نیچے جھانکا۔ اگلے وہیل کی پوزیشن دیکھ کر مجھے اپنی سانس رکی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل اچھل کر حلق میں جا اٹکا تھا۔ اگلا وہیل عین سڑک کے کنارے پر تھا۔ بس ایک ڈیڑھ انچ کا فاصلہ رہ گیا

تھا۔ طاہر بھی ایک لمحے کو لرز گیا۔ محبوب کی چیخ اتنی زور سے نکلی تھی کہ ایسا محسوس ہوا کہ نالے کا پانی بھی ایک لمحہ کو ساکت ہو گیا ہو۔ چلتی ہوائیں اور اڑتے پرندے بھی تھم گئے ہوں۔ بڑی مہارت سے طاہر نے جیپ کو سنبھالا۔ ہم سب دعاؤں کا ورد باآواز بلند کر رہے تھے۔ اگر ایک انچ اور وہیل بڑھتا تو زمین بھربھرا جاتی، بریک لگنا کام آ گیا تھا۔ ورنہ جیپ کسی بھاری پتھر کی طرح لڑھکتے ہوئے نیچے گرتی۔ چھپاک کی زوردار آواز آتی اور کہانی ختم...... شاہ جی کا خوف شاید اتنے شاندار جھٹکوں سے زائل ہو چکا تھا اور وہ خاموشی سے اپنی سیٹ کو پوری قوت سے پکڑے سب کے چہرے کو تک رہے تھے۔

شکر خدا کرتے دعا پڑھتے سفر دوبارہ شروع ہوا۔

کچھ ہی دیر میں میدانی علاقے کی ابتداء ہو گئی۔ گاڑی کے لیے کوئی باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا، صرف ٹریکنگ کے لیے چھوٹے اور بڑے پتھروں سے بھرا پیچ پھیریاں لیتا راستہ تھا۔ جیپ کی اچھل کود بڑھتی گئی۔ میرا خیال تھا کہ جیپ یہیں روک کر جھیل تک پیدل چلتے ہیں۔ اشفاق بضد تھا کہ نہیں، یہاں سے آگے راستہ ہموار ہے۔ طاہر ایک اچھا اور قابل اعتماد ڈرائیور تھا مگر اب اس نے اپنے ہاتھ کھڑے کر لیے۔ اشفاق اور طاہر میں تو تکرار بھی ہوئی مگر فیصلہ یہ ہوا کہ باقی کا راستہ پیدل طے کرتے ہیں۔ محبوب نے جیپ کے ساتھ ٹھہرنے کا اعلان کر دیا۔ ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے ہم نے جیپ کھڑی کی۔ میں نے اپنے رک سیک سے کچھ خشک میوہ جات نکال کر محبوب کو اس لیے دیے کہ اگر اس کو بھوک لگے تو یہاں کھانے کے لیے اسے اور کیا ملے گا۔ ایک پانی کی بوتل بھی اس کے حوالے کی پھر آگے بڑھے۔

ہم نے اپنے رک سیک پیٹھ پیچھے لٹکائے اور اللہ کا نام لے کر ایک جنگل میں جا گھسے، میں نے زندگی میں آج تک اتنے بلند درخت نہیں دیکھے ہوں گے۔ زمین پر کچھ پتھر تھے اور باقی سبز گھاس بچھی تھی۔ ہم یہ منظر کافی دیر بعد دیکھ رہے تھے۔ ایک موڑ ہی مڑے ہوں گے کہ راستے میں ایک شوریدہ ندی راستہ روکے، ہمیں چڑاتی بہتی چلی جا رہی تھی۔ طاہر نے طنز بھری نظروں سے اشفاق کو دیکھا، یہ جتانے کے لیے کہ جیپ یہاں سے کیسے گزرتی؟ اور اشفاق بے پروا نظر آنے کی اداکاری کرتے آگے ہوئے بڑھ گیا۔

شاہ جی، مجھے پھر کچھ خفا خفا نظر آ رہے تھے کہ وہ یہاں میرے بہکاوے پر کیوں آ گئے۔ طاہر اور شیر باز نے لنگوٹ کسا اور اس ندی میں گھس گئے۔ پانی کمر سے نیچے تھا۔ ندی میں پڑے پتھر نظر آ رہے تھے۔ وہ اپنی بھرپور قوت لگا کر ندی کو چیرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ بہاؤ زیادہ ہونے کی وجہ سے ہی اس ایک قوت کے ساتھ سیدھا جانا پڑ رہا تھا۔ وہ پار اترا تو میں اور اشفاق اسی طرح پانیوں سے زور آزمائی کرتے دوسرے کنارے پہنچے۔ چند گز کا فاصلہ شاہ جی نے بھی اپنے زور پر طے کر لیا اور ہم سب ان کی اس کامیابی پر مسرور تھے۔ وہ خود بھی ...... اب مسکرا رہے تھے۔ میں ایک پتھر پر دور بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ پار اترے تو میری جانب دور سے ہاتھ ہلا کر پیغام دیا کہ سب ٹھیک ہے۔ میں اب ان کی طرف سے مطمئن تھا۔ ندی پار اترے تو ایک سبز و شاداب وادی تھی۔

سینکڑوں سالہ پرانے درخت، درجنوں سال خوردہ گرے ہوئے درختوں کے تنے، مخمل کی طرح ہری بھری ملائم گھاس جس پر چلنے سے محسوس ہوتا تھا کہ کسی قالین پر چل رہے ہوں۔ ان گرے ہوئے تنوں، سر اٹھائے کھڑے درختوں، بکھرے پتھروں، نیلے آسمان پر کہیں کہیں تیرتے بادلوں کے جھنڈ نے ایک شاندار منظر تخلیق کر دیا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے دور ہو کر، اپنی اپنی دنیا میں تنہا چل رہے تھے۔ یہاں مداخلت کسی کو گوارہ نہیں تھی۔ سب خاموشی سے چلتے جا رہے تھے۔ کانوں میں کبھی کبھی کسی پرندے کی انجانی سی بولی ٹکرا جاتی جو اس ماحول کو زیادہ خوبصورت بنا دیتی۔ ملتر نالہ میری بائیں جانب کچھ دور ہو کر آرام سے بہہ رہا تھا۔ سامنے برفانی چوٹیوں سے سجے بلند پہاڑ تھے۔ جنہیں ذہن کے کینوس پر محفوظ کرتا ہوا میں دوسروں سے دوری بنا کر تنہا چل رہا تھا۔

جنگل گھنا ہوتا گیا اور ایسا محسوس ہوا کہ شام اتر رہی ہو۔ دو دو سو فٹ بلند صنوبر، چیڑ اور دیودار کے درختوں نے زمین کو اپنے سائے میں سمیٹ رکھا تھا۔ درختوں کے تنے اتنے چوڑے تھے کہ واپسی کے وقت ایک درخت کو ہم پانچ لوگوں نے مل کر جپھا ڈالا مگر وہ پھر بھی ہماری گرفت میں نہ آیا۔ انہی درختوں پر نظر ڈالتے ہوئے میں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کئی درختوں نے وقت کے ساتھ ساتھ عجیب و غریب شکلیں اختیار کر لی تھیں۔ کسی کے دو تنے بن گئے تو کسی کے تنے بل کھا کر لپٹتے بلندی کی جانب چلے گئے تھے جیسے موٹی موٹی رسوں کو ایک دوسرے سے بل دے کر کسی

بلندی سے نکارہا جائے۔

ایک خطرناک ساپل عبور کیا اور ملنز ہار ڈم سے پرے ہوتے ہوئے دائیں جانب چلتا گیا مگر میں ابھی اسی سیاہ جنگل میں بھٹک رہا تھا۔ مجھے اس طرح جنگل میں ساڑھے گھومتا ہوا چلتا رہا تھا۔ چلتے چلتے، چلتے چلتے میں زائد کا وقت ہو چکا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ ہمیں ایسے ہی بھٹکتے رہوں اور جھیل بھی نہ آئے یا پھر بلیک ڈیتھ کا جو دیو ہیکل ہوا درخت میرا منتظر تھا کہ میں اس کے سائے میں آؤں اور وہ مجھے اپنی لپیٹ میں لے لے۔ ابھی میں اپنے آپ کو سمجھا ہی رہا تھا کہ ایک پہاڑ کے مقابل کھڑا ہو گیا جس کی چوٹی برف سے لدی تھی۔

ابھی میں وہیں کھڑا تھا کہ اچانک اوپر اُدھر سے جنگل عبور کرنے والے ساتھی بھی پہنچ گئے اب سے ایک دوسرے کو خوشدلی سے دیکھا پھر اس طرح حال احوال پوچھے۔ لگے جیسے برسوں کے بچھڑے ہوں۔ اس کام سے فرصت ملی تو پھر آگے کا سفر شروع کیا۔

اب سامنے ایک اور نئی مہاری سطح تھی جس میں بڑے بڑے پتھر پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے تھے۔ شور یدہ پانی طوفانی رفتار کا تھا۔ یہ شور اس قوت کا تھا جو دریائے اور رکنا چاہتا تھا مگر اس میں اتنی قوت کہاں تھی کہ ان پتھروں کو بہا کر لے جاتا۔ دُور دُور کے اس مقام کے پتھروں پر پھسلا بھی لگا کرتا تھا۔ شاہدی کے بارے میں ہم نے سن تو رکھا تھا مگر دیکھنے سے تاہم یہ جگہ اس طرح کی تھی جس پر شاہدی نے کوئی کان نہ دھرا اور نہ کسی خوشی کا اظہار کیا۔ تبھی ہی آگے بڑھ گئے۔

ندی کے پار اترے تو پھر ایک اندھیرے جنگل میں داخل ہو گئے۔ دو گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے۔ اشفاق جیسے یہاں آچکا تھا اور بار بار شاہدی کے پوچھے پر بتاتا، ”ہیں قریب ہیں۔“

جب آپ کو شریف پر چل رہے ہوں تو کبھی نہیں پوچھنا چاہیے کہ منزل کتنی دور ہے، کیوں کہ آپ کو کسی اپنی توقع کے مطابق جواب نہیں ملے گا۔ چنانچہ میں نے بھی آپ کو معلوم ہونا ہے کہ کتنی دُور ہے اور وہ اطمینان کا سانس لیتا، رفتار بھی بڑھا دی جاتی ہیں جاسکتی۔ اس لیے سب ہی اپنی دھن میں چلتا جا رہا تھا۔ کہیں بیٹھ کر پانی پیا یا پھر رمائی فروٹ کھالیا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

شاہدی کا ایک بار اشفاق سے، مخزر بھی ہوا۔ شاہدی گونگا تھا کہ وہ ایک گھنٹے سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ سانس نہیں لے رہا اور وہ ایک گھنٹے سے دیکھ رہے ہیں کہ وہ سانس نہیں لے رہا۔ شاہدی کہنے لگے کہ یہاں کوئی جھیل نہیں ہے، یہ سب جھوٹ بولتے ہیں۔ شاہدی کے منہ سے یہ ہم الفاظ سنے دور ہو کر چل رہے تھے۔ جادہ ان کے لفظ کا شکار ہو جاتا ہیں، اب وہ جنگل ہمارا ہو اور اور گرد و پیش پہاڑ ہی پہاڑ نظر آئیں۔ ان چٹانوں کی بلندیوں پر سیاہ رنگ تھے۔ معلوم ہوا کہ سلامتی کے نمائندہ ہیں۔ لوگ چوٹیوں پر جاتے ہیں اور پھر رسول سے لے کر ان مقامات سے سلامتی نکال لاتے ہیں تو جھوٹوں نے قدرے سنجیدہ ہو جاتی ہے۔ شاہدی کے پاس سلامتی کی ایک بیل فراٹے اسٹ تھی اور شاہدی کی نگاہیں ان بلندیوں پر لگی تھیں۔ کسی کے بتانے پر کہ وہ نکلتے میں یہ آسانی طے جائے گی تو شاہدی کے فرائض نوٹ کر لی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ فرائض کرنے والے پچاس سے زائد تھے۔

شیر یار بولا۔ ”شاہدی! اس سے خالص سلامتیت آپ کو پورے مگلت میں نہیں ملے گی۔ بالکل تازہ دودھ کی طرح خالص ہے۔ کبھی تو کسی طرح اور جاتے ہیں اور ایک بوری بھر کر لاتے ہیں۔“

شاہدی کہنے لگے۔ ”بالکل مت بولو بوری سے کہاں؟“

ظاہر کے کندھے پر چادر تھی وہ بولا۔ ”یہ چادر کب کام آئے گی؟ اس میں ڈال لو تم لوگ۔“

شاہدی میری جانب دیکھ کر میری رائے جاننا چاہتے تھے۔

میں نے کہا۔ ”وہ خار یا دے ہیں جو سانسے دکھتا تھا اور سانسے نہ تھا۔“

شاہدی بولے۔ ”یاد کیوں نہیں۔ وہاں چڑھے تو تھے۔ خار سانسے ہی ظفر آباد تھا اور کبھی لگے تھے۔ اور چڑھنے میں۔“

وہ اب شیر یار کو کہانی سنا رہے تھے۔ میں نے کہا کہ شاہدی وہ سانسے تھا۔ وہ دور ہو گیا اور نہ جیلے میں سیاہوں دور ہے اور آپ سلامتیت ان لوگوں کے کہنے پر وہاں سے اتارے چلے ہیں۔

بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی اور پھر اُن کا ظاہر اور شیر یار بھی۔ جھگڑا شروع ہو گیا کہ میں نے وہاں سے کھسکنے کی میں عافیت سمجھی۔ مجھے ان کی آوازیں پیچھے سے آتی رہیں۔

”کوئی خوب صورت چیز یا آسانی دستیاب نہیں ہوتی، کوئی قیمتی پتھر ہر جگہ نہیں پایا جاتا۔ حسن پردے میں ہی اچھا لگتا ہے، مثالیں ہو جائے تو بے سول ہو جاتا ہے، اسرار ٹائٹ جاتا ہے تو تجسس کم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جھیلیں راستوں میں پڑتا ہے تو خوشی محسوس ہوتی ہیں۔ کسی خوب صورت اور حسن کو بھی ادراک نہیں ہونا چاہیے۔ علیحدہ چھپے کہ وہ لوگوں اور پہاڑوں میں گھری جھیلیں، جب تک نہ کسی اور کی نظر پڑتی ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک بلندی آئی اور اس پر چڑھے تو سامنے سبز پانیوں والی ٹھنڈی جھیل تھی۔

میں نے آج تک جتنی بھی جھیلیں دیکھی ہیں، ان کے لیے بھلے کسی بلندی پر چڑھنا نہیں پڑا۔ کوئی جھیل چلتے چلتے، آسانی سے میرے راستے میں آجاتی اور یہی اس جھیل کا حسن تھا۔ خشک جھیل کو دیکھ کر دھوکا ہوتا ہے کہ یہ پانی ہے کہ شبنم۔ جو مٹی جھیل کے اوپر پہاڑوں، درختوں اور آسمان کا تھا، وہی جھیل کے اندر تھا۔ پانی ساکت اور شیشہ تھا۔ اس کی تہہ میں جو سبزہ تھا، وہی اسے سبز رنگ دیتا تھا۔ ایک ایک پودا اور اس کے پتے تک نظر وں کے سامنے تھے۔ کوئی کنکر ڈال دیتا تو وہ بھی پار نظر آتا۔ مچھلی نظر میں اس جھیل نے ابھی سب کو خاص تاثر نہیں چھوڑا تھا۔ اسے بھی جھیل کی بھی سب ماہیوں میں گھر کے۔ شاہدی تو کچھ زیادہ ہی طایوس ہوئے۔ اشفاق بھی بہت خاموش ہو گیا۔

کسی خاطر ملیے ہوتے ہیں، جن کا شیرگر احساس ہیں قدرے دیر سے محسوس ہوتی ہے۔ جب تک آپ ان ناظر میں غور نہ کریں، ان کے ماحول سے آشنا نہیں ہوتے، وہ ایسے جلوے کا پرتو نہیں ہوتے۔ آپ کو کسی کو گھنٹے کے بعد اس کی دل میں اترنا پڑتا ہے۔ یہی حال جھیلوں کا ہوتا ہے، اسی لیے ہم بھی اس کی دل میں جھانکنے کے لیے بلندی سے پھسلنے لگے۔ جھیل کنارے ایک بڑے کھرے کا پتھر یلا ساحل تھا۔ جھیل کنارے ایک دیوار یہاں سیاہ پڑی تھیں۔ ایک خاموشی کا سہ بیاں طاری تھی۔ چاروں طرف ہی خاموشی سے دھوپ میں لپٹی ہوئی تھیں اور سب اپنی اپنی دھن میں مگن تھے۔ ہر ایک اپنے کام میں مصروف تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہر ایک اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔ کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہر ایک اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔

جیلی فش آپ نے اگر دیکھی نہ بھی ہو تو اس کے بارے میں سنا ضرور ہو گا۔ یہ جیلی بھی ہوتی ہے اور ڈنک بھی۔ لیکن اس کا پورا نام ہو چاہیے جیلی وائر فش۔ کہ کیک اس میں 95 فیصد پانی ہوتا ہے۔

آپ لوسٹر کو فریزر میں فریز کر دیتے ہیں اور جب خواہش ہوتی ہے فریزر سے نکال کر فرائی کر کے کھا لیتے ہیں۔ لیکن یہ آسمان سے کہ فرائی کرتے ہوئے زندہ ہو جائے۔

فرخ زبان صرف فرخی ہی میں نہیں بولی جاتی بلکہ یہ 600 سال تک انگلینڈ کی سرکاری زبان رہی ہے۔ یہ تاجروں کی بات ہے۔ جب کہ انگلینڈ اس آفریز کی موجود تھی۔

مرسلہ: ہما بخاری۔ ملتان

☆☆☆

سینکے اسی جانب چل پڑے اور میں جھیل کے گرد چکر لگانے کے لیے دوسری جانب چل دیا۔

مجھے تنہائی بھی چاہیے تھی اور اسی تنہائی کو پانے کے لیے میں جھیل کی جانب نیچے اترا تو میرے سامنے کئی رنگ پھلجھڑیوں کی مانند بکھرتے چلے گئے۔ میں جس کو ایک عام سی جھیل سمجھ رہا تھا، وہ عام ہرگز نہیں تھی۔ خاص الخاص تھی۔ رنگوں کی ایک برسات تھی جو جھیل پر برس رہی تھی۔ حیرت انگیز حد تک جھیل کے پانی نیلے و سبز تھے اور یہ سب رنگ ایک دوسرے سے جدا جدا دکھتے تھے۔ اتنے شفاف کہ جھیل کی تہہ میں پڑا کوئی کنکر، کوئی درخت کا تنا بھی شفاف نظر آ رہا تھا۔ جھیل کی تہہ میں کہیں کائی تھی اور کہیں ریت، چھوٹی چھوٹی ٹراؤٹ مچھلیاں اِدھر اُدھر تیرتی پھر رہی تھیں۔ وہ جھیل کسی ایکوریم کی طرح دکھلائی دیتی تھی، جس کے پانیوں کو رنگ برنگے پتھروں اور مختلف رنگ کی روشنیوں نے قوسِ قزح بنایا ہوا تھا۔ یہاں بھی نظر آنے والے کئی رنگ تھے۔ جھیل کی سطح پانی کی نہیں بلکہ ایک آئینہ جیسی تھی جہاں اردگرد کے بلند پہاڑوں، شاداب درختوں، سورج کی کرنوں کا عکس دکھتا تھا۔ کرنیں ان پانیوں کے پار اترتیں تو اپنے سات رنگوں میں منعکس ہو جاتیں۔ میں اپنے دوستوں سے دور ایک کنج میں بیٹھا، اپنی تھکاوٹ بھلا کر اس منظر کا حصہ بنا، اس دنیا سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے کھویا، آس پاس پھیلی خاموشی کی دلفریب صدائیں سنتا رہا۔ ایسی ویران اور خاموش جگہ رات بسر کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہوتی ہے، ان کے لیے جو زندگی کے ہجوم سے چند دن اپنے لیے چرانے کا کر جاتے ہیں۔

میں ٹہلتا ہوا، درختوں کی ان ٹہنیوں سے جو جھیل پر سایہ کر رہی تھیں، بچتا بچاتا اس پل پر آیا۔ اب مجھے اس سے گزر کر اپنے ساتھیوں کے پاس جزیرے تک جانا تھا، جہاں مخمل کی طرح سبز گھاس بھی میری منتظر تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ جھیل کا پانی کتنا گہرا ہے۔ جھیل کی تہہ شفاف دکھتی تو تھی مگر آئینے سے آسمان بھی قریب دکھتا ہے، اس لیے میں کوئی اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ یہ بیس فٹ سے زائد کا سفر کہیں مجھے ان پانیوں میں پھینک نہ دے، جس کی نہ گہرائی کا پتا ہے اور نہ یہ اندازہ کہ وہاں کوئی دلدل ہے یا نہیں۔ مجھے پار اتارنے کے لیے شاہد اور اشفاق، دونوں نے بار بار پل سے گزر کر مجھے دکھایا اور آخرکار میں بھی کچھ لمحوں میں اس مخمل جیسی ٹھنڈی گھاس پر درخت کے سائے میں جھیل سے ٹکرا کر آتے جھونکوں کی آغوش میں پسلیاں مار رہا تھا۔ غنودگی اچانک آ گئی اور میں کچھ لمحوں کے لیے بے خبر ہو گیا۔

کچھ ہی دیر میں گلگتی دوستوں کی اجنبی خوبصورت بولی، جینا میرے کانوں سے مسلسل ٹکرائی تو میں بیدار ہوا۔ شاہ جی کے اس جزیرے پر بھی خراٹے جاری تھے۔ سورج ڈوبنے کے مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ ہمیں محبوب ہمارا انتظار بھی کر رہا تھا اور آج ہی ہمیں گلگت پہنچنا بھی تھا۔ میں ایک حسرت لیے کچھ دیر اسی جزیرے پر بیٹھا رہا کہ یہاں ایک رات کا قیام کتنا حسین ہوگا؟ کیا میں اکیلا ان سب کو واپس بھیج کر رک سکتا ہوں؟ مجھے اپنے آپ سے جواب جب نفی میں ملا تو ہم واپس جیپ کی جانب روانہ تھے۔ جیپ تک پہنچے تو محبوب کو اپنا منتظر پایا۔ اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی اس کے چہرے پر شکن نہ تھی۔ اکیلے میں اس نے یہ وقت کیسے گزارا، اس کا شکوہ بھی نہ تھا۔ اس نے خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ اب ہمیں جلدی نکل کر اندھیرا ہونے سے پہلے وہ تنگ درہ عبور کرنا تھا۔ اس لیے فوراً ہی چل پڑے۔ واپسی کا سفر خاموشی میں گزرا۔ گلگت پہنچے تو شام مکمل طور پر چھا چکی تھی۔

رات کو شیر باز ہمیں جلت ٹورسٹ ہوٹل میں ڈنر کرانے لے گیا۔ اس کے خوبصورت ہال میں ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مدھم آواز میں شیر باز مجھے فیری میڈو جانے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاہ جی تائیدی انداز میں اپنا سر ہلا رہے تھے اور میں کڑھائی گوشت پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ میرے ہم سفر بھی اس سفر پر راضی نہیں تھے مگر وہ مجھے اکیلا چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ سفر جو ہم نے کل کرنا تھا، اس کی امید ابھی تک مجھے نہیں تھی۔ سب اس جیپ حادثے سے ڈرے ہوئے تھے جو چند دن پہلے فیری میڈو کے راستے میں ہوا تھا اور کئی جانوں کی المناک موت کا سبب بنا تھا۔ ہم اس حادثے کے دن سے اس کا ذکر بھی ایک دوسرے سے نہیں کرتے تھے۔ ہر ایک فیری میڈو جانے کے ارادے سے اندر ہی اندر متزلزل ہو چکا تھا۔ میں اپنے ارادے سے باز آنے والا نہیں تھا۔ شاہ جی خاموش خاموش تھے۔ نہ معلوم اشیاء کو گھور رہے تھے، خلاؤں میں تک رہے تھے۔ اپنے ریوڑ سے گم ہوئی کسی بھیڑ کی مانند اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ شاہد اور اشفاق خالی خالی نظروں سے مجھے تک رہے تھے۔ میرے مصمم ارادے کے سامنے سب نے

سرِ تسلیم خم کر رکھا تھا۔ میں انہیں کئی بار کہہ چکا تھا کہ میں اکیلا چلا جاؤں گا مگر وہ سب اس پر بھی راضی نہ تھے۔

رات میں نیند گہری آئی۔ صبح اٹھے تو ویٹروں کی وہی مانوس آوازیں کانوں میں پڑیں۔ شاہ جی مجھ سے پہلے بیدار ہو کر چھت کو مسلسل گھور رہے تھے۔ آج مجھے فیری میڈو جانا تھا۔ میرا ایک ساتھی اپنے بستر پر پڑا چھت کو ایسے گھور رہا تھا جیسے ہم آخری سفر پر جا رہے ہوں۔ اشفاق اور شاہد کچھ بولتے تو نہ تھے مگر امید افزا نظروں سے شاہ جی کو تک رہے تھے کہ ممکن ہے کہ میں شاہ جی پر ترس کھا کر فیری میڈو کا ارادہ بدل دوں۔ ان دونوں نے اپنی بندوقیں شاہ جی کے ناتواں کندھوں پر رکھی ہوئی تھیں اور شاہ جی اپنی بندوق تانے میرے سامنے کبھی بھی کھڑے ہو سکتے تھے۔ میں جب کسی بات کو ٹھان لوں تو اللہ میرا ساتھ دیتا ہے اور آج بھی یہی ہونے والا تھا۔

ناشتے کے لیے ہم اپنے ہوٹل سے نکل کر بازار میں آئے۔ آج ذرا مختلف قسم کے ناشتے کا پروگرام تھا۔ ہم نے گرم نانوں کے ساتھ مرغ چھولوں کا ناشتا کیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد میں نے شاہ جی کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ”شاہ جی! اب جلدی کرنی ہے کیونکہ رک سیک بھی پیک کرنے ہیں اور سارے سامان کو ایک بار پھر سے چیک کرنا ہے تاکہ اگر کوئی چیز رہ گئی تو بہت مشکل ہو گی۔“

شاہ جی میری اس بات پر پھر ایک بار ذرا سی دیر کے لیے کھو سے گئے کہ یہ کہاں جا رہے ہیں جہاں کوئی چیز بھی مہیا نہیں ہوتی۔ صرف ”ہوں“ میں جواب دینے کے بعد شاہ جی قدرے آگے نکل گئے اور میرا ان کے کندھے پر دھرا ہاتھ لٹک کر رہ گیا۔

پھر جب واپس آئے تو کمرے میں بددلی سے رک سیک پیک کرنے لگے، میرے رک سیک میں ہر قسم کی ضرورت کا سامان پیک ہو گیا۔ آلو، پیاز، مرچ مصالحے، دالیں، چاول، ٹافیاں، دوائیاں، سوئٹر، گرم کپڑے، اونی ٹوپیاں، گرم دستانے، موزے، ٹارچ، کیمرا اور بیٹری سیل، اس کے علاوہ خیمہ، سلیپنگ بیگ، میٹرس بھی تھا۔ مجھے خیال ہی نہ آیا کہ یہ سب مال مجھے اکیلے اٹھانا ہے۔ اتنا سامان تو کوئی گدھا ہی اٹھا سکتا تھا۔ میں کافی دیر اسی سوچ میں رہا کہ کیا میں ایک گدھا ہوں۔ کیونکہ یہ سارا سامان میں اپنی پیٹھ پر لادے، تاتو سے فیری میڈو تک کا ٹریک کیسے طے کروں گا۔

آج کا ہمارا سفر تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا ویگن پر ڈھائی تین گھنٹوں میں گلگت سے رائے کوٹ پل، دوسرے حصے میں وہاں سے جیپ پر دو سے ڈھائی گھنٹوں میں گرم چشموں والے تاتو گاؤں اور آخری حصے میں پیدل ٹریک تین سے چار گھنٹے کا تاتو سے فیری میڈو تک طے کرنا تھا۔

فیری میڈو کو دو راستے جاتے ہیں۔ ایک قدرے آسان مگر دور از راستہ جو جنگلوں کے اندر سے ہو کر وہاں پہنچتا ہے۔ دوسرا قدرے مختصر مگر جان لیوا راستہ ہے جو ایک بلند پہاڑی سے ہو کر فتوری گاؤں کو جاتا ہے۔ یہ راستہ دشوار گزار ہے کیونکہ ایک عمودی پہاڑی پر چلنا پڑتا ہے۔ جہاں چڑھتے ہوئے گھٹنے منہ کو لگتے ہیں اور پھیپھڑے پسلیوں پر زور لگا کر باہر کو نکلتے محسوس ہوتے ہیں۔

مجھے ابھی بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ سامان مجھ پر بہت بھاری پڑ جائے گا، کیونکہ یہ میرا باقاعدہ پہلا ٹریک تھا۔ اگر شاہد اور اشفاق نہ ہوتے تو معلوم نہیں میرا کیا حال ہوتا۔ وہ دونوں اللہ کے فرشتے بن کر میری مدد کو آ پہنچے اور آج میں سلامت ہوں۔

نانگا پربت کی چاہ میں مجھے کتنے مصائب اٹھانے ہوں گے، ان کا میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ اب تو لوگ بہت جانے لگے ہیں اور کافی سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں، آج سے سترہ سال پہلے، فیری میڈو کے نام سے بھی بہت کم لوگ آشنا تھے اور راستے ویران اور دشوار لگتے تھے۔

سامان پیک ہو گیا تھا۔ اب انتظار شروع ہوا کہ کب اشفاق اور شاہد کی جوڑی آئے اور ہم روانہ ہوں۔ وہ دونوں ”ہم کچھ دیر میں آئے“ کہتے ہوئے کچھ دیر پہلے چلے گئے تھے۔ یہ انتظار مجھے بھاری پڑ رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر ہم آج فیری میڈو نہ گئے تو پھر کبھی نہ جا سکیں گے۔ کبھی ذہن میں آتا کہ یہ کیا پنگا لے بیٹھا ہوں؟ کوئی بھی دل سے تیار نہیں لگتا۔ سب کو کیا میں گھسیٹ کر ساتھ لے جا رہا ہوں؟ کیا یہ فیری میڈو اتنا ہی اہم ہے کہ سب کو اور اپنے آپ کو بھی ایک مصیبت میں ڈالوں۔ پھر سوچتا کہ جس کے خواب میں نے پورا ایک سال بنے اور جب تعبیر سامنے ایک قدم دور ہے تو پیچھے ہٹ جانا کہیں ہمیشہ کا پچھتاوا نہ بن جائے۔ یہ خیال میرے ارادے کو مضبوط کر رہا تھا۔

شاہ جی خاموش سے تھے۔ وہ انکار بھی نہ کرتے تھے مگر اب تھک سے گئے تھے۔ میرے اور ان کے ذہن میں

وہی جیپ تھی جو پانچ دن پہلے ناتو کے ہولناک راستے پر رائے کوٹ دریا میں ہزاروں فٹ نیچے گر گئی تھی اور چار سیاح ڈرائیور سمیت ہلاک ہو گئے تھے۔ میں اس افسوس ناک حادثے کو یاد نہیں کرنا چاہتا تھا کہ شاہ جی میری سوچ پڑھ لیں۔

میرے ذہن میں اسی طرح کے مختلف خیالات آتے رہے اور میں اسی دوران اپنے دونوں ساتھیوں کا انتظار کرتا رہا۔ وہ میرے خیال سے لیٹ ہو رہے تھے، کیونکہ آج ہی ہم کو یہ سب مراحل طے کر کے شام سے پہلے فیری میڈو پہنچنا تھا۔ میں اسی پر غور کر رہا تھا کہ بری طرح چونک گیا۔

کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا تھا جس کی وجہ سے میرے خیالات کے تانے بانے ٹوٹ گئے تھے۔ ہمیشہ کی طرح شاہد کمرے میں بوکھلایا سا داخل ہوا۔ ”آپ تیار نہیں ہیں۔ چلیں، دیر ہو رہی ہے۔“

وہ اس بات پر مطمئن تھا کہ اسے ایک خیمہ مل گیا ہے اور اب وہ اپنی دانست میں تیار تھا۔ اس کے کندھے پر لٹکتا ایک چھوٹا سا شولڈر بیگ تھا اور اس کی تیاری مکمل تھی۔ میں نے اس سے لیٹ آنے کی شکایت کی تو وہ مسکرا کر بولا۔ ”ہم ابھی نکلیں گے تو شام سے پہلے فیری میڈو میں خیمے لگا لیں گے۔“

شاہ جی ایک ٹھنڈی سانس لے کر اپنے بستر سے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ ہم سب ایک ایک کر کے شیر باز کی گاڑی میں جا بیٹھے جو ہمیں ویگن اسٹینڈ پر چھوڑ آئی۔ وہاں پہنچتے ہی ایک بجے کی ویگن سے میں نے چار ٹکٹ بک کرائے اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔

فضا میں شدید حبس تھا، گرمی سے حال بے حال تھا۔ شاہ جی اپنی قمیص کے دامن سے اپنے آپ کو پنکھا جھلتے تھے۔ ہم نے وہیں ایک ریسٹورنٹ سے دوپہر کا کھانا کھایا۔ شاہ جی آج ایسے کھانا کھا رہے تھے کہ یہ ان کا آخری کھانا ہے۔ تین بار بسم اللہ پڑھی، کھانے کے بعد دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔

شاہد اور اشفاق یہ سب دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ ہمارا سامان اوپر چھت پر منتقل ہو گیا، شاہ جی اور میں پیچھے والی سیٹ پر جا بیٹھے۔ شاہد اور اشفاق گل اگلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور ان کے ساتھ مزید دو نوجوان آ بیٹھے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر میں ویگن جگلوٹ کی جانب فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔

ٹھنڈی ہوا لگی تو اسماعیل بھی بول پڑے۔ ان کو فیری میڈو سے زیادہ واپس جانے کی فکر تھی۔ ”کوئی ایسا راستہ نہیں ہے جو فیری میڈو سے سیدھا پنڈی جائے۔ یہ تو لمبا راستہ ہے کہ پہلے گلگت آؤ، اور پھر واپس پنڈی۔“

شاہ جی فیری میڈو سے سیدھا پنڈی کا پروگرام بنا رہے تھے۔ میں نے کہا مگر ایک ہفتہ پیدل چلنا ہوگا۔ فیری میڈو سے بابوسر پہنچ کر پہاڑ پار کریں گے اور پھر ناران کے راستے پنڈی پہنچ سکتے ہیں۔

میرے اس جواب پر شاہ جی ڈھیلے پڑتے ہوئے اپنی سیٹ پر ڈھیر ہوتے گئے اور اپنا سر ویگن کی کھڑکی سے نکال کر پھر کسی گہری سوچ میں کھو گئے۔

لگتا یوں تھا کہ شاہ جی کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ ان میں جتنا دم تھا وہ میرے ساتھ چلے آ رہے تھے۔ اب شاہ جی کو میں ایک طرح اپنے کندھے پر اٹھائے گھوم رہا تھا۔ گویا وہ دکھاوے کو ساتھ تھے۔ اتنے میں شاہد نے..... میری جانب مڑ کر جو کہا، اس سے میرے دماغ میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ذہن سن اور زبان گنگ ہو گئی جس خیال اور تذکرے سے میں گریز کر رہا تھا، مجھے کیا معلوم تھا وہ میرے ہمراہ اسی ویگن میں میرا ہمسفر ہے۔ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے دو نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ حیدرآباد سے آئے ہیں اور جو لوگ چند دن پہلے ناتو جاتے ہوئے جیپ حادثے کا شکار ہوئے تھے، یہ ان کے رشتہ دار ہیں۔“

شاہ جی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور جو حادثہ ہم بھول چکے تھے یا بھولنے کی کوشش کر رہے تھے، وہ پھر سے تازہ ہو گیا۔ شاہد نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ لوگ اپنے رشتہ داروں کی لاشیں تلاش کرنے آئے ہیں۔“

میرے دماغ میں ایک ہلچل سی پیدا ہونے لگی۔ شاہ جی رحم طلب نظروں سے میری جانب دیکھ رہے تھے اور میں خالی دماغ افسردہ اور سہمی نظروں سے ان دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔

ان میں سے ایک میری طرف اداس نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا آپ بھی فیری میڈو جا رہے ہیں؟“

میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے اس نے کہا ہو کیا آپ بھی مرنے جا رہے ہیں۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ جس خوف کے سانپ کو میں نے اپنے اندر دبا کر رکھا ہوا تھا، وہ

کنڈلی اٹھائے پھنکارنے لگا تھا۔

میرے اندر ایک افسوس اور دہشت کی ملی جلی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ رائے کوٹ، ناتو، جیپ کا ہزاروں فٹ سے نیچے گرنا، فیری میڈو اور نانگا پربت آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔ میں ایک بے یقینی کے سمندر میں ڈوبتا چلا گیا کہ میں کیا نانگا پربت جا بھی سکوں گا کہ نہیں؟ اگر چلا بھی گیا تو کیسے جاؤں گا۔ میرے سامنے اب کچھ لاشیں تھیں، ان کے روتے لواحقین تھے۔ ساتھ میں لرزتے شاہ جی، اندر سے کانپتا میں خود اور آگے بیٹھے اپنا خوف چھپاتے روجلجی، شاہد اور اشفاق۔ وہ دونوں اپنا خوف چھپا ہوئے تھے تاکہ ان کے بزدل ہونے پر کسی کو شبہ نہ ہو۔

مجھے نانگا پربت کی درندگی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ یہ قاتل پہاڑ اپنی ایک خونی تاریخ رکھتا ہے۔ کوئی بھی اس کی جانب بڑھا، اس نے اسے آ دبوچا۔ اس نے کئی کوہ پیما نگل لیے اور تو اور ہمارے سامنے چار جوان بندوں کی قربانی مانگ لی، جو صرف اس کی ایک جھلک دیکھنے جا رہے تھے مگر انسان بھی بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔ نانگا پربت للکارتا رہا کہ کوئی میری تنہائی میں مخل نہ ہو مگر ہرمن بوہل ہو یا میسنر، رجب شاہ ہو یا نذیر صابر۔ سب اس پر چڑھ دوڑنے اور اس کی برف کو مسمار کرنے، اس کی بلند چوٹیوں تک جا پہنچنے کو بے قرار ہو گئے شاید اس کا بھی اسے غصہ ہو مگر میں تو صرف فیری میڈو میں اپنا خیمہ لگانا چاہتا تھا۔ اس کی پُراسرار گھاٹیوں کو دور سے ایک بار دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنے بوٹوں سمیت اس معبد میں گھسنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر یہ مجھے لگاتار ڈرائے چلا جا رہا تھا۔

دوپہر ڈھل رہی تھی اور ہماری ویگن رائے کوٹ کی جانب بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں تیزی سے پیچھے بھاگتے درخت دیکھتا تھا۔ دریا اور پہاڑ میری نظروں سے اوجھل تھے۔ میں عجیب کشمکش میں تھا۔ میرے اندر سوالات اٹھ رہے تھے کہ کیا میں اتنا خودغرض ہو گیا ہوں جو تین ہرنوں کو لیے شیر کی کچھار میں، اپنی غرض سے گھس رہا ہوں؟ کیا فیری میڈو واقعی اتنا دلکش ہے جس کے لیے میں اتنا تردد کر رہا ہوں۔

ویگن نے ایک موڑ کاٹا تو سامنے پتھریلی، دھوپ میں چمکتی چٹانوں کے پیچھے، نانگا پربت کے برفانی اہرام نظر آئے، جیسے وہ دانت نکالے مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ مجھے اپنی تذلیل محسوس ہوئی اور اسی لمحے میں نے اپنا ٹوٹتا ہوا ارادہ پھر سے پکا کر لیا کہ فیری میڈو میں آج رات میرا خیمہ ضرور لگے گا۔ خواہ کچھ ہو جائے میرے ارادے متزلزل نہیں ہوں گے۔ مجھے نانگا پربت سے ٹکراتا ہے۔ اسے جھکانا ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ ہر ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ نانگا پربت کی قہرناکی کا مجھے مقابلہ کرنا ہے۔

سائے لمبے پڑ رہے تھے۔ چٹانوں پر دھوپ پڑ رہی تھی اور وہ اس وادی میں زرد لگتی تھی اور ہم اسی وقت رائے کوٹ کے پل پر اترے، ویگن کی چھت سے اپنا سامان اتارا۔ ہم اترے تو وہ دو نوجوان بھی کھولتی سڑک پر کھڑے آسمانوں کی طرف جاتے راستے کو دیکھنے لگے تھے، جو ناتو کی جانب جاتا تھا۔ اسی خونی سڑک نے ان کے عزیزوں کی جانیں لے لی تھیں۔ فضا میں شدید تپش کا احساس تھا۔ یہ تپش، لہروں کی صورت ان چٹانوں سے تیرتی چلی آ رہی تھی، جنہوں نے پورا دن سورج کی گرمی کو جذب کرتے گزارا تھا۔ ایک ویرانی تھی جو چار سو پھیلی تھی۔ ایسی ویرانی جو گرمیوں کی تپتی دوپہر میں، داماں سے جڑے میرے چھوٹے سے شہر ڈیرہ اسماعیل خان کی گلیوں میں آوارہ پھرتی تھی۔

آج میں اپنی بچپن کی یادوں میں دیکھتا ہوں تو کچھ موتی میرے ہاتھ آتے ہیں۔ انٹرنیٹ اور میڈیا نے پوری کائنات ہی پلٹ کر رکھ دی ہے۔ ہمارے بچپن میں ابھی ٹی وی نیا نیا آیا تھا۔ ہمارے چھوٹے سے شہر میں ٹی وی بڑے شہروں کی نسبت آٹھ سال بعد آیا تھا۔ صرف شام کی نشریات ہوتی تھیں، جو رات گیارہ بجے ختم ہو جاتی تھیں۔ اسکول کے بعد تو ہمارے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ ہم گلیوں، محلوں میں پلے تھے اور بچپن کا لطف ہم نے اٹھایا ہوا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتیں اور میں اپنا چھٹیوں کا کام پہلے دس دن میں ختم کر لیتا۔ میرے شہر ڈیرہ کی تپتی، ویران اور اجڑی دوپہریں میرے لیے نت نئے مشغلے لے آتیں۔ جب سب گھر والے دوپہر کے کھانے کے بعد ایک کمرے میں اور ایک پنکھے تلے سو جاتے تو میں چپکے سے اٹھتا اور آہستگی سے باہر کا دروازہ کھول کر گلی میں دوڑ لگا لیتا۔

گلی میں ایسی ہی ویرانی ہوتی، جو آج مجھے رائے کوٹ کے پل پر نظر آ رہی تھی۔ ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک ویرانہ شروع ہو جاتا تھا۔ کھجوروں کے درخت تھے اور ان سے پرے قبرستان تھا۔ کبھی میں کسی کھجور کے درخت پر چڑھ کر کھجور توڑ رہا ہوتا تو کبھی کسی پیپل کے درخت کی

اونچائی پر چڑھ کر پرندوں کے گھونسلے دیکھتا۔ میرے دوست خالد اور اللہ وسایا میرے ہمراہ ہوتے۔ ایک بار شہر سے باہر واحد عیدگاہ میں درخت سے کھجور توڑتے ہوئے نیچے آ گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ مجھے ہوش تب آیا جب میرے دوست، ہوش میں لانے کے لیے مجھے نہر میں پھینک چکے تھے۔ پانی کے چھپاکے سے ہوش آیا تھا۔ ادھر ادھر دیکھا ایک ویرانہ تھا، چٹیل اور گرمی تھی۔ کبھی کوئی انسان آتے جاتے نظر آجاتے، ورنہ گدھے کسی سائے میں کھڑے سستا رہے ہوتے۔ ان گدھوں کی سواری بھی ہمارا ایک محبوب مشغلہ تھا اور اسی چکر میں کئی بار گدھوں کی دولتی کھائی۔ اگر گدھوں سے بچ جاتے تو ان دیہاتی مالکوں سے ضرور پٹتے جو ان پر لکڑیاں لاد کر شہر بیچنے آتے۔

اس راجے کوٹ پل کی ویرانی پر اب مجھے اپنے بچپن کی دلکش گلیاں یاد آ گئیں۔ واقعات یاد آ گئے۔

ہم سامان سمیت کھڑے چاروں جانب دیکھ رہے تھے۔ سڑک کی دوسری جانب ایک ویران سا ہوٹل تھا۔ نام تو شنگریلا تھا مگر شنگریلا جیسی دلکشی نہ تھی۔ ہوٹل کے ساتھ چند گیراج بنے تھے اور کچھ جیپیں باہر پارک تھیں اور گیراجوں میں چارپائیاں بچھی تھیں، جن پر ڈرائیور حضرات اپنی شلواریں گھٹنوں سے اوپر تک چڑھائے دراز تھے۔ ہمارے ساتھ، جہاں ہم اترے تھے، وہاں چند دکانیں تھیں جہاں ضرورت کا سامان دستیاب تھا۔ میں چاروں جانب کا جائزہ لیتے ہوئے ان گیراجوں کی جانب اپنے ساتھیوں سمیت بڑھا۔ حیدرآباد کے دونوں نوجوان بھی غم سے نڈھال ہمارے ساتھ ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے چل رہے تھے۔ ان کے غم میں، میں اپنا فیری میڈو بھولتا جا رہا تھا۔ ان سے سوالات کرتا تھا۔ کب روانہ ہوئے؟ آپ لوگوں کو کب اور کیسے معلوم ہوا؟ کیا پہلی بار فیری میڈو جا رہے تھے؟ پھر بار بار ان کو تسلیاں دیتا، گلے لگاتا، وہ رو رہے تھے۔ آنسو میری آنکھوں میں بھی بھر آئے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ ہمیں معلوم ہے کہ اتنی بلندی سے دریا میں گرنے کے بعد لاشیں نہیں مل سکتیں۔ ہم تو بس اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے یہاں آئے ہیں کہ دیکھیں ہمارے بھائی کہاں سے گرے تھے اور یہ سب ان کی ماؤں کو بتائیں تاکہ ان کا غم کچھ ہلکا ہو۔

ہم اپنے منوں وزنی پاؤں پر چلتے ان گیراجوں میں پہنچے۔ جیسے ہی سب کو لواحقین کا معلوم ہوا تو کچھ ہی دیر میں سب مقامی افراد بشمول ڈرائیوروں کے ہمارے اردگرد جمع ہوگئے۔ ان میں وہ بھی تھے جو خطرناک چٹانوں سے نیچے اتر کر لاشیں ڈھونڈنے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ بیٹھے تھے اور کچھ کھڑے ہوئے ہمیں بتا رہے تھے۔ ایک ڈرائیور کہہ رہا تھا کہ وہ چاروں اس دن بہت خوش تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ آپس میں مذاق کر رہے تھے۔ ڈرائیور نیا تھا۔ پہلے وہ چترال روٹ پر چلتا تھا۔ وہ اسی وقت روانہ ہوئے تھے۔ ڈرائیور سمیت وہ چاروں جیپ سمیت ایک موڑ کاٹتے ہوئے نیچے گر گئے۔ ان کو معلوم تب ہوا جب شام ہو رہی تھی۔ انہوں نے لکڑیوں سے اسٹریچر بنائے۔ ساتھ رسے لیے تاکہ لاشوں کو ان سے باندھ کر اوپر لاسکیں۔ خطرناک چٹانوں سے نیچے رائے کوٹ نالے تک اترے۔ رات ہوچکی تھی۔ جیپ نالے کے کنارے پر پڑی تھی۔ کافی دور ڈرائیور کی لاش پڑی ملی اور باقی نالے میں بہہ گئے۔ بہہ کر کہاں جاتے۔ کچھ ہی فاصلے پر سندھ غراتا ہوا بہہ رہا تھا۔ وہ ڈرائیور کی لاش اوپر لائے اور نماز جنازہ پڑھ کر چترال روانہ کردی۔ حیدرآباد کے لواحقین رونے لگے۔ شاہ جی مجھے دیکھ رہے تھے اور میں شاہ جی کو۔ ہماری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

ہمیں بیٹھے اور باتیں کرتے کافی دیر ہوگئی تھی۔ شاہد میرے کان میں بولا۔ ”چلنا ہے تو ابھی نکلیں، ورنہ یہاں شام ہوتے دیر نہیں لگتی۔“

میں نے سوچا واقعی یہاں شام ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ان دونوں لواحقین نے مجھے اٹھایا اور کہا۔ ”ہمارا جو ہونا تھا ہو چکا۔ آپ فیری میڈو ضرور جائیں۔ واقعی بہت خوبصورت جگہ ہے، ہم بھی تین سال پہلے جا چکے ہیں۔ اللہ مالک ہے۔ حادثے ہر روز تو نہیں ہوتے۔“

ایک نے مجھے گلے لگا لیا اور رونے لگا۔ اس کے دو بھائی ہلاک ہو چکے تھے۔ میں بھی آب دیدہ ہوگیا۔

شاہد نے پہلے ہی سے ایک جیپ والے سے بات کر لی تھی اور میں بھیگی آنکھوں سمیت سید حاڈ ڈرائیور کے ساتھ، جیپ میں آگے بیٹھ گیا۔ سامان اشفاق اور شاہد نے پہلے ہی لوڈ کر لیا تھا۔ وہ پہلے سے ہی شاکی تھے کہ میں نے بہت دیر کردی ہے۔ ہمیں تاتو دو گھنٹے میں پہنچنا تھا اور آگے تین گھنٹے سے زائد کا فیری میڈو کا ٹریک تھا۔ جیپ پہلے سے اسٹارٹ تھی، میرے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گیئر بدلا، موڑ کاٹا اور پھر ہم موت کی وادی کے مسافر بنے آگے بڑھتے چلے گئے۔

(جاری ہے)

مرد بحران

زویا اعجاز

اس کی زندگی بحران کی زد میں رہی، لمحہ بھر کو سکون ملتا کہ پھر کوئی نیا بحران گھیر لیتا۔ اتنے بحرانوں کی زد میں رہتے ہوتے بھی وہ اپنے چاہنے والوں کو مایوس نہیں کرتا، کھیل کے میدان میں اترتے ہی مرد میدان بن جاتا۔ اس کے پرستار اس کی کارکردگی دیکھتے، جھوم جھوم اٹھتے مگر کوئی اس کے زخم دل کا مداوا نہیں کرتا۔

مقبولیت کی معراج پر پہنچنے والے ایک کھلاڑی کا ذکر خاص

24 مارچ 2015ء کا دن دو مختلف براعظموں کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ آکلینڈ کی سرزمین پر طلوع ہونے والا سورج اپنے جلو میں بے پناہ سنسنی سمیت لایا تھا۔ کرکٹ کا گیارہواں عالمی کپ اپنے اختتام کی جانب گامزن تھا۔ سیمی فائنل مقابلوں کے پہلے میچ میں نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقا کو اپنی بقا کی دھواں دھار جنگ درپیش تھی۔ یہ میچ دونوں ہی ممالک کے عوام اور کھلاڑیوں کے لیے جذباتی اہمیت کا حامل تھا۔ میزبان نیوزی لینڈ کی ٹیم قبل ازیں عالمی کپ کے چھ سیمی فائنل کھیل چکی تھی۔ لیکن فائنلسٹ بننے کا اعزاز حاصل کرنے میں ہنوز ناکام تھی۔ رواں ٹورنامنٹ ان کے لیے بہت یادگار ثابت ہو رہا تھا اور اب تک کھیلے گئے تمام میچز میں وہ ناقابل تسخیر رہے تھے۔ لیکن مقابل ٹیم بھی بہترین عالمی رینکنگ کے حامل کھلاڑیوں پر مشتمل جنوبی افریقا جیسی ٹیم تھی جو باؤلنگ، بیٹنگ اور فیلڈنگ میں لاثانی تھی۔ عالمی مقابلوں میں انہیں چوکرز کا خطاب حاصل تھا کیونکہ وہ ہمیشہ ناک آؤٹ مراحل تک پہنچ کر کسی نہ کسی اتفاق یا بدقسمتی کی بدولت ٹورنامنٹ

سے باہر ہو جاتے تھے۔ لیکن اس بار معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ پہلی مرتبہ کسی ناک آؤٹ مرحلے سے سرخرو ہونے میں کامیاب رہے تھے۔ امنگیں جوان تھیں اور ارادے مہمیز تھے۔ ٹاس جیت کر جنوبی افریقا نے پہلے بیٹنگ کا فیصلہ کیا۔ ایک محتاط اور قدرے سست آغاز کے بعد انہوں نے گیم پلان تبدیل کرتے ہوئے روایتی جارحانہ انداز میں کھیلنا شروع کر دیا۔ ان کے کپتان نے اپنے ترکش کے تمام تیر آزماتے ہوئے اپنی ٹیم کو ایک مضبوط پوزیشن میں لا کھڑا کیا۔ لیکن ماضی کی روایات کے عین مطابق اس دن بھی انہیں بیرونی عوامل سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا تھا۔ تاریخ ایک دفعہ پھر خود کو دہراتی محسوس ہو رہی تھی۔ بارش بار بار کھیل میں رخنہ انداز ہو رہی تھی۔ بالآخر کرکٹ کے قانون کو حرکت میں آنا پڑا۔ اور کھیل 43 اوورز تک محدود کر دیا گیا۔ نیوزی لینڈ کو فائنل میں رسائی کے لیے 43 اوورز میں 299 رنز درکار تھے۔ دوسری اننگز میں کئی ڈرامائی موڑ آئے۔ جیت کی دیوی کبھی نیوزی لینڈ پر مہربان نظر آتی تو کبھی اس کا دست شفقت جنوبی افریقا کے حق میں محسوس ہونے لگتا۔ لیکن ان سے پے در پے کئی بھیانک غلطیاں سرزد ہوئیں جو کھیل کا پانسا پلٹ چکی تھیں۔ میچ اب آخری اوور میں آن پہنچا تھا۔ جیت نیوزی لینڈ سے محض بارہ رنز کی دوری پر تھی۔ کپتان نے گیند اپنے بہترین باؤلر ڈیل سٹین کو تھما دی۔ یہ وہی باؤلر تھا جس نے ٹھیک ایک سال قبل اسی ٹیم کے خلاف عالمی کپ ہی کے ایک میچ کے آخری اوور میں سات رنز کا دفاع نہایت کامیابی سے کیا تھا۔ تاہم اس دن اس کا تمام تر تجربہ، جارح مزاجی اور کوششیں ناکام رہیں۔ تینتالیسویں اوور کی پانچویں گیند پر گرانٹ ایلیٹ نے ایک فلک بوس چھکا رسید کیا تو اسٹیڈیم میں موجود ہزاروں تماشائی خوشی سے گویا دیوانے ہو گئے۔ دوسری طرف جنوبی افریقی کھلاڑیوں پر سکتہ طاری تھا۔ جو کھلاڑی گراؤنڈ میں جس پوزیشن پر کھڑا تھا وہیں ڈھے گیا۔ مورنی مورکل، ڈوپلیسی بچوں کی طرح اشک بہا رہے تھے۔ ان کا قائد، مرد بحران اے بی ڈی ویلیئرز بھی ہونٹ بھینچے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں ناکام نظر آ رہا تھا۔ وہ آٹھ سال کی عمر سے اپنے ملک کے عالمی چیمپئن بننے کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن ہنوز دلی دور است کے مصداق ایک بار پھر اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا تھا۔ جس کا درد اور اذیت اس کے بہتے آنسوؤں میں عیاں تھی۔ دنیا کے ہر گوشے میں یہ منظر کروڑوں دلوں کو آزردہ کر گیا تھا اور پہلی بار تعصب، قومیت، رنگ، نسل اور فرقے سے بالاتر ہو کر سب شائقین کرکٹ نے اس کے آنسو اپنے دلوں پر گرتے محسوس کیے تھے۔ عالمی کپ میں شکست پر آنسو بہانے والا وہ پہلا کھلاڑی نہ تھا اس سے قبل اس خواب کے ٹوٹنے پر بہت سے کھلاڑی اس جذباتی ردعمل سے گزر چکے تھے جن میں ویرات کوہلی، مصباح الحق اور شاہد آفریدی جیسے بڑے نام شامل ہیں۔ لیکن ان کا درد صرف ان کے اپنے عوام محسوس کر پائے تھے۔ ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ کسی کے تیر بیک وقت ہر براعظم کے عوام کو افسردہ کریں۔

بلاشبہ یہ ایک تاریخی لمحہ تھا۔

ڈی ویلیئرز کو یہ عالمی شہرت و محبت راتوں رات حاصل نہیں ہوئی۔ اس کی داستانِ حیات اس کے خلوص، لگن، جنون اور انتھک محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ابراہام بینجمن ڈی ویلیئرز کی ولادت 17 فروری 1984ء میں پریٹوریا (صوبہ ٹرانسوال) میں ہوئی۔ وہ تین بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ اس کے والد ڈاکٹر جبکہ والدہ جائیداد کے شعبہ میں کام کرتی تھیں۔ اس کا بڑا بھائی جان نو سال جبکہ ویسلو چھ سال کا تھا۔

اس کے گھر میں بچوں پر پڑھائی کا بے جا بوجھ لادنے کی روایت نہ تھی۔ اسے نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں شمولیت کی اجازت تھی۔ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ گھر کے گرد واقع گراؤنڈ میں کھیلا کرتا تھا۔ اپنے بچپن کے اس دور کی یادیں تازہ کرتے ہوئے ابراہام کا کہنا ہے۔ "میں بچپن میں اپنے بھائیوں جان اور ویسلو کے ساتھ گراؤنڈ میں کھیلتا تھا جہاں ان کے ہم عمر دوسرے بھی کھیلنے آیا کرتے تھے۔ وہ وقت میرے لیے بہت سخت ہوتا تھا۔ وہ سب میٹرک کے طالب علم تھے جبکہ میں ان میں سب سے چھوٹا تھا۔ مجھے اکثر انہیں پانی پلانے کے فرائض سونپے جاتے تھے۔ سارا دن یہ فرائض سرانجام دینے کے بعد بلا مجھے تھمایا جاتا تھا جو اس وقت میرے لیے بہت وزنی ہوتا تھا۔ بھائیوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ مجھے جلد از جلد گیم سے باہر کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ لطف اندوز ہو سکیں۔ میٹرک کے ان سب لڑکوں کے مابین میرے ساتھ ایک دودھ پیتے بچے جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ بیخے کو بیلا بیلا میں ہمارے گھر ہونے والی گیمز بہت سخت ہوتی تھیں۔ میرے بھائی بہت بے رحم اور سنگدل ثابت ہوتے تھے۔ یہ گیمز اکثر آنسوؤں پر ختم ہوتی تھیں اور وہ آنسو ہمیشہ میرے ہوتے تھے۔"

ابراہام نے بچپن ہی سے بہت سخت مقابلہ دیکھا تھا۔ اپنے بھائیوں اور دیگر لڑکوں میں اپنا آپ منوانے کے لیے

وہ اپنی جان لڑا دیا کرتا تھا۔ اسے ان مقابلوں میں کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں دی جاتی تھی۔ ہر گزرتا دن اس کے لیے سخت سے سخت تر مسابقت لاتا تھا۔ وہ جان توڑ محنت کرتا تھا۔ اکثر اسے شکست کا تلخ مزہ ہی چکھنا پڑتا تھا۔ لیکن یہی تربیت اسے ایک دن ایک ایسے مقام پر لے آئی جہاں وہ ہر طرح کے پریشر اور نامساعد حالات کا کامیابی سے مقابلہ کرتے ہوئے سرخرو ہونے لگا۔

کھیلوں کا شوق اس کے خاندان میں گویا لہو کی طرح دوڑتا تھا۔ اس کے والدین اور بھائی بھی کسی نہ کسی سطح پر کھلاڑی تھے لہٰذا ابراہام کا مستقبل میں کھلاڑی بننے کا جنون ان کے لیے کسی اچنبھے کا باعث نہ تھا۔ ابراہام کا کہنا ہے "مجھے اپنے بچپن میں کوئی ایک بھی ایسا دن یاد نہیں پڑتا جب میں کھیل سے دور رہا ہوں۔"

قدرت نے ابراہام کو بہت سی صلاحیتوں سے نواز رکھا تھا جس کا اسے بخوبی احساس بھی تھا۔ اسکول میں ایک سائنس پراجیکٹ میں کامیابی پر اسے نیلسن منڈیلا کی جانب سے ایک میڈل دیا گیا تھا۔ وہ ہر قسم کے کھیل یکساں مہارت سے کھیل سکتا تھا۔ ہر وہ چیز جو کھیل میں شمار ہوتی تھی ابراہام اس سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔

کرکٹ اس کا پہلا انتخاب اور پہلی چاہت کبھی بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا اولین جنون ٹینس تھا۔ اس نے انڈر نائن ٹورنامنٹس کے لاتعداد مقابلوں میں حصہ لیا۔ اور اپنے پہلے ہی مقابلے میں آئزک وین سروی جیسے کھلاڑی کو شکست دی جس نے آگے چل کر ٹینس میں جنوبی افریقا کی قومی سطح پر نمائندگی کی تھی۔ اے بی ۱۲ سال کی عمر تک ٹینس کھیلتا رہا تاہم بعد ازاں دیگر کھیلوں میں رغبت کے باعث اس نے ٹینس سے کنارہ کشی کر لی۔

۱۳ سال کی عمر میں اس نے افرقنز ہائی اسکول میں داخلہ لیا جسے افیز بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اسکول کھیلوں کے فروغ میں بہت شہرت رکھتا تھا۔ فاف ڈوپلیسی اور جیک روڈولف بھی اسی اسکول میں زیر تعلیم تھے جنہوں نے بعد ازاں جنوبی افریقی کرکٹ ٹیم کی قومی سطح پر نمائندگی بھی کی۔ اس اسکول میں اسے اپنی صلاحیتوں کو نکھارنے کے بھرپور مواقع میسر آئے۔ اساتذہ اور کوچز کی جانب سے لاگو کردہ سخت نظم و ضبط نے بحیثیت کھلاڑی اس کی شخصیت پر بہت دوررس اثرات مرتب کیے۔ اسے سابق جنوبی افریقی ٹیسٹ وکٹ کیپر ڈینس لنڈسے کی جانب سے بھی بھرپور کوچنگ ملی جس نے اسے وکٹ کیپنگ کے تمام اسرار و رموز سکھا دیے۔ وہ اسکول کی انڈر 14 ٹیم کا اہم حصہ تھا۔ اس کے اسکول میں رگبی کا کھیل سب سے زیادہ مقبول تھا۔ پھر بھلا وہ اس میں طبع آزمائی سے کیسے پیچھے رہتا؟

ایک وقت میں اسے ہاکی کھیلنے کا بھی بہت جنون رہا۔ اپنی قدرتی صلاحیتوں کے باعث وہ اسکول کی انڈر 16 ہاکی ٹیم کا حصہ بھی بنا اور ٹیم کی جیت میں نمایاں کردار ادا کرتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے ہاکی چھوڑ دی اور اس کا رجحان ایک بار پھر رگبی کی طرف ہو گیا۔ بھرپور محنت اور لگن نے اسے اسکول کے بہترین ۱۵ لڑکوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس کی شاندار کارکردگی کے باعث اسے انڈر ۱۸ کی سطح پر بلیو بالز (صوبائی رگبی ٹیم) کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ بلیو بالز اس وقت جن کھلاڑیوں پر مشتمل تھی انہوں نے مستقبل میں جنوبی افریقا کی قومی رگبی ٹیم کی بھی نمائندگی کی۔

علاوہ ازیں ابراہام نے اسکول میں تیراکی کے کئی مقابلوں میں بھی کامیابی حاصل کی اور انڈر 19 سطح پر بیڈمنٹن بھی کھیلتا رہا۔ بنیادی طور پر اس نے جو بھی کھیل کھیلا اس میں اپنی برتری اور ہنر ثابت کرنے میں کامیاب رہا۔ اپنے بچپن کی یادوں کو دہراتے ہوئے اس کا کہنا ہے۔ "بچپن میں جب بھائیوں اور میرے پاس کھیلنے کے لیے کچھ نہ ہوتا تھا تو ہم گھر کے پاس واقع پہاڑی پر چڑھنے اور اترنے کی دوڑ لگایا کرتے تھے۔"

ان کی ابتدائی سرگرمیوں اور بھرپور محنت نے اسے مستقبل میں ہر قسم کے کھیل میں ارفع ثابت کیا۔

اب وہ عمر کے اس دور میں تھا جہاں اسے کسی ایک کھیل کو مستقل طور پر اپنانا تھا۔ اس کے لیے اس نے اپنے ابتدائی جنون کرکٹ کا انتخاب کیا۔ اس کا کہنا ہے۔ "میں آٹھ سال کا تھا جب آسٹریلیا میں ہونے والے 1992ء کے عالمی کپ میں میری ٹیم دو عشروں کے بعد کرکٹ کھیلنے گئی تھی۔ پاکستان کے خلاف ایک میچ میں جونٹی رہوڈز نے جس طرح اڑتے ہوئے انضمام الحق کو رن آؤٹ کیا۔ میرے ذہن پر اس نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ مجھے یہ کھیل بہت زبردست لگا اور میں نے جونٹی کے نقشِ قدم پر چلنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ میں نے بہت سے کھیلوں میں حصہ لیا لیکن جب مجھے سولہ سال کی عمر میں جنوبی افریقی کو کرکٹ ٹیم کے لیے منتخب کیا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ ہاں کرکٹ ہی وہ کھیل ہے جس میں مجھے بہت کچھ کرنے کے مواقع میسر آ سکتے ہیں۔ میں نے مزید محنت

جندرلی

جندرلی، عثمانی ترکوں میں علما اور سیاست دانوں کا ایک خاندان تھا۔ یہ خاندان 750ھ / 1350ء تا 905ھ / 1500ء تک ممتاز اور نمایاں رہا۔ اس خاندان سے پانچ افراد وزیرِاعظم بنے۔ پرانے ماخذوں میں اس خاندان کا نام چندرلی اور جندرلی ہے۔ اس خاندان کے مشہور افراد مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ خیرالدین خلیل بن علی: جو کرہ خلیل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ یکے بعد دیگرے بلجک، ازنک اور برسہ کا قاضی رہا۔ مراد اوّل نے مسند نشینی کے بعد جلد ہی اسے قاضی عسکر کے عہدے پر مقرر کیا۔ غالباً 783ھ / 1381ء میں اسے وزیر بنا دیا گیا۔ وہ پہلا وزیر تھا جسے ملکی نظم ونسق کی نگرانی کے ساتھ فوج کی قیادت بھی دی گئی تھی۔ وہ مغربی تھریس، مقدونیہ اور تھسلی کی فتوحات میں بھی برابر شریک رہا۔ کرمان کی جنگ کے دوران میں اسے سلطان مراد نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے روم ایلی میں تعینات کر دیا۔ جہاں وہ 789ھ / 1387ء میں وفات پا گیا۔ اس کا بیٹا الیاس بیگلر بیگی ہوا جس نے بایزید اوّل کے عہد میں انتقال کیا۔

2۔ علی پاشا: اس نے بھی وزیرِاعظم کے طور پر مراد اوّل، بایزید اوّل اور امیر سلطان کی خدمات انجام دیں۔ اس نے 809ھ / 1406ء میں انتقال کیا۔

3۔ ابراہیم پاشا: 808ھ / 1406ء میں برسہ کا قاضی تھا۔ 818ھ / 1415ء میں قاضی عسکر بنا۔ 823ھ / 1420ء کی ایک دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں وہ وزیرِ دوم تھا۔ مراد ثانی جب خلیفہ بنا تو بایزید پاشا (وزیرِاعظم) تخت کے مدعی مصطفیٰ کے ہاتھوں مارا گیا اور ابراہیم اس کی جگہ وزیرِاعظم بنا پھر مرتے دم تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اس نے بعارضہ طاعون 24 ذیقعدہ 832ھ / 25 اگست 1429ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنے دور میں ایک محتاط اور دانشمندانہ خارجی حکمتِ عملی اختیار کی۔

4۔ خلیل پاشا: ابراہیم پاشا کا بڑا بیٹا تھا۔ 847ھ / 1443ء تک وزیرِاعظم کے عہدے پر فائز رہا۔ 850ھ / 1446ء میں اس نے مراد کو دوبارہ تخت نشین کروانے میں جو کردار ادا کیا نیز بزنطی شہنشاہ کے ساتھ ساز باز رکھنے کے نتیجے میں محمد ثانی نے ناراض ہو کر فتح قسطنطنیہ کے بعد 857ھ / 1453ء میں اسے قتل کروا دیا۔

5۔ ابراہیم پاشا: خلیل پاشا کا بیٹا۔ 833ھ / 1430ء میں پیدا ہوا۔ جب خلیل سلطان کی نظروں میں معتوب ہوا تو اس وقت ابراہیم ادرنہ کا قاضی تھا اور 869ھ / 1465ء تک اس عہدے پر فائز رہا۔ بعد میں قاضی عسکر بنایا گیا۔ 878ھ / 1473ء تک وہ سلطان بایزید کا لالہ (وزیر کے منصب کے ساتھ) تھا۔ بایزید ثانی نے اپنی تخت نشینی کے بعد 890ھ / 1485ء میں روم ایلی کا قاضی عسکر بنایا۔ لیکن اگلے سال 891ھ / 1486ء میں اسے اپنا وزیر مقرر کیا۔ 903ھ / 1498ء میں وزیرِاعظم بنا لیکن اس کے دو سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ابراہیم پاشا کے بعد جندرلی خاندان میں پھر کوئی اس منصب پر فائز نہ ہو سکا اور یہ خاندان معرضِ گمنامی میں پڑ گیا۔

مرسلہ: راشش عطاری، کراچی

کرنی شروع کر دی۔ میں اپنے ہم عصر کھلاڑیوں میں خود کو بہترین ثابت کرنا چاہتا تھا۔"

قسمت بھی اپنی نادیدہ ڈوریاں ہلا رہی تھی۔ انڈر 19 ٹیم کی جانب سے کھیلتے ہوئے ٹائٹنز کے کوچ ڈیو نوسورتھی کی نظرِ کرم ابراہام پر پڑ گئی جس نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپتے ہوئے اسے براہِ راست ٹائٹنز کی طرف سے کھیلنے کے لیے مدعو کر لیا۔ اسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع بہت جلد مل گیا۔ ڈیو نے عالمی کپ 2003ء کے ایک وارم اپ میچ میں کینیڈا کے خلاف اپنی ٹیم کی طرف سے کھیلنے کا موقع دیا۔ ابراہام کی سلیکشن پر کافی لے دے بھی ہوئی کیونکہ وہ اس وقت صرف 19 سال کا تھا۔ لیکن اس نے سنچری بنا کر اپنے ناقدین کے منہ بند کر دیے۔ ان لمحات کو یاد کرتے ہوئے اے بی نے ایک بیان میں کہا۔ "وہ پہلا موقع تھا جب میں ایک ایسا میچ کھیل رہا تھا جو ٹی وی پر براہِ راست دکھایا جا رہا تھا۔ فطری طور پر میں تھوڑا گھبراہٹ کا شکار ہو گیا تھا مگر میں نے ہمیشہ دباؤ میں ہی کامیابی حاصل کی ہے۔ میری تمام تر صلاحیتیں دباؤ ہی کے تحت پروان چڑھی ہیں، خاص طور پر جب مجھ پر لوگوں کی توجہ بھی مرکوز ہو۔ زندگی میں اگر خود کو منوانا ہے تو زندگی سے مواقع ہتھیانے پڑتے ہیں اور میں نے اس سنہری موقع کو دونوں ہاتھوں سے چھینا۔"

اس کے بعد ٹائٹنز نے اس کے ساتھ باقاعدہ کانٹریکٹ کر لیا۔ نوسورتھی کے بے حد اصرار پر اس نے یونیورسٹی کرکٹ سے دوری اختیار کر لی۔ کیونکہ نوسورتھی کی خواہش تھی کہ ابراہام اب کرکٹ کو باقاعدہ بطور پیشہ اختیار کرے۔ اپنی پہلی چار صوبائی اننگز میں اس نے مسلسل تقریباً اسکور کیں انڈر 19 ٹیم کے دورۂ انگلینڈ میں اے بی ایک اسٹار ثابت ہوا 2004ء میں شمالی آئرلینڈ میں کرکٹ کلب آف آئرلینڈ کے ممبر کے طور پر اس نے بہت شاندار سنچریاں بھی بنائیں۔ اے بی کا کہنا ہے۔ "وہ میری زندگی کا بہت اہم موڑ تھا کیونکہ میں پہلی دفعہ اپنے گھر اور خاندان سے دور رہ رہا تھا۔ اس دوران میں نے زندگی سے خود مختاری اور خود اعتمادی سیکھی۔"

اس کی کارکردگی جلد ہی ہر جگہ سرخیوں کا مرکز بن گئی اور اسے جنوبی افریقا کی A ٹیم میں شمولیت کا بلاوا آ گیا۔

اتفاق ایسا ہوا کہ جنوبی افریقی قومی کھلاڑیوں کی کارکردگی ان دنوں زوال پذیر تھی اور سلیکٹرز نئے باہنر کھلاڑیوں کی تلاش میں تھے۔ بیس سالہ ابراہام بینجمن ڈی ویلیئرز اس وقت موزوں ترین کھلاڑی تھا لہٰذا اسے انگلینڈ کے خلاف دسمبر 2004ء میں پورٹ الزبتھ میں ٹیسٹ کیپ دی گئی۔ ایک بیان میں اس نے کہا۔ "مجھے ٹیسٹ کرکٹ سے بہت لگاؤ ہے۔ دباؤ اور شدت سے مجھے بے پناہ محبت ہے۔ جب میں ڈربن میں بیٹنگ کر رہا تھا مجھے تماشائیوں کی آوازیں بالکل سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ جب آپ صوبائی سطح سے قومی سطح پر پہنچ کر کھیلیں تو فطری طور پر چند اوہام اور شکوک کا شکار ہو جاتے ہیں۔ تاہم اگر یہ شکوک و اوہام آپ پر حاوی ہو جائیں تو آپ زوال پذیر ہونے لگیں گے۔ کرکٹ کو اپنا کیریئر بنانا اور پھر قومی سطح پر ملک کی نمائندگی کرنا میرے لیے ایک دیرینہ خواب کی سہانی تعبیر تھی۔ ماضی میں ہم نے کچھ غلطیوں اور غیر مستقل مزاجی کا بہت تاوان ادا کیا ہے۔ لیکن اب ہم نے اپنے لیے کچھ اہداف مقرر کر کے مستقل مزاجی سے کام کرنا سیکھ لیا ہے۔ ہم نے دلیرانہ کرکٹ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

اے بی ڈی ویلیئرز اس وقت جنوبی افریقی کرکٹ ٹیم کا اہم ترین حصہ ہے۔ کرکٹ کے ہر فارمیٹ میں اس کی شمولیت ناگزیر ہے۔

ابراہام کے لیے زندگی محض کرکٹ ہی پر توجہ مرکوز رکھنے کا نام نہیں ہے۔ میدان سے باہر اسے اپنے دوستوں اور خاندان کے ساتھ وقت گزارنا بہت پسند ہے۔ وہ گالف، ٹینس اور گٹار سے بھی کافی رغبت رکھتا ہے۔ اے بی اور اس کے دوست ایمی ڈو پریز کا ایک مشترکہ گانا show them who you are ریلیز ہو چکا ہے۔ جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ 2009ء میں پروٹیز کی آسٹریلیا کے خلاف شاندار فتح پر یہ گانا بطور ترانہ گایا جاتا رہا۔ پرائمری اسکول میں پیانو کے لیے گئے اسباق اور اسکول طائفہ کے ساتھ گائے گئے گانوں نے اسے اس شعبہ میں اجنبیت محسوس نہیں ہونے دی۔ مختلف ممالک کے دوروں میں وہ اپنے ساتھ گٹار ضرور رکھتا ہے۔ ابتدائی گانے کی کامیابی کے بعد وہ اپنے دوست کے ساتھ کئی گانے خود لکھ کر گا چکا ہے۔

اپنے بھائی کے ساتھ فاسٹ فوڈ کے کاروبار میں وہ شراکت دار ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے کیٹرنگ کے کاروبار میں بھی قسمت آزمانے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ یہ کاروبار اس کے کرکٹ کے بعد مستقبل بعید کی حکمتِ عملی میں شامل ہیں۔

2009ء میں ایک انٹرویو میں اس سے سوال کیا گیا "کیا آپ خود کو چالیس سال کی عمر تک کھیلتا دیکھتے ہیں؟"

اے بی نے جواب دیا۔ "نہیں! بالکل نہیں۔ زندگی میں

کرکٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ میں جب مناسب سمجھوں گا اور اپنا خاندان بنالوں گا تو یقینی طور پر ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دوں گا۔ اس کے لیے میں زندگی کے چالیسویں سال کا انتظار بالکل نہیں کروں گا۔"

اے بی ڈی ویلیئرز فلاحی تنظیموں میں شمولیت اور رفاہِ عامہ کے کاموں کے متعلق بھی بہت پُرجوش ہے۔ اس کی ایک تنظیم Make A Difference Foundation ہے جس کو کینسر کے بہترین اسکوں میں پڑھائی کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ اس کا کہنا ہے۔ "میں ایک مخلص بیماری ہوں۔ لگتے تک یقینی سے اہداف مقرر کرکے لوگوں کی زندگیوں میں مثبت تبدیلیاں لانے کی طرف پیش قدمی کرنا بہت پسند ہے۔ میں ہر کھلاڑی سے اس دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کا کہتا ہوں۔ زندگی کے اس سوئمبر پروگرام میں بھی ایک خوب قدآور ہے۔ میں اپنی ذات کے لیے نہیں جیتا۔ آج کا یہ خواب کل ایک خوشگوار تعبیر بھی بن سکتا ہے۔ جنوں کی مثال عشق اور خود اختیاری سے بالاسالی ہے کی جاسکتی ہیں۔ کامیابی 99 فیصد خود اختیاری سے حاصل ہوتی ہے۔ آپ کو اپنی صلاحیتوں پر مکمل بھروسا ہونا چاہیے۔ اگر آپ کو کسی بھی صورتحال کی کنجی اور جنون سے فتح ملنے تک آپ بھی فطری طور پر بردبار ہو جائیں گے۔"

ابراہام جیکبس ڈی ویلیئرز کی شادی ڈینیل سوارٹ کے ساتھ 6 سالہ شادی کے بعد ہوئی ہے۔ دونوں بیٹا بیٹا ملا میں واحد ابراہام کے والد کے فارم ہاؤس پر پلے بڑھے۔ ڈینیل بھارت میں ہونے والے آئی پی ایل میچز دیکھنے کے لیے اس کے ہمراہ ہوتی تھی۔ ابراہام آئی پی ایل میں رائل چیلنجرز بنگلور کی نمائندگی کرتا ہے۔

اے بی ڈی ویلیئرز کا کرکٹ کیریئر فقید المثال اور حیران کن کامیابیوں سے بھرپور ہے۔ وہ کبھی زوال پذیر نہیں رہا۔ مسلسل مواز کامل کنٹرول کے ساتھ کوئی بھی شاٹ کھیل سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے کرکٹ حلقوں میں مسٹر 360 کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ ابراہام کے چند اہم ترین کامیابیاں ریکارڈز حسب ذیل ہیں۔

☆ 18 جنوری 2015ء کو وائٹ وارسٹیڈیم جوہانسبرگ میں اے بی ڈی ویلیئرز نے انگلینڈ کے خلاف 16 گیندوں پر ففٹی اور 31 گیندوں پر سنچری اسکور کرکے ہارنے کرکٹ کو فتح ظفر میں ڈھال دیا۔

☆ کرکٹ میں ٹیسٹ کے بعد اس نے جنوبی افریقہ کی طرف سے تمام تر ٹیسٹ میچز (98) کھیلے ہیں۔ اسے بھی کسی سچی میں ڈراپ نہیں کیا گیا۔

☆ ایک روزہ کرکٹ میں 7000 رنز کا سنگ میل تیز ترین رفتار میں عبور کرنے والا پہلا کھلاڑی ہے۔

☆ وائٹ وارسٹیڈیم جوہانسبرگ میں ویسٹ انڈیز کے خلاف ایک روزہ میچ میں 16 چھکے لگا کر بھارت کے دو سب سے زیادہ چھکے اور ایسٹ انڈیز کے کرس گیل کا ریکارڈ برابر کیا۔

☆ اے بی ایک ہائبرڈ بیٹ ریکارڈ کا حامل بھی ہے۔ عالمی کپ 2007ء میں چار مرتبہ میچ آؤٹ ہوا۔ اس کے علاوہ یہ ریکارڈ کرکٹ کمیٹی اور کونسل سینگ گمن کے پاس بھی ہے۔

☆ کسی بھی پالی کپ میں سب سے زیادہ (37) چھکے لگانے کا ریکارڈ رکھنے کے علاوہ وہ اے بی ڈی کے نام سے۔

☆ دو جنوبی افریقا کی جانب سے کسی بھی عالمی کپ میں سب سے زیادہ اسکور کرنے والا کھلاڑی ہے۔

☆ اے بی ڈی ویلیئرز نے ایک روزہ کرکٹ کی تیز ترین ففٹی سنچری اور 150 رنز اسکور کیے ہیں۔

ایک روزہ کرکٹ میں وہ عالمی نمبر ایک اور ٹیسٹ کرکٹ میں عالمی نمبر دو کی پوزیشن پر براجمان ہے۔ اس کے دماغ چوری دنیا میں موجود ہیں۔ وہ کسی ایک طرز نے پاکستان کا پسندیدہ کھلاڑی نہیں ہے۔ اس کی ہر جہت شخصیت، تھن، تکنیک نیت اور ایمانداری نے اس کی ذات کو ایک متاثر کن صلاحیتوں عطا کردہ ہے جس کی طرف ہر نگ دنسل کے شائقین کھنچے چلے آتے ہیں۔ اس کی زندگی جدوجہد مسلسل سے عبارت ہے۔ جنوبی افریقہ کے علاوہ بھی تمام دنیا اسے ایک آئیڈیل کھلاڑی تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے کنٹرول تھنک ہونے کی مثالیں دیتی ہے۔ اس کی انتھک محنت اور کھیل کے جنون کو کوئی گرہن کبھی نہ پہنچا سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں وہ اس کو ختم نہ کر سکے۔ ریٹائرڈ ہونا ہے۔ تین تک تخمینے کے لیے کسی بھی دوسرے کھلاڑی کو ایک طویل عرصہ یاد رکھا جائے گا۔ کسی بھی انسان کو زندگی میں خوبیاں تمام حاصل کرنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اور عام طور پر کسی بھی کھلاڑی کی صلاحیتوں کو اس کی ریٹائرمنٹ کے بعد ہی زیادہ صحیح پرکھا جاتا ہے۔ لیکن اے بی ڈی ویلیئرز ایک زندہ لیجنڈ ہے۔ جس کی لگن نے اسے کبھی ترک نہ ہونے دیا۔ اس کی عاجزی اور بے لوث فطرت اسے کبھی نہ زوال سے بچائے ہوئے ہے۔ بلا شبہ وہ ایک ہر فن مولا کھلاڑی ہے۔

ملکۂ موسیقی

نور فرحان

فلم نگری عروج و زوال کی لازمی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ پاکستانی فلم نگری کو دانستہ تباہ کیا گیا یہی وجہ ہے کہ یہاں زوال پر کسی کہانیاں زیادہ ہیں مگر ایک ایسی بھی کلوکارہ ہے جو تقریباً آدھی صدی قبل سامنے آئی اور اب بھی جب سامنے آتی ہے تو مقبولیت کی حد پار کرتی نظر آتی ہے۔ یقیناً آپ بھی اس کے گیت سن کر محظوظ ہوتے ہوں گے۔ اس نے تحریمت گلوکارہ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا پھر اس نے مقبول اداکارہ کا تاج اپنے سر پر رکھا اپنام عروج میں ہی پیادیس سدھار گئی اور ایک اچھی ہیری کی طرح گھر گرہستن میں مشغول ہو گئیں۔ سب نے یہی سمجھا کہ شائقین اسے بھلا چکے ہیں لیکن جب وہ دو تین دہائی کے بعد پھر سے سامنے آئی تو لوگ اسی طرح سر دھننے لگے، جیسے روز اوّل مقبول تھی وہی مقبولیت برقرار رہی۔ ایسے فنکار کمیاب کہلاتے ہیں۔

پاک فلم نگری کی ایک مقبول گلوکارہ کا مختصر سا احوال

لاہور ریڈیو اسٹیشن پر ایک سریلے بچے رہتے تھے جن دنگلا گاکے گانے کے لیے اپنی آواز کا آڈیشن دینے اپنی ایک دوست کے ساتھ پہنچی۔ یادرہے یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے ہاں ریڈیو کے علاوہ انٹرٹینمنٹ کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ سیاسی خبریں ہوں، ڈرامے یا گانے ہوں، انہیں عوام تک پہنچانے کا ذریعہ صرف اور صرف ریڈیو تھا۔

یہ برمحل پوش لڑکی جب ریڈیو اسٹیشن پہنچی اور اس نے اپنے وجود کو برقع سے باہر نکالا تو دیکھنے والی لاہوں نے

دیکھا؛ ایک دیدہ زیب اور نوخیز تھی۔

ریڈیو پر پہلی آواز اکا دکا آنا شروع ہوئی تو اکثر لوگوں نے سمجھا کہ شاید کوئی ٹرانسمیٹر میرے ہے ہوگا۔ کوئی ڈراموں میں صداکاری کرنے لگا تو کوئی گانے لگا۔ کوئی دکھ پر مبنی ڈراموں میں صداکاری کے لیے آڈیشن دیتا تھا۔

اس لڑکی سے پوچھا گیا۔ ”تم کس شعبے کے لیے آڈیشن دو گی؟“

”گلوکاری کے لیے۔“

فضا اس کا آڈیشن لاہور ریڈیو کے پروگرام عہد الغنی قریشی اور گلوکارہ امت الرشید نے لیا۔ امت الرشید نابینا ہونے کے باوجود ریڈیو کی بہت اچھی اور بھی بھی گلوکارہ اور ریڈیو کی پیڈ ٹاپ گیسٹ۔

آڈیشن کے بعد عہد الغنی قریشی نے کہا۔ ”اپنے آڈیشن کا نتیجہ اگلے ہفتے آکر معلوم کر لینا۔“

لڑکی اپنی سہیلی کے ساتھ واپس چلی گئی تو امت الرشید نے کہا۔ ”قریشی صاحب! کیا بات تو یہ ہے کہ اسے ابھی اسی وقت بتا دینا چاہیے تھا کہ کیا اس میں کمی ہے یا خوبی ہے۔ مجھے تو یہ لڑکی بہت اچھی آواز معلوم ہوئی ہے۔“

”آپ غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔“ قریشی صاحب نے جواب دیا۔ ”مگر آپ جانتی ہیں کہ ہمارا اصول یہ ہے کہ جس فیصلہ سے کسی کو بھی اس کا آواز سے کوئی دور کا بھی واسطہ ہو گا اسے آڈیشن کا نتیجہ معلوم کرنے کی تو اسے یہ خوش خبری سنا دی گئی۔

”اب ہم نہیں دنیا تو گانے کے لیے بلائیں گے۔“

لڑکی کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ یہ خوشگوار واقعہ 1953ء میں پیش آیا تھا۔ یعنی آج سے کوئی 62 برس پہلے۔ اس زمانے میں لڑکا رنگ کا رواج رائج نہیں تھا کیونکہ یہ گیتا دت ہی کی ہوا سے ہر ایک میں نہیں بھی تھی۔ اس نئے سیاسی حالات و واقعات اور ذرا رسموں کی طرح گانے بھی برابر اوسط نشر کیے جاتے تھے۔ یہ لڑکی بھی ہولی آواز کے دکھ بھاؤں کے دردی درد ونگ بتلائے گی۔ ہر جنتے والا اس آواز سے متاثر ہوا تو کہ اسی کو معلوم ہوں تھا کہ آج کی یہ اچھی آواز نے والوں دن میں ایک مشہور آواز کہلائے گی اور وہ ایک معروف شخصیت کا روپ دھارنے والی ہے۔

ملیحہ مسعود نقوش

اور اس کے گانے ریڈیو کے ذریعے گلی گلی تک پہنچے تو اس کی آواز کے سحر میں گرفتار ہونے والوں نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تب انہیں یہ معلوم ہوا کہ وہ لاہور کے علاقے گوالمنڈی میں رہتی ہے۔ اس کے باپ کا نام خواجہ نذیر احمد ہے جو ایک کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور 1936ء میں ہی لاہور آکر بسی ہوا ہے۔ لاہور میونسپل کارپوریشن میں حیثیت رجسٹرڈ کنٹریکٹر کے کام کرتا ہے۔ یہ لڑکی 16 جولائی 1936ء کو گوالمنڈی شاہ والوں میں ہی پیدا ہوئی جب خواجہ نذیر احمد کو لاہور پہنچے ہوئے کئی مہینے ہی ہوئے تھے۔ اور اب انور العزت نے اس لڑکی کو بچپن میں سوتی شکل دی تھی اور اسی طرح صورت آواز سے بھی اسے نوازا تھا۔ اسے گانے کا شوق بچپن ہی سے تھا جو اس کی عمر کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا۔ جس محلے میں وہ رہتی تھی وہاں ایک کرسچین فیملی بھی آباد تھی۔ ان کی ایک لڑکی زور زور کر بھی مسیحی کا بڑا شوق تھا۔ جب اس لڑکی کو معلوم ہوا کہ کرسچین لڑکی زور زور سے بھی گانے کی شوقین ہے تو اسے اپنی ٹکی بنا لیا اور اس کے ساتھ مل کر گھر کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے لگی۔

اس کے والد زیادہ خوش حال نہیں تھے مگر اپنی اولاد دل کو بھی تعلیم دلوانے کے خواہش مند تھے۔ اپنی بیٹی کی پیدائش پر وہ اس قدر مسرت سے سرشار ہوئے کہ اس کا نام ہی مسرت رکھ دیا۔ اسے وہ ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسرت ڈاکٹر بن کر دکھی انسانوں کی خدمت کرے۔ اس لیے بیٹی مسرتی حسین کی اسی طرح ذہن کی اسکول میں داخل ہوئی تو پڑھائی میں غیر معمولی قسم کی ہوشیار بھی تھی۔ ہر جماعت میں امتیازی نمبروں سے پاس ہوئی تھی۔ میٹرک کا امتحان بھی اسی شان سے پاس کیا۔ اس کے بعد کوئینز میری کالج میں اسے داخل کرا دیا گیا۔ یہاں بھی اس نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان بہترین نمبروں سے پاس کیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی گلوکاری کا شوق بھی جاری رہا اور یہی شوق اسے ایک دن ریڈیو اسٹیشن لے گیا۔ اس کے والد بیرون کو اس بات کا علم تھا کہ اس کی بیٹی گانے کا شوق رکھتی ہے اور وہ اسے برا نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے جب وہ ریڈیو میں آڈیشن دینے کی بھی تو اس نے ان سے اس کی اجازت لی بھی اور آڈیشن میں کامیاب ہونے کی خوش خبری سنانے کے بعد ریڈیو سنگر کے طور پر گانے کی بھی باضابطہ اجازت لی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عام طور پر آج کی طرح نوجوان نسل مادر پدر آزادیں نہیں تھی۔ اپنے ماں باپ اور بڑوں کی فرمانبردار ہوا کرتی تھی۔

ملیحہ مسعود نقوش

ریڈیو کے سامعین اس کی سنگر کی آواز کے سحر میں ایسے مبتلا ہوتے گئے ویسے ویسے اس کی شہرت اس کی آواز کی طرح دور دور تک دلی دماغ کو مسخر کرتی گئی۔ جب ریڈیو سے یہ اعلان ہوتا کہ فلاں دن، فلاں وقت پر مسرت نذیر سے ہوں گی تو اس کی آواز کے شیدائی مقررہ وقت پر ریڈیو کان سے چپک جاتے۔

اس کی آواز سے متاثر ہونے والوں میں فلم والے بھی تھے۔ آخر کی طرح اس دور میں بھی فلم سنگر اس بات کے تاک تھے۔

دیکھا ہوں جو حسین پھول بنا لیتا ہوں
ریڈیو سنگر مسرت کی مواقع مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ہدایت نگاروں نے چاہا کہ اسے اپنی فلم ”گھونگھٹ“ کے لیے گوائے۔ اس مقصد کے لیے اسے بلایا گیا۔

”ہم نہیں اپنی فلم کے لیے بیک سنگر کے طور پر گوانا چاہتے ہیں۔“

”ہم حاضر ہیں۔“

”مگر اس کے لیے تمہیں پہلے آڈیشن دینا پڑے گا۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟ میری آواز پسند ہے اسی لیے آپ نے مجھے بلایا ہے۔“

”تمہاری آواز کی پسندیدگی اپنی جگہ مگر ہر ہدایت کار فلم کا فارمیٹ چونکہ مختلف ہے اس لیے ہم اپنی ہر فلم کی موزوں کو پیش نظر رکھ کر فنکار کا آڈیشن لیں گے۔“

”اگر یہ بات ہے تو ٹھیک ہے۔ آڈیشن لے لیجیے۔“

مسرت کو یقین تھا کہ ریڈیو کی طرح فلم کے لیے آواز آڈیشن میں بھی اس کی آواز کانگ زدہ ہدایت کار معیار پر پوری اترے گی۔

مگر اس کی یہ سوچ غلط ثابت ہوئی۔ نقاب نے اس سے معذرت کر لی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ فلموں کی پلے بیک سنگر کے معیار پر آپ سامنہیں کر سکیں۔“

مسرت نذیر کو پہلی بار اپنی ہدایت پر دکھ ہوا کہ میری اتنی خوب صورت آواز کے باوجود فلموں کے لیے جنتے رہ گئی۔ کہا گیا ہے مگر چونکہ تعلیم یافتہ اور ذہین تھی اس لیے اس ناکامی کو مثبت انداز سے لینے لگی اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچی کہ شاید نقاب صاحب نے درست کہا تھا کہ فلم کا فارمیٹ ریڈیو سے مختلف ہے۔ اس سے نا واقف ہونے کی وجہ سے ہی میں فلم گلوکارہ کے طور پر مسترد کر دی گئی۔

اسے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ اس لیے اس نے ٹھکر

مسرت نذیر کی فلموں کی فہرست

نمبر شمار	فلم	زبان	سال	ہدایت کار
1	قاتل	اردو	1955	انور کمال پاشا
2	چن	پنجابی	1955	لقمان
3	بانے خان	پنجابی	1955	
4	محبت	اردو	1956	مہدی افضل
5	ماہی منڈا	پنجابی	1956	ایم ایس راٹھ
6	پینگاں	پنجابی	1956	امین ملک
7	مرزا صاحبان	اردو	1956	داؤد چاند
8	باغی	اردو	1957	اشفاق ملک
9	گڈی گڈا	اردو	1957	ولی صاحب
10	سیتن	اردو	1957	ایس ایم ظہیر
11	کچے دھاگے	پنجابی	1957	ایم ایس راٹھ
12	بلکاں	پنجابی	1957	امین ملک
13	ٹھنڈی سڑک	اردو	1957	اے حمید
14	آنکھ کا نشہ	اردو	1957	حسنین افضل
15	سنتی	پنجابی	1957	ایم ایس راٹھ
16	باپ کا گناہ	اردو	1957	انور کمال پاشا
17	جاگ بانہ	اردو	1958	فضیرت منصوری
18	دیوان بہار	اردو	1958	شوکت حسین رضوی
19	زہر عشق	اردو	1958	مسعود پرویز
20	جنج	پنجابی	1958	ایم ایس راٹھ
21	خاندان	اردو	1958	فضل ذیدن
22	موسائی	اردو	1959	ایم اے خان جونیئر
23	سہارا	اردو	1959	سلیم چکرورتی

کمرس کی اور فلمی کامیابی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ پھر وہ وقت بھی آگیا جب موسیقار انتر حسین انکھیاں نے بلیک سنگر کے طور پر اسے منتخب کر لیا اور ہدایت کار ایم حازق کی فلم ”امریتسر 77“ میں بہ طور گلوکارہ کے طور پر اس کا گایا ہوا گیت ریکارڈ کیا جس کے بول تھے۔

یوں چلتے چلتے آنکھوں میں تصویر تری لہرائی ہے

24	یار دلبل	پنجابی	1959	خلیل قیصر
25	سولہ آنے	اردو	1959	آغا سکی
26	گرہ دھکہ	پنجابی	1959	سید نور سید
27	راز	اردو	1959	ہمایوں مرزا
28	گلن سکی	پنجابی	1959	ولی صاحب
29	جائیداد	پنجابی	1959	ریاض الحسن راجو
30	جھومر	اردو	1959	مسعود پرویز
31	کلرک	اردو	1959	خلیل قیصر
32	17 منٹ 77	اردو	1960	ایم جاوید
33	بلن	اردو	1960	انور کمال پاشا
34	نوکری	اردو	1960	ایم کے پاشا
35	نمعمدن	اردو	1960	ایس حمید
36	دل دادن	اردو	1960	نعیم طاہر
37	خان بہادر	اردو	1960	ایس حیدر زیدی
38	ڈاکو کی ڈری	اردو	1960	ہمایوں مرزا
39	سہرے سجے	اردو	1961	امین ملک
40	مجھے نہ سرکاؤ	اردو	1961	ریاض احمد راجو
41	سنگدل	اردو	1961	اے کے سرحدی
42	عشق بر	پنجابی	1961	اسلم ایرانی
43	گلفام	اردو	1961	ایس سلیمان
44	شہید	اردو	1962	خلیل قیصر
45	اک سنڈل دو راہیں	اردو	1962	نجم نقوی
46	عشق پر زور نہیں	اردو	1963	شریف منر
47	بہادر	اردو	1967	منور رشید

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ گیت اس جاسوسی فلم میں سرست پر ہی فلمایا گیا تھا۔اب وہ پورے نام سرست نذیر سے پہچانی جارہی تھی۔ "سحر"۔ کے ڈائریکشن سے لے کر اس وقت تک بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ قدرت کے کھیل بھی بڑے نیارے ہوتے ہیں۔ وہی لقمان جنہوں نے بلے بیک سٹکر کے طور پر سرست نذیر کو ٹیل کر دیا تھا اپنی فلم "جٹی" کے لیے ہیروئن کے طور پر کاسٹ کرلیا۔ یہ بے قدرت کا کرشمہ ؟ آڈیشن کے دوران لقمان کی دور بین نگاہوں نے اس میں سوتی صورت کی گلوکارہ کو ایک کامیاب اداکارہ کے طور پر دیکھ لیا تھا۔

حالات کیسے بدلتے ہیں اور واقعات کیسے رونما ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگائیے۔ لقمان نے "جٹی" کے لیے اس وقت کی ٹاپ ہیروئن سیمو خانم کو کاسٹ کیا تھا اور معاہدہ کے تحت 15 ہزار روپے ایڈوانس ادا کیا جاتا تھا۔ جبکہ دوسرے صاحب سے ایک لاکھ روپے فی فلم کی فائیننسنگ کے دوران ہدایت کار لقمان اور سیمو کے مابین اَنا کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ ہدایت کار و ہیروئن کی بات پر ان ہو گئی اور بات اتنی بڑھی کہ ہدایت کار نے فلم کی ہیروئن سیمو کو فلم سے کٹ کر دیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد انہی کی ہیروئن کو منتخب کرنا تھا۔ اس موقع پر انہیں سرست نذیر کی یاد آئی۔ جسے انہوں نے بطور بلے بیک سنگر متعارف کرایا تھا۔ اس لڑکی کی شکل صورت، رنگ اور اداکارہ کے طور پر آزمایش کے مرحلے سے گزرنا تھا۔ اس نے اپنے پروڈکشن کنٹرولر کو بلا کر اس سے کہا۔

"وہ ریڈیو سنگر جو ہماری فلم "کوبرا" میں بلے بیک سنگنگ کے لیے آئی تھی۔

"اور ناکام ہو کر واپس لوٹ گئی تھی۔" پروڈکشن کنٹرولر نے لقمان صاحب کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں وہی۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"سرست نذیر۔"

"یار اس لڑکی کو بلاؤ ذرا۔"

"کیا اس کا دوبارہ ٹیسٹ لینے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں۔ تم اسے بلا کر تو لاؤ۔"

اگلے روز وہ جونیئر پروڈکشن کنٹرولر سرست نذیر ہدایت کار لقمان کے روبرو کھڑی تھی۔ لقمان نے اسے خوف کھانے لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم وہی ہو نا جو پہلے بار میری ایک فلم کے لیے بلے بیک کا آڈیشن دینے آئی تھی؟"

"جی ہاں وہی ہوں۔ کیا ایک بار پھر آڈیشن لینے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں، میں تمہیں اپنی فلم کی ہیروئن بنانا چاہتا ہوں۔"

"اس کے لیے بھی مجھے ٹیسٹ دینا پڑے گا اور آپ مجھے ریجیکٹ کردیں گے۔"

"ارے نہیں، اس بار ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم بلا خوف

نے کہی اداکاری کی ہے؟"

"جی ہاں، اسکول کے زمانے میں ایک ڈرامے میں اداکاری کا کردار ادا کیا تھا۔"

"گڈ!"

"ہور آج کل....." اتنا کہہ کر رک گئی۔ جیسے سوچ میں پڑ گئی ہو۔ آخر کچھ توسوچ لیا ہوگا۔"

"ہاں بالی تاڑ....کس ڈرامے کے لیے اداکاری کررہی ہو؟"

"ڈرامے کے لیے نہیں۔" اس کا لب تالا ہی پڑا۔

"اگر فلم میں اداکاری کررہی ہو....."

"فلم کی؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ کون سی فلم میں اداکاری کررہی ہو؟"

"وہ کمال صاحب۔ میرا مطلب ہے محترم انور کمال پاشا صاحب کی فلم" چاندنی" میں ایک خاتونی کردار ادا کررہا ہوں۔"

"بیٹا....تم نے تو میری ساری پریشانی ہی دور کردی۔ پاشا صاحب کی فلم میں کام کرنے کا مطلب ہے فلموں کی اداکاری کی سند مل جانا۔ پھر میں آپ کی ہوگی۔ فلموں کی اداکاری اتنج کی اداکاری سے مختلف ہوتی ہے۔" لقمان صاحب ڈرامے کے ٹکڑے پر مشتمل ٹیسٹ لیتے ہوئے بولے۔ "اب تمہیں کیمرے کے سامنے ٹیسٹ کی ضرورت نہیں اور ہاں ہماری فلم میں تم ہیروئن کا کردار ادا کررہی ہو۔ میں ایگریمنٹ شائع کرتا ہوں۔"

"نہیں.....ابھی نہیں....." سرست نذیر نے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

"کیوں.....ابھی کیوں نہیں.....؟"

"میں اپنے ابّا جی کی اجازت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ فورکیل پاشا صاحب کو بھی ابّا جی کو راضی کرنا پڑا تھا۔"

"چلو اپنے ابّا جی سے جا کر پوچھ آؤ۔ اگر وہ راضی ہوتے تو میں انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔"

مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ خواجہ عزیز احمد نے خوشی سے اجازت دے دی اور ہنسی کے ساتھ لقمان صاحب سے مخاطب ہو کے کہنے لگے۔ ان کی مصروفیتوں کے شیڈیول تیار ہوا اور معاہدے کے تحت اس کا معاوضہ 15 سو تھرو، جو اب کے اس کو دوا کے لیے صرف پیکم 15 ہزار دیا گیا تھا مگر معاہدہ سینئر اور جونیئر کا تھا۔ اس لیے یہ معاوضہ منتخی قبول کرلیا گیا۔

اور گرلال پاشا کی اردو فلم" چاند" اور لقمان کی پنجابی فلم "جٹی" کے بعد دیگرے 1955ء میں ریلیز ہوئیں اور

میرا لونگ کو اچا

اللہ کے نیک بندوں کا کہنا ہے کہ ہر کام میں اللہ کی کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ سرست نذیر لندن اور کینیڈا روانگی تک بہت خوش تھی۔ گھر بلو دعوتوں اور درباروں کے ساتھ گانے کا شوق بھی پورا کرلیتی تھی۔ اس کا میکہ اور سسرال دونوں ہی لاہور میں تھے اور جیکے اور سسر ایس کی پذیرائی بھی بہت ستائش تھی۔ اکثر وہ ڈائریکٹر صاحب سے کہتی چلو لاہور کا ایک چکر لگا آئیں۔ ڈائریکٹر صاحب کہتے۔ "ارے بھئی! یہ کوئی گوالمنڈی سے گھیر کن تک کا سفر نہیں کہ اٹھے اور ایک چکر لگا لیا۔ جانے آنے میں خاصے دن لگ جاتے ہیں کہ جب کہ میرے لیے یہاں ایک دن کی مہلت بھی بھی دشوار ہے۔ آخر ایک دن سرست بول پڑی۔ "آپ پھر آپ یہاں رہیے مجھے بھی جانے دیجیے۔" ڈائریکٹر صاحب کے لیے یہ بات بھی قابل قبول نہیں تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بیاہتا جوڑے میں جدائی کی جو تڑپ ہوتی ہے وہ کنواری لڑکی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔ اس سال کے طویل عرصے کے بعد جب وہ دبئی آئی تو جہاں اس کے عزیز و اقارب کے گھروں میں خوشیوں کے شادیانے بج اٹھے وہاں سرست کے شیڈیولوں نے بھی اس کی موجودگی کا خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ اس دوران کچھ ایسے گیتوں اور فلموں کا اضافہ ہوا جنہوں نے فن گائیکی کی دنیا میں اک تاریخ رقم کی۔ جن میں سب سے نمایاں گیت "لونگ کو اچا" ہے جس نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ یہ بتانا ضروری نہیں ہو گا کہ یہ گیت سرست نذیر کی پہچان اور شناخت بن گیا۔ یہ گیت عبدالغفور کے ساتھ مل کر اس نے پنجابی فلم "دلاری" میں گایا تھا۔ اس گیت کی مقابل خود سرست نذیر ہے۔ اسے لکھا بھی اس نے اور اس کی دھن بھی اس نے بنائی۔ بعد میں یہ گیت فلم "دلاری" میں شامل کیا گیا اور اداکارہ انجمن پر فلمایا گیا۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ فلم "اغلہ گھاٹ" میں بھی انجمن ہی اس گانے کی فلمبندی ہوئی۔ اس کی دھوم ہندوستان تک پہنچی اور وہاں کے فلمسازوں اور ڈائریکٹروں میں بھی اسے شامل کیا گیا۔

دیدوں نے ظاہر تھا کامیابی حاصل کی۔ جس کے بعد کامیاب ریڈیو سٹار مسز نذیر کو کامیاب فلمی اداکارہ تسلیم کرلیا گیا۔ اب مسز نذیر آواز کی طرح اس کی جاندار اداکاری نے بھی اس کی ترقی اور شہرت کے ساتوں در کھول دیئے۔ اسے اداکاری کے ساتھ ساتھ گلوکاری کا بھی موقع ملنے لگا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ عادتی کی جاسوسی فلم "اسٹریٹ 77" سے بطور گلوکارہ فلموں کے لیے گانے بھی گائے اور اداکاری بھی کرنے لگی۔ یہ فلم 1960ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

پھر یہ کہانی دائی لوگوں اس کی شہرت آسمان پر پہنچ گئی۔

ایک زمانہ تھا جب لاہور میں کیے یا تانگے عوامی سواری کے طور پر چلتے تھے۔ اس تانگے یا یکے کو مرکزی خیال بنا کر اس کی کہانی کے تانے بانے بنے گئے تھے اور کہانی کو ایک نیا رنگ دینے کے لیے فلم ڈائریکٹروں کی بھی ایک ٹولی نے اس کو استعمال کیا تھا۔ اس لیے عام یکوں سے ہٹ کر اس کا ایک خاص روپ دے کر دائی کے ساتھ ساتھ اس کو ایک اسٹیٹ بھی دے دی گئی تھی۔ تانگہ والوں کی طرح وہ تانگہ والیوں کو سواریوں کو بلانے میں اس پوشیدہ مقصد کو بھی فلمایا گیا تھا۔

فلمی سواری یعنی یکہ والی لوباری

اس فلم کی کامیابی کے بعد یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ جب تک دائی کی کامیابی کے تانے بانے بنے گئے تھے اور پاکستان کے سینما بینوں کو اس فلم کی کہانی کے ساتھ ساتھ اداکاری کا بھی موقع ملنے لگا۔ اس فلم کی کہانی کو ایک نیا رنگ دینے کے لیے فلم ڈائریکٹروں کی بھی ایک ٹولی نے اس کو استعمال کیا تھا۔ اس لیے عام یکوں سے ہٹ کر اس کا ایک خاص روپ دے کر دائی کے ساتھ ساتھ اس کو ایک اسٹیٹ بھی دے دی گئی تھی۔ تانگہ والوں کی طرح وہ تانگہ والیوں کو سواریوں کو بلانے میں اس پوشیدہ مقصد کو بھی فلمایا گیا تھا۔

فلمی سواری یعنی یکہ والی لوباری

اس فلم کی کامیابی کے بعد یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ جب تک دائی کی کامیابی کے تانے بانے بنے گئے تھے اور پاکستان کے سینما بینوں کو اس فلم کی کہانی کے ساتھ ساتھ اداکاری کا بھی موقع ملنے لگا۔ اس فلم کی کہانی کو ایک نیا رنگ دینے کے لیے فلم ڈائریکٹروں کی بھی ایک ٹولی نے اس کو استعمال کیا تھا۔ اس لیے عام یکوں سے ہٹ کر اس کا ایک خاص روپ دے کر دائی کے ساتھ ساتھ اس کو ایک اسٹیٹ بھی دے دی گئی تھی۔ تانگہ والوں کی طرح وہ تانگہ والیوں کو سواریوں کو بلانے میں اس پوشیدہ مقصد کو بھی فلمایا گیا تھا۔

بدری ہونے کی وجہ سے فلم والوں کو آؤٹ ڈور کے لیے باہر جانے کی ضرورت پیش رہی۔

دائی کے بعد ہی اداکارہ نے مسز نذیر کو پاکستان کی پہلی اور اب تک کی آخری عورت فلمی اداکارہ تسلیم کروایا۔ یوں تو اس فلم میں اس کے تمام ٹیلنٹ کی داد لوگوں نے دی اور کئی فلم سازوں نے اپنی نئی فلموں کے لیے اداکارہ کا انتخاب کرنے کے لیے مسز نذیر سے ملاقاتیں کیں۔ مسز نذیر نے اپنا تاکل رول اس خوبی کے ساتھ ادا کیا تھا جیسے وہ پیدائشی ایکٹرس ہی ہو۔ سدھیر اس فلم میں اس کے ہیرو تھے۔ فلم کی دائی نے اس فلم کے باپ کا کردار ادا کیا تھا جو رات کو ڈاکو بن کر لوگوں کے گھروں میں ڈاکہ ڈالتا تھا۔ آج کے معروف ہدایت کار اقبال کاشمیری نے کوٹے کا نام سے ایک دائی (مسز نذیر) کے چھوٹے بھائی کا کردار ادا کیا تھا۔ اقبال کاشمیری بذریعہ ظریف اور ظام محمد کی کہانی کا کردار بھی قابل ستائش تھی۔ اس فلم کی موسیقی بابا جی اے چشتی نے دی تھی جس نے فلم کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہدایت کار اے حمید کے ریڈیو کی مشہور اور مقبول پروگرام "کے دائی" کو کامیاب ترین فلم بنا دیا تھا۔ کہانی فلم کی بنیاد پر دل سے اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دائی فلم بینی کی بطور پہلی فلم سیٹھی کامیاب رہی۔

اس فلم کی کہانی کو مرکزی خیال سعادت حسن منٹو کے افسانے "بیگمس" سے لیا گیا تھا۔ پہلے اس افسانے کو بنیاد بنا کر ہدایت کار اسرام شرما نے فلم "تانگے والی" بنائی تھی جس میں مصنف دادا کامریڈ اجتماعی نے بھارتی فلم میں کچھ تبدیلیاں کر کے یہ دائی فلم بنائی۔ ایک اچھی اور معقول کہانی کو ایک اچھے ہدایت کار نے تمام فنی مسائل چن بُرے کر کے لاتے ہے ہوئے اچھی ڈائریکشن اور بے حد سحر کن موسیقی سے سجا کر پیش کیا۔ اس پر سونے پر سہاگا اس کے آرٹسٹوں کی اعلیٰ معیاری اداکاری نے اسے ایسے وقت کی بلاک سٹر فلم بنا دیا۔ مسز نذیر جس نے فلم کا مرکزی کردار کیا تھا اس نے فنی، پیشہ ورانہ اور فطری اداکاری سے اس فلم کی بے حد کامیابی میں اہم کردار ادا کیا۔ "کے دائی" ایک نفسیاتی، سماجی اور رومانوی فلم تھی۔ یہ مسز نذیر کی ایک ایسی فلم تھی جس کے تذکرے کے بغیر مسز نذیر کی فلمی بات مکمل سمجھا جاتا ہے۔

کیا "کے دائی" مسز نذیر کی واحد کامیاب فلم تھی؟ نہیں وہ ایک باصلاحیت اداکارہ تھی۔ اس نے اس کی فنی صلاحیتوں کے ثبوت کے طور پر اس کی دیگر فلمیں بھی موجود ہیں جنہوں نے ریکارڈ کامیابی حاصل کی اور اسے وراسائل اداکارہ کے طور پر فلم انڈسٹری میں ممتاز مقام متعین کیا۔ چن، بابلے خان، خالی منڈا، چوچاں، مرزا صاحباں، قسمت، باغی، آنکھ کا نشہ، ترنگ، عشق، سوسائٹی، کرتار سنگھ، جھومر، شہید اور عشق پرزور فلمیں۔ اردو اور پنجابی کی وہ فلمیں جن میں مسز نذیر کے کردار کو اس نے یادگار فلمیں بنا دیا۔ مسز نذیر نے ثابت کر دیا کہ وہ سنہری آواز کی ملکہ ہی نہیں پرفارمنگ کوئن بھی ہے۔

مسز نذیر نے چن، بابلے اور ماں منڈا وغیرہ میں جہاں پنجاب کی روایتی خیالہ کا کردار کامیابی کے ساتھ ادا کیا وہاں اس نے چنگاں اور پائے خان میں ماڈرن شہری لڑکی کے روپ میں بھی پورا اترا تھا۔ ایسی کاشمیری بذریعہ کے میدان میں وہ ایک شہ سوار بھی جس نے ہر میدان میں اپنی فنی صلاحیتوں کا مکمل کامیاب منوایا اور ناقدین فن سے پرداد بھی حاصل کی جہاں اس نے اپنے کردار ادا کیا تھا۔ ہدایت کار ایاز اس نے مائی کا بھی کردار ادا کرنے میں نہ جھجک محسوس کی نہ ہی شرمائی۔ ہدایت کار سدھیر کی ہوم پروڈکشن میں بنے والی فلم "آنکھ کا نشہ" میں مسز نذیر نے میسنہ خانم کی ماں کا کردار ادا کیا۔ میسنہ خانم اس کی ہم عمر اور حقیقی ادا کارہ بہن تھی۔ کوئی دوسری اداکارہ ہوتی تو اس انکار کر دیتی کہ اس طرح تو میری ساتھ پر مثلی اڑ پڑے گا مگر مسز نذیر نے ایک حوصلہ مند اداکارہ کے طور پر اس پیشکش کو قبول کر کے اور ہر طرح سے کامیاب ہو کر دوسری اداکاروں میں جو مقام حاصل کیا اس سے تو قبل وہ "ماں" میں اس نے کمال اداکاری کا مظاہرہ کر دیا تھا۔

ایک فلم میں نذیر کا یکہ گم تو دوسرے کو لاتے دکھایا تھا۔ ہدایت کار نے ان سے کہا: "آپ کے بالوں کی ایک دو لٹیں کو چک اپ کے ذریعے سفید کر دو گے۔" زیبا بیگم ایک ہم اداکارہ تھیں۔

"نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا..... میں اس طرح اپنے اچھے کو سہتا ڈرتی ہوں کہ آپ ہیرے بال سفید کے لفیر شاٹ لیں۔ ورنہ میں پھر جائی ہوں۔"

ایک آپ نے اداکارہ ایسی بھی ہیں جو ہوتی ہیں۔

اس فلم میں مسز نذیر کے کردار کا چائنہ دیکھیے اور داد دیجیے کہ وہ کیسی باصلاحیت اور گریٹ اداکارہ تھی کہ وہ اپنی ہم عصر اداکارہ کی ماں کا کردار ادا کرنے میں بھی کسی تکلف اور تردد کا

جھومر کی بیٹی

خوبرو خورشید انور کو عام لوگ ایک بلند موسیقار کی حیثیت سے جانتے ہیں جب کہ وہ فلم کے بہت سے شعبوں پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ جھومر ان کی ذاتی فلم تھی جس کی کہانی انہوں نے خود لکھی تھی۔ انہیں پلاٹ اور موضوع کے انتخاب کردار نگاری اور منظر نامے پر اس قدر قدرت حاصل تھی جو بہت دن کم کہانی لوٹیوں کو میسر آتی ہے۔ جھومر کی کہانی کا پس منظر پہاڑی ماحول میں رہنے والے انسان کی ہے۔ بہن اور بھائی کی محبت اور بیٹی کے کردار میں پاکستانی حکومت کے جذبہ ایثار کا خاصی اہمیت کے ساتھ ایک پُرتاثیر انداز میں بیان کیا گیا۔

جھومر میں اداکاروں کے کردار کے بارے میں مسز نذیر نے جو کچھ کہا وہ پڑھ لیجیے۔ "میں نے فلم جھومر میں ایک الھڑ دوشیزہ کا کردار ادا کیا تھا۔ فلمبندی سے پہلے مجھے ہدایت کار مسعود پرویز نے سمجھا دیا تھا کہ اس فلم میں تم اپنے آپ کو ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی تصور کر کے کام کرو گی۔ کردار میں جان ڈالنے کے لیے مسعود صاحب نے مجھے بچے جیسے چہرے، بات بات پر ہنسنے کی عادت ڈال دی تھی۔ اس لیے کہ نوخیز لڑکیوں کی چال ڈھال بڑی لڑکیوں سے الگ ہوتی ہے۔ ان کے بات چیت کرنے میں معصومیت اور شوخی کا ایک ایسا امتزاج ہوتا ہے جو انہیں عام زیب دیتا ہے۔ چنانچہ اس فلم میں، میں ایک الھڑ دوشیزہ کے روپ میں ہیرو سے ملتی تھی اور اسے اپنے گھر کے آنگن میں ہوتی تو اس کا سب بچپن چھپا تھا۔ اس لیے ایک کم عمر لڑکی محبت کے جذبے سے آشنا ہوتی ہے۔"

جھومر پاکستان کی وہ خوب صورت نغماتی فلم تھی جو نہ صرف پاکستان میں پسند کی گئی بلکہ اس کو برلن فلم فیسٹیول کے لیے بھی بھیجا گیا اور جب اس کی نمائش لندن کے کانن ہوائس میں ہوئی تو اسے تماشائیوں نے بے حد پسند کیا۔ اس فلم میں مسز نذیر کو اس کی تجربہ اور خوب صورت اداکاری پر سال کی بہترین اداکارہ کا ایوارڈ دیا گیا۔

شکار نہیں ہوئی۔ وہ اداکارہ جو کئی فلموں میں گلیمر اداکارہ کے روپ میں نمودار ہو کر اپنا ایک بہتر تشخص اور پہچان بنا چکی ہو اس کا عین عروج کے دور میں ماں کا کردار ادا کرنا کوئی عام اور معمولی بات نہیں تھی۔ اس نے ہر طرح کے کردار ادا کرکے ثابت کر دیا کہ وہ ایک ورسٹائل اداکارہ ہے۔

مسرت نذیر نے اپنی ابتدائی فلموں قاتل، پتن اور پاٹے خان میں اپنی خداداد فنی خوبیوں کا بھرپور مظاہرہ کر کے اپنے لیے ایک مستند اداکارہ کی حیثیت منوائی تھی۔ کسی بھی نئی اداکارہ یا اداکار کے لیے مستند اور مستحکم فنکاروں کے سامنے اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا بڑا چیلنجنگ مرحلہ ہوتا ہے۔ مسرت نذیر کو بھی اس صورتِ حال کا سامنا تھا مگر اس نے اپنی بے پناہ فنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ہر صورت حال کا مقابلہ بڑی جواں مردی سے کیا جس کردار کے لیے بھی اسے منتخب کیا جاتا اسے قبول کر لیتی۔ اگرچہ اس طرح اسے نقصان بھی پہنچتا۔ اس کا اپنے آپ پر اعتماد اپنی جگہ مگر دوسرے جب اپنے معیار پر پورے نہیں اترے تو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی لے ڈوبتے ہیں ایسے میں اس کی فلموں کا ناکام ہونا کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ ناکام فلموں سے اس میں کام کرنے والوں کی ساکھ کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسرت نذیر کو اس کی ناکام فلموں نے متاثر نہیں کیا کیونکہ فلم میکرز جانتے تھے کہ فلم کی ناکامی میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ اس لیے اس کی مانگ میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اچھی ٹیم نے جب بھی اچھی کہانی پر کوئی اچھی فلم بنائی، اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، مسرت نذیر نے اس میں اپنی پرفارمنس سے ایسا رنگ بھرا کہ وہ کامیاب فلم کی کامیاب اداکارہ قرار دی گئی۔ اس کی پنجابی اردو کی مجموعی 47 فلموں میں سے 15 فلمیں مختلف وجوہ کی بنا پر ناکام ثابت ہوئیں۔ تاہم ان فلموں کی ناکامی سے اس سے زیادہ ان فلموں کے دیگر ساتھی آرٹسٹ متاثر ہوئے۔ اس کی اپنی بہتر کارکردگی کی وجہ سے اس کی ساکھ سلامت رہی مگر کئی بری طرح متاثر ہوئے۔ ان میں سرِفہرست اسلم پرویز تھا، جسے ناکام ہیرو کی حیثیت سے ریجیکٹ کر دیا گیا۔ جو کچھ دنوں تک گوشہ گمنامی میں رہا اور جب ایک فلم میں اسے ولن کے روپ میں پیش کیا گیا تو اسے دوبارہ زندگی ملی۔

مسرت نذیر کی کئی کامیاب فلموں کے بعد ... ری میک فلمیں بنائی گئیں۔ ان میں پاٹے خان، قسمت، باغی اور یکے والی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

پاٹے خان کو ہدایت کار مسعود پرویز نے 1975ء میں میراثاں پاٹے خان کے نام سے بنایا جب کہ پاٹے خان 1955ء کی فلم تھی۔ مگر اس پر بنائی جانے والی ری میک میراثاں پاٹے خان پاٹے خان جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

قسمت مسرت نذیر کی اردو فلم تھی۔ 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ ہدایت کار ایس سلیمان نے 1976ء میں طلاق کے نام سے اس کا ری میک بنایا۔ اس میں شبنم اور شاہد نے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

باغی ہدایت کار اشفاق ملک کی فلم تھی۔ 1956ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس کی بلاک بسٹر کامیابی سے متاثر ہو کر ہدایت کار ایس سلیمان نے 1978ء میں آگ اور زندگی کے نام سے اس کی ری میک بنائی جس میں ممتاز اور محمد علی نے مسرت اور سدھیر کے کردار ادا کیے تھے۔ یہ فلم بھی باغی جیسی کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اپنے وقت کی بلاک بسٹر فلم "یکے والی" ہدایت کار ایم جے رانا کی پنجابی فلم تھی جو 1957ء میں ریلیز کی گئی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں ایم جے رانا ہی نے اس فلم کو اردو زبان میں تانگے والی کے نام سے دوبارہ بنایا۔ اداکارہ شبنم نے مسرت نذیر والا کردار کیا تھا جس میں وہ بری طرح ناکام رہی تھی۔ اس فلم کو یکے والی جیسی پذیرائی حاصل نہیں ہوئی۔

مسرت نذیر کی ری میک فلموں کی عدم پذیرائی کی کیا وجہ تھی؟ جب کہ انہیں دوبارہ بنانے والے اور ان میں کام کرنے والے سب ہی اپنے دور کے بڑے لوگ تھے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان فلموں میں سب کچھ تھا مگر مسرت نذیر نہیں تھی۔ مسرت نذیر جو اپنی فنی صلاحیتوں سے ایسی مالا مال تھی کہ اس جیسی خوبیاں دوسروں کو نصیب نہیں ہوئیں۔ اپنی انہی خداداد خوبیوں کی وجہ سے وہ معمولی نوعیت کے گھسے پٹے کرداروں کو بھی زندگی سے بھرپور بنا دیتی تھی۔ "قاتل" سے لے کر "بہادر" تک اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کی عظمت اور سربلندی نظر آتی ہے۔ کوئی دوسری اداکارہ اس کی فنی بلندیوں کو نہ چھو سکی جس نے مختلف فلموں میں مختلف نوعیت کے کردار کیے اور ہر کردار کے مطابق اسے زندگی بخشی جانِ بہار، کلرک اور سوسائٹی میں اس کے کردار آنسوؤں میں گندھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شہید میں وہ ایک بے باک توپ شکن حسینہ کے روپ میں جلوہ نما نظر آتی ہے تو دوسری طرف وطن سے محبت کرنے والی ایک جانباز

عورت کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ زہرِ عشق میں اس کا کردار انتہائی پیچیدہ اور مشکل تھا۔ اس فلم میں وہ اس دھرتی کی علامت ہے جو بنجر ہے مگر اس کے سینے میں گہرے گھاؤ ہیں۔ بانجھ ہونے کا دکھ اس عورت کا المیہ ہے۔

اس نے اردو فلموں کی طرح پنجابی فلموں میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ پنجابی فلموں میں وہ پہلی معیار بن کر سامنے آئی۔ یکے والی میں اس کا کردار عوامی سطح پر مقبول ہوا اور اسے پہلی عوامی اداکارہ ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ماہی منڈا اور جٹی اس کی کامیاب اور خوب صورت فلمیں اس لیے قرار پائیں کہ اس کی اداکاری نے ان کرداروں کو یادگار بنا دیا۔

مسرت نذیر کو مکالموں کی ادائیگی میں جو کمال حاصل تھا وہ بہت ہی کم اداکاراؤں کو نصیب ہوا۔ اس کی ڈائیلاگ ڈلیوری میں ایک خاص طرح کا ناقابلِ بیان مگر پُرآشوب کرب جھلکتا ہے۔ مکالموں کی ادائیگی کے وقت لہجے میں موسیقیت، آہ و بکا کی کیفیت میں ایک تاثر۔ اس میں وہ اپنی سانسوں کے تلاطم کو بھی شامل کر لیتی تھی۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس کی یہ ساری خوبیاں عطیۂ خداوندی تھی۔

اس نے رب کریم کی جانب سے بخشی اپنی سنہری آواز اور اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے پاکستانی فلموں اور فلمی صنعت کو تر و تازگی، سربلندی اور استحکام عطا کیا۔ یہ پاکستانی فلم انڈسٹری کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت فلمسازی کے جدید ساز و سامان موجود تھے نہ ٹیکنالوجی کی سہولتیں میسر تھیں۔ اس وقت تکنیک کاروں اور فنکاروں کی صلاحیتیں ہی اس صنعت کا سرمایہ تھیں۔ ایسے باصلاحیت افراد میں مسرت نذیر کی شخصیت بھی نمایاں تھی۔ اس دور میں عوامی پذیرائی کے طور پر کوئی ایوارڈ یا اعزاز نہیں دیا جاتا تھا۔ نگار ایوارڈز کا اجراء 1957ء میں ہوا۔ اس کی دوسری تقریب میں مسرت نذیر کو سال کی بہترین اداکارہ کا نگار ایوارڈ ملا۔ اس کے بعد جھومر اور پھر شہید میں اسے اسی اعزاز سے نوازا گیا۔

مسرت نذیر کے والدِ محترم خواجہ نذیر احمد نے اپنی ہونہار بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کا خواب دیکھا تھا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اللہ نے اسے ابھرتی ہوئی پاکستانی فلمی صنعت کی مسیحائی کا کام سونپ دیا۔ گلوکاری اور اداکاری میں وہ اتنی مصروف ہوگئی کہ تعلیمی سلسلہ منقطع ہوگیا اور قومی فلمی صنعت کی ایک اہم ضرورت بن گئی۔ عین اس وقت جب وہ اپنے کیریئر کے عروج پر تھی اس کا ایک رشتہ آیا۔ یہ ایک ڈاکٹر کا رشتہ تھا۔ خواجہ نذیر احمد کو کچھ پرانی باتیں یاد آگئیں۔ انہوں نے اپنی اس بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہا تھا مگر وہ ڈاکٹر نہ بن سکی۔ اب انہیں داماد کی صورت میں ایک ڈاکٹر مل رہا تھا۔ اس لیے اس رشتے سے انکار نہ کر سکے۔ تصدیق و تحقیق کے بعد جب وہ ہر طرح قابلِ قبول نظر آیا تو 21 اپریل 1961ء کو انہوں نے مسرت نذیر کا نکاح ڈاکٹر ارشد مجید سے کر دیا۔ ہر اداکارہ کی طرح مسرت نذیر کے بھی ہزاروں پرستار اور چاہنے والے تھے۔ اب تو نہیں،

شادی خانہ آبادی

ڈاکٹر ارشد مجید کی مسرت نذیر سے پہلی ملاقات صحافی، ادیب اور ہدایت کار احمد بشیر کے گھر پر ایک پارٹی کے دوران ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا و پسند کیا۔ پھر کچھ ملاقاتوں کے بعد دونوں ذرا کھلے تو ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"مجھ سے شادی کرو گی؟"

مسرت خاموش رہیں جس پر ڈاکٹر نے ٹوکا۔

"کیا بات ہے تم جواب کیوں نہیں دے رہی ہو؟"

"وہ...... بات دراصل یہ ہے کہ یہ فیصلہ میں خود نہیں کر سکتی۔"

"پھر کون فیصلہ کرے گا؟"

"میرے والدین۔"

"تم اتنی بڑی فنکارہ ہو کر اتنی دقیانوسی بات کرتی ہو۔"

"میں آج جو کچھ بھی ہوں اپنے ماں باپ کی دعاؤں اور کوششوں کی وجہ سے ہوں۔ اس لیے میں کوئی بھی کام ان کی مرضی اور منشا کے بغیر نہیں کرتی۔ شادی بھی میں ان کی مرضی اور پسند سے کروں گی۔ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو اپنے بڑوں کو میرے گھر بھیج کر میرا رشتہ مانگیں۔"

اور پھر ڈاکٹر نے ایسا ہی کیا۔ ان کے گھر والے ان کے لیے مسرت نذیر کے گھر پہنچ گئے اور اس کا رشتہ مانگا جو تصدیق و تحقیق کے بعد قبول کر لیا گیا اور 21 اپریل 1961ء کو دونوں نکاح کے بندھن میں بندھ کر ایک دوسرے کے شریکِ حیات بن گئے۔

پہلا انٹرویو

ستر ہ سال کی عمر میں فلمی دنیا میں قدم رکھنے والی اداکارہ جس نے جلد ہی اپنی خداداد فنی صلاحیتوں سے فلم انڈسٹری میں اپنے لیے ایک مستقل اور مستحکم مقام بنالیا۔ اپنی دو ابتدائی فلموں "قاتل" اور "نجن" کی کامیابیوں کے بعد جب سیڈیا والوں کی توجہ کا مرکز بنی تو اس نے اپنے پہلے اخباری انٹرویو میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود وہ کس قدر بالغ نظر تھی۔

سمرت نذر یہ نے ایک اخباری سوال کے جواب میں کہا۔ "میں نے 28 نومبر 1954ء کے دن فلمی دنیا میں قدم رکھا۔ مجھے یہاں آکر کوئی خوف محسوس نہیں ہوا کیونکہ جبتک میرے کردار کا تعلق ہے میرا یقین ہے کہ اس کا بڑی حد تک انحصار خود مجھ پر ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ فلی نگار خانے یا کردار لوگوں سے پاک ہیں۔ ایسے لوگ تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی لڑکی اپنے کردار پر آنچ نہ آنے دینے کا عزم کرلیتی ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا بال بیکا نہیں کرسکتی۔ میں اس وقت یقین کے ساتھ فلمی دنیا میں داخل ہوئی ہوں۔"

بازی گر

سمرت نذر یہ کی آخری فلم "بازی گر" جو اس کے لندن چلے جانے کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھی۔ جب 1966ء میں مختصر وقت کے لیے وہ پاکستان آئی تو اس کے تقاضا نے اپنی فلم مکمل کرانے کی درخواست کی۔ جسے سمرت نذر یہ نے قبول کرلیا۔ جب یہ فلم مکمل ہوگئی تو سنسر میں پیش نہیں ہوسکی اور وہاں سے چھٹکارے کی صورت میں اس کا نام بدلا اور کھویا گیا۔ نمائش کے بعد یہ فلم بری طرح ناکام ہوگئی جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فلم میں فلمی دنیا کے دو اہم کام کیا تھے جو فن (1967ء) یہ فلم ریلیز ہوئی تھی فلمی دنیا کا سیاب اور سپر ہیرو کے طور پر متعین ہو چکے تھے۔ ان کے پرستاروں نے انہیں اس فلم میں دُہرا کے طور پر دیکھنا چاہا اور فلم فلاپ ہوگئی۔

ہوئے کہ ان کی ایک پاکستانی گلوکارہ کی مقبولیت اغوا میں بھی ہاتھ ہوسکتا ہے۔

ڈی وی انٹرویو کے بعد پرنٹ میڈیا نے بھی سمرت نذیر کو خصوصی توجہ کی مستحق سمجھا اور بھارت سے شائع ہونے والے فلمیل رسالوں جلد منبر، فلمیلا اور سوسائٹی میں اس کے انٹرویو شائع ہوئے۔ غالباً یہ اس وقت کی بات ہے جب نازنین حسن کا پورے اخبار میں ڈسکو دیوانے مقبولیت کی بلندیوں پر تھا۔

بھارتی ایکٹرز کے اور پرنٹ میڈیا کے زریعے جو تشہیر ہوئی اس کے نتیجے میں 1980ء سے 1983ء تک گلوکارہ سمرت نذیر کے لگن لاگے ہوئے ریلیز ہوئے جن میں سے ہر ایک ریکارڈ توڑ ہوا۔ ہندوستان ساتھ ان کے تھے۔

بھارتی کے پرائیوٹ چینل نے بھی سمرت نذیر کی شہرت سے فائدہ اٹھانے ہوئے اس سے ڈسکو اور پاپ میوزک سے آراستہ کیسٹ کوائے۔

1964ء میں سمرت نذیر جب پاکستان چلی گئی تھی تو وہ اپنے دور کی ایک مقبول گلوکارہ ہی نہیں تھی لیکن جب 1989ء میں پاکستان ٹائمز کی ایک رپورٹ میں انکشاف کیا گیا کہ بھارتی فلم انڈسٹری کی گلوکارہ کے طور پر اداکارہ الکا یاگنک کی شہرت کے دھنکے رہے ہے۔ اس بار ڈاکٹر شاہد مجید نے اپنی فنکارہ بیوی کو پھر زندہ دلوں کے لیے اس کے پہلے کیسٹ کی طرح سمرت نذیر کی آواز کی تیز طرار ہی اس کے لگن کے دیوانے اس سے آن ملے۔ پی ٹی وی نے اس کی آواز میں گیتوں اور گانوں کی ریکارڈنگ شروع کردی اور "میری پہچان" ہی پروگرام میں اس کیسٹ ٹیلی کاسٹ کرنا شروع کردیا جو بے حد مقبول ہوئے۔ ضیا الدین حیدر کی غزل

پہلے تو سمجھ نہ جانے کا منتر آہستہ آہستہ

نے نہ صرف مقبولیت حاصل کی۔ جو اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ اس کے گانوں کی مقبولیت میں چونکہ پاپ میوزک کے ساتھ مشرقی موسیقی کا روایتی حسن بھی شامل ہوتا تھا اس لیے ہر طبقہ فکر کے سننے والوں میں مقبول ہوتا تھا۔

1985ء میں اسلام آباد ٹیلی ویژن نے اپنی سالگرہ کے جشن منانے کے لیے ایک پروگرام "مہدی ہاں بھدی" کے نام سے نشر کیا جس میں گانے کے لیے سمرت نذیر کا انتخاب کیا گیا جو توقعات سے بڑھ کر مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اسلام آباد ٹیلی ویژن نے اپنے انٹرویو کی خصوصی نشریات کے دوران وہ راہ سے پیش کیا۔

شعلے جیسی بھی ہوتی آواز میں کہا جاتا ہوا تھا کہ اس کی

ایک چیمپئن کردار

پاکستانی فلمی صنعت کے ابتدائی دنوں میں بڑی خوب صورت اور اچھے ہیجیک پر بڑی معیاری فلمیں بنائی گئیں۔ ایسی ہی فلموں میں ایک فلم "زہر عشق" بھی تھی جسے پاکستان کی پہلی نشیانی فلم ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس فلم میں سمرت نذیر فن کی ان بلندیوں پر نظر آئی ہے جہاں پہنچ کر ایکٹریس بنتی ہے۔ سمرت نذیر نے ایک موقع پر اس فلم کی کردار نگاری پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ "زہر عشق میں مجھے ایک ایسی لڑکی کا کردار دیا گیا جو حقیقی طبیعت اور نظرت کی حامل تھی۔ بہت بے باک، سخت ضدی، اجلد اور گھوار۔ اس کے باوجود فطرتاً نیک دل۔ انتقام سخت تھا۔ کردار مشکل مگر مسعود پرویز جیسے اعلیٰ ہدایت کار کے سہارے سے کردار نبھا گئی۔ اس فلم میں ایک سخت مقام تھا۔ یعنی محبت میں پیدا ہونے والے وسوسے اور شک کی کشمکش۔ انسان جتنا جس سے محبت کرتا ہے اتنا ہی اس کے متعلق وسوسے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور اپنے محبوب کی طرف کسی کا دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ بسا اوقات اپنی قسمت پر خود رشک کرنے لگتا ہے۔ مجھے بھی محبت کے اس نازک ترین جذبے کو پیش کرنا تھا۔ میرے محبوب کی چاہت تھی کہ میں اس کی پوجا کیا کروں۔ اس کو خود میں معصوم جانور پر حرم کیے گئی۔ میں جو پہاڑوں میں پلی بڑھی تھی۔ انتہا پسند لڑکی تھی، کسی طرح برداشت کرسکتی تھی کہ میرا محبوب میرے علاوہ کسی اور کو چاہے یا کسی جانب متوجہ ہو۔ میں نے کتنے کو پھاڑ پھاڑ کے پھر لفافوں میں بھیج دیا۔ میرے اس فعل میں محل بربریت بھی تھی۔ جس وابلہانہ محبت کے جذبے کے تحت میں نے یہ کام کیا تھا اس سے کہیں زیادہ ارفع تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس منفرد کے بعد ایک کے بعد ایک مختلف کرداروں کی پیشکش نہیں ٹھکرا دی ہونے کے باعث ہی ہوئے کہ مقبول ہوا۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر اسلام آباد ٹیلی ویژن نے اپنے انٹرویو کے ساتھ اداکرات کے دوران دوبارہ اسے پیش کیا۔

شعلے جیسی بھی ہوتی آواز میں کہا جاتا ہوا تھا کہ اس کی

گائی ہوئی پرسوز غزل، ہر گیت، ہر نغمہ سننے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا تھا۔ آواز کے ساتھ اس کے گانے کا انداز بھی منفرد تھا۔ یوں تو اس کی آواز میں کافی باتیں ہوا کرتی تھیں لیکن کچھ گلوکاروں کو سُر پر دست پسندیدگی کی سند حاصل ہوتی تھی ایسے ہی گیتوں میں ڈوبی ہی گایا ہوا ایک گیت "میرا دل تیرے لئے دھڑکے" بھی ہے جسے موسیقار نثار علی پگارو نے کمپوز کیا تھا۔ اس طرح نثار علی ڈوبی پر عبدالغفور کی سوانح پر مکمل ہوا گیت "میرا الوگ کو گیا" نے متبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ صاحب طرز موسیقار خواجہ خورشید انور نے بھی ایک ڈوبی پر فلم میں اپنی دھنوں سے ترتیب دیا ایک گیت "میرا بچھڑا ہم کہاں آ گیا" سسرت نذیر پر ریکارڈ کروایا۔ نئے بہت پسند کیا گیا۔ ایک مقبول گیت جو فلم "راز" میں سسرت نذیر پر فلمایا گیا تھا جسے زبیدہ خانم نے گایا تھا اور جس کے بول تھے "میٹھی میٹھی بتیوں سے جیا نہ جلا" جب بھی گیت فیروز نظامی کی "دھن" میں سسرت نذیر سے گوایا گیا تو اس گیت کا لطف ہی دوبالا ہو گیا۔ سنگیت کے پنڈتوں نے زبیدہ خانم کی آواز میں گائے ہوئے گیت سے سسرت نذیر کے گائے ہوئے گیت بدرجہا بہتر قرار دیا۔ کچھ اسی طرح جواد۔ موسیقار رشید عطرے کا مشہور اور مقبول گیت " آج میرے منڈیر پہ کاگا بولے" سسرت نذیر سے گوایا گیا تو آواز کی اس جادوگری نے اس گیت کو کچھ اس انداز سے گایا کہ لوگوں کو مسلم کرنا پڑا۔ اچھے گیتوں کو اچھا گانے والا ہی متبولیت کی سربلندی عطا کرتا ہے۔

وہ جو مختلف چہروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خدا ایسے چہرے بناتا ہے کم، اسی طرح سسرت نذیر کی آواز کے بارے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ خدا کبھی سریلی اور لوں میں اترجانے والی آواز بہت کم گانے والیوں کو عطا کرتا ہے۔ یہ اس کی آواز ہی تھی جس نے سارے عالم کو اپنا دیوانہ بنا لیا تھا۔ اس کی عالمگیر متبولیت کی وجہ سے نندن، کینیڈا اور انگلستان میں اس کی گائیکی کے کئی شوز کیے گئے جو توقعات سے بڑھ کر کامیاب ہوئے۔ ان پروگراموں میں اس وقت کے پرستانی فنکاروں ندیم اور شبنم نے بھی شرکت کی جب کہ میزبانی کے فرائض طارق عزیز نے انجام دیئے۔

سسرت نذیر کی عوامی متبولیت کی وجہ سے اسے پاکستان کی نمائندگی کرنے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ سارک ممالک کے درمیان ثقافتی پروگراموں کے جذابے میں سسرت نذیر کے شادی بیاہ کے ایک پروگرام کو نیپالی کاسٹ کیا گیا جسے بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔

جب وہ بچوں کے لیے پاکستان آئی اور اس کی موجودگی سے ٹی وی والوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا تو فلم والے بھلا کیوں پیچھے رہتے کیونکہ وہ تو اسی کے سہارے کی فنکارہ تھی۔ چنانچہ موسیقار وزیر افضل نے اپنی دو فلموں "پگڑی" اور "پگلو" کے لیے اس کی آواز میں کئی گانے ریکارڈ کروائے پہلی فلم پگڑی کے تمن گیت

اچے نانے پر کی باجھ پڑھ پنجرے
وے زیر جیا نکیا اس دیکھ دی
اے میرے میری اڈی دی رج گھنڈ اتھیا

اور دوسری فلم پگلو کے لیے

دھول بجا کے کہہ گئے کل جہان نو
مہندی نال سجدی ہے بچے منڈے دی ماں

میلے دے رج تھیں ملدے نے رج کے لڈی

پہلی فلم 1985ء میں اور دوسری 1987ء میں ریلیز ہوئی۔ موسیقار اسلم اشرف نے بھی اپنی بنجابی فلم دشمن ڈاکو کے لیے سسرت نذیر سے چار گیت ریکارڈ کروائے جن کے بول تھے

آ جان جی آ ہووے من
آن دی میرے محبوب مستان وی
چن وے کی شوخیاں ہوئیاں
دشمن ڈاکو اسرار شمی نہیں بلکہ اسرار

ہدایت کار حیدر چوہدری نے اپنی فلم "آج تے من" کے لیے ایک گیت سسرت نذیر سے ریکارڈ کروایا۔ یہ گیت تھا دو بنجارہ لڑکیوں بانل کھنداری جو اداکارہ نادرہ پر فلمایا گیا تھا اور بہت مقبول ہوا تھا۔

موسیقار ذوالفقار علی نے بھی اپنی فلم "آخری قتل" کے لیے سسرت سے ایک گانا گوایا تھا اس کے بول تھے کاغاں اتے دھیاں رل تھیاں۔

اپنی آواز کا جادو جگانے والی سادہ پاکستان میں بسنے والوں تک سرحدوں کی دنیا میں دھوم مچانے کے بعد واپس چلی گئی کیونکہ ہر عورت کے لیے بیاہ کا گھر ہی سب سے پیارا ہوتا ہے جہاں وہ خوش ہے، شاد ہے، آباد ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عمر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے مگر اس کی خوب صورت آواز پہلے کی طرح اب بھی بھرپور جوان ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں خوب صورت آوازوں کے رسیا موجود ہیں وہاں سسرت نذیر کے گیتوں کی قندیل روشن ہے۔

میری کوم

تنویر ریاض

اس نے ہندوستان کے ایک انتہائی پسماندہ علاقے میں جنم لیا۔ ہندو مذہب میں عورتوں کو تو ویسے بھی حقیر سمجھا جاتا ہے، پھر وہ غریب بھی تھی اس لیے اسے تحقیر کے لاتق گردانتے تھے مگر اس کے دل میں حوصلہ تھا، وہ خود کو منوانا چاہتی تھی اس لیے اس نے ایک مردانہ کھیل منتخب کیا، اس کھیل میں مہارت حاصل کی تو دنیا لوگ جو اسے حقیر سمجھتے اپنا فخر کہنے لگے۔

ہم صغیر کی نامور لیڈی باکسر کی روداد زندگی

کھیلوں کی دنیا میں بے شمار خواتین نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں لیکن ان میں سے زیادہ تر کا تعلق فیشن، ریلیشن، اٹھلیٹک اور فن پرفارمنس سے ہے لیکن باکسنگ کے شعبے میں خواتین کی دلچسپی برائے نام تھی۔ گو کہ پہلا خواتین کا باکسنگ میچ 1876ء میں کھیلا گیا لیکن بہت ہی بڑی کشمکش کے خواتین کے باکسنگ کھیلنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ سویڈن وہ پہلا ملک ہے، جس نے 1988ء میں یہ پابندی ختم کی اور خواتین کو ریگ باکسنگ میں حصہ لینے کی اجازت مل گئی۔ بعد ازاں امریکا اور دوسرے ملکوں نے بھی اس کی تقلید کی اور اس کھیل میں بھی خواتین آگے بڑھتی نظر

آئیں۔ ان میں سے چند ایک نے بالنگ کی دنیا میں بہت نام کمایا اور عالمگیر شہرت حاصل کی۔ انہی میں سے ایک نام بھارتی یا اسپیری کوم کا بھی ہے۔ اس کا پورا نام سکھی چگے تن جنگ بیری کوم ہے۔ وہ 6 مارچ 1983ء کو منی پور میں پیدا ہوئی جو بھارتی ریاست منی پور کے ضلع چوراچند پور میں واقع ہے۔ بیری کوم باکسر مرتضیٰ رولنڈیا پر باکسنگ سیکھنے لگی تھیں اور وہ واحد خاتون باکسر ہے جس نے چھ مرتبہ ہونے والی چیمپئن شپ میں ہر بار ریکارڈ 6 وہ واحد بھارتی خاتون باکسر ہے جس نے 2012ء کو اولمپکس میں خالی ڈویژن کا تمغہ جیتا۔ اسے انٹرنیشنل بالنگ فیڈریشن کی دولہ ون کی طرف سے ''میگا سٹیٹ کوئین'' کے چنے جانے پر سرپرستی کا اعزاز حاصل ہے۔ اس نے 2014ء میں ہونے والے ایشین گیمز میں سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ 2013ء میں اس کی خوشدامن ''ان بے ایک اسکل'' کے نام سے شائع ہوئی جب کہ 2014ء میں اس کے اوپر بنے والی فلم میں بولی وڈ کی ہیروئن پریا نکا چوپڑا نے بیری کوم کا کردار ادا کیا۔ اس کی تفصیل آگے چل کر بیان کی جائے گی۔ بیری کوم نے منی پور کے دارالحکومت امپھال میں خواتین کے لیے ایک باکسنگ کلب بھی قائم کیا ہے جس میں لڑکیوں کو جنسی تشدد کے خلاف مزاحمت کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔

☆☆☆

بیری کوم کا بچپن غربت میں گزرا۔ اس کے والدین تونگا کوم اور اکھم کم، کھیتوں میں کام کرتے تھے جس سے ان کا گھر بار چلتا تھا۔ بیری کوم نے پانچ جماعت تک تعلیم لوک تک گرجین ماڈل ہائی اسکول سونے رگے سے حاصل کی اور آٹھویں کلاس تک بیسٹ ڈیجیٹو سکھلک اسکول میں پڑھا پھر اس نے آدم جاتی لوئی اسکول امپھال میں داخلہ لے لیا۔ لیکن میٹرک کا امتحان پاس نہ کر سکی۔ اس نے دوبارہ امتحان دینے کی بجائے وہ اسکول چھوڑ دیا اور دوسرے اسکول سے امتحان میں شرکت کی۔ پھر پڑھائی چھوڑ دی اور سے گریجویشن کر لیا۔

کوکو اے بچپن سے ہی اتھلیٹکس سے دلچسپی تھی لیکن سنی سے وہ سے تعلق رکھنے والے باکسر ٹنکو کو سنگھی کامیابی سے متاثر ہوئی اس کے بعد ہی باکسر بننے کا فیصلہ کیا اور اس نے منی پور اسپورٹس اکیڈمی کوچ نرجیت سنگھ کی زیر نگرانی اپنی تربیت شروع کر دی۔ اس کی شادی کے اوکرام سے ہوئی۔

ان دونوں کی ملاقات 2001ء میں ہوئی جب

میری کوم پنجاب میں ہونے والے بینشل گیمز میں شرکت کے لیے دہلی دہلی گئی جب کہ اوکرام، دہلی یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا ان دونوں نے 2005ء میں شادی کر لی اور پھر دو جڑواں بیٹے کے والدین بن گئے۔ 2013ء میں اس نے تیسرے بچے کو جنم دیا۔

دو سال کے وقفے کے بعد بیری کوم نے 2008ء میں ہونے والی ایشین ویسٹرن باکسنگ چیمپئن شپ میں حصہ لیا اور تانبے کا تمغہ جیتا جب کہ 2006ء میں ہونے والی ویسٹرن زونل چیمپئن شپ میں وہ گذشتہ چوٹی بار سونے کا تمغہ حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ اس نے فوراً بعد اس نے 2009ء میں ہونے والے دوحہ ایشین گیمز میں سونے کا تمغہ جیتا۔ 2010ء میں اس نے گاذ شمان میں ہونے والی ایشین ویسٹرن باکسنگ چیمپئن شپ میں سونے کا تمغہ اور بار بار ڈوس میں ہونے والی ویسٹرن زونل باکسنگ چیمپئن شپ میں مسلسل پانچویں بار سونے کا تمغہ جیتا۔

2010ء کے ایشین گیمز میں اس نے اکیاون کلو گرام کے مقابلے میں حصہ لیا اور کامیابی کا تمغہ جیتنے میں کامیاب رہی۔ اس نے 2011ء میں بھی میں ہونے والے 48 کلوگرام کے ایشین ویسٹرن چیمپئن شپ میں سونے کا تمغہ جیتا جب کہ 2012ء میں منگولیا میں ہونے والی ایشین باکسنگ چیمپئن شپ میں اسے سونے کا تمغہ ملا۔ اکتوبر 2014ء کو اس نے ییلو بار جوئیلی کو ہرایا میں ہونے والے ایشین گیمز میں سونے کا تمغہ جیتا۔

باکنگ مرتبہ کی دنیا فیڈریشن بیری کوم 46 اور 48 کلو گرام کی کیٹیگریز میں کئی تمغے جیت چکی تھی لیکن باکسنگ کی عالمی تنظیم کی جانب سے پابندی عائد کر دی گئی کہ خواتین صرف تین کیٹیگریز میں حصہ لے سکتی ہیں اور ان میں سے صرف دو کیٹیگریز میں ہی اولمپکس میں شرکت کر سکتی ہیں۔ چنانچہ 2012ء میں ہونے والی ویسٹرن زونل باکسنگ چیمپئن شپ میں بیری کوم نے صرف اس مقابلے میں حصہ لیا جس کی وجہ سے اسے اسی سال لندن میں ہونے والے سمر بالی اولمپکس کے لیے بھی کوالیفائی کرنا تھا۔ تاہم وہ اکیاون کلو گرام کے کوارٹر فائنل میں برطانیہ کی نکولا ایڈوز سے شکست کھا گئی۔ ویسٹرن زونل باکسنگ چیمپئن شپ ہونے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ بیری کوم کو کسی تمغہ حاصل نہ کر سکی تاہم وہ لندن اولمپکس کے لیے کوالیفائی کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

بیری کوم اس مقابلے میں شرکت کے لیے اپنی ماں اور شوہر کے ہمراہ لندن پہنچی۔ اس کا پہلا مقابلہ 5 اگست 2012ء کو پولینڈ کی کیرولینا سے ہوا جسے اس نے 19-14 سے شکست دے دی۔ دوسرے روز کوارٹر فائنل میں وہ تیونس کی نیرہ واسلیتی کو شکست دینے کے سیلاب رہی لیکن یہی فائنل میں ایک بار پھر برطانیہ کی نکولا ایڈورسے ہار گئی۔ اس طرح وہ اولمپک گیمز میں کانسی کا تمغہ حاصل کر سکی۔ اس کامیابی کی خوشی میں منی پور کی حکومت نے اسے پچاس لاکھ روپے نقد انعام دینے کا اعلان کیا۔

بیری کوم نے صرف ملکی اور بین الاقوامی مقابلوں میں ہی کامیابیاں حاصل نہیں کیں بلکہ اسے متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا جن کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

بہادری (بھارت کا سب سے بڑا اعزاز جو اسے اسپورٹس میں ملا) 2013ء، ارجن ایوارڈ (باکسنگ 2003ء، پدما شری (بھارت کا دوسرا بڑا سویلین اعزاز جو اسے اسپورٹس میں ملا) 2010ء، راجیو گاندھی کھیل رتنا ایوارڈ 2007ء، بیسٹ پلیئر ایوارڈ سکاٹ کلب آف ریکارڈز 2007ء، راجیو گاندھی کھیل رتنا ایوارڈ 2009ء، اسپورٹس وومن آف دا ایئر ممبار اسپورٹس ایوارڈ۔

لندن اولمپکس میں کامیابی کا تمغہ جیتنے پر ہندوستان کی حکومت کی جانب سے پچاس لاکھ روپے، منی پور حکومت کی جانب سے پچاس لاکھ روپے اور دو ایکڑ زمین، ہریانہ حکومت کی جانب سے تیس لاکھ روپے، اتراکھنڈ پردیش حکومت کی جانب سے دس لاکھ روپے، وزارت خارجہ امور کی جانب سے دس لاکھ روپے نقد انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔

بیری کوم کا بچپن بڑے ہی نامساعد حالات میں گزرا جب اس نے باکسر بننا چاہا تو اس کے پاس اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اس فیصلے کی مناسب تربیت حاصل کر سکے لیکن اس نے ہمت نہ ہاری اور اپنے عزم و حوصلے کی بدولت منزل کی جانب بڑھتی رہی۔ ریفرنڈم آفیسر کو دیے گئے ایک انٹرویو میں بیری کوم نے اپنی ابتدائی زندگی اور کیریئر کے حوالے سے کچھ پوچھ تاچھ بیان کیے تھے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے اس انٹرویو کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

چیمپئن شپ جیتنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ بیری کوم کو کسی تمغہ حاصل نہ کر سکی تاہم وہ لندن اولمپکس کے لیے کوالیفائی کرنے میں کامیاب رہی۔

ملینا مصور گزشت: آپ کا بچپن کیسا گزرا؟

ج: ہم بہت غریب تھے اور گزر اوقات مشکل سے ہوتی تھی۔ مجھے یہ بچپن میں ہی دوسروں کا بوجھ آن پڑا۔ جہاں تک ممکن ہوتا والدین کی مدد کرنے کی کوشش کرتی جب میں نے باکسنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا تو ابتدا میں والدین سے یہ بات چھپائی کیوں کہ ہمارے فیصلے میں اور معاشرے میں اس کھیل کو پسند کیا جاتا تھا۔

ملینا: یہ بات کیا تھی؟ کیا اس سے آپ کا کوئی تعلق تھا؟

ج: نہیں، مجھے مارشل آرٹس سے دلچسپی تھی۔ ہمارے علاقے میں صرف لڑکے ہی کھیلتے تھے۔ لڑکیوں کے لیے کوئی کھیل نہیں تھا۔ میں نے کبھی کسی لڑکی کو باکسنگ کرتے نہیں دیکھا۔ میں نے اپنے ہمسایوں کے بیٹے کو باکسنگ کرتے دیکھا تھا۔ میں نے اس سے باکسنگ کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ باکسنگ کے لیے بہت زیادہ پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے اپنے والدین سے اس بارے میں بات نہیں کی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں نے باکسنگ شروع کر دی تو وہ مجھے روکیں گے۔ اس لیے میں نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اپنے کوچ سے کہا کہ وہ میرے والدین سے بات کریں۔ میرے کوچ نے میرے والدین کو بتایا کہ میں باکسنگ میں بہت اچھی ہوں اور مجھے باکسنگ کرنی چاہیے۔ میرے والدین نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔

ملینا: آپ کے والدین کا ردعمل کیا تھا؟

ج: میرے والدین نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔

ملینا: آپ کے والدین کا ردعمل کیا تھا؟

ج: میرے والدین نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔

ملینا: آپ کے والدین کا ردعمل کیا تھا؟

ج: میرے والدین نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میں باکسنگ کرنا چاہتی ہوں تو وہ مجھے روکیں گے نہیں۔

س: رنگ میں اترتے وقت تمہارے ذہن میں کیا بات ہوتی ہے۔

ج: جج شروع ہونے سے پہلے صرف جیت کے بارے میں سوچتی ہوں۔ ایک بار مقابلہ شروع ہو جائے تو میرے ذہن میں کچھ نہیں ہوتا کیوں کہ ایک لمحے کے لیے بھی توجہ ہٹ جائے تو ایک پوائنٹ کا نقصان ہو سکتا ہے۔ اگر کبھی میں کوئی سٹنٹ ہو تو میرے شوہر بھی کہیں بتاتے اور کبھی کہتے ہیں کہ میرے بارے میں سوچا ہوا اور پوائنٹ گیٹنگ پر توجہ دو۔ اب میں پہلے کے مقابلے میں بہتر طور پر اپنی غضب ناکی ترتیب دینے کے قابل ہوگئی ہوں۔ مجھے اپنی طاقت اور کمزوریوں کا کافی اندازہ ہے۔

س: تمہارے کیریئر میں سب سے مشکل مرحلہ کب آیا؟

ج: 2012ء اولمپکس کے بھی کافی عرصہ پہلے میں برطانوی باکسر گولڈ ایلوے مرے سے ہار کے بھیجے بہت افسوس ہوا تھا۔ ان کیا کہیں اس بات کو ٹوٹی کہیں ہے کہ اولمپک مقابلوں میں ونکٹری اسٹینڈ رکھ کے سے کھلاڑ پورا ہو گیا۔

س: بظاہر میرے سے ایک اعزاز ہے لیکن میں اس تمغہ کا رنگ تبدیل کرنا چاہتی ہوں اور میری خواہش ہے کہ 2016ء کے اولمپکس میں سونے کا تمغہ حاصل کروں۔

س: تمہارے کیریئر کا نازک ترین واقعہ؟

ج: اس وقت میں اٹھارہ برس کی تھی اور دبئی میں ٹریننگ لے رہی تھی۔ جب میری ملاقات انگلینڈ سے ہوئی وہ سول سروس کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اسی دنوں مجھے پہلی بار دولت مشترکہ شپ میں شرکت کے لیے امریکا جانا تھا لیکن میرے پاس صرف پندرہ سو روپے تھے۔ جب اسے یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے چندہ جمع کر کے میرے لیے پندرہ ہزار روپے کا انتظام کیا۔ میں اس کے خلوص اور جذبے سے بہت متاثر ہوئی اور اس طرح ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے پھر 2005ء میں ہماری شادی ہو گئی۔

س: شادی کس طرح ہوئی؟

ج: اس نے ایک سال تک مجھے جذبے پر پروز کر دیا تھا لیکن میں اور میرے گھر والے تیار نہیں تھے۔ والد کا کہنا تھا کہ میں ابھی بہت چھوٹی ہوں اور مجھے کم از کم عرصہ بعد شادی کرنی چاہیے چنانچہ میں نے انکار کر دیا۔

س: تم نے تین سال انتظار کیا اور 22 سال کی عمر میں شادی کر لی۔ کیا اس سے تمہارا کیریئر متاثر نہیں ہوا؟

ج: بالکل نہیں، دراصل جب آپ مشہور ہو جاتے ہیں تو لوگ آپ کو پسند کرنے لگتے ہیں۔ میں روایتی پسند نہیں کرتا میں بنائے فریضہ بنانا نہیں چاہتی شادی بیاہ کا خیال تھا کہ شادی کے بعد اپنے طریقے پر کھیلوں گی لیکن شادی کے بعد میرے جسم سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی باکسنگ جاری رکھوں گی۔ میں نے 2007ء میں باکسنگ اکیڈمی قائم کی۔ میں زیادہ تر سفر میں رہتی ہوں اور میری بہت سوفوں میں دبئی اور امریکا میں اکیڈمی کا انتظام کرتا ہے۔ اس کے میں نے اپنے ہمسٹر کو خطاب دے رکھا ہے۔

س: کہیں یہ اکیڈمی قائم کرنے کا خیال کیسے آیا؟

ج: کچھ نوجوان میرے پاس آئے اور بولے۔ میڈم! ہمیں باکسنگ سکھانا ہے۔ ہم آپ جیسا بننا چاہتے ہیں۔ میں انہیں انکار کرتی اور مجھے اپنا زمانہ یاد آ گیا جب خود بھی اسی طرح کھیل میں دلچسپی لے رہی تھی۔ چنانچہ میں نے انہیں اگلے ہفتے آنے کے لیے کہا۔ اس وقت بہت تھوڑے لوگ آئے تھے۔ میں نے انہیں ورزش کے وقفے کے دوران سکھانا شروع کر دیا۔ اب ان کی تعداد تین تک پہنچ چکی ہے اور ان میں سے ایک تبتی بہت کم عمر نوعی مینجمنٹ بھی دیکھ رہا ہے۔

س: کیا تم صرف اپنے قبیلے کو ہم خواتین کو تربیت دیتی ہو؟

ج: جی نہیں، ایسی کوئی پابندی نہیں۔ کوئی بھی لڑکا یا لڑکی اس اکیڈمی کی فیس ادا کر سکتا ہے۔ البتہ میں مسلم ہونے کے ناتے لوگوں کو دعا ضرور دیتی کیوں میرے پاس ایسی سہولتیں نہیں ہیں۔ اب بھی نظر بنا چند وہ طالب علم میرے گھر میں رہتے ہیں اور انہیں ان کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام کر پاتے ہے۔

س: اس اکیڈمی کے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں۔ کیا تم ٹالب علموں سے کوئی فیس لیتی ہو؟

ج: میں کسی سے ایک روپیا بھی نہیں لیتی۔ یہ سب غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور میں اپنی جیب سے ان کے اخراجات پورے کرتی ہوں۔ ہمیں اسپورٹس اتھارٹی سے کچھ سہولیں ملی ہیں لیکن ان کے علاوہ کوئی اضافی سہولت میسر نہیں ہے۔ کارپوریٹ سیکٹر بھی نہیں ہے۔

س: تم یہ فیصلہ کس طرح کرتی ہو کہ کسے داخلہ دینا ہے؟

ج: میں صرف جسمانی فٹنس نہیں دیکھتی۔ کوئی بھی شخص باکسنگ کیے سکتا ہے۔ چند دن کی تربیت کے بعد مجھ لوگوں کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور وہ آنا چھوڑ دیتے ہیں کیوں کہ اس میں محنت بہت ہے۔

مائی شہرت یا نفسہ باکسر میری کوم کی اپنے شوہر اوتار کیرونگ سے ملاقات ایک حادثے ہی، جس کی تفصیل نوٹر نے بھی اس طرح بیان کی ہے۔ "جی ہاں میں اسے ایک حادثہ کہوں گی۔" 2000ء کی بات ہے۔ جب ایک غیر معروف کم عمر لڑکی بالکل مچھلیوں شب میں حصہ لینے کے لیے منی پور سے بنگلور کے لیے روانہ ہوئی۔ اس سے پہلے اس کے ساتھ میں اس کا والد گیم بھی جا چکا تھا۔ لہٰذا اس مرتبہ اس نے خلع بالغہ کے طور پر اس نے سوٹ کیس کو ایک زنجیر کے ذریعے اپنی کلائی سے باندھ لیا جس میں اس کا پاسپورٹ اور نقدی بھی تھی لیکن اس کی بے احتیاطی رائیگاں گئی اور جب اس کی آنکھ کھلی تو سوٹ کیس غائب تھا۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے میری کوم آبدیدہ ہو گئی۔ اس نے کہا۔ ان دنوں میری پاس بہت برا حال تھا۔ سب سے زیادہ فکر پاسپورٹ کی تھی جس کے بنوانے میں وقت لگتا۔ میں نظر تو نہیں لیکن اس۔۔۔ لیے میں نے خوشی کرنے کے بارے میں سوچا بھی بہت جدوجہد کے بعد ہم نے ہمت نہیں ہاری۔

اوتار اس وقت نارتھ ایسٹ اسٹیٹ پولیس بٹالین کا صوبہ تھا۔ اسے جب اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے میری کوم کو مدد کی پیشکش کی۔ "میں پہلی بار میری سے دہلی کے نیرو اسٹیڈیم میں ملا تھا کہ وہ مشکلات کے باوجود باکسنگ کے لیے پُرعزم ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ اسے جس کسی کی مدد چاہیے وہ اسے مل سکتی ہے۔ وہ ایک مرتبہ میرے لیے کھانا بھی لے کر آئی پھر ہم دوست بن گئے۔ ہماری دوستی چلتی رہی، پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ شادی کر لینی چاہیے۔ میں اس کے خواب کے بارے میں جانتا تھا اور ہر طرح سے میں اس کی مدد کے لیے تیار تھا۔

میری کوم کی سے ملنے کے بعد میری قسمت بدل گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت خوب صورت یا مشہور نہیں تھی۔ میں نے اس کی سادگی اور ایک کامیاب باکسر بننے کی خواہش دیکھ کر شادی کی۔ ہماری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں لیکن ہم ابھی تنہائی سے ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے صدیوں سے جانتے ہیں۔

میری کوم کی خوشگوار ساتھ حیات ان بریک ایبل کے نام سے شائع ہو گئی ہے۔ اس کی تقریب افتتاح کے موقع پر میری کوم نے کہا۔ میری کہانی اس ملک کی ہزاروں

ماہنامہ پاکیزہ کراچی
میں نیا دل گداز سلسلے وار ناول
گم شدہ محبت
آپ بیتی پر مبنی تحریر اور نیا ناول منگوانے کا بہترین موقع
انجم انصار
کے ماہرانہ قلم کا شاہکار..... شوخ و چنچل..... جملوں سے سجا..... معاشرتی و نفسیاتی گرہیں کھولتا ناول
محبت کے ایک انوکھے اور بے حد خوب صورت رنگ سے بھی روشناس کرائے گا
ماہ فروری سے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

عورتوں جیسی ہی ہے۔ اپنی زندگی کی جدوجہد کے بارے میں لکھنے کا مقصد دوسرے لوگوں کو اس بات پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ بھی اپنی آئیسہ کا دامن نہ چھوڑیں اور اپنے خوابوں کے لیے لڑتے رہیں۔"

جب اس سے دوسری کتاب لکھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا: "کتاب لکھنا، دلچسپ ہونے کی وجہ سے میرا سیڈل چبھنے سے زیادہ مشکل ہے۔ میں فطرتاً کم سخن ہوں لکھنا میرے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ میں عام طور پر کم عمر بچوں کو سمجھتی تھی، جب میرے پاس فاطمہ موجود ہوتا تھا، اس سلسلے میں بہن نے میری بہت مدد کی۔ زندگی کے بارے میں بہت سے واقعات یاد دلانے جو میں بھول چکی تھی۔"

میری کوم کو جو کچھ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس کی زندگی اور کارناموں پر بولی ووڈ میں ایک فلم بنائی گئی جس کے پروڈیوسر بنے لیلا عصالی اور ڈائریکٹر اومنگ کمار تھے جب کہ ہندی فلموں کی سپر اسٹار پریانکا چوپڑا نے اس فلم میں میری کوم کا کردار ادا کیا۔ درشن کمار نے میری کوم کے شوہر اونکھر کا رول نبھایا۔ فلم کی ریلیز تنازعہ سے گھری رہی۔ کئی ناموں کے رول بدلے گئے۔ یہ فلم 5 ڈیڑھ سو سنیما ہالوں میں 2014ء کو ریلیز ہوئی اور اسے تنقادوں کے ساتھ ساتھ عام فلم بینوں نے بھی پسند کیا۔ باکس آفس پر اس کی کامیابی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے پہلے چار ہفتوں میں چھ سو کروڑ روپوں کا بزنس کیا۔

پریانکا چوپڑا نے اس کردار میں خصوصی دلچسپی لی اور شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے وہ میری کوم سے ملنے منی پور گئی کہ اس کی زندگی کے بارے میں مزید جان سکے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے میری کوم نے کہا: "میں نے اسے اپنی زندگی کے ان گوشوں کے بارے میں بتایا جو دوسرے نہیں جانتی تھی۔ ایک بیوی اور ماں کے ہونے کے باوجود میں نے کس طرح اپنی گھریلو زندگی اور پروفیشن میں توازن برقرار رکھا ہوا ہے اور اپنی ٹیم کے ساتھ کس طرح رہ رہی ہوں۔"

پریانکا نے شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے دس روز تک باکسنگ کی تربیت لی اور شوٹنگ کے دوران وہ زخمی بھی ہوئی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہر اس کے کیریئر میں کسی سب سے مشکل فلم کی، جس میں اسے ایک کھیسری ایکٹریس کی بجائے سخت کیریکٹر کا رول ملے گا پڑا۔ تاہم اس کی محنت رنگ لائی اور اسے بہترین اداکاری پر کئی ایوارڈز ملے۔

میری کوم نے حال ہی میں شائع ہونے والی ان خبروں کی تردید کی ہے جن میں اس سے یہ بیان منسوب کیا گیا ہے کہ وہ شمالی مشرقی علاقوں میں کشیدگی کی وجہ سے اس فلم کے بیان کو نوٹ ڈرو ڈرٹریل کر لیا ہے۔ میں نے کبھی ایسا کچھ نہیں کہا۔ میں ایک محب وطن ہندوستانی ہوں اور میرا تعلق اس ریاست سے ہے اور یہاں سے کبھی اس طرح کا بیان نہیں دے سکتی۔"

اس سے پہلے اطلاعات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ میری کوم کی پوری فلم ہونے والے سانحہ پٹھانکوٹ واقعات سے خوف زدہ ہے جس میں دہشت گردوں نے ایک فوجی قافلے پر حملہ کر کے تین فوجیوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ اس وقت بنکوک میں آئندہ سال ہونے والی ورلڈ چیمپئن شپ کی تیاری کر رہی ہے جس میں کامیابی کی صورت میں وہ 2016ء کے اولمپک گیمز کے لیے اولمپل قابل کر سکے گی تاکہ اس کا سونے کا خواب پورا ہو سکے۔

معلوم ہوا ہے کہ میری کوم کے نام سے ٹیلی ویژن کے لیے ایک ایکٹیسٹ سیریز بنانے کی تیاری ہو رہی ہے جس کا کام میری کوم مہیا کرے گا ہے۔ اس سلسلے میں 32 سالہ باکسر نے پروڈکشن کمپنی سے معاہدہ کر لیا ہے۔ اس بارے میں اس کا کہنا ہے کہ مجھے لگتا ہوں کہ اس بارے میں مجھے زیادہ ذمے داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ لڑکیاں مضبوط بنیں اور ان میں اعتماد آئے۔"

اس ٹی وی سیریز میں میری کوم کے بچپن، اس کی اسکول لائف اور باکسر بننے کے مراحل کا احاطہ کیا جائے گا اور اس کا مقصد کم عمر لڑکیوں کو اپنی شناخت کے لیے تیار کرنا اور ایسے کھیلوں بالخصوص باکسنگ کی جانب راغب کرنا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے آپ کو منضبط کر سکیں۔

میری کوم کی جدوجہد ابھی جاری ہے۔ 32 سال کی عمر میں تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود اس کا حوصلہ جوان ہے اور وہ پورے جوش کے ساتھ آئندہ سال ہونے والے مقابلوں کے لیے تیاری کر رہی ہے۔ اب اس کی نگاہ منزل 2016ء کے اولمپکس میں سونے کا تمغہ جیتنے پر ہے۔ اس کے لیے وہ ہر طرح کی تیاری کر رہی ہے۔ اس نے گزشتہ تجربات اور ناکامیوں سے بہت کچھ سیکھا ہے اور اس کی روشنی میں وہ اپنی کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے پوری امید ہے کہ اس بار وہ اپنے مداحوں کو مایوس نہیں کرے گی۔

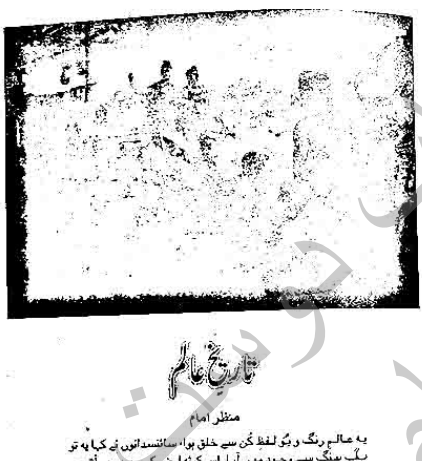

تاریخ عالم

منظور امام

یہ عالم رنگ و بُو لفظ کُن سے خلق ہوا، سائنسدانوں نے کہا یہ تو بگ بینگ سے وجود میں آیا۔ اس کرۂ ارض کے وجود میں آنے کی بھی زندگانی نے انگڑائی لی۔ آدمی کا وجود سامنے آیا۔ آدمی نے پی کس کرۂ ارض کی رنگینی میں اضافہ کیا۔ اس نے ترقی کا اسپ تیز رفتار دوڑایا۔ یہ دنیا ترقی یافتہ دنیا، رنگینیوں، آسائشوں سے بھری دنیا کوئی ایک دن کی کہانی نہیں۔ ہزاروں سال پر محیط کہانی ہے جسے نہایت مختصر مگر جامع انداز میں احاطہ تحریر میں لایا گیا۔

خوش ذوق قارئین کے لیے ایک دلچسپ تحریر کا ساتواں حصہ

پچھلی قسط میں ہم نے تاریخ کو حلہ اور جلد سینے کی کوشش کی تاکہ پڑھنے والوں کو تھوڑے سے مطالعے کے بعد بہت کچھ جاننے کا موقع مل جائے۔

ہم مختلف ادوار کا تجزیہ کرتے ہوئے 399 قبل مسیح تک آگئے۔ یعنی اوّل قبل مسیح سے چار سو تک۔ اس دور میں جو بڑے لوگ انسانی تاریخ میں سامنے آئے۔ ان کا مختصر ذکر کردیا گیا تھا۔

جیسے سقراط، افلاطون، ارسطو، سکندر اعظم، مانی اور لاؤتسو۔ یہ لوگ دنیا کے مختلف ممالک میں تھے اور مختلف قوموں سے ان کا تعلق تھا۔

ہم ارسطو تک آئے تھے۔ اب اسی عہد کا ایک اور بڑا آدمی سکندر اعظم بھی تھا۔ سکندر اعظم کی شہرت افسانوی ہو کر

رہ گئی ہے۔ بلکہ مقدر کا سکندر۔

کچھ باتیں سکندر اعظم کے حوالے سے ہو جائیں تو بہتر ہے۔

سکندر اعظم (356ء تا 323ء قبل مسیح)

دنیائے قدیم کا عظیم فاتح سکندر اعظم مقدونیہ میں 356 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ بادشاہ فلپ دوم تھے۔ ستونوں میں غیر معمولی قابلیت اور بصیرت کا حامل انسان تھا۔

لفظ جیمس بیس برس کی عمر میں فلپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔ باپ کی موت کے وقت سکندر صرف بیس برس کا تھا۔ اتنا کم سن کہ بڑوں کی مدد کے بغیر باپ کی جگہ اقتدار میں آگیا کیونکہ باپ نے اپنے بیٹے کی جانشینی کے لیے راہیں ہموار کر دی تھیں۔

نوجوان سکندر کو اہل مقدونیہ کی حمایت سے بیس کیسا گیا تھا۔ فلپ نے اس کی ذہنی تربیت کا بھی خاطر خواہ انتظام کیا تھا۔ عظیم عالم ارسطو کو اس کا اتالیق مقرر کیا تھا۔

سکندر کی فتوحات کے بیشمار میں سے تخت نشین ہونے کے دو سال بعد ہی سکندر نے یونان اور شمالی علاقہ جات کو پھر سے فتح کر لیا جو مقدونیہ کے زیر باد کر سکیل چکا تھا۔

بعد ازاں اس نے ایران کی طرف یلغار کی۔ دو سو سالوں سے ایرانیوں نے ایک وسیع علاقے پر جو تقریباً موجودہ دور کے ہندوستان جتنا محیط تھا۔ ایک عظیم سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ اگرچہ ایرانی سلطنت کو اب ماضی جیسا عروج حاصل نہیں۔ تاہم ایک بے نہایت قابل تسخیر طاقت اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھی۔

334 قبل مسیح میں سکندر ایران پر حملہ آور ہوا۔ اسے اپنی فوج کا کچھ حصہ مقدونیہ میں چھوڑنا پڑا تھا اور صرف پینتیس ہزار فوج لیکر اس کے ساتھ ایران پر حملہ آور ہوا تھا۔

ایران کے پاس کہیں بڑی فوج تھی۔ اس کے باوجود سکندر نے شکست دے دی۔ اس کی کامیابی کی تین بڑی وجوہات تھیں۔

ایک۔ فلپ کی تیار کردہ تربیت یافتہ فوجیں سے کہیں زیادہ تربیت یافتہ اور منظم تھی۔

دوم۔ سکندر ایک غیر معمولی اہلیت کا حامل سالار تھا۔ عالمانہ تاریخ کا سب سے بڑا جنگجو۔

سوم۔ اس کی ذاتی شجاعت مثالی نے بہت اہم کردار ادا کیا۔

اپنے خاص سواروں کے رسالے کی قیادت وہ خود کرتا تھا۔ جس سے اس کی فوج کے حوصلے بلند رہتے تھے۔

ایک بار عصر سے کے دوران میں اسے شاہ ایران کا ایک پیغام موصول ہوا کہ روپا جی نصف سلطنت کے بدلے اس سے اس معاہدہ کرنے کو تیار ہے۔

سکندر کے ایک سپہ سالار پارمینو نے پیشکش کا قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ اس نے کہا۔ "اگر میں سکندر ہوتا تو یہ پیشکش قبول کر لیتا۔"

اس پر سکندر نے ایک تاریخی جملہ کہا۔ "ہاں! میں بھی قبول کر لیتا اگر میں پارمینو ہوتا۔"

ایران کے بعد وہ مصر کی طرف متوجہ ہوا۔ کسی مقابلے کے بغیر اسے پایا بھی ہو گئی۔ وہ صرف چھ سال برس کا تھا جب اس نے فرعون کا تاج پہنا اور خود کو فرعون قرار دیا۔

پھر وہ ایشیا واپس آیا اور بابل کی فتح کر لی۔ اس کے بعد اس نے ایرانی فوج کو مکمل طور پر اکھاڑ پھینکا۔ اس کے بعد بابل، افغانستان، ہندوستان۔

وہ ایک دانش ور بھی تھا۔ اس نے صرف فتوحات ہی حاصل نہیں کیں بلکہ تہذیبوں پر بھی اپنے اثرات مرتب کیے۔ اس نے ایرانیوں اور یونانیوں کی شادیاں کروائیں تاکہ ایک نیا تمدن سامنے آئے۔

323 قبل مسیح میں جون کے اوائل میں بابل میں سکندر اعظم بیمار پڑ گیا اور صرف دس روز بعد دنیائے فانی سے کوچ کر گیا۔ تب اس کی عمر فقط تینتیس برس تھی۔

اپنی فوری موت کے بعد فوجی زندگی میں اس نے ایک بار بھی شکست نہیں کھائی۔

اب ہم چین کی طرف جاتے ہیں۔ وہاں اب یہ زمانہ لاؤ تسو کا ہے۔

ان ہزار ہا کتابوں میں جو چین میں لکھی گئیں ایک ایسی بھی ہے جس کے سب سے زیادہ تراجم ہوئے اور جو ملک سے باہر بھی پڑھی گئی۔

یہ ترجمہ دو ہزار سال قبل لکھے گئی اور لاؤ تسو یا تاؤ تی چنگ کے نام سے جانی جاتی ہے۔ یہ تاؤ مت کے فلسفہ کے حوالے سے ایک بنیادی کتاب ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا اور غیر معمولی دبلا پتلا انداز میں لکھا گیا ہے۔ تاؤ مت کے بنیادی تصور "تاؤ" کو عموماً راستہ کے طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے۔

چینی روایت کے مطابق تاؤ تی چنگ کا اصل مصنف لاؤ تسو تھا۔

قبل از مسیح چین میں بہت سے ایسے دانشور اور مفکر گزرے ہیں جن کے افکار نے چینیوں کی تہذیب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

جیسے کنفیوشس، ماذی، بی شی، چوانگ تسو وغیرہ۔

تاریخ کے اس حصے میں ارسطو، سقراط، افلاطون اور سکندر اعظم وغیرہ بھی اس جیسے ہی چین میں لاؤ تسو کی کتاب "تاؤ تی چنگ" بھی لکھی گئی تھی۔

اب ہم 300 قبل مسیح سے ہوتے ہوئے 199 قبل مسیح تک آجاتے ہیں۔ اس دور میں بھی کئی اہم کردار سامنے آئے جیسے الیگزینڈر، ہیرا بعل خاشگ، ارخمائس آف سائراکیوز، آرشمیدس وغیرہ۔ اس دور میں ٹی بعل نے چین کو متحد کیا تھا۔

آرشمیدس دنیائے قدیم کا ایک انتہائی ذہین ریاضی داں اور ماہر سائنس داں تھا۔ اسے سپہ سالار عاصل سے کم اس نے "لیور" (پہیا) کا اصول اور تصویر سمجھنے میں مدد کی تھی۔ آرشمیدس سے صدیوں قبل لیور کے بارے میں محسوس آگاہی موجود تھی لیکن وہ پہلا شخص تھا جس نے لیور کے عمل کو ایک کلیہ کی صورت میں واضح طور پر بیان کیا۔

جب کہ آرشمیدس سے بہت پہلے مصری معمار لیور کو استعمال میں لاتے تھے۔

کسی شے کی کثافت (جسم کی ہر اکائی کا وزن) کا تصور جو شے کے حجم وزن کے برعکس ہے۔ آرشمیدس سے پہلے انسان علم کو جنم ہی چکا تھا۔

آرشمیدس کے حوالے سے یہ روایت بہت مشہور ہے کہ وہ ان ہی سب پر غور کیا کرتا تھا اور اسی غور کے دوران ہی نہانے کے لیے جب وہ غسل خانے میں داخل ہوا اور نہانے کے لیے ٹب میں اترا تو اس کے پانی کا اچھلنا شروع ہو گیا۔ وہ اس حالت میں جب بے خبر بازار کی گلیوں میں یہ پکارتا ہوا دوڑے نکل پڑا تھا۔ "میں نے پالیا، میں نے پالیا۔"

بطلیموس دانش اور آرشمیدس کا معاصر بہت بلند پایہ۔

اراصل اس نے قریب قریب ایک دائرکی علم الاحاطا (Calcos) جمع کر لیا تھا جسے مختلف حالت میں احاطہ ہو سال بعد نویشی نے تخمین لگائی تھی۔

اب ہم اس دور کے ایک اور اہم شخص کی طرف آتے ہیں۔ وہ ہے ہندوستان کا مہاراجا اشوک۔ ہندوستان کی تاریخ میں عالمانہ ہے اس مہاراجا سے بڑی عظیم شخصیت کا تعارف کرانے والا کوئی اور نہیں۔ یہ ان اصلاحات نے ہیں کہ تہذیبی اتحاد کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا تھا جو آج بھی موجود ہے۔

ٹی یو لانگ کی 259 قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ 210 قبل مسیح میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ چاؤ خاندان کے دور اقتدار کے آخری دنوں میں پیدا ہوا تھا۔

اشوک کا سال پیدائش یا علم ہے۔ غالباً 300 قبل مسیح کے لگ بھگ پیدا ہوا۔ 273 قبل مسیح میں تخت پر بیٹھا۔ اول اول اس نے اپنے دادا کی حکمت عملی کا اتباع کیا اور لشکر کشی کے ذریعے توسیعات حاصل کرتا چلا گیا۔

اپنے اقتدار کے آٹھویں برس اس نے ہندوستان کی شرقی سرحدوں پر واقع ریاست کلنگا کو گھمسان کی جنگ کے بعد جیت لیا (آج اس ریاست کو اڑیسہ کہا جاتا ہے)۔ لیکن جب اسے اپنی فتح کے بعد انسانی جانوں کی تباہ کاریوں کا احساس ہوا تو وہ شدید دکھ میں مبتلا ہو گیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں مارے گئے تھے۔ جب کہ اس سے کہیں زیادہ زخمی ہوئے تھے۔

اس صدمے اور پشیمانی کے عالم میں اشوک نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستان کی فوجی فتح مکمل نہیں کرے گا بلکہ ہر طرح کی جارحانہ کارروائیوں کو ترک کر دے گا۔

اس نے بدھ مت کو اپنا لیا۔ بدھ مت فلسفے کے طور پر اپنایا اور دھرم کی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کی۔

ذاتی طور پر اشوک نے شکار ترک کر دیا اور سبزی خور بن گیا۔ جب کہ زیادہ اہم اور مستحق جیلوں اور سیاسی حکمت عملیاں میں بتراس نے اختیار کیں۔

اس نے بہت سے اصلاحی کام کیے۔ اسپتال اور جانوروں کے اسپتال قائم کروائے۔ تخت قوانین کو عام کیا۔ سڑکیں بنوائیں اور لنگر آباد یا کنوئیں کھدوائے۔

بدھ مت کے پھیلاؤ میں اشوک کا بہت بڑا حصہ ہے۔

اس کے حکم پر اس کی زندگی کی تفصیلات اور اس کی حکمت عملیوں کو بڑی چٹانوں اور ستونوں پر کندہ کروایا گیا تاکہ سلطنت میں نصب کیے جائیں۔ ان میں سے کئی ابھی تک باقی ہیں۔

اس بادشاہ روں کے پھیلاؤ سے ہمیں اشوک کی سلطنت کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

اب آجاتے ہیں کی طرف۔ تاریخ کے اس دور میں عظیم چینی شہنشاہ یو لانگ تھے 210 قبل مسیح تک۔ چین پر حکمران رہا۔ اس نے عسکری قوت سے چین کو متحد کیا اور متعدد جامع اصلاحات کیں۔ ان اصلاحات نے چین کے تہذیبی اتحاد کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا جو آج بھی موجود ہے۔

اس زمانے میں یعنی بیسویں صدی کے شروع میں بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا۔ یہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ کبھی کبھار کوئی ریاست اپنی فوجی قوت کے بل بوتے پر کمزور کے ایک حصے پر قبضہ کرلیتی تھی۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اپنی ریاست کی سرحدوں کو وسیع کرے۔ اس کے لیے وہ ہمسایہ ریاستوں پر حملہ کرتی تھی۔ اس طرح کی جنگوں کو ''توسیع پسندانہ جنگیں'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی جنگیں جن کا مقصد اپنی ریاست کی توسیع کرنا ہوتا ہے۔ ایسی جنگوں کو ''توسیع پسندانہ جنگیں'' کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی جنگیں جن کا مقصد اپنی ریاست کی توسیع کرنا ہوتا ہے۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنی سرحدوں پر موجود ہمسایہ ریاستوں کو ایک سلسلے میں جوڑ دیا تھا۔ اور یہی دیوار دنیا کی سب سے بڑی دیوار یعنی چین کی عظیم دیوار کہلاتی ہے۔ اس دیوار میں شامل ہونے والی ریاستوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔ اس طرح یہ دیوار وجود میں آئی تھی۔ اس دیوار کی لمبائی 1500 میل ہے۔ اس دیوار کی تعمیر میں 10 لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔ اس دیوار کی تعمیر میں 10 سال کا عرصہ لگا تھا۔ اس دیوار کی تعمیر میں 221 قبل مسیح میں شروع ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 210 قبل مسیح میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 11 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 10 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 9 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 8 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 7 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 6 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 5 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 4 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 3 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 2 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 1 سال میں مکمل ہوئی تھی۔

اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے اپنی سرحدوں پر موجود ہمسایہ ریاستوں کو ایک سلسلے میں جوڑ دیا تھا۔ اور یہی دیوار دنیا کی سب سے بڑی دیوار یعنی چین کی عظیم دیوار کہلاتی ہے۔ اس دیوار میں شامل ہونے والی ریاستوں کو ایک دوسرے سے ملا دیا تھا۔ اس طرح یہ دیوار وجود میں آئی تھی۔ اس دیوار کی لمبائی 1500 میل ہے۔ اس دیوار کی تعمیر میں 10 لاکھ مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔ اس دیوار کی تعمیر میں 10 سال کا عرصہ لگا تھا۔ اس دیوار کی تعمیر 221 قبل مسیح میں شروع ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 210 قبل مسیح میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 11 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 10 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 9 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 8 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 7 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 6 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 5 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 4 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 3 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 2 سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس دیوار کی تعمیر 1 سال میں مکمل ہوئی تھی۔

اس کی تمام اصلاحات میں سے ایک جس نے سب سے زیادہ دیرپا اثرات چھوڑے۔ وہ ایک نئے گھڑیال کا اجرا تھا۔ جو ترجمہ اس نے متعارف کروائی وہ معمولی سی ترمیم کے ساتھ آج بھی رائج ہے۔

اور یہی دور آکٹس سیزر کا ہے۔ سلطنت روما کا پہلی آگسٹس سیزر تاریخ کی چند عظیم مرکزی شخصیات میں سے ایک ہے۔ وہ 63 قبل مسیح میں پیدا ہوا اور جولیس سیزر کا بھانجا بھی تھا۔ اس کا نام آکٹاویس تھا۔

سیزر کی موت کے بعد اقتدار کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی تھی۔ پھر آگسٹس اور انتھونی کے درمیان طویل جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ میں باری باری وقفے کے دوران میں انتھونی کلیوپٹرہ سے محبت کی پینگیں بڑھاتا رہا۔ جب کہ آگسٹس نے اپنی عسکری قوت مضبوط کرنا شروع کردی۔

اگلے برس تک پھر چھڑی اور اوکٹاوین (آگسٹس) کو مکمل فتح حاصل ہوئی اور انتھونی، کلیوپٹرہ نے خودکشی کرلی۔

مکمل اقتدار میں آنے کے بعد آگسٹس حیرت انگیز طور پر صلح جو ہوگیا تھا۔ وہ غالباً تاریخ میں ایک قابل اور کریم النفس آمر کی بہترین مثال ہے۔ وہ ایک مجاہد اسلام والا تھا۔ اس کی صلح جویانہ سخت عملیوں نے روما جیسی جنگجو اس سے پہلے ہونے والے خلفشار کو دور کیا۔ اس نے تقریباً چالیس برس روم پر فرمانروائی کی۔

ہم مکمل اڑنج کے تقریر جائزہ اہم واقعات کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ دنیا کے مختلف ممالک میں زندگی اور تہذیب کس رفتار سے سفر کرتی رہی۔

اب ہم بعد از مسیح کی تاریخ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ یادگیریں کہ ہماری تاریخ کا یہ حصہ تاریخ اس سے شروع ہوا تھا۔

اس وقت سے جب انسان نے کرۂ ارض پر اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔ پھر چھتروں کا عہد، دھاتوں کا عہد اور ہوتے ہوتے ہم بعد از مسیح تک آگئے ہیں۔ بعد از مسیح وقت اور زندگی کی رفتار بہت تیز تھی۔

اس عہد کا سب سے بڑا واقعہ اور سب سے بڑا کردار تو خود حضرت عیسیٰ ہیں۔ ان کا زمانہ 6 قبل مسیح سے تیس عیسوی تک کا ہے۔

حضرت عیسیٰ کے بارے میں ہماری مذہبی کتابیں ہیں اور دوسرے حوالوں سے اس قدر لکھا گیا ہے کہ ان کی تفصیل دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک عیسوی سے سو عیسوی تک سینٹ پال نے عیسائیت کی تبلیغ کی۔ تحریر اور تالیف کا کام شروع کیا۔ مسیحی المیات وضع کرنے کا کام بنیادی طور پر سینٹ پال نے سر انجام دیا۔

سینٹ پال عہد نامہ جدید کے ایک بڑے حصے کے مصنف تھے۔ وہ یسوع مسیح کے ساتھیوں میں سے تھے۔ ایک سو عیسوی تک کے اہم ترین واقعات قابل ذکر ہیں (حضرت عیسیٰ کو مصلوب کرنے کی کوشش بھی اسی دوران میں ہوئی ہے)۔

سن ایک سو ایک سے ایک سو نواسی عیسوی تک۔

اس پوری صدی کا اہم ترین واقعہ جس نے انسانی تاریخ پر گہرا دخل دیا وہ کاغذ کی ایجاد تھا۔ اس کے بعد روئی سلطنت کا عروج، بطلیموس، جالینوس وغیرہ۔

ٹسائی لون

کاغذ کے موجد ٹسائی لون کا نام بہت سے قارئین کے لیے نیا یا مصروف نہیں ہے اس شخص کی اس ایجاد نے انسانی ترقی کی رفتار کو بڑھا دیا۔ اس نے 105ء میں شہتوت کا کاغذ کے نمونے پیش کیے تھے۔

ٹسائی لون کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔ چینی تاریخی دستاویزات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک مشہد تھا۔ شہتوت یا ٹسائی لون کی اس ایجاد سے بہت خوش تھا۔ اس نے ٹسائی لون کو انعام و اکرام دینے کے علاوہ اس کا عہدہ بھی بڑھا دیا تھا۔ بعد ازاں وہ شاہی محل کی سازشوں میں مبتلا ہوگیا۔ اسے معتوب ٹھہرایا گیا۔ اس جرم کی وجہ سے اس نے خودکشی کرلی تھی۔

بہر حال اس کی زندگی کے واقعات اور حالات چاہے کچھ بھی ہوں اس کی ایجاد نے انسانی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔

اور یہ وہی زمانہ ہے جب رومی سلطنت نے بے پناہ عروج حاصل کیا۔ اس کی بنیاد آگسٹس سیزر نے رکھ دی تھی۔ جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

اب آتے ہیں سن 200 عیسوی سے سن 300 عیسوی تک۔

یعنی اس ایک سو برسوں میں دنیا میں کیسے بڑے واقعات رونما ہوئے اور کون کون سے کردار سامنے آئے۔ یہاں ایک بار پھر یہ واضح کردیا جائے کہ یوں تو دنیا کے ہر حصے میں کوئی نہ کوئی تغیر الشان واقعہ ضرور رونما ہوا ہوگا یا کوئی باکردار سامنے آیا ہوگا لیکن ہم یہاں ان کرداروں اور ان واقعات کا جائزہ لے رہے ہیں جنہوں نے تاریخ پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے۔

اس سوسال کے عرصے میں چین میں یان خاندان کا اختتام ہوا اور مانی نے مسیوپوٹیمیا ایران میں اپنی تعلیمات کا پرچار شروع کیا۔

ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ 226 عیسوی میں ساکا اور ستیان کی بلادا قوم کے سرداروں نے مشرقی ایران، سیستان، بلوچستان، سندھ، گجرات، کاٹھیاواڑ میں جاگیریں قائم کرکے وسیع سلطنت بنالی اور کوشانی قوم کے اقتدار کا خاتمہ کردیا۔

اس دور کا ایک اہم کردار مانی ہے۔

مانی کا زمانہ 216 عیسوی سے 276 عیسوی تک کا ہے۔

مانی، مانی مت کا بانی تھا۔ آج یہ مذہب بانی نہیں رہا۔ لیکن اپنے عروج کے زمانے میں اس کے پیروکاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ مشرق وسطیٰ میں اس کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد بانی مت مغرب میں، نخراطونیوس اور مشرق میں، نخرا کالمل تک پھیل گیا۔

مانی نے جو مذہب تخلیق کیا وہ قدیم مذاہب کے خلاصے کا ایک دلچسپ اختراع تھا۔ مانی کے مطابق روز تشت، دھارما اور یسوع مسیح حقیر تھے لیکن مانی کی صورت میں یہ ایک ہی مذہب اب مکمل ہوگیا تھا۔

مانی نے تمام روئی کرۂ زمین پر ایک ہی مسیحی کی حکومت نہیں بلکہ اس مسلسل ٹکراؤ اور تصادم میں دو قوتیں کارفرما ہیں۔ ان میں سے ایک قوت ہے جسے مانی نے ظلمت اور مادے سے متماثل قرار دیا۔ دوسری قوت خیر کی ہے جسے اس نے نور اور روح کہا۔ (بظاہر یہ خدا اور شیطان کے تصور کا اعادہ ہے)۔

اس نے انسانی روح کو خیر کی اور انسانی جسم کو شر کا قرار دیا۔ جس سے یہ عقیدہ وجود میں آیا کہ تمام جسمانی تعلقات سے اجتناب ضروری ہے۔ یہ گوشت خوری اور شراب نوشی سے بھی منع کرتا ہے لیکن یہ اصول عام لوگوں کے لیے نہیں ہیں۔ خاص لوگوں کے لیے ہیں۔

مانی 216 عیسوی میں مسیوپوٹیمیا میں پیدا ہوا اور وہ علاقہ اس وقت چالیسیں خاندان کی ایرانی سلطنت میں شامل تھا۔ مانی خود نازی النسل تھا۔

بارہ برس کی عمر میں ہی اس پر بقول اس کے وحی نازل

ہوئی شروع ہوئی۔ تین برس کا ہوا تو اس نے اپنے نئے مقصد کے لیے جدوجہد شروع کردی۔

اپنے آبائی وطن میں ابتدا میں اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر وہ شمالی مغربی ہندوستان چلا گیا۔ جہاں وہ ایک مقامی حکمران کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

242 عیسوی میں وہ ایران واپس آیا۔ بادشاہ شاپور اوّل نے اسے اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت دے دی۔ مانی نے بہت سے پیروکار جمع کرلیے۔ زرتشت مت کے لیے اس کا خروج ناقابلِ برداشت تھا۔

276 عیسوی کے قریب نئے بادشاہ ہرام اوّل کی تخت نشینی کے بعد مانی کو گرفتار کرکے قید کردیا گیا۔ چار چھبیس روز تک بے پناہ تکلیفیں برداشت کرنے کے بعد اس کا انتقال ہوگیا۔

اپنی زندگی میں اس نے کئی کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ایک فارسی زبان میں ہے۔ باقی سریانی میں ہیں۔

ہم دو سو عیسوی سے دو سو ننانوے عیسوی تک آگئے ہیں۔

اب ہم جائزہ لیتے ہیں تین سو عیسوی سے تین سو ننانوے عیسوی تک کے تین دہشیں کہ اس دور میں کیا بڑے واقعات رونما ہوئے۔

اوّلین بیرونی تہشاہ دوم کا سلسلہ تین اوّل، آمر دایلس کی جنگ میں رکاوٹوں اور گھمنڈ کا شکیوں سے آزمائے سواروں کے گوجک رستے نے روڈی یاد فوج کو شکست دی۔

ہندوستان میں کوہستانی خاندان کے زوال اور خاتمے کے بعد گپتا خاندان کی سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ 320 عیسوی میں اس خاندان کا ایک حکمران چندر گپت مہاراجا دھیراجا کے لقب سے دادی گنگا اور اس نے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کی غرض سے ایک مہاراجی کمار دیوی سے شادی کرلی۔ پھر جلد ہی چڑھائی کرکے اودھ اور الہ آباد تک قابض ہوگیا۔ اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سمدر گپت تخت نشین ہوا۔

سمدر گپت نے دکن کی سرزمین کو فتح کرکے وہاں کے راجاؤں کو اپنا مطیع بنالیا۔ سمدر گپت کے بعد اس خاندان کا مشہور بادشاہ چندر گپت ثانی بکرما ہیت حکمران ہوا۔ جس نے 375 عیسوی سے 413 عیسوی تک حکومت کی۔

اس بادشاہ کے عہد میں ہر معیوں کو بہت عروج حاصل ہوا۔ بدھ مت کے مقابلے میں تمام برہمن مت فروغ پانے لگا۔ سن سکرت زبان کو اور سرفراز کیا گیا۔ برہمنوں اور مذہبی کتابوں پر نظر ثانی کی گئی۔ سن سکرت کی مشہور رامائن اور مہابھارت کا ترجمہ فرمایا۔ نولیں بکالی داس اس بادشاہ کے عہد میں گزرا ہے۔ (جس کا ہنگ شکنتلا ابھی شامل آپ ہے)۔

کانس جن ٹائن اعظم اس کا زمانہ 280 عیسوی سے 337 عیسوی کا ہے۔

کانس جن ٹائن روم کا پہلا عیسائی شہنشاہ تھا۔ اس نے عیسائیت کے فروغ کے لیے بہت سے کام کیے۔ اس کے علاوہ اس کی دیگر اصلاحات بھی قابلِ ذکر کریں۔

اس کا ایک بڑا کارنامہ قدیم بازنطینی شہر کی تعمیر بھی ہے۔ اس شہر کو اس نے کانس تنطی نوپل کا نام دیا اور اسے اپنا دارالحکومت بنالیا۔ وہی شہر آج استنبول بلاتا ہے اور دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے۔

جب تین سو ایک عیسوی سے سفر کرتے ہوئے ہم سو عیسوی تک آپہنچے ہیں۔ اب اس سے آگے کی تاریخ دیکھیں ہے۔

یہ تاریخ 400 عیسوی سے 499 عیسوی تک ہے۔

اس صدی کے چند بڑے واقعات دیکھیں ہیں۔

روم کو زوال پذیری ہونے ہے۔ ہیلے آ لمناتھن کا دور۔

ہینگ سین فو نے انتظامات پر حملہ آور ہوئی ہے۔ مغربی سلطنت روما کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

اب ہندوستان کی طرف آئیں۔

ہندوستان میں گپت خاندان کے ہمرا جیت کی حکومت ہے۔

اس دور میں ہندوستان میں آرٹ کو بہت ترقی ہوئی۔ سنگ تراشی کے بہت خوب صورت نمونے سامنے آئے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی مورتیاں بھی بہت زیرِ دست بنائی جاری ہیں۔

413 عیسوی میں چندر گپت نے وفات کے قریب مہرولی میں لوہے کی ایک لاٹھ نصب کروائی۔ جس پر اس کے نام کا کتبہ درج ہے۔ یہ لاٹھ آج تک موجود ہے۔

ہم 499 عیسوی تک آپہنچے ہیں۔ اس سے آگے تاریخ اور بھی تیز رفتار ہوتی جاری ہے۔ واقعات اور کردار کا انبار لگا ہوا ہے۔

بہر حال ہم کوشش کریں گے کہ خاص خاص واقعات اور کرداروں کو چنتے ہوئے آگے بڑھتے جائیں۔

(جاری ہے)

فروری کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے دوسرے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنہوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنہیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

اس ماہ کئی افراد کا تذکرہ دوبارہ مگر الگ انداز سے کیا گیا ہے تاکہ شخصیت کا خاکہ ذہن میں تازہ رہے

☆ فیض احمد فیض

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحرا میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

ان کے اشعار بھی عجیب ہیں۔ بستے جائیں، سر دھنتے جائیں۔ بے قرار کردیتے ہیں کہ جی چاہتا ہے اور دیر تک گنگناتے رہیں۔

اردو شاعری کا عہد عالب تو دوسرا اقبال ہے منسوب۔ اس کے بعد کی صدی فیض کے نام ہے۔ پوری دنیا کے مظلوموں کو آواز دیتا۔ اب اپنی قوت سے تیسری نسل کے دلوں پر دستک دے رہے ہیں۔ ان کے اشعار زبان زدِ خاص و عام ہوئے۔ گیتوں کی صورت ان کے اشعار نے ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک سفر کیا۔ ان کے معرکے مظلوم کی پکار بن گئے۔ کوئی ان کا بہت بڑا سامع کر دو ہر 15 مئی برسی کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ مگر نہایت مختصر معلومات کا خاکہ کہ گزشتہ معلومات کو دہرانا نہ پڑے کیونکہ کوئی بھی عظمت کا ایک سب ان کی جدوجہد بھی ضروری۔ جیل یاترا اور ان کا جیل خانے کے حال تھے۔ ادب میں نصیب بنی۔ وہ ترقی پسند نظریات کے حامل تھے۔ ادب میں

سول رولز اختیار کی۔ گیارہ پارٹی آف پاکستان کے بانی ارکان میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ان کے اشعار نے اس تحریک کے لیے تن لاکھ کہا۔

ان کے مجموعے نقشِ فریادی، دستِ صبا، زندان نامہ، دستِ تہ سنگ، سرِ وادیِ سینا، شامِ شہرِ یاراں، مرے دل مرے مسافر کے نام سے عنوان سطر عام پر آئے۔ انھیں بین الاقوامی شہرت ملی۔ لینن ایوارڈ سمیت کئی اہم اعزازات سے نوازے گئے۔ ان کی مقبولیت ''اسپرائے وفا'' کا شمار اردو میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتب میں ہے۔ اقبال بانو کی ملک گیر شہرت میں کم کمال فیض کی شاعری کا بھی ہے۔ ''ہم دیکھیں گے'' اور ''دشت تنہائی میں'' کا طلسماتی اثر حقیقت فیض ہی کے گن کی دین تھا۔

13 فروری 1911 کو وسیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔

ایک علمی وادبی گھرانے میں پرورش ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد ابراہیم میر بھائونی سے حاصل کی۔ 1921ء میں اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں داخلہ لیا۔ اسکول ہی کے زمانے میں فارسی اور عربی سیکھی۔ ایف اے انھوں نے مرے کالج سیالکوٹ سے کیا۔ میر مولوی شمس الحق ان کے استاد نہ میں شامل تھے۔ جو شاعر مشرق کے بھی استاد رہے۔ فر بخیریش اور انگریزی میں ماسٹرز کا مرحلہ گورنمنٹ کالج لاہور سے طے کیا۔ بعد ازاں اورینٹل کالج لاہور سے عربی میں ایم اے کیا۔ بعد ازاں میں مدرس کا پیشہ اختیار کیا۔ ایم اے او کالج امرتسر میں پروفیسر رہے۔ 1942ء میں یہی صاحب فوج میں کیپٹن رینک ہو گئے تھے۔ تعلیمات عامہ میں کام کیا۔ پہلے میجر پھر لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی پائی۔ 1947ء میں فوج سے استعفیٰ دیکر واپس لاہور آگئے۔ 1959ء میں پاکستان آرٹس کونسل میں سیکرٹری تعینات ہوئے، تین برس وہاں بتائے۔ 1964ء میں لندن سے واپسی پر آپ عبدالحق بہاولپور کالج کراچی میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1947ء تا 1958ء وہ مدیر ادب لطیف اور مدیر پولیس رہے۔

1930ء میں ایلس فیض سے شادی ہوئی۔ اُن کی بیگم بھی اہم سماجی شخصیت تھیں۔

اب ذکر جنرل یحیٰی کا ہو جائے۔

اور کبھی تم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی وصل کی راحت کے سوا

یہ کل یا بظاہر سادہ سا سوال رہے۔ غیالباً ترین مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سازش کیس مشہور۔ 9 مارچ 1951ء کو اُنھیں اس سازش میں معاونت کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ چار سال سرگودھا، سالہوال، حیدرآباد اور کوہاٹ کی جیلوں میں گزارے۔ اپریل 1955ء میں رہائی نصیب ہوئی۔ ان کے مجموعے زنداں نامہ کی بیشتر نظمیں اسی عرصہ میں لکھی گئیں۔

ایک زمانے میں ترقی پسند ادب کی مخالفت زوروں پر تھی، البتہ یہ حقیقتِ نفس کا ناگزیر احساس ہے کہ ایک شاعر کتنا سبب پسند یا کسان کے شاعر ہونے اظہار ہے کی کوئی اور نظیر نہیں ملتی۔ ان کے استعارے، الفاظ اور علامتیں آج بھی زندہ ہیں۔ موضوعات تو شاید بھی پرانے ہیں۔ دراصل انہوں نے آفاقی موضوعات کا انتخاب کیا تھا۔ سیاسی مسائل کو شعوری احساسات سے جوڑتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے پیش کر دیا۔

مغرب میں انگلش اور اردو شاعری کا چرچا کیا جاتا تھا۔ دراصل یہ انگلش اور اردو شاعری کو لگ بھگ یکساں حالات کا سامنا رہا۔ دونوں نے حقیقی مسائل کو موضوع بنایا۔ سلاستی اور آسان سی قلم اٹھایا۔ فیض صاحب کا 20 نومبر 1984ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو گوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

☆ فضل محمود

یہ اُس زمانے کی بات ہے، جب کرکٹ شرفا کا کھیل ہوا کرتا تھا۔ شائقینِ کرکٹ اکثر اوقات ہی اظہارِ ہے زور دار دلی کی اجازت نہ تھی۔ اس زمانے کے کرکٹرز چٹکلیں تھے۔ انتہائی مہذب، شیخی سے عاری، بڑے کھلے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ برطانوی آداب معاشرت کو نام کرنے میں کرکٹ کا بڑا کردار رہا۔

کاروان کے بعد دوسری نمایاں شخصیت محمود حسین کی انتہائی دلچسپ کرکٹ کی سست آتے تھ طوس میں بیہڑ ہوتے۔ ہر دل عزیز انسان تھے۔ آج بھی ان کی مثال دی جاتی ہے۔

وہ 18 فروری 1927ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پیشۂ کرکٹ تھے۔ پھر پاکستان کے مختلف علاقوں میں شامل ہوا۔ کرکٹ ٹیم سے رٹائر ہوئے۔ اسی حصے کرکٹ کا آغاز کیا۔ جلد ہی اپنی جادو کی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ اس تاریخ رقم کرنے والے کی ہوا کو چیرتی ہوئی گیند کا پورے پنجاب میں چرچا تھا۔ اسی زمانے میں سکہ کا واقعہ ہوا۔ یہ کوہرتا یا پاکستان کے حصے میں آیا۔ 16 اکتوبر 1952ء کو انھوں نے دہلی میں بھارت کے خلاف اپنا پہلا ٹیسٹ میچ کھیلا۔ اگلے دس برس تک پاکستان کی نمائندگی کی۔ آخری بار 62ء میں انگلینڈ کے خلاف ایکشن میں دکھائی دیے۔

ان دس برسوں میں مجموعی طور 34 ٹیسٹ میچ کھیلے گئے۔ مگر وکٹوں کی تعداد تین ان کم رہی۔ فی ہاں، پورے 139 شکار کیے۔ 13 بار ایک اننگز میں پانچ وکٹیں لیں، چار بار ایک میچ میں دس وکٹیں لے کا کارنامہ انجام دیا۔ وہ آف گگز اور لیگ بریکوں

طرح کی گیندیں کرانے کے لیے مشہور تھے۔ گیند پر زبردست کنٹرول اور پچ پر مسلسل سوئنگ اُن کا امتیاز تھا۔ پچ تو یہ ہے کہ وہ خوبصورت انسان کرکٹ کی دنیا میں خوف کی علامت تھا۔

1952ء کی ٹیسٹ سیریز میں لکھنؤ کے میدان میں پاکستان نے بھارت کے خلاف جو تاریخی کامیابی حاصل کی، اس کا ہیرو فضل محمود ہی کے سر، جنھوں نے 94 رنز دے کر 12 وکٹیں لیں اور جیت میں اہم کردار ادا کیا۔ دوسری اننگز میں وہ بھارت پر قہر بن کر ٹوٹے اور سات وکٹیں لے اڑے۔

1954ء کے دورۂ انگلینڈ نے اس باصلاحیت بولر کو انتظامی شہرت دے ڈالی، وہ چار میچز کی سیریز کی۔ جب آخری ٹیسٹ کے لیے دونوں ٹیمیں اوول میں سامنے آئیں، تو پاکستان ایک صفر کے خسارے میں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ سیریز انگلینڈ کے نام رہے گی۔

پہلی اننگز میں فضل محمود 6 وکٹیں لے اڑے، مگر پاکستان کے دیگر بلے باز بری طرح ناکام رہے۔ آخری اننگز میں انگلینڈ کو فقط 168 رنز کا ٹارگٹ ملا۔ انھوں نے دو وکٹوں کے نقصان پر 109 رنز بنا لیے تھے، مگر پھر... فضل کا ستارہ چمکا۔ انھوں نے حریف کن پر شک کرتے ہوئے تین اہم بلے بازوں کو پویلین کی راہ دکھائی۔ اس دن کے اختتام پر جب کپتان نے فضل سے پوچھا، تو جان پچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تو انھوں نے اعتماد سے جواب دیا: سر، پچ میری جیب میں ہے۔

ایسا ہی ہوا۔ اگلی صبح... انھوں نے دو وکٹیں مزید لیں۔ پاکستان 24 رنز سے وہ میچ جیت گیا۔ جی ہاں، تاریخ رقم ہوئی۔ اگلے برس انھیں دو زون کا کراٹ دی ایئر کا خطاب دیا گیا۔ میسر ہرٹن نے کہا: ''یہ جسمانی سروں کا ہیرو اور جوانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے۔'' کہ ان شہرت سے متعلق ایک قصہ بڑا مشہور ہوا۔ برطانیہ کے ایک پرکشش اسکول میں ایک استانی نے طلبا و طالبات سے پوچھا: ''پاکستان کس خطے میں ہے؟'' کس کو جواب نہیں پتا تھا۔ آخر ایک ننھی کھڑی ہوئی: ''انھوں نے پورے اعتماد سے کہا: ''پاکستان وہاں ہے، جہاں فضل رہتا ہے۔'' اس قصے کے بعد ان کی بابت مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

زندگی کے آخری حصے میں وہ خاصے بیمار ہو گئے تھے۔ 30 مئی 2005ء کو لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ جوش ملیح آبادی

اس کا رونا نہیں کیوں تم نے دل برباد کیا
اس کا غم ہے کہ بہت دیر میں برباد کیا

چھیوں صدی کے شاعر کے نام ہوئی؟ اس سوال کے جواب میں شاید بیش تر قارئین کا نام نہیں، مشہور کاہبر اچھی خاصی تعداد کے ناموں کے بتا دے۔ البتہ ایک حلقہ ایسا بھی ہے جو اپنا فیصلہ جوش کے حق میں سنائے گا۔ ان کے انتقال کو چار عشرے ہونے کو ہیں، لیکن یادوں کے نقش دھندلے نہیں پڑے۔ وقت کے ساتھ اُن کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔ ان پر جامعات میں مقالے لکھے جا رہے ہیں۔

اس قادرالکلام شاعر کا تعلق تو قریدی قبیلے سے تھا۔ وہ 5 دسمبر 1898ء کو اتر پردیش کے شہر ملیح آباد کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پورا نام شبیر حسین خان تھا۔

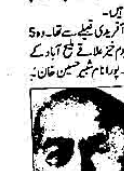

اس خاندان میں نواب فقیر محمد خان، نواب محمد احمد خان اور امیر احمد خان جیسے شاعر اور ادیب گزرے۔ صفائی اور اسکالر عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اسی گھرانے سے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے سے حاصل کی۔ سینٹ پیٹرز کالج آگرہ سے سینئر کیمرج کا امتحان پاس کیا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم بھی متواتری مولوی محمد نبی اور مولوی شاکر علی سے لی۔ ریاضی میں بھی زبردست مہارت تھی، تاہم 1916ء میں والد کے انتقال کی وجہ سے وہ تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔

1925ء میں انھوں نے ریاست حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کی ذمے داری سنبھالی۔ البتہ یہ زمانہ مختصر رہا۔ چند برس میں کے مطابق اس کا سبب نظام کے خلاف لکھی گئی نظمیں، پھر انہوں نے نظم و نثر پر مبنی کی بنیاد رکھی، جس کے ذریعے انگریز راج سے آزادی کے حق میں رائے عامہ ہموار کی۔ ان کی معرکۃ الآرا مثنوی ''حسین اور انقلاب'' نے انہیں شاعرِ انقلاب کا خطاب دلوایا۔ وہ کیمونسٹ سے زیادہ انقلابی تھے۔ وقت کے ساتھ آزادی کے حق میں ان کی آواز بلند ہوتی گئی۔ اسی زمانے میں ہندوستان کے نمایاں سیاست

وادوں سے تعلق تھا جو بعد میں پنڈت نہرو کی وزارت تھے۔ تقسیم کے بعد وہ "آج کل" کے ایڈیٹر ہو گئے۔

1958 میں پاکستان سیلنے آئے۔ اس کے پیچھے وہ خدمات تھے، جو پاکستان میں اردو کو فائق تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہرو نے انھیں ایوب کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کے تحریکی سلنے گئے تھے، بعد میں وہ پاکستان آنے کے فیصلے پر افسوس کرتے رہے۔

ادھر وہ آخر ترقی اردو سے جتنی ہو گئے، اردو ثقافت کی تیاری سمیت کئی اہم منصوبوں میں معاونت کی۔ اردو کے ساتھ انھیں عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔ یہ لسانی مہارت بڑی کام آئی۔

شعری سفر کی عمر پر محیط ہے۔ اس نے نصابوں کے ادبی دوق کی آب یاری کی۔ نئے رجحانات متعارف کروائے۔ روشن شعری کو معیار سے جوڑا۔ انھیں کئی شعری مجموعے چھپے۔ ان کے شعری مجموعے کی خزانے سے کم نہیں۔ نثر میں بھی ادبی مثال آپ۔ نثری تخلیقات مقالات جوش، اوراق زریں، جذبات فطرت، اشارات، مقالات جوش، مکالمات جوش کے عنوان سے آئیں۔ خودنوشت "یادوں کی برات" کو شاہکار درجہ حاصل ہے۔ یہ اردو کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ معروف جہات پاکستان کا ریڈیو پاکستان کے مشورے پر انھوں نے تلکوں کے لیے گیت بھی لکھے۔

22 فروری 1982 کو اسلام آباد میں وہ 83 برس کی عمر میں انتقال کر گئے۔

آزاد تیا نہ کوئی مشکل میں
مشورے دے گیا ہے کہ بات گئے احباب
انھیں کئی بار اعزازات سے نوازا گیا۔ جرأت سے قبل 1954 میں بعد وستانی طیفے سے انھیں پہلا پوشن جیسا انعام ابھارا دیا۔ ادیبوں کے ایک طبقے نے انھیں صدی کا سب سے بڑا شاعر ٹھہرایا۔ 2012 میں حکومت پاکستان نے ان کے لیے بلال پاکستان کا اعلان کیا۔

☆ قدرت اللہ شہاب

اردو کی مقبول ترین کتب کی فہرست ترتیب دی جائے اور اس میں شہاب نامہ کا ذکر نہ ہو، یہ کیوں کر ممکن ہے۔ اور یہ بے نظیر تصنیف ہے بھی، یہ ایک ایسے شخص کی سوانح عمری ہے، جسے بھی پاکستان کا سب سے بااثر بیوروکریٹ تصور کیا جاتا تھا۔ ایوب خان کے زمانے میں وہ طاقت کا مرکز رہے۔ البتہ ان کی افسانوی شہرت کی وجہ یہ ہوں کا وہ حلقہ بنا، جو انھیں ایک صوفی کے روپ میں پیش کیا تھا۔ ان میں ممتاز مفتی نمایاں تھے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ بھی ان کے معتقدین میں شامل تھے، جن کی تانوں میں شہاب سے متعلق کچھ انوکھا واقعات ملتے ہیں۔ ویسے ان کی اپنی کتاب میں بھی ایسے کئی قصے موجود ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ قدرت اللہ شہاب نے تقسیم کے بعد اردو ادب میں ایک الگ شعبے کی بنیاد رکھی، تو غلط نہ ہوگا۔ اس کی بنیاد پر شہرت تو ملی، مگر تنازعات بھی پیدا ہوئے۔ ناقدین انھیں ادیبوں کو تنخیم کرنے، ایک تخصیص نظر یے کے ادب کی ترویج اور رسائل کی بھرتی سے نکالنے کا الزام دیتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب 26 فروری 1917 کو گلگت میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم، باسط، جموں و کشمیر اور ثقلی الہ آباد میں حاصل کی۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے، ایل ایل بی کیا۔ 1941 میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے۔ انھوں نے بہار اور اڑیسہ میں خدمت انجام دیں۔ 1943 میں بنگال میں بے چینگ ہوئی۔ قحط کے زمانے میں انھوں نے متاثرین کی معافی کے لیے اہم اقدامات کیے۔ مسلمانوں کی جانب جھکاؤ نظری قائد اعظم کی نظروں سے اوجھل نہ رہا۔ وہ اسکندر مرزا اور بعد ازاں ایوب خان کے بھی سیکرٹری مقرر ہوئے۔ اس زمانے میں پیرو کرسی میں قدرت اللہ شہاب کی بڑی کرشمہ تھی۔ ادیب بھی اسی زمانے میں ان کے گرد اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ پاکستان سائنس گلڈ کا سیاسی ان کی سے سر پرست۔

پاکستان میں جنرل یحییٰ خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد انھوں نے سول سروس سے استعفیٰ دے دیا اور اقوام متحدہ کے ادارے یونیسکو سے وابستہ ہو گئے۔ وہ ایک معتوں میں جلاوطنی کا زمانہ تھا، جہاں انھیں کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

انھوں نے متوقعہ عرب علاقوں میں اسرائیل کی شرانگیزی کا جائزہ لینے کے لیے تین دورہ کیا اور اس کا پردہ چاک کیا۔ ان ہی کی کوششوں سے متوقعہ عرب علاقوں میں یونیسکو کا منظور شدہ منصوبہ رائج ہوا۔

عرب دنیا میں ان کی صوفیانہ شہرت کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان ان کی تخلیقی جہت کو ہوا۔ وہ بہت عمدہ قسم کا غیر تخیلی نثاری میں بڑی کرتب تھی۔ "ماں جی" جیسا شاہکار انسان نے قلم کے نگاہ۔ ان کی کہانیوں میں جنسی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کا زاویہ بیان ہوتا۔ "ماٹ" "یاخدا" انتہائی متاثر کن کہانیاں ہیں۔ 24 جولائی 1986 کو اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا۔ شہر خاموشاں میں ان کی آخری منزل ٹھہرا۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

☆ یحییٰ خان

جنرل آغا محمد یحییٰ خان کا تعارف فقط یہ نہیں کہ وہ پاکستان کی بری فوج کے تیسرے سربراہ اور پاکستان کے چوتھے صدر تھے، ان کا ذکر وہاں سائے کے بغیر ادھورا ہے، جس نے پاکستان دولخت کیا۔ فی الحال 16 دسمبر 1971 کو جب خود ساختہ فیلڈ مارشل اور سپریم کمانڈر یحییٰ خان کے ہاتھ میں کچھ شاید کچھ نہیں سارا الزام مجیب الرحمان پر عائد کر دیں، کچھ گروہ ذوالفقار علی بھٹو کو قصوروار ٹھہرائیں، مگر منطق اور دلیل یہ کہتی ہے کہ جو سب سے طاقتور اور بااختیار شخص ہوتا ہے، ذمے داری بھی اسی کے کاندھوں پر ہوتی ہے۔ سربراہ مملکت کی غلطیوں اور بے پروائی سانحات کو جنم دیتی ہے۔ سقوط ڈھاکا کے بعد انھیں طویل عرصے تک نظر بند رکھا گیا۔

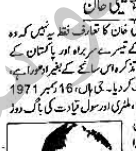

یحییٰ خان نے 4 فروری 1917 کو چکوال میں آنکھ کھولی۔ ابتدا ہی سے افتاد ان پر مہربان رہی۔ قحط، وبا، غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد، تقسیم کی خونیں ہجرت، یہ سب کچھ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کے والد خان بہادر آغا سعادت علی خان انڈین پولیس میں افسر تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی سے حاصل کی۔ پنجاب یونیورسٹی سے کریجویشن کیا۔ پھر انڈین ملٹری اکیڈمی دیہ دون کا رخ کیا۔ 1938 میں فوج میں کمیشن حاصل کیا۔ دوسری عالمی جنگ میں متعدد محاذوں پر لڑے۔ 1945 میں کنگز لائٹ انفنٹ کالج کوئٹہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد ازاں انسٹرکٹر رہے۔

قیام پاکستان کے بعد کئی اہم ذمے داریاں نبھائیں۔ 1962 میں مشرقی پاکستان کے کمبرین ڈویژن کمانڈر مقرر ہوئے۔ 1965 کی جنگ میں نمایاں خدمات کے صلے میں ہلال جرأت کا اعزاز دیا گیا۔ ستمبر 1966 میں جنرل موسیٰ خان کے ریٹائر ہونے پر افواج پاکستان کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے۔

وہ استبداد کے دور تھے۔ مارشل لا مخالف تحاریک زوروں پر تھیں۔ معاہدہ تاشقند کے خلاف ظاہر کیک شدت اختیار کر گئی۔ اسے برداشت نہ کر پایا گیا، مگر اقتدار تک تنہا نہیں پہنچ جاتے۔

وزارت خارجہ کا قلمدان چھننے کے بعد بھٹو نے پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی، تو عوام میں موجود ایوب مخالف جذبات کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ 1966 میں عوامی لیگ نے شیخ مجیب الرحمان کے 6 نکات پیش کر دیے، جنھیں مغربی پاکستان اور حکومت سلیم کی طرف سے اقتدار سے علیحدگی کے مترادف ٹھہرایا گیا۔ شیخ مجیب الرحمان گرفتار ہوئے، ادھر بھٹو کی تحریک زور پکڑ گئی۔

نومبر 1968 میں سیاسی جماعتوں کے متحدہ محاذ نے بحالی جمہوریت کی تحریک شروع کر دی۔ مارچ 1969 میں ایوب خان کی گرفت کمزور پڑنے لگی، تو جمہوریت کو موقع دینے کی بجائے ایک اور مارشل لا کے لیے راہ ہموار کی جانے لگی۔ 25 مارچ 1969 کو ایوب خان نے قوم سے خطاب میں اقتدار سے الگ ہونے کا اعلان کیا، تو اعلیٰ فوجی افسران کے ہاتھ کا کھلونا بنے رہے۔

کچھ بڑے فیصلے کیے گئے، جن سے اگلے سال عام انتخابات کا فیصلہ سے ہوا تھا۔ جون 1970 میں مرحلہ وار بالغ رائے دہی کی صورت میں ہوئے۔ جنرل یحییٰ خان نے 17 دسمبر کو صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے، جنھیں کھلی و غیر جانبدار حیثیت میں پاکستان کی تاریخ میں پہلے آزاد اور منصفانہ انتخابات قرار دیا گیا۔

دیتے تھے، مگر ان کا نتیجہ اچھا نہیں نکلا۔ اقتدار کی کشمکش نے بڑے کردار سامنے لائے۔ مشرقی پاکستان اشتعال کی لپیٹ میں آگیا۔ جھڑپوں اور اطلاعات، ابہام کی صورتِ پریشی، مفاد پرستوں اور مکر وفن کی خفیہ کے نتیجے میں 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان بنگلہ دیش میں ڈھل گیا۔ عوام کے بڑھتے ہوئے دباؤ کے باعث 20 دسمبر 1971ء کو جنرل یحییٰ نے اقتدار مسٹر بھٹو کی جنیر میں ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دیا۔ عوام کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے 8 جولائی 1972ء کو شملہ کنونشن منعقد کیا گیا۔ جولائی 1977ء میں ضیاالحق کی آمد کے بعد نظر بندی ختم ہوئی۔

یحییٰ خان کے کردار پر کئی سوال پیدا ہوئے ہیں۔ کئی متضاد کہانیاں ہیں۔ 10 اگست 1980ء کو ان کا انتقال ہوا۔

☆ طاہر القادری

اُن کا پہلا خطاب درس و تدریس ہے، ہزاروں تلامذہ اس فن کے چاہنے والے ہیں، ہندوستان سمیت دنیا بھر میں ان کے چاہنے والے ہیں۔ سیاست دو آتشہ احوال ہے۔ پہلے پہل ایک مخلص کی راہ چنی، پھر طرحوں کے راستے پر چل پڑے۔ 2014ء میں وہ دو خبروں کا محور بنے رہے۔ ایک ماڈل ٹاؤن لاہور کے کیمرے اُن پر نگران گولیوں سے چلنے والی دو گلی آنسو بہائے۔ دوسری وقت آنسو۔ خاندانی المیہ ہوا تھا۔

مغرب کے لیے وہ اسلام کا معتدل چہرہ ہیں۔ خوش حلی اور بہت گردن کے حق تلف ہیں۔ انگریزی میں اظہار کی تابعیت رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر ان کی ساکھ ہے۔ ایک مدت سے بیرونِ ملک مقیم ہیں۔ اس باعث ان کی رائے کی رسائی بہت زیادہ ہے۔

تحریک منہاج القرآن کے بانی محمد طاہر القادری 19 فروری 1951ء کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ منہاج ویلفیئر فاؤنڈیشن انکی کے ادارے کی ذیلی تنظیم ہے۔ انھوں نے منہاج یونیورسٹی بھی قائم کی اور پاکستان عوامی تحریک کے نام سے سیاست میں قدم رکھا۔ وہ 1980ء سے اپنی تنظیم کے پلیٹ فارم سے تبلیغ میں مصروف ہیں۔ شیخ سید طاہر علاؤالدین القادری الگیلانی کے مرید ہیں۔ انھیں 1994ء میں پگھاں کے معروف بزرگ سید رسول شاہ نما نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا۔

طاہر القادری نے معروف عالم دین ڈاکٹر فرید الدین قادری کے گھر آنکھ کھولی۔ ابتدا سیالوں کے علاقہ سے ہے، جو پنجوت روڈ پر واقع گاؤں کھیا کے نواب سے ہے۔ طاہر القادری اوائل سے انقلابی، نوجوان رہے تھے۔ 1971ء میں انھیں معروف مفکر ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی صحبت ملی، جس سے ان کی فکر کو بڑی دین پختہ ملی۔ ہم کار دار دار ہا کیا۔

آنے والے برسوں میں جناب امام عزالی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شیخ احمد سرہندی، مولانا عبیداللہ سندھی کی فکر کا مطالعہ کیا، وہ کارل مارکس، فریڈرک انجلس، لینن، اور ماؤزے تنگ کو بھی پڑھا۔ وہ انقلابی تحریک کے لیے ذہن سازی کرنا رہا۔

جدوجہد کا آغاز 1976ء میں ہوگیا۔ اس میں جگہ میں تاسیس ہونے والی خود جوانوں کی تنظیم کا آغاز ہوا۔ یہ 1980ء میں تحریک منہاج القرآن کا نام رکھ دیا گیا۔ اس دوران تصنیف و تالیف اور درس قرآن کا سلسلہ جاری رہا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبہ قرآن و سنت تک بنی پھیلتی گئی۔ پی ایچ ڈی کے پروگرام "علم القرآن" نے اس کی منزلت میں اضافہ کیا۔ کچھ زمانے میں سیاں صاحب کے بعد حقہ ترین ہے۔ خواجہ شریف کی اشتیاق سعید میں انھیں خطیب مقرر کیا گیا۔

ان کے سیاسی اور انقلابی نظریات سے اختلاف ہو سکتا ہے، مگر ان کی تعلیم اور زندگی کے دیگر شعبوں میں خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ 1995ء میں انھوں نے عوامی تحریک منصور کی بنیاد رکھی، جسے بحر طلعتِ غیر سرکاری تنظیم کا درجہ حاصل ہے۔ یہ تنظیم سماجی خدمات کرتی ہے۔ اس کے تحت پاکستان کے طول و عرض میں 572 تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ پھر ملا یونیورسٹی قائم ہوئی۔ منہاج یونیورسٹی بھی ایک اہم ادارہ ہے۔

☆ عارف کریم

ہماری بدحالی اپنی جگہ، شعبہ تعلیم کی زبوں حالی کا بھی اعتراف ہے، یہ بھی سچ ہے کہ ترقی کے لیے شعبے بہت کارآمد ہیں۔ کہ پڑھی کی نذر ہو جاتے ہے، مگر اس کے باوجود اس زرخیز زمین سے کیسی کیسی کونپلیں پھوٹتی۔ یہاں کیسی باصلاحیت روزگار شخصیات

نے جنم لیے۔ اس آسمان پر کتنے ہی ستارے چمکے۔ بڑے بڑے، جن سے نہ جی ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ علامہ یوسف زئی پہلی مثال ہیں۔ اس سے پہلے ایک عارف کریم بھی تو گزری تھی، جسے لوگ معجزی فضل (Prodigy) کہا کرتے تھے۔ یعنی ایسا بچہ جو خداداد صلاحیتوں کا مالک ہو۔

2 جنوری 1995ء کو پیدا ہونے والی اس عارفہ کریم کو قدرت نے ذہن ذکا عطا کیا تھا۔ 2004ء تک انٹرنیٹ کی عربی، انگریزی سائنس کی تصویتی شعبہ پر پبلشنگ (MCP) بن کر اس نے ہلچل مچادیا۔ اس دا مان کی بھرتی مصروف عمل کے حوالے سے بات کی جائے والے پاکستان کو کم سن کی شاخت ہی تو اس کا سب بنی تھی۔ علی شمنے نے عارفہ کو ایک نگر ساخت کے وقتر ہونا تو پاکستانیوں کے مقرر سے بلند ہوا۔

اس نے جدید کمالوں سے متعلق دنیا بھر میں ہونے والے سیمینارز اور کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ حکومت نے بھی اس کی ذہانت کو پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والی کم عمر ترین شخصیت تھی۔ وزیراعظم کی جانب سے فاطمہ جناح میڈل بھی عارفہ کو دیا گیا۔ اس کے جدید سے فاطمہ جناح یونیورسٹی میں بھی ہوا۔ لاہور کا عارف سوفٹ ویئر ٹیکنالوجی پارک اس سے موسوم ہوا۔

پاکستان بچوں سے عارفہ کو آئیڈیل بنایا۔ (گو کہ مارچ 2006ء میں بابرہ فاؤنڈیشن بھی بچے نے کم عمر ترین پائلٹ و سائنس پروفیشنل بن کر اس کا ریکارڈ توڑ دیا) اس وقت عارفہ زندہ تھی۔ نے نقابِ جبری کی عمر میں یہ ریکارڈ بنا کر عارفہ کی یاد تازہ کر دیا۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں، ایسے انسانوں کی زندگی تھوڑی ہوا ہے، ہمارے انسانوں کو خدا جلدی اپنے پاس بلوا لیتا ہے۔ یہی کچھ عارفہ کے ساتھ ہوا۔ 22 مئی 2011ء کو اسے سر کی رگ پھٹ جانے کی وجہ سے بری طرح متاثر ہوا۔ اسے دبئی لایا گیا، لاہور میں ایڈمٹ کر دیا گیا، مگر حالت بگڑتی گئی اور وہ کوما میں چلی گئی۔ اس واقعے نے پورے ملک کو سوگوار کر دیا۔ تین الاقوامی میڈیا بھی اس کی بازگشت سناتی رہی۔ فیل تھنس کی جانب سے عارفہ کے والدین سے رابطہ کیا گیا اور یہ بین الاقوامی معیار کا ایک منفرد تشکیل دیا گیا، جو اس کیس میں پاکستانی ڈاکٹروں کی معاونت کرتا رہا۔ 13 جنوری 2012ء کو اس کی حالت میں کچھ بہتری دیکھی گئی، مگر افسوس عارفہ علی، 14 جنوری 2012ء کو یہ جہان سے چلی گئی۔ اس کی تدفین میں مشاہیر کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

اور تو تحریر کیا رہ گیا
ہاں مگر ایک خلا رہ گیا

☆ چوہدری رحمت علی

جو گزاری نہ جا سکے ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

تحریک پاکستان نے ہمیں کیسے کیسے ستارے عطا کیے۔ سب ہی ایسی خوبیوں کے حامل تھے۔ جن میں سے چند کی خوبیاں ہم تک نہیں پہنچ سکی۔ شاید وہ ہم سے بہت دور تھے۔ ماورا رحمان ان کی سب نہیں کیا۔ چوہدری رحمت علی بھی ایسا ہی ایک نام ہیں۔ اگر اس تحریک پاکستان کا خاموش سپاہی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ ایسے ہی اس کی یاد میں کی آج کیمبرج کے قبرستان میں دفن ہے۔ انھیں اتنا فاصلوں کیا گیا تھا۔ مختلف اوقات میں ان کے جسد خاکی کو پاکستان لانے کے اطلاعات کے گئے مگر وہ دفن ہی کیا رہنے دیا جائے۔

چوہدری رحمت علی 16 دسمبر 1897ء کو شمرتی پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں ہی ذہین تھیم ماحول کی۔ مشرک ناموں نے انگلستان سکونت اور اسکول جانے مجبور کیا۔ 1914ء میں لاہور کا رخ کیا، جہاں وہ اسلامیہ کالج میں داخل ہوئے۔

سولہ برس کی عمر سے ہی متاثر تھے۔ 1915ء میں اسلامیہ کالج میں برسم کی بنیاد رکھی۔ اسی پلیٹ فورم سے انھوں نے پہلے پہل مضمون (1915ء میں) ہندوستان کی تقسیم کا تصور پیش کیا۔ (چند مورخین کے نزدیک یہ مسلمانہ تاثر ہے) 1918ء میں گریجویشن کرنے کے بعد وہ کیمبرج میں کانون میں ایڈمیٹ ہو گئے۔ 1928ء میں انہی کی مدد سے کانج انتظامیہ منتخب ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد بار ایٹ لا کا درجہ حاصل کیا۔ کیمبرج اور ڈبلن یونیورسٹیوں سے قانون اور سیاست میں اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔

1933 میں برصغیر کے طلبا پر مشتمل ایک تنظیم پاکستان نیشنل لبریشن موومنٹ قائم کی۔ یہ ایک بڑا اقدام تھا، جو برصغیر کی سیاست پر دوررس اثرات مرتب کرنے والا تھا۔ اسی سال دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اپنا مشہور کتابچہ Never or Now (اب یا کبھی نہیں) شائع کیا، جس میں لفظ پاکستان استعمال کیا گیا۔ اس کی بازگشت بہت دور تک سنی گئی۔

انھوں نے پاکستان، بنگلستان اور عثمانستان کے نام سے تین دیگر ممالک کا بھی نقشہ پیش کیا۔ ان کے پیش کردہ نقشے میں پاکستان میں کشمیر، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کے علاقے شامل تھے۔ دہلی بھی پاکستان میں شامل تھا۔ 1935 میں .... انھوں نے کیمبرج سے جو ہفت روزہ نکالا، اس کا نام پاکستان ہی تھا۔

وہ 23 مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں لاہور آنا چاہتے تھے لیکن چند روز قبل ہونے والے پُرتشدد واقعات کی وجہ سے ان کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کردی گئی۔ 1947 میں انھوں نے اقوام متحدہ میں کشمیر پر اپنا موقف پیش کیا۔ 6 اپریل 1948 کو پاکستان آئے تھے، مگر پاکستانی بیوروکریسی اس باصلاحیت اور صاحب کردار انسان کی راہ میں رکاوٹ بن گئی۔

29 جنوری 1951 کو ان پر نمونیے کا حملہ ہوا۔ 3 فروری 1951 کو ان کا انتقال ہوگیا۔

☆ شعیب ملک

شمار ان کا پاکستان کرکٹ کے معروف ترین کھلاڑیوں میں ہوتا ہے۔ کسی زمانے میں کپتانی کا تاج بھی ان کے سر تھا۔ کچھ ان کی شادی بھی خبروں میں رہنے کی وجہ بنی کہ بیگم بڑی مقبول ہیں، اس کے باوجود بصرین متفق ہیں کہ شعیب ملک نے جو کچھ حاصل کیا، وہ اس سے بہت زیادہ کے حق دار تھے۔ کچھ پسند ناپسند، کچھ گروہ بندیاں، پھر ان کی اپنی غفلت، ایک ایسا کھلاڑی جو جم کر پاکستان کی خدمت کرسکتا تھا، کپتانی سے محروم ہونے کے بعد ان آؤٹ کے بھنور میں پھنس گیا۔

اس آل راؤنڈر نے 227 ون ڈے میچز میں 5,990 رنز بنائے اور 147 وکٹیں لیں۔ 33 ٹیسٹ میچز میں 1,851 رنز اور 21 وکٹیں اپنے نام کیں۔ ایک شان دار ڈبل سنچری بھی بنائی۔

شعیب ملک یکم فروری 1982 کو سیالکوٹ، پاکستان میں پیدا ہوئے۔ اوائل میں آف اسپنر تھے، مگر بلے بازی کی صلاحیت بھی جلد ہی آشکار ہوگئی۔ ایسے آل راؤنڈر ثابت ہوئے، جو محدود اوور کی کرکٹ میں کسی بھی نمبر پر کھیل سکتا ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے، پچ پر ٹھہرتے ہیں، جب تقاضا ہوتا ہے، آگے بڑھ کر ہٹ لگاتے ہیں۔

ون ڈے کیریئر 1999 میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم کے خلاف کیا۔ ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز 2001 میں بنگلا دیش کے خلاف ہوا۔ جلد ہی نظروں میں آگئے۔ کچھ ہی برس بعد وہ ٹیم کا مستقل حصہ تھے۔ آف اسپن بولنگ اور سود مند بیٹنگ کے ساتھ ان کی فیلڈنگ بھی پائے کی تھی۔ ہاں، ایک مرحلے

پر ان کا ایکشن زیرِ عتاب آیا اور اسے غیر قانونی قرار دیا گیا، مگر بعد میں بازو کی سرجری اور مشق سے انھوں نے اس مسئلے سے نجات حاصل کرلی۔

کپتانی تو ان کا نصیب بنی ہی تھی، مگر بدقسمتی سے یہ واقعہ وقت سے کچھ پہلے ہوگیا۔ وہ ابھی نوجوان تھے اور 2007 ورلڈکپ میں شکست کے بعد ٹیم اور کرکٹ بورڈ بڑی تبدیلیوں سے گزر رہا تھا۔ انضمام الحق کی ریٹائرمنٹ کے بعد محمد یوسف، محمد یونس اور شعیب ملک کا نام اگلے کپتان کے طور پر لیا جانے لگا۔ زیادہ تر لوگ یونس کے حق میں تھے اور شاید وہی اس وقت بہتر انتخاب تھے، مگر صورتِ حال میں تبدیلی آئی اور کپتانی کا تاج شعیب کے سر رہا۔

اوائل میں ان کی کارکردگی بہت اچھی رہی۔ چھوٹی ٹیموں کے خلاف انھوں نے تسلسل سے فتوحات حاصل کیں، مگر بڑی ٹیموں کے مدمقابل ان کی ٹیم کی ناتجربے کاری عیاں ہوگئی۔ حسبِ روایت کپتان کو شکستوں کا ذمے دار ٹھہرایا گیا۔

کوچ اور بورڈ خلاف ہوگئے، نیا کپتان چنے کا فیصلہ کیا گیا، اس بار قرعہ فال یونس خان کے نام نکلا۔ یوں وہ باصلاحیت کھلاڑی اور کپتان جو پاکستان کو ٹی 20 ورلڈکپ کے فائنل تک لے گیا، یکدم مشکلات میں گھر گیا۔ حالاں کہ ان کی قیادت میں 36 میں سے 24 ون ڈے میچز میں پاکستان فاتح رہا تھا۔ جن 17 ٹی 20 میچز میں وہ کپتان رہے، ان میں سے 12 میں فتح ملی۔

انھیں ٹیم سے باہر کردیا گیا، اگر شامل کیا جاتا تو بھرپور موقع نہیں ملتا۔ ایک زمانے میں یہ کہا جانے لگا تھا کہ ان کا کیریئر ختم ہوگیا، مگر 2014 میں ان کی واپسی ہوئی، تو یکسر الگ روپ میں نظر آئے۔ کارکردگی میں واضح بہتری دیکھی گئی۔ پھر محمد حفیظ کے ایکشن پر پابندی لگنے کے بعد ان کی اہمیت بڑھ گئی۔ اس وقت وہ ٹیسٹ سے ریٹائرمنٹ لے چکے ہیں، مگر ون ڈے اور ٹی 20 ٹیم کا حصہ ہیں۔

2010 میں شعیب ملک خبروں کی زینت بنے رہے۔ اس کا سبب ہندوستان سے تعلق رکھنے والی بین الاقوامی شہرت یافتہ ٹینس اسٹار ثانیہ مرزا سے ان کی شادی تھی۔ پھر ایک تنازع اور تھا۔ ہندوستان کا ایک خاندان یہ دعوے دار تھا کہ شعیب ملک ان کے داماد ہیں۔ الغرض ہندوستان ان کا سسرال بننے کے لیے بے چین تھا۔ خیر، 12 اپریل 2010 کو ان کی شادی ہوگئی اور ان تنازعات کا خاتمہ ہوا۔ بعد میں ثانیہ مرزا اکثر میچز میں شعیب ملک کی حوصلہ افزائی کرتی نظر آئیں۔

☆ فخرالدین جی ابراہیم

ان کی زندگی مختلف ادوار میں منقسم ہے۔ ایک زمانے میں وہ منصف تھے، تب انھوں نے مارشل لا کی چھتری تلے حلف لینے سے انکار کرکے جرأت کی انوکھی مثال قائم کی۔ آنے والے دور میں بہ طور قانون داں عزت کمائی۔ گورنر بھی رہے۔ پھر انھیں پاکستان کے اہم ترین انتخابات کے لیے الیکشن کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ الیکشن بے ضابطگیوں کی وجہ سے متنازع رہے۔ ان کا ہاتھ تو صاف تھا، مگر ادارہ پرفارم نہ کرسکے، تو سربراہ ہی ذمے دار ٹھہرتا ہے۔ یہی فخرالدین جی ابراہیم المعروف فخرو بھائی کے ساتھ ہوا۔ جب ہم انھیں ایک منصف، قانون داں اور سابق گورنر سندھ کے طور پر یاد کرتے تھے، تو ان کی ایمان داری، سچائی اور قابلیت کی مثال دی جاتی ہے، مگر الیکشن کمیشن کے سربراہ کی حیثیت سے صورتِ حال ذرا مختلف رہی۔

وہ 2 فروری 1928 گجرات میں پیدا ہوئے۔ تعلق پڑھے لکھے متوسط طبقے سے تھا۔ قابل طالب علم تھے۔ 1952 میں انگلینڈ سے قانون کی ڈگری لی۔ وہاں سے لوٹ کر کراچی کو مسکن بنایا۔ ان دنوں ان کے محسن زیڈ اے سلہری سینٹرل جیل کراچی میں نظربند تھے۔ جرم اخبار میں ایک کارٹون چھاپنا تھا، جس میں مشرقی پاکستان کو شعلوں میں گھرا دکھایا گیا تھا۔ وہ زیڈ اے سلہری سے ملنے جیل جایا کرتے۔ وہیں مشہور ترقی پسند رہنما حسن ناصر بھی قید تھے۔ نوجوان فخرالدین جی ابراہیم نے ان کا مقدمہ لڑا۔ ان کی مخلص کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئیں۔ حسن ناصر کو بعد میں شہید کردیا گیا۔

انھوں نے کیریئر میں بڑی کامیابی حاصل کیں۔ سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، سپریم کورٹ کے جج رہے۔ اٹارنی جنرل اور وفاقی وزیر قانون جیسے اہم عہدے سنبھالے۔ اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ جب راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوشش کی گئی، انھوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی سب سے بڑی اور روشن مثال ضیا دور میں سامنے آئی۔ 1981 میں وہ سپریم کورٹ کے جج تھے۔ جنرل ضیاالحق نے ججز کو پی سی او کے تحت حلف اٹھانے کا حکم دیا۔ فخرالدین جی ابراہیم سپریم کورٹ کے ججز میں جونیئر تھے، مگر انھوں نے اصولوں کو پیشِ نظر رکھا اور انکار کردیا۔ حرف انکار آمر کو کہاں گوارا تھا۔ ملازمت سے فارغ کردیے گئے۔

بے نظیر بھٹو کے پہلے دورِ حکومت میں انھوں نے گورنر سندھ کا عہدہ سنبھالا۔ یہ اپریل 1989 کا ذکر ہے۔ کراچی میں Citizen Police Liaison Committee (CPLC) کے قیام میں ان کا کردار کلیدی رہا۔ وہ فقط ایک برس گورنر کے عہدے پر رہے۔ علیحدگی کا سبب اصولی اختلاف ٹھہرا۔

1995 میں آسٹریلوی کھلاڑیوں نے جب پاکستانی کپتان سلیم ملک پر الزامات لگائے، تو ان کی انکوائری فخرو بھائی ہی نے کی۔ 2006 میں پاکستان کرکٹ بورڈ نے اینٹی ڈوپنگ کمیٹی بنائی، تو وہ ان کے چیئرمین تھے۔ 14 جولائی

2012 کو وہ الیکشن کمیشن پاکستان کا سربراہ مقرر ہوے۔ 2013 کے عام انتخابات ان ہی کی سربراہی میں ہوئے۔ بعد میں کے مطابق ان کی کوششیں ثمر بار ثابت نہیں ہوئیں، مگر بدلتے نظام کے باعث وہ اس ذمے داری کو احسن طور پر نہیں نبھا سکے۔ صدارتی انتخابات کے فوری بعد 31 جولائی 2013 کو انھوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

☆اسفندیار ولی

عوامی نیشنل پارٹی کے موجودہ سربراہ اسفندیار ولی کی کہانی اس کے والد ولی خان کے تذکرے کے بغیر ادھوری ہے، وہ خان عبدالغفار خان المعروف باچا خان کے پوتے ہیں، جنھوں نے خدائی خدمت گار تحریک کی بنیاد رکھی اور سرحد (موجودہ کے پی کے) کے گاندھی کہلائے، ان کے والد ولی خان کا شمار تقسیم کے بعد سرحد کے اہم ترین سیاست دانوں میں ہوتا ہے، انھوں نے عملی جمہوریت کے لیے طویل جدوجہد کی، کتنے ہی برس پابندِ سلاسل رہے۔ اس گھرانے نے سیاست کو بیگم نسیم ولی خان جیسی خاتون دیں، ترقی پسند افکار کی حامل نیپ جیسی جماعت کی تشکیل اور ترتیب میں اس خاندان کی کردار کلیدی رہا۔ یہی جماعت بعد میں عوامی نیشنل پارٹی میں تبدیل ہوئی۔ جب عوامی نیشنل پارٹی بنی، تو ولی خان ہی پہلے سربراہ تھے۔ دیگر پاکستانی سیاسی جماعتوں کے مانند یہ بھی الزامات کی زد میں رہی۔

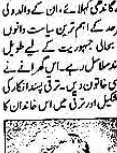

اسفند یار

ولی 19 فروری 1949 کو صدر (مردان) میں پیدا ہوئے۔ اس وقت ان کے والد جیل میں تھے۔ انھیں جنم دینے چیچے ان کی والدہ چل بسیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم ایچی سن کالج لاہور سے حاصل کی، پھر اپنے والد کی روایت پر چلتے ہوئے نوجوانی میں سیاست میں قدم رکھ دیا۔ ایوب خان کے خلاف شروع ہونے والی طلبا تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جیل میں ان پر فوجی عدالت نے مقدمہ بھی چلایا۔ خیال رہے کہ اس وقت ان کے والد خان کی حمایت میں عسکری جدوجہد کا بھی الزام عائد کیا گیا۔ 1975 میں ان پر حیات شیر پاؤ کے قتل کا الزام عائد کیا گیا۔ وہ گرفتار ہوئے۔ ان پر تشدد کیا گیا۔

حیدرآباد ٹریبونل نے انھیں قصور وار ٹھہرایا۔ بھٹو حکومت کے خاتمے کے بعد 1978 میں وہ رہا ہوئے۔ اگلے چند برس انتقالی سیاست سے دور رہے۔ 1990 میں وہ صوبائی اسمبلی کے رکن بنے۔ 1993 میں قومی اسمبلی تک پہنچے۔ 1997 میں پھر صوبہ سرحد اسمبلی کا حصہ بنے۔ 1999 میں وہ اے این پی کے صدر بنے۔ البتہ 2002 کے انتخابات میں انھیں مخالف فریق کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ اگلے برس وہ سینیٹر ہوگئے۔ 2008 کے انتخابات اُن کے لیے اہم ثابت ہوئے۔ ان کی پارٹی نے صوبہ سرحد میں حکومت بنائی۔ سندھ میں وہ حکومت کے اتحادی رہے۔

پانچ برس وہ اتحادی حکومت میں شامل رہے، اس دوران انھیں شدید مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ سرحد بدترین دہشت گردی کی لپیٹ میں تھا۔ وہاں کھل کا ندر کے علاقے سلسلہ وار ٹارگٹ کلنگ، ان کے رہنماؤں اور کارکنوں کو قتل کیے گئے۔ خود اسفندیار پر بھی حملے ہوئے۔ کرپشن کی بازگشت الگ۔ اہم کراچی میں لسانی فسادات کے الزامات کا سامنا۔ ان کی پارٹی پر الزام لگا کہ کارکردگی کا اثاثہ 2013 میں نظر آیا، جہاں ان کی پارٹی کو بدترین شکست ہوئی۔

☆عبدالرب نشتر

تحریکِ پاکستان کے ہراول دستے میں شامل یہ نام کون ایک کھلی اور بدنام راہ اپنائے تھا، جس کی سیاست خدمت کے جذبے سے سرشار تھی۔ خالص بھی ان کے ایثار کی مثال دیتے تھے۔ ذہانی رسا پر وہ جمہوری فکر اور دلائل کو ترجیح دیتے۔

یہ ذکر ہے سردار عبدالرب نشتر کا، جنھوں نے 13 جون 1899 کو پیدا ہوے کے ایک کاکزئی خاندان میں آنکھ کھولی۔ نشتر ان کا خاص تعارف کا مطمع نظر نہیں بنا۔ اصلاح رہا۔ خود احتسابی کو وتیرہ دیتے تھے۔ میٹرک کا مرحلہ 1918 میں سٹن ہائی اسکول سے طے کیا۔ گریجویشن کے لیے انھوں نے ایڈورڈز کالج، پشاور کا رخ کیا۔ پھر علی گڑھ یونیورسٹی پہنچے، جہاں سے 1925 میں ایل ایل بی کی ڈگری

لی۔ سیاست کی سمت آنا لگ بھگ طے تھا۔ اس وقت کانگریس سب سے بڑی سیاسی جماعت تھی۔ 1928 سے 1931 تک وہ اس جماعت سے وابستہ رہے۔ 1929ء تا 1938 انھوں نے پٹنہ میں سول لائنز کے کمشنر کی حیثیت سے ذمے داری نبھائی۔ جلد انھیں احساس ہوگیا کہ کانگریس پر ہندو سیاست دانوں کی نمائندگی میں دلچسپی نہیں رکھتی۔ 1932 میں وہ مسلم لیگ کی سمت چلے آئے۔ جلد ان کا شمار نمایاں سیاست دانوں میں ہونے لگا۔ قرارداد مقاصد کی منظوری ان کا اہم کارنامہ ہے۔ یہ قرارداد پاکستان کے آئین کا حصہ ہے۔ لیاقت کے سانحۂ اغتاص میں قائدِ اعظم محمد علی جناح نے انگریزی میں تقریر کی، تو اس کا ترجمہ سردار عبدالرب نشتر ہی نے کیا۔ مسلمانوں کو ہندو بنانے کی شدھی اور سنگھٹن تحریکیں شروع ہوئیں، تو آپ نے ان سے مقابلے کے لیے ادارہ تبلیغ اسلام بنایا۔

قیامِ پاکستان کے بعد وہ پہلی کابینہ میں وزیرِ مواصلات بنے۔ ان کا بینہ نے ساتھ اول ایئلینڈ پاور پراجیکٹ کی منظوری دی تھی۔ جو آج 454 کلا باغ ڈیم کا منصوبہ کہلاتا ہے۔ سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے دو مرتبہ گورنر رہے۔ انھوں نے اگست 1949ء تا نومبر 1951ء تک ذمے داری نبھائی۔

شاہی طلبہ لاء ہوسٹل مرکزی دروازہ طویل عرصے سے بند تھا، اس کے پیچھے شاید انگریز کی سامصیدار رویہ تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد سردار عبدالرب نشتر نے اسے کھلوایا۔ 14 فروری 1958 کو کراچی میں فوت ہوے۔ آپ کو بابائے قوم قائدِ اعظم محمد علی جناح کے کہنے پر مزارِ قائد کے احاطے میں دفن کیا گیا۔

☆راشد منہاس

"تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر" شاعرِ مشرق کا یہ مصرع شاید راشد منہاس جیسے نوجوانوں کے لیے ہی کہا گیا تھا۔ نوجوان، جو ستاروں پر کمند ڈالنے میں کمنہ۔ نشانِ حیدر حاصل کرنے والے سب سے کم عمر پاکستانی اور پاک فضائیہ کے پہلے آفیسر کی جہت کا نشان پاکستان کے اٹھارہ کروڑ عوام کے دلوں پر ثبت ہے۔

راشد منہاس نے 17 فروری 1951 کو کراچی میں آنکھ کھولی۔ والد ریڈیو کے میری کیمسٹری اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور سینئر کیمبرج کراچی سے کیا۔ ستمبر سال کی عمر میں پاک فضائیہ کی رسالپور اکیڈمی میں بہ طور فلائنگ کیڈٹ داخلہ لیا۔ 1971 میں گریجویشن کیا۔ فوج کا پائلٹ کی تربیت حاصل کرنے کے لیے کراچی میں پی ایف ایٹ میں سرور میں پوسٹنگ ہوئی۔

بظاہر اس نوجوان کی زندگی معمول کی رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی، وہ ذہین اور زندگی سے بھرپور تھا۔ البتہ اُس میں کچھ ایسا تھا، جس کی اور وں کو خبر نہیں تھی۔ ایک خواہش اس کے سینے میں پنپ رہی تھی۔ حب الوطنی کا جذبہ دل میں جوش مارتا تھا۔ یہ نوجوان اپنے ہم وطنوں کی طرح ہمسر ہاسم احمد خان سے بہت زیادہ متاثر تھا، جنھیں ستارۂ جرأت سے نوازا گیا تھا۔ اس کے مطالعے کا محور بھی جنگ پر مبنی کتب تھیں۔ وہ ہندوستانی جارحیت کے اقبال ڈائری میں محفوظ کر لیا کرتا تھا، جن میں قومی ہیرو بھی شامل تھا۔ "ایک شخص کے لیے سب سے بڑا اعزاز اپنے ملک کے لیے خود کو قربان کر دینا اور قوم کی امیدوں پر پورا اترنا ہے۔"

جو کچھ ہے کہ قدرت نے اسے ایک عظیم کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ پھر مہروان آن پنجاب 20 اگست 1971ء کو تربیتی پائلٹ کی حیثیت سے راشد منہاس پی 33 جیٹ ٹیزر کو اڑانے کی تیاری میں تھے، جب ایک بنگالی انسٹرکٹر مسلح الرحمان غیر متوقع طور پر اُن کے ساتھ سوار ہوا۔ دورانِ پرواز مسلح الرحمان نے راشد منہاس کو سر پر شدید ضرب لگا کر پرواز کا کنٹرول سنبھالنے کی کوشش کی اور جہاز کا رخ بھارت کی جانب موڑ دیا۔

دشمن ملک کو کیا معلوم تھا کہ خدا راشد منہاس نے اپنے حواس پر قابو پالیا۔ نوجوان پائلٹ کے پاس اپنے طیارے کو ہندوستان لے جانے سے روکنے کا ایک ہی راستہ تھا۔ راشد منہاس نے ہندوستانی سرحد سے محض 32 میل دور طیارہ گرا کر اپنی جان دشمن کے لیے قربان کر دی۔

ماں کے لیے بیٹے کی جدائی بڑا کرب ہے، مگر راشد منہاس کی والدہ زری نے ہر ماں کا سر بلند کر دیا۔ وہ نشانِ حیدر کے حق دار ٹھہرے۔ انھیں 21 اگست 1971 کو مکمل فوجی اعزاز کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔

☆آغا طالش

نگار ایوارڈ ایک زمانے میں سب سے بڑا فلمی اعزاز تھا، یہ نشان سیاہ فن کار کو مستقل ظہور تھا، اس کا قد بڑھتا، جن صاحب کا ہم اب تذکرہ کر رہے ہیں، انھیں ایک دو نہیں، پورے سات ایوارڈ ملے۔ مگر یہ اعزاز جن کو ملیں۔ ان کی صلاحیتوں حق ادا بھی کر گئیں بھرپور انداز میں خراج تحسین پیش کیا جاتا۔ وہ ایک بے فن کار تھے، جو کہ ایکٹر ایکٹرز کے طور پر ایک طویل عرصے انڈسٹری پر چھائے رہے۔ ان کے انتقال کو دو عشرے ہونے کو ہیں، مگر ان کی آواز اب بھی سماعتوں میں گونجتی ہے، ان کا انداز اب بھی لوگوں کو یاد ہے۔

ان کا اصل نام آغا علی عباس تراب تھا۔ وہ 10 نومبر 1927 کو لودھراں میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی فن کار تھے۔ شعور کی دہلیز عبور کرتے ہی اس سمت چلے آئے۔ تقسیم سے قبل اس میدان میں قدم رکھ دیا تھا۔ بمبئی میں بننے والی فلم "کرائے سے باہر" سے فلمی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ لاہور انھیں راس آگیا۔ آغا طالش کا نام اختیار کیا۔ پہلے ریڈیو پاکستان پشاور سے منسلک ہوئے، پھر فلم انڈسٹری کی سمت آگئے۔ وہ ہنرمند اور قدآور اداکار تھے، با صلاحیت لوگوں کو شناخت کیا جاتا، انھیں موقع ملتا۔ پاکستان میں ان کی پہلی فلم "نتھ" تھی۔ پشتو فلم "ترہ" میں یہ طور ان نظر آئے۔ اس فلم نے انھیں شناخت عطا کی، شہرت انھیں فلم "سات لاکھ" سے ملی۔ 1962 میں ریلیز ہونے والی فلم "لخمیر" نے آغا طالش کو شہرت کی بلندی پر پہنچا دیا۔ دیکھ ریکھ ظلموں میں باغی، بیگل، فرنگی، نرغا، وطن، نیند، کنیز، لاکھوں میں ایک، نزہت اور امراؤ جان ادا شامل ہیں۔

آغا طالش کا 19 فروری 1998 کو انتقال ہوا۔ ان کے بیٹے احسن طالش بھی اسی سمت میں آئے۔ انھوں نے خود کو بہ طور ڈائریکٹر اور پروڈیوسر منوایا اور دی کونٹر، راکھ، اعتراف، محبت کرنے والوں کے نام جیسے ڈرامے دیے۔

ملہا مصر گزشت

☆اجمل خٹک

اُن کے کئی حوالے ہیں۔ ایک جانب سیاست میں جھنڈے گاڑے، دوسری سمت ادب کے میدان میں خود کو منوایا، پھر ترقی پسند دانشور کی حیثیت سے کارکنوں کی تربیت کی۔

اجمل خٹک 15 ستمبر 1925 کو اکوڑہ خٹک کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکمت خان بھی علاقے کی جانی مانی شخصیت تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مدرسے کی سمت آئے، مگر علمی استعداد بڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ منشی فاضل، ادیب اے، بی اے کیا۔ پشاور یونیورسٹی سے انھوں نے فارسی میں ایم اے کیا۔ اسلامیہ کالج پشاور کے زمانے میں پشتو ادب کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ ان کی سیاسی اور ادبی گہری نظر تھی، ادب کو زندگی کے قریب لانے کی خواہش تھی، ان کا اظہار بے پروا سرحد تھا۔ ان کے سفرِ زندگی میں ریڈیو پاکستان پشاور سے بطور اسکرپٹ رائٹر وابستگی کا بھی ذکر کرنا ہوگا۔ ایک عرصے تک وہ ریڈیو سے منسلک رہے۔

انقلابی مزاج تھا۔ قوت پرست سیاست توجہ کا طالب رہی۔ باچا خان سے متاثر تھے۔ اگر پرسکار کے خلاف تمام تحاریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس سفر میں اگلے پانچ عشروں میں بے تحاشا قربانیاں دیں۔

اوائل میں وہ صوبائی خودمختاری کے حق میں تھے۔ خان عبدالغفار خان کے ہمراہ آزاد پختونستان کی بھی حمایت کی۔ ان نظریات کے باعث قید و بند کی صعوبتوں سے بھی دوچار ہوئے۔ ولی خان کے زمانے میں وہ عوامی نیشنل پارٹی کے سینئر نائب صدر بھی رہے۔ 1973 میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے نیپ کو غیر قانونی جماعت قرار دیا اور پارٹی کے سرکردہ رہنماؤں کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اجمل خٹک روپوش ہو کر افغانستان چلے گئے۔ کچھ برس جلاوطن رہے۔ وہاں بھی چین سے نہیں بیٹھے۔ جانتے ہیں، افغانستان میں کیمونسٹ حکومت کے قیام میں ان کا بھی کردار رہا۔ یہ سرکار زیادہ عرصے قائم نہیں رہی۔ سوویت یونین کی افغانستان میں شکست کے بعد حالات تبدیل ہوگئے۔ 1989 میں وہ واپس پاکستان لوٹ آئے۔ 1990 سے 1993 میں وہ قومی اسمبلی کے رکن رہے۔ مارچ 1994 میں جیب کے رکن منتخب ہوئے۔ ولی خان کے بعد انھوں نے عوامی نیشنل پارٹی کی صدارت بھی سنبھالی۔ اپنے طور پر نظام کی بہتری کی کوشش کی، مگر حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ ترقی پسند نظریات متروک ضرب۔ زمانہ تبدیلی کے عمل سے گزر رہا تھا۔ مگر بازیوں نے انھیں گھیر لیا اور دھیرے دھیرے وہ سیاست سے دور ہو گئے۔

شعر و ادب کا سفر ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوا تھا۔ آخر تک اس سے منسلک رہے۔ البتہ جدید فکر کو بھی قبول کیا۔ اردو اور پشتو دونوں زبانوں پر گرفت رکھتے تھے، جس کے طفیل ان کے کلام میں تنوع بھی آیا اور رسائی بھی ہو سکی۔ ان کی شاعری حبِ وطنی، بے گھری جیسے المیوں کی کمال مہارت سے عکاسی کرتی ہے۔ ان کے کام کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا۔ انھوں نے اپنی ادبی خدمات کے لیے کمال فن ایوارڈ تو قبول کیا، مگر حکومت کی جانب سے ستارۂ امتیاز لینے سے معذرت کر لی۔ طویل علالت کے بعد 7 فروری 2010 کو پشاور میں ان کا انتقال ہوا۔

☆شہباز ادرائے

اس کو کیا رکھ سکتوں ہیں "آئی کون" کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا نقشِ تفریح کار ذہن میں بنا، بلکہ اس نے ایک بہت بڑے پیغام کی شکل ڈھال لی۔ آگاہی کا ذریعہ بنا۔

شہباز ادرائے کے کیریر کے پہلے حصے پر تو کانٹیں کا غلبہ نظر آتا ہے، مگر دھیرے دھیرے ان کے گانوں میں معاشرتی رنگ بھی جھلکنے لگا۔ ایک وقت میں یہ اداکار اتنا مصروف ہو گیا کہ ان کے گیتوں پر پنجابی فلمیں بننے لگیں۔ شہباز ادرائے کے نغمات ایسے فنکار کی خوبیوں کی بھی شہادت ہیں، بلکہ امریکی یلیسیوں اور ڈرون حملوں کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک پہلو اور ہے، اس فن کار نے فلم کے میدان میں بھی خیر ان کر کیا۔

16 فروری 1977 کو کراچی میں پیدا ہوئے والے اس فنکار کا 1995 میں پہلا البم "زندگی" ریلیز ہوا۔ یہ البم بہت پسند کیا گیا۔ دو برس بعد "درش" منظر عام پر آیا۔ 1999 میں اپنے تیسرے البم "تیری صورت" میں وہ مغربی موسیقی کی سمت جاتے ہوئے محسوس ہوئے۔ "رب جانے" اور "بری بات ہے" اس کے بعد ریلیز ہوئے اور لوگوں کے معیار پر پورے اترے۔ البتہ 2008 میں اس کا کار نے ایک دھماکا کر دیا۔ یہ ان کا چھٹا البم "تست اپنے ہاتھ میں" تھا، جس نے ہمیں راہ نمائی گیت گانے والے اس فن کار کے نئے روپ سے متعارف کروایا۔

اس البم کو کریوی جیل میں ملاپ کیا گیا۔ اس کی پہلی ویڈیو "نچ رہے" جمود پرست سماجی رویوں پر گہری چوٹ کی تھی۔ اس میں سیاہ صورتِ حال کو بھی منظر کیا گیا۔ اس البم کا ٹائٹل ٹریک "قسمت اپنے ہاتھ میں" بڑی بہت نے دے ہوئی، کچھ حلقوں نے اسے بہت بولڈ سمجھا۔ اور مغربی میڈیا نے اس پر اعتراض اٹھایا کہ پاکستان کی ہاکا عکاسی ہے، مگر پھر ایسا نہیں ہوا۔ البم کی ویڈیو میں دو سانحے گیت کے انداز میں، دلچسپ پیرائے میں پاکستان کی تاریخ بیان کی گئی۔ بعد میں البم کے داستو کے اس گانے کو ہم کو اپنے گانے "اپنے آپ" میں شامل کیا۔ یہ گانا ایک دلربا نغمہ تو تھا ہی، سراہنے والے بہت ملے، چند نے تنقید

ملہا مصر گزشت

کی۔ وہ اسے ساتھ لانھوں نے "واسوخت میں" کے نام سے ایک نئی ہی پروگرام بھی کیا یہ ایک مختلف کوشش تھی۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔

2013 میں 22 اقساط پر مشتمل ڈاکیومینٹری سیریز "چل پڑھا" میں وہ نظر آئے۔ جس میں انھوں نے دو سو سے زاید سرکاری اسکولوں کے دورے کیے۔ اس کوشش اور عام لوگوں کی جانب سے بھرپور پزیرائی ملی۔ اپنی خدمات کے لیے شیڈ ایوارڈ سے بھی نوازے گئے اور یہی تعلیمی اداروں سے کی۔ اعزازات حاصل کرچکے ہیں۔

☆ عطاء الحق قاسمی

ان کا شمار پاکستان کے معتبول اور بلند قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ اب کی کسی تعارف میں طبع آزمائی کی، سب میں کامیاب رہے، ہاں بلاشبہ شہرت کالم نگاری اور سفر نامہ نویسی میں ملی۔ سکوتی مخلوق، پاگلوں میں ان لیک کے قریب تصور کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے ڈرامے اور قوالی لیجنڈ پر پاکستان سفر کی تحریریں سے خدمات انجام دیں۔ ان کے ایک بیٹے یاسر پیرزادہ نے بھی کامیابی سے نام پیدا کیا۔

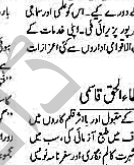

عطاء الحق قاسمی

یکم فروری 1943 کو پنجاب میں پیدا ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انھوں نے ایم اے اردو کیا، پھر گورنمنٹ کالج اے او کالج لاہور سے وابستہ ہوگئے۔ طویل عرصہ اس تعلیمی ادارے میں پڑھایا۔ 2000 میں ایف سی کالج سے ایسوسی ایٹ پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ صحافت میں ان کی شہرت کا آغاز "قوائے وقت" میں چھپنے والے کالموں سے ہوا۔ 32 برس تک اس اخبار سے کالم نگار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ وہ کبھی بھی سرکاری ملازم کی حیثیت کا انتظار کیا کرتے۔ ادبی محفلیں بھی رہے۔ 2001 میں روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوگئے اور آج بھی "روزن دیوار سے" کے عنوان سے کالم لکھ رہے ہیں۔ اے پی این ایس کی طرف سے بہترین کالم نویس کا ایوارڈ اتنی دفعہ مل چکا ہے۔ کالموں اور مضامین کے مجموعے "روزن دیوار سے" پر ایم فل کی ڈگری بھی حاصل کی۔ ان کے کالموں کے کئی مجموعے شائع ہوکر پذیرائی حاصل کرچکے ہیں، جن میں آپ بھی شرمسار ہوں، محمول وحیلہ، میں معمول، باز پرس اتفاقی، روزن دیوار سے، ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے، شغل مہنگا، رنگ برنگ موضوعات پر لکھتے ہیں، حیات نے سمیٹ رکھا ہے۔

اردو ادب میں ان کی شناخت "شوق آوارگی" سے ہوئی، جس کو اردو کے بہترین سفر ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ سفر نامہ کالموں کی صورت میں سامنے آئے جو "نقوش" میں قسط وار چھپتا رہا۔ ان کی کتاب "لو بھی سیاح کا سفر نامہ" پر لطف طنز و بیان کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی۔ "گروں نے کہا تھا" ان کا خوب صورت سفر نامہ ہے" اور "وہی زور است" بھی ان کے سفر نامے ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "ذات میں اجنبی ہیں" کے نام سے چھپا۔ ناکوں کی کتاب "کاش" مزید کچھ لکھیں" ہے۔ ٹی وی کے لیے تصور کیے ہے ڈرامے لکھے انھیں بے حد مقبولیت ملی۔ ان میں طوطے "خواجہ اینڈ سن" بہت مشہور ہوا اور "شب دیگ" دو بہترین ڈرامائی سیریل کا کریڈٹ ایوارڈ ملا۔ دیگر ڈراموں میں ملی جلتا چاند پور، آب کام، (شیرازی)، اپنے پرائے، عروسی، الیکشن الیکشن اور برزخ سوتا نمایاں ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کو 1998 میں حکومت پاکستان کی جانب سے ستارۂ امتیاز کا ایوارڈ دیا گیا۔

1979 میں انھوں نے "معاصر" کے نام سے ادبی جریدہ نکالا تھا، جو بہت مقبول ہوا۔ گذشتہ چند برس سے وہ لاہور آرٹس کونسل (الحمرا) کے چیئرمین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ گذشتہ برس کے آخر میں انھی کی ٹی وی کے چیئرمین کی حیثیت سے کام کرنے کی خبر سنی گئی تھی۔

☆ حنیف اوڈھو

حنیف اوڈھو کا شمار باصلاحیت فنکاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے ٹی وی اور فلم دونوں میں خود کو منوایا۔ ٹی وی چینلز کی حیثیت سے بھی نام کمایا۔ میک اپ مصنوعات کے کاروبار میں کامیابی حاصل کی۔ ایک سیاست میں بھی قسمت آزمائی کی۔ ایک ہی جماعت سے وابستہ ہوئیں، جو پاکستان میں مقبول قومی جماعت رہی تھی۔ پھر تجارت میں بھی اچھی رہیں۔ انور مقصود کے ڈرامے "تنزارہ اور عبدالقادر" سے انھوں نے کیریر شروع کیا۔ ان کی اداکاری نے ناقدین کو متوجہ کیا۔ عوام نے انھیں سراہا۔ ماہ عید کے ڈرامے "دشت" میں انھوں نے مرکزی کردار ادا کیا۔ یہ چنداں کی مسافرت کے گرد گھومتے اس ڈرامے نے ناظرین کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ ان کے دیگر مقبول ڈراموں میں تیرات اور ہم غلاماں ہیں۔ حنیف نے انھیں فلموں کی جانب بھی رخ کیا۔ "جوڑ گیا وہ مر گیا" اور "مجھے جانے دو" میں نظر آئیں۔

وہ 12 فروری 1968 کو شکار پور، سندھ میں پیدا ہوئیں۔ کراچی میں شعور کی آنکھ کھولی۔ 1989 میں انھوں نے میک اپ آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنا کیریر شروع کیا۔ فلم "لو بھی سیاح" میں ان کی صلاحیتوں کے لیے کام کیا۔ اسی زمانے میں وہ اداکار حنیف کی توجہ میں آئیں۔ 1993 میں ستارہ اور ہم المناک انھیں شادی بیاہ، ناچ پارٹیوں اور ان کی ثقافتی تقریبات میں ریلیز ہوئی۔ 1997 میں "نظر" میں نظر آئیں۔ مقامی فلم "تم سے کہنا تھا" میں ان کے کام کو سراہا گیا۔ مجموعہ فلموں کے لیے منتخب زنانہ فلمی اداکارہ کا ایوارڈ ملا۔

ایسٹری دیسر

دیسر ہے، پرکشش شخصیت کی مالک ہیں۔ زیادہ فلمیں ٹی وی پر ہوئی۔ انھوں نے اداکاری کے ساتھ ساتھ ماڈلنگ بھی کی۔ ایک ٹی وی چینل پر "ہوم شاپنگ" شو میں انھوں نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔ ایک ٹی وی چینل پر "ہوم شاپنگ" شو میں انھوں نے میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔ ایک سماجی کارکن کی حیثیت سے انھوں نے خاصا کام کیا۔ خود قدرے ٹی وی پر ہوئی۔ ان کی اداکاری میں شوخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ایک فلم "ہم ہیں راہی پیار کے" میں ان کی پرفارمنس کو خاصا سراہا گیا۔ ماڈلنگ کے ذریعے انھوں نے اپنا کیریر شروع کیا۔ ایک ٹی وی چینل پر "ہوم شاپنگ" شو میں میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔ ایک ٹی وی چینل پر "ہوم شاپنگ" شو میں میزبانی کے فرائض سرانجام دیے۔

☆ بدر میاں داد

یہ باکسٹن ہے۔ اس کے جذب میں ردیائے ستلج بہتا ہے۔ سلطان محمود غزنوی نے پہلی حکومت یہیں قائم کی، یہیں مشہور صوفی بزرگ بابا فرید شکر گنج مدفون ہے اور اسی

انفرادیت (خودی)

انفرادیت کے بغیر ہم اس دنیا کا تصور نہیں کر سکتے۔ ہر انسان کو اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا چاہیے۔ اس کو مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنی انفرادیت کو ظاہر کرنا چاہیے۔ اس کو اپنی انفرادیت کو پہچاننا چاہیے۔ اس کو اپنی انفرادیت کو سمجھنا چاہیے۔ اس کو اپنی انفرادیت کو جاننا چاہیے۔ اس کو اپنی انفرادیت کو پہچاننا چاہیے۔ اس کو اپنی انفرادیت کو سمجھنا چاہیے۔ اس کو اپنی انفرادیت کو جاننا چاہیے۔

شہر میں قوالی کی دنیا میں خود کو منوانے والے بدر میاں داد نے 17 فروری 1962 کو آنکھ کھولی۔ ہجرت کے بعد ان کے خاندان نے اسی علاقے کو مسکن بنایا۔ ان کے والد رشید میاں دادا اور دادا دین محمد اپنے وقت کے معروف قوال تھے۔ ان کا گھرانہ سیکڑوں سال سے موسیقی کے فن سے وابستہ ہے۔ بدر میاں داد معروف قوال صحبت علی خان کے ماموں زاد بھائی تھے۔

گائیکی تو جیسے گھٹی میں پڑی تھی، پھر ماحول بھی سہر گار تھا۔ تربیتی مراحل تیزی سے طے کیے۔ آغاز بھی حاضل سے ہوا۔ کم عمری میں ریڈیو تک رسائی حاصل کر لی۔ ملتان ریڈیو سے انھیں شہرت ملی۔ وہیں سے ان کی قوالیاں پورے ملک میں پھیل گئیں۔ بدر میاں داد نے اپنے بھائی شبر میاں داد کے ساتھ مل کر گائیکی کا آغاز کیا تھا۔ ایک عرصے تک وہ ساتھ گاتے رہے۔ پھر گروہ الگ ہو گئے۔ کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ یہ بچھڑنے بدر میاں داد کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ ان کا فن نکھر کر سامنے آیا۔ ان کے ہنر کی مانگ بڑھنے لگی۔ انداز نے کے مطابق ان کے ہنر کی قدر دو سو کے قریب ہے۔ ان کی آواز عارفی غلوں میں بھی سنائی دی۔ انھوں نے گلوکار سرفراز بلوا ور نے کے ساتھ مل کر قالیں اور جدید طرز کی موسیقی کے نغموں کا ایک البم ریکارڈ کیا تھا، جسے بہت پسند کیا گیا۔

لوگوں کی ان سے بہت اُمیدیں تھیں، مگر دل کے عارضے کی وجہ سے لاہور میں مارچ 2007 میں نقد 45 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

☆ شفقت امانت علی

گذشتہ دو عشروں میں باپ اور کلاسیکی موسیقی کے نغمہ خوانوں کا ہمارے ہاں خاصا چرچا رہا۔ کئی تجربات ہوئے، اس کے مثبت فن کا شکیبی کو جو اعتبار و وقار میسر آیا ہے، ان میں شفقت امانت علی کا نام نمایاں ہے۔ ایک ایسا گلوکار، جسے قدم قدم اور جدید رنگوں طرز کی موسیقی پر خوب گرفت تھی، جس کی مرغوبت آواز پاکستان سے ہوتی ہوئی ہندوستان پہنچی اور بول و دُھن ہر جگہ سنی گئی۔ اور یہ حیران کن نہیں۔ وہ دنیائے موسیقی کو لازوال گائیکی اور خوبصورت البمز عطا کرنے والے استاد امانت علی کے سپوت ہیں۔ یعنی صاحب باب، دیدہ بینا۔

26 فروری 1965 کو لاہور میں پیدا ہونے والے شفقت امانت علی کا تعلق پٹیالہ گھرانے سے ہے۔ وہ موسیقی کی بڑی ہی نامور گھرانے کی فرد ہیں۔ تربیت کے مراحل گھر میں طے ہوئے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور سے انھوں نے گریجویشن کیا۔ وہاں کی میوزک سوسائٹی کی شہرت میں شفقت نے بہت کام کیا۔

اوائل عمر کی ریکارڈنگ میں "فیوژن" کے رجحان کی جھلک آواز لوگوں تک پہنچی۔ پہلی ریلیز "نکھوں کے ساگر" نے سب کو چونکا دیا۔ جینئے نے سب کی توجہ حاصل کر لی۔ "انکھیاں" کو بھی بہت مقبولیت ملی۔ "کھوج" ہی کی تاریخ رقم کی۔ نہ صرف یہ گیت لازوال ٹھہریا، بلکہ اس کے ذائرکٹر کو قومی ملک پر بھی تعریف کے ڈونگرے برسے۔ بندوستانی فلم نگری نے بھی ان کی صلاحیتوں کو شناخت کیا۔ اس کا سہرا معروف سنگ ساز موسیقار شنکر کے سر ہے، جنھوں نے ریڈیو پر "نکھوں کے ساگر" سن کر شفقت کو طلب کیا تھا۔

2006 میں مدھر رخ خان کی فلم "کبھی الوداع نہ کہنا" میں "متوا" گا کر انھوں نے بمبئی کو جادیا۔ اگلی فلم "ڈور" میں "یہ حوصلہ" جیسا ہٹ گیت گا کے دکھائی دیے۔ "مائی نیم از خان" میں "تیرے بنیا" کا بھی بڑا چرچا ہوا۔ 2011 میں "ولہ دن" میں ان کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی فلموں کے لیے گایا۔ ایک معنوں میں وہ بالی وڈ کا مستقل حصہ بن گئے۔

فیوژن اور ان کا ساتھ 2006 رہا۔ پھر انھوں نے سولو کیریر شروع کیا۔ اس میں ان کی توجہ صوفی اور لوک گائیکی پر مرکوز رہی۔ 2008 میں شبیر کے نام سے ان کا البم آیا، جسے خاصی پزیرائی ہوئی۔

نظریے

شیراز خان

یہ راہ روی کیا دور دورہ نہ ہو، عمدہ معاشرہ تشکیل پائے ایسا معاشرہ جس میں امن و امان کا سایہ ہے، لوگ راست باز اور اعلیٰ نظریے کے حامل رہیں۔ اس سلسلے میں ابتدائی آفرینش سے سعی مسلسل جاری ہے۔ جہاں جہاں الہامی مذہب کے پیغام پہنچے ویاں ویاں مذہب کی بنیاد مضبوط رہی لیکن کچھ علاقوں میں مخصوص لوگوں نے الہامی احکامات کو اپنے طور پر اپنے انداز میں ملفوظ بنا کر کے ایک نیا نظریہ سامنے لائے۔

انسان کے لیے اہمیت صرف روٹی، کپڑا اور مکان کی نہیں ہے۔ بلکہ انسان کو روحانی خوراک بھی چاہیے۔ ایک ایسا مضبوط سہارا بھی چاہیے جو ہر پریشانی میں اس کا ساتھ دے سکے۔ جس سے وہ فریاد کر سکے، جس سے دعائیں مانگ سکے، جس سے وہ اپنی امیدیں وابستہ کر سکے۔

ایک ذات صرف خدا کی ہوتی ہے۔ اور خدا کا تصور انسان کو مذہب نے دیا ہے۔

مذہب کا احترام اور مذہب سے وابستگی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ مذہب کے بغیر رہ نہیں سکتا۔

مذہب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسان کی تاریخ ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مذہب انسان کے ساتھ ہی وجود میں آیا ہے۔

خود فطرتِ انسان مذہب بھی ہے بس ہوا ہے، اس نے آسمان کی طرف دیکھا ہے۔ اس نے جس چیز سے خوف محسوس کیا، جس سے اسے فائدہ پہنچایا اسے اپنا خدا تسلیم کرلیا۔ چاہے وہ سورج ہو یا دریا، دریا ہو یا پہاڑ، سانپ ہو یا گائے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب خدا کا تصور اس کے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ اس زمانے میں اخلاق اللہ اور نہ ہونے کے برابر تھیں۔

بس انسانی آبادی تھی، بغیر کسی اصول کے زندگی گزارنے والی۔ اس وقت ہر وہ چیز اور ہر وہ عمل جائز تھا جو کسی کو فائدہ پہنچائے۔ اس سلسلے میں انفرادیت یا اجتماعیت بھی کسی تخصیص نہ تھی۔

ایسے میں ضرورت محسوس ہوئی کہ کچھ ایسے اصول بنائے جائیں جو انسان کو اس پستی سے نکال کر خدائے واحد کی انسان میں لے آئیں۔

لہٰذا پیغمبر آتے رہے، انسان کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اس طرح انسانی تاریخ میں کئی مذاہب سامنے آئے۔

ان میں سے کچھ بڑے مذاہب جنھیں (جن کو الہامی مذاہب کہا جاتا ہے) جیسا کہ اسلام، یہودیت اور عیسائیت۔

ان کے علاوہ بھی بیشمار مذاہب اور نظریات تھے اور ہیں۔

ہم نے اس مضمون میں ان ہی مذاہب کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مذاہب آج بھی موجود ہیں اور ان پر عمل کرنے والے بھی ہیں۔

امید ہے کہ یہ مختصر سا مضمون ایسے مشہور مذاہب کا ایک تعارف تو ضرور کروا دے گا۔

الاڈورا Aladura

جی ہاں یہ بھی ایک مذہب (یا نظریہ) ہے۔ اس کا وجود مغربی افریقا میں یوروبا لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اس مذہب کی بنیاد 1918ء میں پڑی۔

اس زمانے میں ایک اور نظریہ انجلی ازم اپنے عروج پر تھا۔ یہ تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ الاڈورا انجلی ازم کے رد کے طور پر سامنے آئی تھی۔

اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔

عام طور پر یہ لوگ کئی خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسے موت کا خدا، زندگی کا خدا، صحت اور دولت کا خدا وغیرہ۔

یہ مذہب افریقی قبائل کی بہت سی رسومات اور کچھ باہری رسومات کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ عبادات کے نام پر ان کے یہاں مراقبہ، فیوژن اور ہیلنگ ہوتی ہے۔ جو ان کا کوئی مذہبی پیشوا اپنی تحریکی میں کرواتا ہے۔ ان کے یہاں جنات بعد موت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی ان کے پاس ان کی کوئی مذہبی کتاب ہے۔

آمش Amish

اس مذہب کی بنیاد 1693ء میں سوئٹزر لینڈ میں ڈالی گئی۔ اس کو رائج کرنے والا جیکب آمان نام کا ایک شخص تھا۔ جس کی تعلیمات توریت سے ماخوذ ہیں۔ دنیا میں اس کے ماننے والوں کی تعداد تقریباً دو لاکھ کے قریب ہے۔

تعلیمات: آمش کی تعلیمات کی خاص باتیں یہ ہیں، سادگی، عاجزی اور انسانی ہمدردی۔ بڑے کاموں سے بچو اور خدا کی اطاعت کرو۔ ان کے یہاں خدا، جنت، دوزخ اور حیات بعد الموت کا تقریباً وہی تصور ہے جو عیسائیت میں ہے۔

رسومات: ان کے یہاں ایک سال میں دو بڑے اجتماعات ہوتے ہیں۔ اجتماع میں شریک ہونے سے پہلے اپنے بھائیوں کو خوب اچھی طرح معاف کر دینا ہے تاکہ دنیا کے سفر کی مکمل طور پر تکمیل کر سکیں۔ جو کہ ان کے درج ذیل بولنے والے لوگ زیادہ دیکھ بھال کرتے ہیں۔ یہ موجودہ دور کی سہولیات سے فائدہ نہیں اٹھاتے جیسے بجلی وغیرہ۔

ان کے لباس بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے سترہویں صدی کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ 17 سے 20 سال کی عمر تک مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ جنتی جوان کو مکمل طور پر اس فرقے میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ ان کی کتاب بائبل ہے۔

آساترو Asatru:

یہ بھی ایک مذہبی فرقہ ہے۔

1970ء میں اس کی بنیاد امکسٹھ نویں ممالک اور امریکا میں ڈالی گئی۔ قدیم رومن قدیم کے خداؤں کا تصور ان کے یہاں موجود ہے اور تقریباً اس قسم کی روایات ہیں جو روایات قدیم رومن فلوہ مذہب کی ہیں۔ ان کے یہاں جنت اور دوزخ کا تصور ہے لیکن ان حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

جنت کے لیے یہ ویکلیا والی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ یعنی انتہائی ترین جنت، لیکن جہنم صرف ان کے مجھے میں آتی ہے جو جنگ میں مارے گئے ہوں۔

عام ادیان کے لوگوں کے لیے تہل کا لفظ ہے۔ یعنی بہت برے لوگوں اور شراب اور بدکار لوگوں کے لیے ہائی فل (جہنم و دوزخ)۔

رسومات: ان کے یہاں شروعات اور مختلف اجتماع زمانے کے طور پر ہے جاتے ہیں۔ ان کے اپنے تہوار ہیں۔ جن میں یہ اپنی رسومات ادا کرتے ہیں اور ان کو مذہبی رسومات کہا جاتا ہے۔

لادینیت Atheism:

اس نظریے کا وجود قدیم زمانے سے رہا ہے۔ خاص طور پر یونانی فلسفے میں۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے آغاز سے جب علم کی روشنی پھیلی تو اس کے ساتھ ساتھ اس نظریے کو بھی تقویت ملتی چلی گئی۔

اس نظریے کو ماننے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور یہ پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

ان کے نظریے کے مطابق خدا اور خداؤں کا کوئی وجود نہیں ہے اور جب وہ ان باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتے تو جنات بعد از موت اور جنت یا دوزخ کا تصور بھی ان کے یہاں نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ اسی دنیا میں ہے۔

ان کے خیال کے مطابق جو کائنات ایک بڑے سائنسی حادثے کا نتیجہ ہے۔ اس میں کسی کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس نظریے کی کوئی خاص کتاب نہیں ہے۔ جہاں بھی اور جس زبان میں بھی لادینیت کے موضوع پر کچھ لکھا گیا ہے وہ ان کا ہے۔ اس کے ماننے والوں میں بہت مشہور لوگ بھی ہوئے ہیں۔ جیسے کارل ساگان، رچرڈ ڈاکنسن اور مشہور فلسفی۔ برٹینڈ رسل وغیرہ۔

جہاں:

یہ فرقہ ایران کے شہر جہان سے 1863ء میں شروع ہوا۔

اس کی بنیاد علی محمد باب نے ذوالی قعدہ اور اسے بہاللہ نے پھیلایا۔ اس عقیدے کے ماننے والے 50 لاکھ کے قریب ہیں۔ یہ ایک ایسے عقیدہ پر یقین رکھتے ہیں جو وحدت پر ہے لیکن اس نے اپنی عبادات کو ایک خاص طریقے پر مخصوص کر دیا ہے۔ اس نے اپنی عبادات کے لیے خود کو مختلف مذاہب کے دیوی دیوتاؤں کے روپ میں ظاہر بھی کیا ہے۔

روح غیر فانی اور بیماری طور پر یا کیزہ ہوتی ہے۔ روح کے کثیف کرنے سے انسانی خیالات ہوتے ہیں جس کی وجہ سے جسم گناہ آلودہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کا مقصد روحانی طور پر خود کو اس سے اعلیٰ ترین کرتے رہنا ہے۔ روح جسم سے الگ ہو کر مرکز اول (خدا) کی طرف اپنا سفر شروع کر دیتی ہے اور یہ سفر اس وقت ختم ہوتا ہے جب وہ اپنے مرکز سے جا کر مل جائے۔

ان کے نزدیک کے عقیدے کے مطابق انسان تعلیم حاصل کرکے اپنی روح کو پاکیزہ رکھنا، عبادت کرنا، تلاوت وجود کے کام کرنا اور نشے سے بچنا چاہیے۔

کائنات: ان کی مذہبی اور مقدس کتابوں میں "کتاب مقدس" اور اینیڈن ورڈز شامل ہیں۔ یہ تحلیلات پر مشتمل ہیں یا دور سے بہائی دینی پیشواؤں سے نکلی ہیں۔

بون Bon

یہ تبت کا ایک مذہب یا عقیدہ ہے۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔

بدھ ازم سے بڑی حد تک مماثلت ہے۔ ان کے یہاں عبادت کے طور پر مراقبے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مراقبہ روح اور جسم کی صفائی کے لیے کیا جاتا ہے۔

ان کے عقیدے کے مطابق انسان کے پیدا ہونے اور مرنے اور پھر پیدا ہونے کا یہ چکر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ مکمل نجات حاصل نہ کرلے۔

ان کے یہاں ستارہ شناسی کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرد تبت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

بدھ ازم:

سدھارتھ گوتما (بدھا) کی تعلیمات پر مشتمل جو 520 پی ایس نوٹی (پہال کی زبان) بولیا کے شمالی حصے میں ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ بہت بڑی آبادی اس مذہب کے ماننے والوں کی ہے۔

مذہب کا احترام اور مذہب سے وابستگی انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ وہ مذہب کے بغیر رہ نہیں سکتا۔ مذہب کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدیم انسان کی تاریخ ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ مذہب انسان کے ساتھ ہی وجود میں آیا ہے۔

خود فکار انسان جب بھی سر اٹھاتا ہے اس نے آسمان کی طرف دیکھا ہے۔ اس نے جس چیز سے خوف محسوس کیا اس سے اسے فائدہ پہنچانے اپنا خدا تسلیم کرلیا۔ چاہے وہ سورج ہو یا درخت، دریا ہو یا پہاڑ، سانپ ہو یا گائے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب خدا کا تصور اس کے ذہن میں واضح نہیں تھا۔ اس زمانے میں اخلاقی اقدار نہ ہونے کے برابر تھیں۔

بس انسانی آبادی تھی، بغیر کسی اصول کے زندگی گزارنے والی۔ اس وقت ہر وہ چیز جو ہر وہ عمل جائز تھا جو کسی کو فائدہ پہنچا سکے۔ اس سلسلے میں افراد یت یا اجتماعیت کی بھی تخصیص نہ تھی۔

بعد میں تو ایک بستی کے ہر فرد کا اپنا ایک خدا ہوتا تھا۔ ایسے میں ضرورت محسوس ہوئی کہ کچھ ایسے لوگ آئیں جو انسان کو اس پستی سے نکال کر خدا کے وحدانی الہٰ میں لے آئیں۔

لہٰذا جو پیغمبر آتے رہے، انسان کو رواسات پرانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اس طرح انسانی تاریخ میں کئی مذاہب سامنے آئے۔

ان میں سے کچھ بڑے مذاہب تھے (جن کو الہامی مذاہب کہا جاتا ہے) جیسا کہ اسلام، یہودیت اور عیسائیت۔

ان کے علاوہ بھی بیشمار دوسرے مذاہب اور نظریات تھے اور ہیں۔

ہم نے اس مضمون میں ان ہی مذاہب کا جائزہ لیا ہے۔ یہ مذاہب آج بھی موجود ہیں اور ان پر عمل کرنے والے بھی ہیں۔

اُمید ہے کہ یہ مختصر سا مضمون ایسے مشہور مذاہب کا ایک تعارف کا کچھ اندازہ دے گا۔

الاذورا Aladura

ہی ہاں یہ بھی ایک مذہب (یا نظریہ) ہے۔ اس کا وجود مغربی نائجیریا میں یوروبا لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اس

مذہب کی بنیاد 1918ء میں پڑی۔

اس زمانے میں ایک اور نظریہ انجلی اثر اپنے عروج پر تھا۔ یہ تحریک زور پکڑتی جارہی تھی۔ لالاذورا نجلی ازم کے رد کے طور پر سامنے آئی تھی۔

اس مذہب کو ماننے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب بتائی جاتی ہے۔

عام طور پر یہ لوگ کئی خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔ جیسے موت کا خدا، زندگی کا خدا، صحت اور دولت کا خدا وغیرہ۔

یہ مذہب افریقی قبائل کی بہت سی رسومات اور کچھ باہر کی رسومات کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ عبادات کے نام پر ان کے یہاں ریاضہ وغیرہ ہوتا ہے۔ جو ان کا کوئی مذہبی پیشوا اپنی نگرانی میں کرواتا ہے۔ ان کے یہاں حیات بعد موت کا کوئی تصور نہیں ہے اور نہ ہی ان کے پاس ان کی کوئی مذہبی کتاب ہے۔

آسٹک Amish

اس مذہب کی بنیاد 1693ء میں سوئٹزر لینڈ میں ڈالی گئی۔ اس کو وارنج کرنے والا جیکب آمنان نام کا ایک شخص تھا۔ جس کی تعلیمات تو بہت سخت تھیں۔ دنیا میں اس کے ماننے والے تین چار لاکھ کے قریب ہیں۔

تعلیمات: آسٹک کی تعلیمات کی خاص خاص باتیں یہ ہیں، سادگی، سچائی اور انسانی ہمدردی۔ برے کاموں سے بچو اور خدا کی اطاعت کرو۔ ان کے یہاں خدا، جنت، دوزخ اور حیات بعد از موت کا تقریباً وہی تصور ہے جو عیسائیت میں ہے۔

رسومات: ان کے ہاں ایک سال میں دو بڑے اجتماعات ہوتے ہیں۔ اجتماع میں شریک ہونے سے پہلے یہ اپنے ہاں دن کو خوب اچھی طرح دھو لیتے ہیں تاکہ دنیا کے سفر کی گندگی کو ختم کرسکیں۔ جن لوگوں نے دوچ بولنے والے لوگ زیادہ دیکھ رکھا ہیں۔ یہ وہ جوڑے دور کی سہولیات سے فائدہ نہیں اٹھاتے جیسے بجلی وغیرہ۔

ان کے لباس بھی ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے ستر ہویں صدی کے لوگ پہنا کرتے تھے۔ 17 سے 20 سال کی عمر تک مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔ یعنی نوجوان کو مکمل طور پر اس فرقے میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ ان کی کتاب بائبل ہے۔

آساترو Asatru:

یہ بھی ایک مذہبی فرقہ ہے۔

1970ء میں اس کی بنیاد اسکنڈے نیوین ممالک اور امریکا میں ڈالی گئی۔ قدیم رومن مذاہب کے خداؤں کا تصور ان کے یہاں موجود ہے اور تقریباً اس قسم کی روایات ہیں جو روایات قدیم رومن مذاہب کی ہیں۔ ان کے یہاں جنت اور دوزخ کا تصور ہے لیکن ان خصوص میں تقسیم کردیا گیا ہے۔

جنت کے لیے یہ دلیل پاہ کی اصلاح استعمال کرتے ہیں۔ یعنی اعلیٰ ترین جنت، لیکن یہ جنت صرف ان کے لیے ہی آتی ہے جو جنگ میں مارے گئے ہوں۔

عام اور ادنیٰ لوگوں کے لیے نیفل کا لفظ ہے۔ یعنی بہت برے لوگوں کے لیے نیفل کا لفظ ہے۔ یعنی بہت برے لوگوں جگہ اور شراب اور بدکار لوگوں کے لیے ہیلی فل (یعنی دوزخ)۔

رسومات: ان کے یہاں شادیات اور مختلف اجتماعی نذرانے کے طور پر دیے جاتے ہیں۔ ان کے اپنے تہوار ہیں۔ جن میں یہ اپنی رسومات ادا کرتے ہیں اگر ان کو مذہبی رسومات کہا جائے تو۔

لادینیت Atheism:

اس نظریے کا وجود قدیم زمانے سے رہا ہے۔ خاص طور پر یونانی فلسفے میں۔ لیکن انیسویں صدی کے آغاز سے جب مگر کی روشنی پھیلی تو اس کے ساتھ ساتھ اس نظریے کو بھی تقویت ملتی چلی گئی۔

اس نظریے کو ماننے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے اور پوری دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

ان کے نظریے کے مطابق خدا اور خداؤں کا کوئی وجود نہیں ہے اور جب وہ ان باتوں پر یقین ہی نہیں رکھتے تو حیات بعد از موت اور جنت یا دوزخ کا تصور بھی ان کے یہاں نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ اسی دنیا میں ہے۔

ان کے خیال کے مطابق یہ کائنات ایک بڑے سائنسی حادثے کا نتیجہ ہے۔ اس میں کسی کے ارادے کا کوئی دخل نہیں ہے۔

اس نظریے کی کوئی خاص کتاب نہیں ہے۔ جہاں بھی ہے وہ ان کا ہے۔ اس کو ماننے والوں میں بھی لادینیت کے موضوع پر کچھ لکھا گیا بھی ہوئے ہیں۔ جیسے کارل ساگان، رچرڈ ڈاکنس اور مشہور فلسفی برٹینڈ رسل وغیرہ۔

بہائی:

یہ فرقہ ایران کے شہر جران سے 1863ء میں شروع ہوا۔

اس کی بنیاد بھی محمد باب نے ڈالی تھی اور اسے بہاءاللہ نے پھیلایا۔ اس عقیدے کے ماننے والے 50 لاکھ کے قریب ہیں۔ یہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتے ہیں جو واحد تو ہے لیکن اس نے انسان کی اصلاح کے لیے خود کو مختلف خداؤں کے روپ میں ظاہر بھی کیا ہے۔

روح غیر فانی اور بنیادی طور پر پاکیزہ ہوتی ہے۔ روح کے کثیف کرنے سے انسانی خیالات ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جسم گناہ آلود ہو جاتا ہے۔ زندگی کا مقصد روحانی طور پر خود کو اس سے اعلیٰ ترین قدرت رہنما سے۔ روح جسم سے الگ ہو کر مرکز اول (خدا) کی طرف اپنا سفر شروع کردیتی ہے اور یہ سفر اس وقت ختم ہوتا ہے جب وہ اپنے مرکز سے جا کر مل جائے۔

ان کے فرقے کے عقیدے کے مطابق انسان کو تعلیم حاصل کرنا، اپنی روح کو پاکیزہ رکھنا، عبادت کرنا، خلوص، بھروسے کا جذبہ اور نشے سے بچنا چاہیے۔

کتابیں: ان کی مذہبی اور مقدس کتابوں میں "کتاب مقدس" اور باہیڈن ورڈز شامل ہیں۔ یہ خطبات پر مشتمل بیان یا دوسرے بہائی مذہبی پیشواؤں نے لکھی ہیں۔

بون Bon:

یہ تبت کا ایک مذہب یا عقیدہ ہے۔ اس کے ماننے والوں کی تعداد دس لاکھ کے قریب ہے۔

بدھ ازم سے بڑی حد تک مماثلت ہے۔ ان کے یہاں عبادت کے طور پر عراقے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مراقبہ، روح اور جسم کی صفائی کے لیے کیا جاتا ہے۔

ان کے عقیدے کے مطابق انسان کے پیدا ہونے اور مرنے اور پھر پیدا ہونے کا یہ چکر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک وہ مکمل نجات حاصل نہ کرے۔

ان کے یہاں ستارہ شناسی کو بھی ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ فرقہ تبت تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

بدھ ازم:

سدھارتھ گوتما (بدھا) کی تعلیمات پر مشتمل جو 520 بی سی لونیٹ (نیپال کی ترائی) پر اپنے شمع بستی میں ہندوستان میں پیدا ہوئے تھے۔ تبت بڑی آبادی اس مذہب کے ماننے والوں کی ہے۔

بدھ ازم کے عقیدے کے مطابق انسان اگر اچھے عمل نہ کرے تو وہ بار بار پیدا ہوتے اور بار بار مرنے کے جال میں پھنسا رہتا ہے۔

مکمل نجات کے لیے اسے چند پاکیزہ اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ ان کے یہاں جو آواگون کا تصور ہے وہ ہندوؤں کے آواگون کے عقیدے سے مختلف ہے۔ ان کے یہاں کتاب کوئی ایسی نہیں ہے جس کو ذہبی کتاب کہا جائے لیکن مہاتما بدھ کے خطابات ضرور ہیں جو اس مذہب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

ان کے یہاں مختلف فرقے ہیں اور یہ فرقے، مراقبے اور مذہبی رسومات کے طریقے ایک دوسرے سے الگ رکھتے ہیں۔

تبت کے بدھ مت کے مقدس الفاظ پالی تہذیب کے الفاظ سے مختلف ہیں۔ عام طور پر اس مذہب کے ماننے والوں کو امن پسند سمجھا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بہت سے واقعات میں ان کے تشدد آمیز رجحانات بھی سامنے آئے ہیں۔ بحیثیت مجموعی طور پر یہ ایک بڑا مذہب ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اور اس کو ماننے والوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔

کوڈالی Coa Dai:

اس عقیدے کی بنیاد 1926ء میں پڑی۔ اس کو رائج کرنے والے کام ٹو وان چنوتھا۔ اس فرقے کی ابتدا ویت نام سے ہوئی ہے۔ اس کو ماننے والے ابھی خاصی تعداد میں ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق خدا رنیا کے نیک اور برگزیدہ لوگوں کے ذریعے اپنی جھلک دکھاتا رہتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تاؤازم، بدھ ازم، ہندو ازم، اسلام، عیسائیت اور یہودیت وغیرہ سب کے سب سیدھے راستے ہیں۔ خدا کے دلی دنیا میں آکر نیک تعلیمات کا پرچار کرتے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر سیون وغیرہ۔ ان نظریے کی تعلیمات کا نچوڑ اور مقصد یہ ہے کہ انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ہر شخص امن و سکون کی دنیا میں اس دنیا کو منتقل ہو۔

خدا کو باہر کی دنیا میں اور اپنے اندر تلاش کرتے رہو۔ دل میں ہی جانے گا۔ ان کے خیال کے مطابق نیک لوگ اس دنیا میں دوبارہ جنم لیتے ہیں اور برے لوگوں کو کسی بھیانک دنیا میں پیدا ہونے کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

ان کے یہاں نروان یا نجات حاصل کرنے کا سسٹم وہی ہے جو دوسرے مذاہب کا ہے۔ روزانہ کی عبادات میں مراقبہ کو خاص اہمیت ہے۔ ان کی مقدس کتاب

والدہ تھیں۔ (چونکہ ہم سب حضرت عیسیٰؑ کے حوالے سے سب کچھ جانتے ہیں اس لیے یہاں زیادہ تفصیل نہیں دی جارہی۔)

عیسائیت کے عقیدے یا نظریے کے مطابق مقدس حیثیت سے یسوع بطور خدا، یسوع باپ اور روح القدس۔ گناہ کے سب تینوں روپ خدا سے الگ ہوگئے۔ پھر آپ کو مصلوب کر دیا گیا۔ (ان کے نظریے کے مطابق) اور انہوں نے مصلوب ہو کر سارے ماننے والوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا۔ صلیب کی بہت زیادہ اہمیت ہے کہ اس کا نشان ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے۔

جنت اور دوزخ پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کی عبادتوں میں ہر اتوار کو چرچ جانا۔ بائبل کی تلاوت، روزہ وغیرہ ہیں۔ ان کی مذہبی اور مقدس کتاب بائبل (انجیل) ہے۔

شیوخان کا چرچ:

30 اپریل 1966ء میں آسٹین لادیل نے امریکا کے شہر سان فرانسسکو سے اس عقیدے کی ابتدا کی۔ یہ فرقہ نذر خدا پر اور نذر کی شیطان پر عقیدہ رکھتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شیطان کی بھی ایک کائنات ہے۔ بلکہ وہ صرف ایک انسانی تخلیق ہے اور جس طرح خیر نے لاکھوں کروڑوں برگزیدوں اور مخلوق کو پیدا کیا ہے اسی طرح انسان بھی وجود میں آگیا۔ یہ ایک فرد ہے جو اپنی ترقی یا تنزلی کا ذمہ خود قبول کرتا ہے۔ ان کے خیر کا دروازہ ہر ایک کے لیے کھلا ہوا ہے۔ جانوروں کا مارنا غلط ہے۔ سوائے ایسے جانور کے جو کاٹنے یا شدید بھوک کی صورت میں۔ ان پر مہربانی کرو جو اس قابل ہوں اور ان لوگوں پر مہربان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

پال کی کتاب ڈیان بائبل ہے۔

کنفیوشس ازم:

یہ عقیدہ چین کے کنفیوشس کی تعلیمات اور ان کے نظریات پر قائم ہے۔

کنفیوشس یا خونجیس صدی ق م میں تھے۔ سات کروڑ کے قریب لوگ آج بھی اس ازم کے پیروکار ہیں۔

کنفیوشس نے خدا کا کوئی واضح تصور نہیں دیا ہے لیکن اس نے زندگی کو سلیقے سے گزارنے کا درس ضرور دیا ہے۔

اس مفکر کو ہم مذہبی رہنما کی بجائے ایک عظیم اخلاقی رہنما کہہ سکتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد معاشرے کے لیے مفید ثابت ہونا ہے اور وہ صفر اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ خوشامدی، متملق اور دوسروں کا ہمدرد و غم گسار اور

بھوکا بھی کیا چیز ہے۔ یہ کچھ نہیں دیکھتی، نہ اچھا تولہ پایا۔ اب اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ جب دو منہ والے سانپ پیدا ہوتے ہیں تو خوراک کے لیے ایک دوسرے کو کھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

آپ دن بھر میں کتنا پیدل چل لیتے ہیں۔ میں ان کی بات نہیں کر رہا جو باقاعدہ واک کرتے ہیں بلکہ ان کی بات ہو رہی ہے جو ہام طور پر پیدل چلتے ہیں۔ مگر سے بازار تک چلے گئے۔ بچوں کو لینے اسکول چلے گئے یا اس طرح کی کوئی اور سرگرمی۔ ایک اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک عام آدمی اپنی پوری زندگی میں اتنی واک ضرور کرتا ہے کہ پوری دنیا کے گرد تین بار چکر لگائے۔

مرسلہ۔ نوی۔ کراچی

میرباں ہو۔ اس کو اپنے گھر اپنے دوستوں اور اپنے معاشرے کی پرواہ ہے۔ کنفیوشس کے کہنے کا قول آج بھی ویسا ہی ہرا ہے جانے ہیں۔

ذی ازم:

یہ انصار میں مدی کی ایک تلمیذ تحریک یا نظریہ ہے جو بعد میں باقاعدہ عقیدے یا فرقے کی صورت اختیار کر گئی۔

مشہور فلاسفر کانٹ نے اس نظریے کو پرکھنے کی کوشش کی تھا۔ اس کے پیروکاروں میں ڈاکٹر، پائلٹ، جنجرس اور دوسرے فلاسفر بھی شامل ہوتے گئے۔

اس کے مطابق ہم میں کوئی شک نہیں کہ کائنات کا خالق ایک خدا ہے لیکن اب اس خدا کو کائنات سے دلچسپی نہیں رہی۔ دنیوی ہلچل کی بنیاد ہے۔

ان کے یہاں کوئی مخصوص عبادتی نہیں ہیں اور نہ ہی کوئی مخصوص کتاب ہے۔ البتہ تھامس پائن کی کتاب The age of reason اس عقیدے کو سمجھنے کے لیے ہو سکتی ہے۔

ایک بانکر Eckankar:

اس کی بنیاد 1965ء میں لاس ویگاس میں رکھی گئی تھی۔

اس فرقے کی بنیاد رکھنے والا جان پال لچ ویل تھا۔ مرکزی روحانیا سکر نڈوالی Eckankar کا نام رکھا گیا۔

ہم میں سے ہر ایک، ایک ایسی روح ہے جس کے وجود میں خدا کی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ جسے روحانی تجربات کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

روح کو انسانی بے اور اپنی نجات کے لیے سفر کرنی رہتی ہے۔ اس کا یہ سفر مختلف جسموں میں بھی نجات کی صورت میں ہو سکتا ہے اور اگر کسی کے اعمال اچھے ہیں تو اس کا پہلا قدم ہی اس کی نجات کے لیے کافی ہے۔ ان کی عبادات میں Eck کی خفیہ عبادات (جس کے بارے میں بیرونی دانوں کو بہت کم معلوم ہے) سراقبہ اور خواب دیکھنے میں (پتہ نہیں کس طرح ہوتا ہو گا اس کے بارے میں نہیں معلوم)۔ بارہویں کی لکھی ہوئی مذہبی کتابیں ان کے لیے مقدس کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں۔

ایپی کیورین ازم Epicureanism:

بہت لمبا چوڑا نام ہے لیکن اس نام کی اصل یہ ہے کہ اس فرقے کی بنیاد ایپی کیورس نے یونان میں نے 300 ق ق میں رکھی تھی (یعنی بہت قدیم ہے)۔

خدا کا تصور ان کے یہاں مختلف ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ خدا کا وجود ہے لیکن وہ انسانوں کے معاملات میں دلچسپی نہیں لیتا۔

ان کا خیال ہے کہ ہر وہ شی اصل ہے اور یہ چیز ایٹم (مادے) سے بنا ہے۔ خدا اور روح بھی مادے کی بنیاد اور ہے۔

جنت و دوزخ کا کوئی تصور ان کے یہاں نہیں ہے۔ یہ حیات بعد از موت پر یقین نہیں رکھتے، کہتے ہیں کہ موت کے بعد انسانی جسم اور روح دونوں فنا ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی اس مختصر زندگی میں زیادہ سے زیادہ خوشیاں حاصل کرے اور دکھوں سے بچے۔

ایپی کیورس کے خطوط کا مجموعہ ان کی مذہبی کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔

فالون گنگ Falun gang:

چین میں اس فرقے کی بنیاد 1992ء میں لی یونگ زمانے میں ڈالی گئی۔ ان کے یہاں دس لاکھ کے قریب خداؤں کا تصور ہے۔

خداؤں کے علاوہ یہ ان گنت روحانی قوتوں پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ ماورائی مخلوق، ان کا کہنا ہے کہ توانائی ایک پیسے کی طرح ہے جو پھیلتی رہتی ہے اور انسانی جسم میں توانائی کا مرکز ناف ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ وہ ریاضتوں کے

ذریعے ماورا ہو جائے اور یہ متصدان کی عبادات سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ان کے یہاں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پانچ درجے (یا عبادتیں) انسان کی سب سے بڑی کمزوری اس کی تجاذل ہے۔

اس کو پرظلموں اور پرتپیں ہونا چاہیے۔ جتنی دو جو ریاضتیں کر رہا ہے اس کا ضرور فائدہ ہو گا۔

گوشت کھانا ان کے یہاں گناہ سے منع ہے ان کی کتاب ہاسٹرل نے لکھا ہے۔ یہ اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔

نوسٹی سزم Gnosticism:

یہ بھی بہت قدیم فرقہ ہے۔

اس کی بنیاد دوسری یا تیسری صدی میں یونان میں ڈالی گئی۔ اس کے بہت سے رجحانات۔ دراصل یہ فرقہ اس وقت وجود میں آیا جب یونان میں دیوی دیوتاؤں کے نظریات تھے۔ یہ بیزاری اور ناپسندیدگی کرتے تھے۔

یہ فرقہ ان لوگوں کی وجہ سے آیا تھا اور اس نے آتے ہی خدا کے بارے میں کہہ دیا کہ خدا ایک عظیم طاقت تو ہے لیکن انسان کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ جب کہ ان گنت شیطانی طاقتیں اور ان کے آقا کو ہر زمانے میں سامنے ہیں (جو مل کر ہے ان گنت دیویوں دیوتاؤں کے بارے میں کہا گیا ہو)۔

انسان کا نات کے راز معلوم کر کے روحانی دنیا میں جا کر اصل مقام حاصل کر سکتا ہے۔

ان کی عبادتوں میں مراقبہ اور وجدان گیان ہے اور کچھ ایسی ورزشیں ہیں جن کے ذریعہ کائنات کی خفیہ طاقتوں کو جانچا جاتا ہے۔

مذاہب کے تعارف کا یہ پہلا حصہ تھا۔ اب اور کچھ باقی ہے۔ اس چھوٹی سی تحریر سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ انسان اور مذہب کا کتنا گہرا رشتہ ہے۔ اس نے ہر دور میں خود کو کسی نہ کسی مذہب سے منسلک کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ وہ جعلی اور مصنوعی مذاہب ہوں لیکن اس کی بے چین طبیعت کسی بھی دور میں خاموش ہو کر نہیں بیٹھی۔

اس نے خدا کے وجود کو پا تو دیا کہ یا تسلیم کیا ہے (کسی بھی شکل میں سہی) یہ ایک الجھا معاملہ ہے۔ کہ نہ جانے ہم جس ماحول میں رہ رہے ہیں وہاں کتنے خفیہ مذاہب ہوں۔

رسم شادی

ثناء ثاقب

جیون ساتھی کے انتخاب کی رسم کا نام شادی ہے جو شاہراہ زیست کو اپنے انداز سے تسخیر کرنے کے لیے ضروری ہے۔ نسل کو مہمیز کرنے کی خاطر بہت اہم ہے۔ یہ رسم دنیا کے مختلف حصوں میں الگ الگ انداز میں ادا کی جاتی ہے جو دلچسپ بھی ہے اور عجیب بھی۔ معلومات کے خزینے کو وسیع کرنے کے لیے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

مختلف علاقوں میں ہونے والی رسم عروسی کا بیان

شادی ایک مبارک مقدس اور خوب صورت فریضہ ہے۔ دو دل ایک ہو جاتے ہیں۔ زندگی بھر کا بندھن ہو جاتا ہے۔ لڑکیاں اپنے اپنے ساجنوں کے سپنے اپنی آنکھوں میں بسائے رکھتی ہیں۔ شادی کے بعد زندگی ایک نئے انداز سے سفر کرنے لگتی ہے۔ بابل کا آنگن چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ لڑکوں کے لیے جدوجہد کے نئے راستے سامنے آجاتے ہیں۔ کیسی کیسی صعوبتیں اور تمنائیں اس لفظ سے وابستہ ہوتی ہیں۔ اسلام اور دنیا کے ہر

مذہب میں شادی کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ مگر اس مقدس فریضہ کو انجام دینے کے لیے کیسے کیسے طریقے کار، کیسی کیسی رسومات رائج ہیں۔ آیئے ہم آپ کو دنیا کی چند دل چسپ رسومات کے بارے میں بتاتے ہیں۔

یہ رسومات بھی اور تہذیب کی علامت ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں ہندوؤں پہلے سے اعمال بننے شروع ہو جاتے ہیں اس سلسلے میں ایک قدغن نہیں

ملتے دونوں روز کسی ایک مقام پر
پھر جانے کیوں بدل گیے ملنے کے راستے
ڈھولک بھی پڑھیں میں تو سمجھ یہ کھلا
لڑکی پرائی لڑکے کے والدین
یعنی ڈھولک بجانا گویا اس بات کا اعلان کیا جاتا ہے کہ اس گھر میں رہنے والا کوئی لڑکا یا لڑکی شادی کی مضبوط رشتے سے منسلک ہونے جا رہی ہے۔

بات رسومات کی ہے۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ کیسی کیسی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔

لڑکی کے لیے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر وہ ننھے کی بیٹر ہے یا اس میں توبہ برداشت کی گئی ہے تو ایسی صورت میں شوہر کے گھر جا کر اس کو پریشانیاں اٹھانا پڑیں گی۔ اس لیے کہ ماں باپ تو تحمل سے برداشت کر لیتے ہیں چنانچہ سسرال والے برداشت کریں یا نہ کریں۔

اس لیے امکانات لینڈ کی دلہنوں کے چہرے سیاہ کر دیے جاتے ہیں۔ ان پر لفاظت جھگی جاتی ہے۔ اس کو اس حد تک پریشان کیا جاتا ہے کہ وہ دوستی لگتی ہیں لیکن یہ سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔

انہیں ضرب یا نار لگتی کا اظہار نہیں کرنا پڑتا۔ وہ تہیہ کیا جاتا ہے کہ لڑکی نے کی تیز اور زبان دراز ہے۔

جس وقت اس سے چاری کے ساتھ یہ برا سلوک ہو رہا ہوتا ہے۔ اس وقت شاید ہونے والی سسرال کے لوگ بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی ہوا اسکرمانی ہوتی ہے۔

دلہن کی رخصتی سے پہلے رونے کا رواج بہت سے علاقوں میں ہے۔ یہ رونا رخصتی کے وقت کچھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن سب سے انوکھا مظاہرہ چین کے Tujia لوگوں کے یہاں دیکھنے میں آتا ہے۔

ان کے یہاں ایک مہینا پہلے سے رونا دھونا شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے دلہن روتی ہے۔ دلہن کے رونے کے بعد بھائیوں اور بہنوں کے رونے کی باری آتی ہے۔

ان کے بعد گھر کے بڑے بوڑھے روتے ہیں۔

اور اصل میں یہ رونا واقعی کوئی رونا نہیں ہے بلکہ صدیوں پرانا ایک ریت ہے۔ اس کیت کو اس انداز سے گایا جاتا ہے جیسے سب رو رہے ہوں اور جو لوگ زبان سے واقف نہیں ہیں وہ یہی سمجھتے ہیں کہ سب لوگ رو رہے ہیں۔

سنگولیا کے ایک قبیلے "داورا" کی ایک عجیب رسم ہے۔ اس رسم کو دل چسپ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ رواج ضرور کہہ سکتے ہیں۔

شادی ہونے سے پہلے لڑکا اور لڑکی کے ساتھ مرچوں کے ننھے ننھے جوڑے رکھ دیے جاتے ہیں اور ایک ہزار جانوروں کی قربانی ان خصوصی جوڑوں پر ہوتی ہے۔ دونوں مل کر ایک جوڑے کو ذبح کرتے ہیں اس کی چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ اس عمل کے دوران میں خاندان کے بزرگ بھی موجود ہوتے ہیں۔ پھر اس جوڑے کے جگر کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ لوگوں کے جگر میں کسی بھی قسم کا نقص ہو تو پھر دوسرا جوڑہ ذبح کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے۔ جب تک عمل بہت عمدہ نظر سامنے نہ آ جائے۔

ائنی سیدھی رسومات کے حوالے سے ہندوستان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ بلکہ یہاں کی رسومات شادی خاص دنیا کی رسومات سے زیادہ ہی ہوتی ہیں۔

پنڈت حضرات شادی کا دن اچھا دیکھتے ہیں۔ مہورت نکالتے ہیں۔ اگر یہ شہر ہو جائے کہ شادی کے بعد ستاروں کے منفی اثرات ہوں گے تو پھر کسی درخت کو قربانی کا بکرا بنا دیا جاتا ہے۔ دلہا صحت کو گزر کی شادی پہلے اس درخت سے کر دی جاتی ہے۔ یا قاعدہ شادی کی رسومات ہوتی ہیں، دعوت ہوتی ہے۔

اس کے بعد پھر اصل شادی لڑکے سے ہوتی ہے۔

اس دوران میں ان کے خیال کے مطابق منحس اثرات دور ہو چکے ہوتے ہیں۔

پھر اس درخت کو کاٹ کر اس کی لکڑیاں جلا دی جاتی ہیں۔ یہ چار روز رخصت۔

قوت برداشت کا اندازہ لگانے کے لیے ہر ویڈیو میں ایک حیرت انگیز رسم ہے۔ خود اندازہ کریں کہ یہ چار سے دولہا پر کیا گزرتی ہوگی۔

شادی کے تین دنوں تک انہیں واش روم جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ چاہے بھگ بھی ہو جائے۔

ہنی ایک بہت خوب صورت جزیرہ ہے اور دنیا کے ہر

آج کل کھوڑ میں کالبٹ وغیرہ بھروی جاتی ہے۔

تو ہم پوری دنیا کے ہر ملک میں ہے۔ خاص طور پر شادی کے وقت نیک شگون کے لیے اور نظر بد سے بچانے کے لیے دولہا دلہن کو نمک کرنے کے لیے کہا جاتا ہے اور اس میں اہتمام یہ ہوتا ہے کہ دولہا کے پاؤں کسی صورت فرش سے اٹھنے نہ پائیں۔ دوسرے برادر شگون سمجھا جاتا ہے۔

نمکین کا گرتہ

یہ رسم آرٹیفیشل ہی ہے۔ شادی کے موقع پر نوجوان لڑکے نکلوں سے سجے ہوئے لمبا چین کر دلہن کے گھر جاتے ہیں اور دلہن کو ان کے ساتھ رخصت کرنا پڑتا ہے۔

تیرا تماری

یہ بھی ایک رسم ہے۔ اس کو تعلق بھین کے جوگر کہتے ہے۔ اس میں یہ جاری دلہن کو چوت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شادی کے فوراً بعد دلہن کو گھر فاصلے پر کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور دولہا تیروں سے اس کا نشانہ لیتا ہے۔ تین تیر مارے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ تیروں کی نوک کبھی جگہ پر نہیں لگائی جاتا ہے لیکن چوٹ تو ہو جاتی ہے۔ جیسے روکی گولی ماردی گئی ہو۔

آپ ایسی رسموں کو کیا کہیں گے۔

ہمارے یہاں بھی معاملہ کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔

ایک رسم ہے جو ہندوستان اور پاکستان دونوں میں ہے۔

اس رسم سے ہم سب ہی واقف ہیں اور وہ ہے جوتے چھپائی کی رسم۔ ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی جاری دولہا کے جوتے چرا کر چھپا دیے جاتے ہیں، اب وہ بیچارے پاؤں تو شادی میں شریک ہونے سے رہا۔ اس لیے وہ جوتوں کی واپسی کا تقاضا کرتا ہے اور جوتوں کی واپسی کے عوض اسے انیکی خاصی رقم دینی پڑ جاتی ہے۔

جو جوتے چرانے یا چھپانے والوں میں برابر برابر تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اب ذرا سوچیے کہ دولہا ہو تو وہ پیسے دینے کے لیے جیب پاؤں ہی محفوظ رہے۔

فرانس کی ایک رسم ملاحظہ فرمائیں۔ یہ وہ رسم ہے جس کا جواب نہیں ہے۔

شادی کی رسومات ختم ہو جانے کے بعد دولہا کے رشتے دار یہ طے کر لیتے ہیں کہ دولہا اور دلہن کو ایک کمرے میں بند کر دیا جائے گا۔ کمرے میں ایک بستر ہوگا۔ اس بستر پر ایک طرف دولہا اور دوسری طرف دلہن کو بٹھا دیا جاتا ہے۔ دونوں کے درمیان میں ایک بوتل رکھ دی جاتی ہے۔ اس بوتل میں شراب ہوتی ہے۔ دونوں کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے جاتے ہیں۔ اب دونوں کو اس شراب کو پینا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کمرے سے باہر آ سکتے ہیں۔

اس میں قباحت یہ ہے کہ دولہا یا دلہن میں سے اگر کوئی بہت زیادہ لمبا قد لے چارے لینے والے یا لینے والی کا کچھ حرج نکل جاتا ہوگا لیکن کیا کریں رسم تو رسم ہی ہے۔

بہت سے علاقوں میں برے شگون سے بچنے کے لیے ارواحوں کو دھوکا دینے کے لیے اصل شادی سے پہلے جانوروں سے شادی کا ناٹک رچایا جاتا ہے (ہندوستان سمیت)۔

کیا عجیب طریقہ ہے۔ خوشی تو دولہا دلہن کی ہوتی ہے اور ساری قسمیں جانوروں کے حصے میں آجاتی ہیں جنہیں خوشی خوشی ذبح ہونا پڑتا ہے۔

ایک بہت دل چسپ اور افسوسناک رسم کا ذکر میں ہوتی ہے۔

دولہا دلہن کی قوتِ برداشت اور سنجیدگی آزمانے کے لیے کوئی کامیڈین کو بلایا جاتا ہے۔ وہ لطیفے سناتا ہے۔ انہی سیدھی فرمائش کرتا ہے۔ پوری محفل ہنس رہی ہوتی ہے لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ دولہا اور دلہن کو مسکرانے تک کی اجازت نہیں دی جاتی۔

اگر وہ کسی بات پر مسکرا بھی دیں تو ان پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔۔۔ یہ دل چسپ۔

افوہ! کر تا بہت بڑا جرم ہے اور خاص طور پر لڑکیوں کا افوہ۔ اس بھیانک جرم پر لڑکی کے لئے سزا میں دی جاتی ہیں لیکن روایت میں ایسا کہیں نہیں ہوتا۔

افوہ کرنے والے کو انعام کے طور پر دوسری لڑکی دلہن بنا کر دے دی جاتی ہے۔ جی ہاں یہ رواج کا دستور ہے کہ اگر شادی کرنی ہے تو دلہن کو بار بار افوہ کرنے کا ہنر ہوگا۔

یہ رسم شادی سے دو ایک روز پہلے ادا کی جاتی ہے۔

دولہا اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر باقاعدہ پلاننگ کرتا ہے اور لڑکی کو افوہ کرا لیتا ہے۔

اس کے بعد شادی کی رسومات کی ابتدا ہوتی ہے۔

اسی قسم کی رسم ہندو میں بھی رائج تھی۔ جس کی مثال پرتھوی راج چوہان اور سنجوگتا کی شادی ہے۔ ناظرین یہ کیا ہے۔ ایسے کیا کیسے۔

اب فرانس کی ایک رسم کے بارے میں سن لیں۔

یہ رسم دولہا دلہن کو ننگ کرنے کی رسم ہے۔ ان بے چاروں کو برہنہ کرنے کا مشن سونپ دیتے ہیں۔

خلط ملط روی کے باہر زبردست قسم کا شور برپا کیا جاتا ہے۔ ڈرم، گٹار، تواہ برتن جو بھی ہاتھ میں ہو اسے زور زور سے بجایا جاتا ہے۔ آخر کار تنگ آ کر دولہا کمرے سے باہر آتا ہے اور گھوڑے لا کر یہ سلسلہ ختم کیا جاتا ہے۔

(اسی قسم کی ایک رسم ہمارے یہاں بھی ہے۔ کو کر دراصل مختلف ہے کہ لڑکے کی بھابی یا بہنوئی گیٹ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے کچھ رقم دے کر رخصت کیا جاتا ہے)۔

کوریا میں شادی کی رسومات کے خاتمے کے بعد دولہا کو ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے مخنوں کو باندھ کر اس پر مولی مچھلیاں سے مشابہ مارنے لگاتے ہیں۔ دھڑا دھڑ اس کے پیر چارے کی مار برداشت کرنا پڑتی ہے۔

یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ آئندہ زندگی کی سختیاں برداشت کر سکے۔

بھارت کے صوبہ مہاراشٹر میں شادی مندروں میں کی جاتی ہے۔ منتر جاپ کے پہلے لڑکی پنڈت کے بائیں جانب بیٹھتی ہے۔ منتر پورا ہوتے ہی لڑکی پنڈت کے داہنے اور لڑکا بائیں جانب بیٹھ جاتا ہے۔ پنڈت لڑکی سے پوچھتا ہے۔ "کی پاہی ہے؟" (کیا چاہیے) لڑکی گھریلو اشیا کا نام بتاتی جاتی ہے۔ مہمان وہ اشیا فراہم کرتے جاتے ہیں۔

بمبئی کولہاپور کی رسم ہے کہ دلہن کو پہلی صبح اٹھنے کے بعد آس پڑوس کے گھروں کے چکر لگانے ہوتے ہیں۔ بمبئی کے گھر اتنوں میں رسم ہے کہ دلہن کو رخصت کرا کر گھر لانے کے بعد اسے ایک بلوس کی شکل میں گلی گلیوں میں گھمایا جاتا ہے۔ آگے آگے دولہے کی بھابی یا بڑی بہن ایک چٹنی کے پلیٹ میں دیپ جلا کر چلتی ہے۔ دلہن کے ساتھ تو ار کو بلند کیے، دولہا چلتا ہے اور پیچھے پیچھے عورتیں گیت گاتی چلتی ہیں۔ دولہا کا باپ ایک رجسٹر کھولے ساتھ ہوتا ہے..... ہر گھر کے سامنے رک کر دولہے کا باپ رقم دیتا ہے اور رجسٹر دیکھ کر کہتا ہے۔

"آپ کے ہاں کی شادی میں ہم نے دو سو روپے دیے تھے۔ آپ چار سو دلیں گے یں۔" کھلے بھرے وصولی کر کے یہ جلوس گھر لوٹتا ہے۔ بگل کے ڈھاکا کے مسلمانوں میں رسم ہے کہ دولہا راستے میں ملنے والے ہر شخص کو بلند آواز میں سلام کرے گا۔

مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے تو یہ دنیا بے کیف ہونے کے باوجود بہت دل چسپ بھی ہے۔ اور اس قسم کی رسومات نے اسے اور بھی دل چسپ بنا دیا ہے۔

قدیم مگر تہذیب

طارق عزیز خان

اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ دنیا کی قدیم ترین تہذیب نے ہمارے خطۂ ارض پر جنم لیا، یہیں پھلی پھولی اور دنیا کو مذہب بنانے کے اصول کی ترسیل کا باعث بنی۔ اس کا ثبوت ہڑپہ مرئن جو دڑو کے کھنڈرات ہیں جہاں سائنسی بنیادوں پر زندگی گزارنے کے طریقے ہزارہا سال قبل بھی رائج تھے۔

دنیا سے مٹ گئی تہذیب پر ایک مختصر مگر جامع تحریر

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مطابق دنیا میں پانچ ہزار سال پہلے تین نمایاں تہذیبوں کا تعلم ہوا۔ ان ایک دریائے نیل کے کنارے واقع قدیم مصری تہذیب (3300 سے 30 قبل از مسیح)، دوسری دریائے دجلہ و فرات کے کنارے میسو پوٹیمیا (Mesopotamia) (7000 سے 600 قبل از مسیح) اور تیسری برصغیر پاک و ہند میں دریائے سندھ اور اس کے معاون دریاؤں کے کناروں پر وادیٔ سندھ کی تہذیب (3300 سے 1700 قبل از مسیح) تھی۔ وادیٔ سندھ کی

تہذیب کشمیر میں کوہ ہمالیہ سے لے کر بحیرہ عرب کے ساحلوں تک اپنی ہمعصر تہذیبوں کے مقابلے میں دگنے یعنی لگ بھگ چار لاکھ مربع کلومیٹر علاقے میں پھیلی ہوئی تھی۔ آج تک اس تہذیب کے پاکستان اور بھارت میں چار سو سے زائد آثار دریافت ہوچکے ہیں۔ جن میں موہن جوداڑو (Mohenjo-Daro) اور ہڑپہ (Harappa) نمایاں ہیں۔ وادیٔ سندھ کے آثارِ قدیمہ سے متعلق پہلی معلومات 19 ویں صدی کے آخر میں منظر عام پر آئیں جبکہ 20 ویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی میں موہن جوداڑو اور ہڑپہ کے آثار کو باقاعدہ دریافت کیا گیا۔ ابتداء میں ماہرین کا خیال تھا کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کی بنیاد 1500 قبل مسیح میں مغربی ایشیا سے آئے آریاؤں نے ڈالی تھی لیکن 1950ء میں سندھ کے مقام کوٹ ڈیجی میں ہوئی کھدائی نے یہ خیال غلط ثابت کردیا۔ اس کھدائی کے دوران نئی چیزیں سامنے آئیں جنھوں نے پرانے تصورات کو تبدیل کردیا۔ کوٹ ڈیجی میں ہڑپہ سے بھی 800 سال پرانی تہذیب کے آثار ملے جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ آریاؤں کے آنے سے پہلے وادیٔ سندھ، تہذیب و تمدن کا گہوارا بن چکا تھا اور اس تہذیب کے سرچشمے اسی سرزمین سے پھوٹے تھے اور یہ مقامی سماج کے ارتقا کا نتیجہ تھی۔ جبکہ بیرونی اثرات کم اور ثانوی اہمیت کے حامل تھے۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے باسی پکی اینٹوں سے مکان بناتے تھے۔ ان کے پاس بیل گاڑیاں تھیں۔ وہ چرخے اور کھڈی سے کپڑا بننا جانتے تھے۔ سوتی کپڑا انھی لوگوں نے پہلے پہل تیار کیا۔ وہ کپڑا بننے کے اس فن کو ”کاتنا“ کہتے تھے جس سے انگریزی لفظ ”کاٹن“ بنا ہے۔ شکر اور شطرنج دنیا کے لیے وادیٔ سندھ کے انمول تحفے ہیں۔ شطرنج کا کھیل پہلے پہل اسی تہذیب میں کھیلا گیا جو 600 عیسوی میں برصغیر کی بدولت دنیا میں متعارف ہوا۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے علاوہ شمالی پاکستان میں دریائے سواں کے کنارے گندھارا تہذیب کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم پاکستان میں واقع تین نمایاں آثارِ قدیمہ اور ان کی باقاعدہ دریافت کا احوال پیش کرتے ہیں۔

پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کے 20 کلومیٹر مغرب میں گندھارا تہذیب کے مرکز ٹیکسلا کے آثارِ قدیمہ واقع ہیں۔ یہ شہر 600 قبل از مسیح سے آٹھویں صدی عیسوی تک موجود رہا۔ 326 قبل از مسیح میں مقدونیہ (یونان) کے حکمران سکندرِ اعظم نے ٹیکسلا کو فتح کیا۔ اس نے شہر میں قیام کے دوران ہندو راجا پورس سے لڑنے کی منصوبہ بندی کی۔ 190 ق م میں سکندر کے جانشینوں نے شمالی پنجاب کو فتح کرنے کے لیے ٹیکسلا کو اپنا بیس کیمپ بنایا۔ ہندوستان کی ماوریان سلطنت (Maurayan Empire) کے تیسرے بادشاہ مہاراجا اشوک اعظم (269-232 ق م) کے دور میں ٹیکسلا شہر بدھ مت کی تعلیم کا اہم مرکز تھا۔ ساتویں صدی عیسوی کے دوران چینی سیاح ہیونگ سانگ نے شہر کی سیاحت کی اور اپنے سفرنامے میں شہر کی شان و شوکت کا ذکر کیا۔ آج ٹیکسلا میں واقع عجائب گھر میں رکھے گندھارا آرٹ کے نمونے، ہزاروں سکے اور دیگر نوادرات سیاحوں کی کشش کا باعث ہیں۔

موہن جوداڑو کے آثارِ قدیمہ پاکستان کے صوبہ سندھ میں لاڑکانہ شہر سے 20 کلومیٹر اور سکھر سے 80 کلومیٹر جنوب مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہیں۔ ماہرین آثارِ قدیمہ کے مطابق موہن جوداڑو کا شہر 2600 سے 1500 قبل از مسیح کے دوران موجود تھا۔ اندازہ ہے کہ یہ شہر دریائے سندھ کے رخ میں تبدیلی، بیرونی حملہ یا پھر زلزلے کی وجہ سے ویران ہوا۔ موہن جوداڑو، سندھی زبان کا لفظ ہے جس کا مطلب ”مردوں کا ٹیلہ“ ہے۔ ماہرین کے مطابق اپنے دورِ عروج پر موہن جوداڑو کے شہر میں 35 ہزار کے لگ بھگ لوگ آباد تھے۔ جو کہ اندازے کے مطابق یہ دراوڑ نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ لوگ تین ہزار سال قبل مسیح یا اس سے کچھ پہلے مغربی ایشیا سے ہجرت کرکے یہاں آباد ہوئے تھے۔ شہر کے زوال کے ساتھ یہ نسل معدوم نہیں ہوئی بلکہ بار بار سیلاب کی تباہ کاریوں نے انھیں مجبور کردیا کہ وہ جنوب مشرق کی طرف ہجرت کرجائیں۔ شہر کے کھنڈرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر بڑی ترتیب سے بنا ہوا تھا۔ اس کی گلیاں سیدھی اور کھلی تھیں اور پانی کی نکاسی کا مناسب انتظام موجود تھا۔ اپنی تعمیر کے بعد سے یہ شہر سیلاب کی وجہ سے سات مرتبہ اجڑا اور پھر دوبارہ بسایا گیا۔ یہ شہر دریائے سندھ کے اندر ایک جزیرہ نما جگہ پر آباد تھا جس کے دو اطراف میں دریا جبکہ ایک طرف دریا سے نکلنے والا نالا نارا بہتا تھا۔ جبکہ چوتھی طرف خشکی تھی۔ شہر کی حفاظت کے لیے دو کلومیٹر لمبا ایک بند بھی تعمیر کیا گیا تھا تاہم سیلاب کے دنوں میں اس بند میں بار بار شگاف پڑجاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موہن جوداڑو کی تہذیب میں بار بار سیلاب کی تباہ کاریوں کے آثار ملتے ہیں۔

موہن جوداڑو کا عمومی پلان ہڑپہ جیسا ہی تھا۔ شہر کے مغرب میں ایک بلند ٹیلے پر قلعہ ہے۔ جس کے گرد گلیاں ایک جال کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ قلعے کی بیرونی دیواروں اور گلیوں کے درمیان ایک چوڑی خالی جگہ موجود ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ قلعے کو محفوظ بنانے کے لیے اس کے چاروں طرف پانی چھوڑا جاتا تھا۔ تہذیب کے عروج کے دنوں میں دریائے سندھ کی ایک ذیلی شاخ قلعے سے محض تین کلومیٹر کے فاصلے پر بہتی تھی۔ شہر کی گلیوں کی ترتیب، مکانات اور اناج گھر سب ہڑپہ جیسا ہی ہے۔ البتہ یہاں کی سب سے نمایاں منفرد عمارت ایک بڑا ”اشنان گھر“ ہے۔ بڑا غسل خانہ بڑی باؤلی یا عظیم حمام۔ تمام عمارت کے بیچوں بیچ پانی کا ایک بڑا تالاب بھی ہے۔ جس کی لمبائی قریب 39 فٹ چوڑائی 23 فٹ جبکہ گہرائی 8 فٹ ہے۔ تالاب کے اندر رسائی کے لیے دو متوازی کناروں پر سیڑھیاں اندر کی طرف اترتی ہیں۔ موہن جوداڑو... کی شہری گلیاں پکی تھیں تاہم ان کے نیچے زمین دوز پکی نالیاں بنائی گئی تھیں جبکہ مناسب مقامات پر پکے مین ہول بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ موہن جوداڑو... میں کُل نو رہائشی پرتیں دریافت کی گئیں جن میں کئی جگہ سیلاب کی تباہ کاریوں کے آثار ملتے ہیں۔ موہن جوداڑو... کے لوگ زراعت پیشہ تھے۔ وہاں کی زمین میں تل، مٹر اور کپاس کی کاشت کے ثبوت دریافت ہوئے ہیں۔ وہاں دھاگے کا بنا کپڑے کا ایک ٹکڑا بھی ملا ہے جس پر موجود گہرا سرخ رنگ آج کے زمانے کی سندھی اجرک کے مخصوص رنگوں سے میل کھاتا ہے۔ شہر کے باسی زرعی اجناس کے علاوہ جانوروں کی تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ کھنڈرات سے ملی ہڈیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہاں کوہان والا بیل، بھیڑ بکری اور خنزیر پالے جاتے تھے۔ جبکہ بعد ازاں گھوڑے اور گدھے کے پالے جانے کے آثار بھی ملتے ہیں۔ موہن جوداڑو تہذیب کا مذہب توہم پرستی تھا۔ مقامی لوگ مظاہرِ فطرت یعنی سورج چاند کے علاوہ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ جبکہ مذہبی پیشواؤں کو بھی مقدس درجہ دیا جاتا تھا۔ شہر کی کھدائی کے دوران بارہ سو کے قریب مہریں بھی دریافت ہوئی ہیں۔ یہ مہریں عمدہ دستکاری کے شاندار نمونے ہیں جن پر پالتو جانوروں کی حقیقی تصاویر کھدی ہوئی ہیں۔ یہاں سے ملی بیشتر مہروں کی حیثیت دستخطی ہے جنھیں سرکاری عہدے دار اپنی انفرادی کے اظہار کے لیے استعمال کرتے تھے۔ وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیبوں کا ایک سربستہ راز وہاں کا عجیب و غریب رسم الخط ہے۔ ماہرین آثارِ قدیمہ نے اسے پڑھنے کی کوششیں کی ہیں لیکن انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی ہے۔

پوری تہذیب کی تباہی کسی بڑے بیرونی حملے یا عظیم

انفراریڈ (شعاعیں)

شعاعوں کی ایک خاص قسم جن کا طول موج بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اسے غیر مرئی روشنی بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہ انسانی آنکھ ان شعاعوں کو نہیں دیکھ سکتی۔ ان سے حرارت خارج ہوتی ہے اور ان کی موجودگی کا اندازہ حرارت ناپنے والے آلات یا فوٹو گرافی کی حساس پلیٹوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں سالموں (Molecules) کی ترتیب اور ساخت کا پتا چلانے، انسانی آنکھ کی رسائی سے دور کے فاصلوں سے تصاویر لینے اور مختلف امراض کے علاج کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔

مرسلہ: نعمان اصغر۔ جہلم

الیگزینڈر بانومگارٹین

کانٹ کے عہد سے پہلے کا جرمن فلسفی جس نے پہلی بار فلسفے کی اس شاخ کو جو حسن اور فن سے تعلق رکھتی ہے جمالیات کا نام دیا۔ اس کی ایک کتاب ”جمالیات“ (ایستھیٹکا) کافی مشہور ہوئی۔ اس میں اس نے حسن کے مسئلے کا تجزیہ کیا ہے جو اس کے نزدیک کلیت اور جامعیت کی شناخت کا دوسرا نام ہے۔

Bicycle

دو پہیوں کی وہ ہلکی سواری جسے پاؤں سے چلایا جاتا ہے۔ بائیسکل کی یہ ترقی یافتہ صورت کئی مدارج طے کرنے کے بعد اس کو میسر آئی ہے۔ سب سے پہلی بائیسکل 1816ء میں پیرس کے ایک شخص نے بنائی۔ یہ لکڑی کی تھی اور سوار اس کو پاؤں سے دھکیل کر چلاتا تھا۔ 1840ء میں اسکاٹ لینڈ کے ایک لوہار کرک پیٹرک میکیلن نے اس میں کئی تبدیلیاں کیں اور اس کو ایک آرام دہ سواری بنادیا۔ 1885ء میں اس میں فری ویل اور پیڈل کا اضافہ کرکے اس کو اور آرام دہ بنادیا گیا۔ 1888ء میں اس کے لیے ربر کا ٹائر استعمال کیا جانے لگا۔ 1953ء میں پاکستان میں بھی بائیسکلوں کی تیاری شروع ہوگئی اور رستم، سہراب، ہیگو کے نام سے بائیسکل بننے لگے۔ چینی سائیکل فونیکس کا شمار دنیا کے بہترین سائیکلوں میں ہوتا ہے۔

مرسلہ: اریبہ شکیل۔ سیالکوٹ

طوفان کی وجہ سے نہیں ہوئی جیسا کہ پہلے اندازہ لگایا گیا تھا۔ کھنڈرات سے ملے چند ٹوٹوں سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ سوہن جوداڑو پر تقریباً دو ہزار سال تک پانی کی سطح سب سے بڑی وجہ بار بار آنے والے سیلاب تھے۔ تباہ کن سیلاب کے بعد ہر بار بسنے والی تہذیب کا معیار پہلے سے پست ہوتا چلا گیا۔ بغیر کسی منصوبہ بندی کے پہلے سے موجود ٹیلے پر نئی عمارتیں تعمیر کی گئیں جو ناپائیدار ثابت ہوئیں اور پورا شہر بتدریج کھنڈرات میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ شہری حکومتوں کے دوران نئے بلند شہر آبادیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں قتل کیا گیا تھا۔ تاہم یہ واضح نہیں کہ یہ جرائی حملے کے نتیجے میں ہوئے والے قتل عام کی طرف اشارہ بھی کرتے۔ اگرچہ ہر بار آباد قدیم ڈاکٹر جارج ایف ڈیلز نے 1942ء میں ایک کھدائی کے دوران سوہن جوداڑو سے پانچ انسانی ڈھانچے دریافت کیے۔ ان میں تین مرد ایک عورت اور ایک بچے کا ڈھانچا تھا۔ ڈاکٹر ڈیلز کا خیال ہے کہ انہیں کھدائی تک گرا کشتی کیا گیا تھا۔ بعد کی کھدائیوں سے بھی درجنوں سے زیادہ انسانی ڈھانچے مزید برآمد ہوئے۔ جن کی قریبی بڑیاں اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انہیں بھی قتل کیا گیا تھا۔ تاہم یہ یقین حتمی نہیں کہ یہ ہر ان ہلاکتوں کی وجہ سے ہوئے یا طاعون کی وبا سے ہوئے۔ ڈاکٹر ڈیلز کا خیال ہے کہ یہ لوگ سطح آب پانی کی لہروں کا نشانہ بنے تھے۔ جس کے واقعات 1700 قبل مسیح میں پیش آئے جو موہن جوداڑو تہذیب کی آخری تباہی کا باعث بنے۔ اس طاعی کے بعد یہ شہر دوبارہ کبھی آباد نہیں ہوا۔

یہ بین جو دڑو سے 588 کلومیٹر شمال میں واقع سندھ کی تہذیب کا ایک اور نمایاں مرکز ہڑپہ واقع ہے۔ ہڑپہ کے کھنڈرات پاکستان کے صوبہ پنجاب میں ساہیوال شہر سے 35 کلومیٹر مغرب جنوب میں واقع ہیں۔ یہ شہر 3500 قبل از مسیح سے 1600 قبل مسیح تک سیوحد دریا اپنے دور عروج میں شہری آبادی 24 ہزار کے لگ بھگ تھی۔ قدیم شہر 150 ایکڑ رقبے پر مشتمل تھا جس میں سے موجودہ کھنڈرات 76 ایکڑ رقبے پر موجود ہیں۔ ہڑپہ باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ مکانوں کی تعمیر میں پختہ اینٹوں استعمال کی گئی تھیں چوڑی گلیاں منظم انداز میں کھودے گئے کنویں، زچگی والی نالیوں پر مشتمل نکاسی آب کا انتظام، اناج گھر، بھٹی بنانے کی بھٹیاں اور فنی مقامات اس شہری شان تھے۔

یہاں سے ان زمانہ پتھر، مرجان و یاقوت سے بنے ہوئے ہار، مالے اور چھڑی نما مہریں، جانوروں کے شیشے اور پرانی

1987ء سے خدمت میں مصروف
LEUCODERMA-VITILIGO
تما جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج
STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT
ملنے کا پتہ: اجمل زیدی
کیرو ویٹ کا ستان کا مستند روحانی

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT
AWARD PILLAR OF LEUCODERMA
اسلام آباد
9-اپریل 30th منگی
9-مئی 30th تک
9-جون 30th جنوری
لاہور
14-فروری 27th فروری
14-جون 27th تک
14-اکتوبر 27-اکتوبر
کلف سینٹر
بلاک 16
0300-8566188
بنوں
گیارہ فروری 11th فروری
گیارہ جون 11th جون
گیارہ اکتوبر 11-اکتوبر
ہیرل اسپیشلسٹ
0300-8566188
کراچی
13-فروری 27th فروری
13-جون 27th جون
13-اکتوبر 27th اکتوبر
ہیرل اسپیشلسٹ
0300-8566188
ملتان
28-اپریل 6th مئی
28-جولائی 6th اگست
28-نومبر 6th دسمبر
ہیرل اسپیشلسٹ
0300-8566188
syedajmalzaidi@hotmail.com • syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

میں 1899ء سے 1901ء کے دوران Aegean تہذیب (3000 سے 1200 ق م) سے تعلق رکھنے والے آثار قدیمہ دریافت کیے جن میں کنوسس (Knossos) کے کھنڈرات نمایاں ہیں۔ 1902ء میں سر جون مارشل (Sir John Marshall) کو برطانوی ہندوستان کے نگران آثار قدیمہ کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کردیا گیا۔ اس زمانے میں لارڈ کرزن (1859-1925) ہندوستان کا گورنر جنرل (1905-1899) تھا۔ سر جون مارشل نے موجودہ پاکستان کی حدود میں دریائے سندھ کی وادی کے سروے کا کام شروع کروایا۔ ان کا پہلا نمایاں کارنامہ شمالی پاکستان میں گندھارا تہذیب کے مرکز ٹیکسلا کی دریافت ہے۔

سر جان مارشل کی 1913ء میں ٹیکسلا میں کھدائی کا کام شروع کروایا، جو اگلے تین سال جاری رہا۔ انھیں 1914ء میں "سر" کا خطاب دیا گیا۔ انھوں نے 1918ء میں ٹیکسلا میوزیم کی بنیاد بھی رکھی۔ سر جون مارشل کی کوششوں کے نتیجے میں 1920ء میں ہڑپہ اور موہن جوداڑو میں کھدائی کے کام کا آغاز ہوا۔ موہن جوداڑو کی دریافت کے حوالے سے ایک کتاب نگری رائے سے لکھی گئی۔ 1911ء میں غیر مسلم مہندوستان کے باہر آثار قدیمہ آرکے بھنڈرنے دریافت کیا تھا۔ اس سلسلے میں موہن جوداڑو کو زیادہ سیلن سیل کے سابق ڈائریکٹر میجر ماکس شاہ نذاری کا کہنا ہے کہ آر کے بھنڈر پہلے بدھ مت کے مقدس مقام کی حیثیت سے اس جگہ کی تاریخی حیثیت کی جانب توجہ مبذول کروائی، جس کے لگ بھگ ایک عشرے بعد سر جون مارشل یہاں آئے اور انھوں نے اس مگہ کی کھدائی شروع کروائی۔ 1931ء میں سر جون مارشل کی وادی سندھ کی تہذیب سے متعلق کتاب Mohenjo-Daro and the Indus Civilization شائع ہوئی۔ اس کام نذر کی گئی کی وجہ سے کھدائی کا کام روک دیا گیا۔ تاہم سر جون مارشل کی تیم نے اپنے ظہور پر سے کے کام جاری رکھا اور بہت جلد یہ انکشاف ہوا کہ قدیم تہذیب سے آثار ہڑپہ اور موہن جوداڑو کے مقامات تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ اس تہذیب کے ذیلی سلسلے سندھ میں چنہودڑو، جھوکر، علی مراد اور پنجاب میں رنوپڑ اور بلوچستان میں بال اوشکی کے مقامات پر بھی پائے گئے ہیں۔

سر جون مارشل کی کوششوں سے موہن جوداڑو اور ہڑپہ میں کھدائی کا کام دوبارہ شروع کیا گیا اور اس بار باقاعدگی کھدائی کا کام مکمل کیا گیا۔ 1936ء میں اسے برٹش اکیڈمی کا فیلو منتخب کیا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جون مارشل نے اپنی باقی زندگی انگلینڈ میں گزاری، جہاں 17 اگست 1958ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔

پاکستان میں وادی سندھ کی تہذیب کو منظر عام پر لانے کے حوالے سے سر جون مارشل کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بہت ممکن ہے کہ 19ویں صدی کے آخر میں متعدد مقامی لوگ دریائے سندھ کی وادی میں واقع آثار قدیمہ سے متعلق ہیں گر رکھتے ہوں، تاہم سر جون مارشل ہی وہ پہلا شخص خاص کی کوششوں کے نتیجے میں یہ قدیم دنیا پاکستان میں واقع قدیم تاریخی ورثے کے سروے سے روشناس ہوئی۔ قیام پاکستان کے بعد ان کے دریافت کردہ مقامات کی نگہداشت اور دیکھ بھال کی ذمہ دار محکمۂ آثار قدیمہ کے سپرد کیا گیا۔

آج موہن جوداڑو اور ٹیکسلا کے مقامات کو کسی حد تک تسلی بخش قرار دیا جاسکتا ہے لیکن مختلف تنظیموں کی عدم توجہی مقامی لوگوں میں شعور کی کمی اور سب فنڈز نہ ہونے کی وجہ سے ہڑپہ کی قدیم ترین تہذیب کی باقیات زبوں حالی کا شکار ہیں۔ اسامی قریب میں کی گئی کھدائیوں کے دوران ہڑپہ سے ملنے والے کئی نایاب نوادرات چوری ہونے کی خبریں بھی گردش کرتی رہی ہیں۔ تاہم اس سب کے باوجود کچھ مخلص لوگ اور ادارے پاکستان کے قدیم تاریخی ورثے کی حفاظت کے لیے دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں نام پاکستان کے بین الاقوامی شہرت یافتہ مورخ اور ماہر آثار قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی کا ہے۔ وہ 20 جون 1920ء کو ہندوستان کے شہر بھینس گڑھ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے 1944ء میں جامعہ بنارس ہندو سے تاریخ میں ایم اے کیا۔ وہ اس دور کی مسلمہ ڈگری حاصل کرنے والے پہلے مسلمان تھے۔ احمد حسن دانی 1945ء میں محکمہ آثار قدیمہ سے منسلک ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ٹیکسلا، موہن جوداڑو اور ہڑپہ میں کھدائی کے کام میں حصہ لیا۔ ان کی نگرانی میں پشاور اور لاہور کے عجائب گھروں کی تزئین و آرائش کی گئی۔ ان کی علمی خدمات پر حکومت پاکستان نے انھیں ستارۂ امتیاز اور ہلال امتیاز کے اعزازات سے نوازا۔ ان کا 26 جنوری 2009ء کو اسلام آباد میں انتقال ہوگیا۔ احمد حسن دانی اور ان جیسے جواں ہمت لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں اقوام متحدہ کے ادارہ برائے تعلیم، سائنس و ثقافت یونیسکو کی جانب سے پاکستان میں واقع ٹیکسلا، موہن جوداڑو اور ہڑپہ کے آثار قدیمہ کو عالمی ورثہ قرار دیا گیا۔

لڑاکو

م الف

لڑائی بھڑائی انسان کی سرشت میں شامل ہے۔ یہی لڑائی جب بڑی قوموں میں بڑے پیمانے پر ہو تو جنگ کہلاتی ہے۔ تاریخ کے دامن میں ایسے بہت سے نام ہیں جنھوں نے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے جنگ کا بازار گرم کیا۔ انسانیت کا خون پانی کی طرح بہایا۔ بستی کی بستیاں تاراج کیں۔

ظالم کا کوئی خاص انسانی خون کا پیاسا تھا، کوئی ہیرا روندنے والوں کا ذکر

کائنات کی سب سے عجیب مخلوق انسان ہے۔ کسی بھی اعتبار سے تضاد نہیں ہے۔ جتنا انسان میں ہے۔ ایک طرف انتہائی رحم دلی۔ دوسری طرف انتہائی بے رحم۔ ایک طرف محبت کا دیوتا تو دوسری طرف نفرت کا شیطان۔ ایک طرف بقا کا وفادار تو دوسری طرف انتہائی دھوکے باز۔ غرض یہ کہ جتنی بھی انسانی خوبیاں ہوسکتی ہیں ان کا تضاد بھی انسان میں ہی ہے۔

آپ نے انسانی تاریخ کے جم دل انسانوں کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا جو کسی کو تکلیف میں دیکھ کر خود تڑپ جاتے تھے۔ کوئی آنسو بہانا تو چوٹ ان کے لبوں پر لگتی تھی۔ کوئی مصیبت میں گھرا ہوتا تو اس کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتے۔

ایسے لوگ انسانیت کا زیور ہوا کرتے۔ تاریخ ایسے ہیروں اور ان کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔ سارے پیغمبر، انبیاء، اولیاء، مفکر، دانش ور سب اسی مزاج کے لوگ تھے۔

یہ وہ لوگ تھے جو چلتی دھوپ میں سائے کی طرح ہوا کرتے۔ جنھوں نے انسان کو گلے سے لگا رکھا تھا۔ دنیا بھر کی فلاحی تنظیمیں ان ہی کے دم سے وجود میں آئیں جنھوں نے خدمت خلق کر کے اپنے رب کو راضی کیا ہے۔

یہ انسان کا ایک رخ ہے۔ اور دوسرا رخ کیا ہے کہ یہی انسان انتہائی بے رحم، جابر، ظالم اور سفاک دل بھی ہے۔ اس نے انسان کو اذیت دینے اور اسے تباہ کرنے کے ایسے ایسے طریقے استعمال کیے کہ زمین کانپ اٹھی۔ آسمان لرز کر رہ گیا۔

یہ صوت، تباہی، خونریزی اور تعدد کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے انسانی تاریخ میں اپنے نام شامل تو کیے ہیں لیکن انتہائی بے رحمی سے۔

آئیں آپ کو تاریخ کے ایسے چند کرداروں سے ملواتے ہیں جن کے ظلم و تعدد کی داستانیں بے رحمی کی داستانیں بن کر رہ گئی ہیں۔

ڈریکولا

یہ نام ظلم کی تاریخ میں سرِ فہرست کردہ ہے۔

کاؤنٹ ڈریکولا۔ یہ شخص تین بار ولاچیا کا بادشاہ مقرر ہوا۔ اس کی ریاست خود مختار ریاست تھی۔ اس کا زمانہ 1428ء سے 1476ء تک کا ہے۔

اس کا نام ڈریکولا نہیں ولاد تھا۔ یہ نام مؤرخوں نے

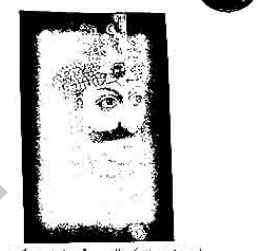

اسے دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے چھوٹا شیطان اور یہی نام اس کی پہچان بن گیا ہے۔

اگر کسی سے کہا جائے کہ یہ داستان کاؤنٹ ولاڈ کی ہے۔ تو کسی کو اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ کاؤنٹ ولاڈ کون تھا لیکن جب ڈریکولا کہا جائے تو ایک بچہ بھی اس کو پہچان لے گا۔

یہ شخص خون بہانے میں بے پناہ لذت محسوس کیا کرتا۔ بتاتا ہوا انسانی خون اس کے لیے لذت کا سبب بنتا۔

اقتدار پر آنے کے بعد جب اس کو طاقت مل گئی تو اس نے اپنے کھیل اور بے رحمی کا دائرہ وسیع کر دیا۔ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو کر کسی کا بھی خون کروا دیتا۔

انسانوں کو مارنے کے اس نے نئے نئے وحشیانہ طریقے اختیار کیے۔ ایسے کے کئی طریقے بہت پسندیدہ تھے۔

وہ انسان کی ٹانگیں باندھ کر دو مختلف ستونوں کی طرف جانے والے گھوڑوں سے باندھ دیتا اور جب وہ گھوڑے پوری طاقت سے مختلف سمت کو جاتے تو وہ بے چارہ آدمے دھڑ سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔

ولاڈ اس منظر کو دیکھ کر جنونیوں کی طرح ہنستا۔ شراب پیتا اور اپنے ساتھیوں کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتا۔

اس کے ساتھی اس موقع پر کانپ کر رہ جاتے ہوں گے کہ کہیں کل ان کا بھی یہی حشر نہ ہو۔ اپنے خلاف ذرا سی بات بھی اس کی برداشت سے باہر تھی۔

انسانوں کے ساتھ اس کے بے رحمانہ سلوک کا ایک اور طریقہ تھا۔ لکڑی کی چھڑیاں آگے سے بے انتہا نوکیلی

کہا جاتا ہے کہ اس نے تیس لاکھ انسانوں کو مروایا تھا۔ تیس لاکھ بہت بڑی تعداد ہوتی ہے۔ اس میں دس لاکھ کے قریب یہودی تھے۔

ہم جب تاریخ کے کسی ایسے کردار کے بارے میں ریسرچ کرنا چاہتے ہیں تو ان ہی معلومات پر اکتفا کرنا ہوتا ہے جو کتابیں دستیاب ہیں یا جو معلومات انٹرنیٹ کے ذریعے حاصل ہو سکتی ہیں۔

تاریخ کے ایسے کرداروں کے بارے میں ہمیشہ سے تصویر کے دو رخ رہے ہیں۔ اگر کوئی مخالف ہے تو وہ اپنی مخالف میں اس کا چہرہ اس طرح مسخ کر دیتا ہے کہ اس کی اچھائیاں تک چھپ جاتی ہیں اور اگر کوئی اس کے حق میں ہے تو وہ اسے فرشتہ بنا کر پیش کر دیتا ہے۔ اس کے خیال کے مطابق اس سے کوئی غلطی ہو ہی نہیں سکتی۔

ایڈولف ہٹلر

یہ مشہور زمانہ کردار ہے۔ اس شخصیت کے بارے میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید اضافہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہولوکاسٹ والے واقعے نے اسے پوری دنیا میں بدنام کر دیا ہے۔ اس کی پناہ سفاکی کی داستانیں ہر

وہ تھی جاتا ہے جو ذرا بھی تاریخ سے دلچسپی رکھتا ہو۔ اس کی شخصیت کے کئی پہلوؤں کو اس طرح لیجا کر کیا جاتا ہے کہ یہ کردار روز مرہ بن کر رہ گیا ہے کہ فلاں شخص تو ہٹلر بن کر رہ گیا ہے۔ بہرحال اس کی شخصیت کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا کہ وہ رومان پسند اور بہت اچھا مصور بھی تھا۔

لیول پاٹ

کیوڈیا کا وزیر اعظم 1975ء سے 1979ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس کے ساتھ بھی اس کی بے پناہ بے رحمیوں کی داستانیں موجود ہیں۔ اس نے بھی ہزاروں افراد کو مروا دیا۔ ایک اہم بات ان تمام لوگوں میں یہ دیکھی ہے کہ وہ اپنی اذیت پسندی میں اتنے شدید ہوا کرتے کہ اپنے مخالفین کو ہلاک کرنے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتے۔

ہر ڈکٹیٹر اپنے ساتھ اپنا خود ساختہ نظریہ یا فلسفہ بھی لے کر آتا ہے۔

پول پاٹ کا یہ خیال تھا کہ کیوڈیا اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک پرانی اقدار اور معاشرے اور مذہب کو

بدل کر کیوڈیا کو جدید نہ بنا دیا جائے۔

اس کے ذہن پر مسخ انقلاب کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ اس نے مسخ انقلاب برپا کرنے کے لیے ایسے ایسے مظالم کیے کہ تاریخ شرمندہ ہے۔

اس کے عہد میں لاکھوں افراد سے جبری بے گار لیا جاتا۔ کام کام اور صرف کام۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا یا کسی اور وجہ سے کام نہیں کر پاتا تو عورت اور مرد کی تمیز کیے بغیر اسے انتہائی خطرناک پانی میں اس طرح کھڑا کر دیا جاتا کہ پانی اس کی گردن تک آنے لگے۔ اس بے رحم عمل کے وقت اس بدنصیب کے جسم سے سارے کپڑے اتار لیے جاتے۔ حاملہ عورتوں کو بھی نہیں چھوڑا جاتا۔ سخت سردی میں ان کے جسم اکڑ جاتے اور وہ موت کے گھاٹ اتر جاتے۔

لفظ دیت نام اس کے لیے گویا کی طرح تھا۔ اگر اس کے ملک کا کوئی مرد یا عورت دیت نام کی کسی لڑکی یا مرد سے شادی.... کرتا تو دونوں کو مار دیا جاتا۔

اس نے جتنے لوگوں کو ہلاک کروایا تھا ان کا پورا حساب کتاب (تصویروں کے ساتھ) اس کے پاس محفوظ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانی کھوپڑیاں بھی جمع کر رکھی تھیں۔

آئی وان

یہ ماسکو کا ایک کردار ہے۔

1533ء سے 1584ء تک یہ شخص روسیوں کا زار رہا ہے۔ یعنی پورے روس کی تقدیر کا مالک۔ یہ شخص بھی اپنی ایڈیسٹی اور بے رحمی میں اپنی مثال آپ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جو بہار ہر سال کے پیچھے چھپی بات۔ تو یہ بچپن ہی سے ایسا تھا۔

اس کا پسندیدہ شغل یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کو بلندی پر لے جا کر نیچے پھینک دیتا اور ان کے تڑپنے اور مرنے کا تماشا دیکھا کرتا۔

اس کو ایک وہم یہ ہو گیا تھا کہ ہر شخص اس کا دشمن ہے۔ اگر کوئی اس کی طرف دیکھ رہا ہے تو اس کے ارادے خطرناک ہیں۔

اگر کسی نے اونچی آواز میں بات کی ہے تو آگے چل کر وہ اس کے لیے پرابلم پیدا کردے گا۔ لہٰذا اس وہم میں مبتلا ہو کر اس نے ہزاروں افراد کو بے دردی سے مروا دیا۔

اس نے اپنے محل ہی میں اپنا تہہ خانہ کا چیمبر بنا رکھا تھا۔ اس کی اذیت پسندی یہ بھی تھی کہ وہ والدین کے سامنے اولاد کو اور اولاد کے سامنے والدین کو ہلاک کروایا کرتا۔

انسان کتنا وحشی اور کتنا بے رحم ہے۔ اس کا اندازہ ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر ہوتا ہے۔ 1584ء میں اس کی موت اس وقت ہوئی جب وہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ شطرنج کھیل رہا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔

اٹیلا

اس کا زمانہ 434ء سے 453ء تک کا ہے۔ اس کی سلطنت جرمنی سے لے کر دریائے ڈینوب تک پھیلی ہوئی تھی اور وہ اتنے بڑے علاقے کا سب سے طاقت ور انسان

تھا۔ وہ ایک ایسا بے رحم شخص تھا کہ اس کی بے رحمی کی وجہ سے اسے اٹیلا کہا جاتا یعنی خدا کا تیر۔ وہ روم کا دشمن تھا۔ اس کے یہاں کسی کو معاف کر دینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ اذیتیں دے دے کر مارا کرتا اور خوشی محسوس کرتا۔ اس کے زمانے میں ارملا کی ایک پارسا خاتون تھی۔ بہت خوب صورت، جمیل اس کو جنت ارملا کہا کرتے۔ اٹیلا نے اس سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا اور ارملا کے انکار کرنے پر اس نے ارملا اور اس کے بارہ ہزار حواریوں کو ہلاک کر ڈالا۔

تاریخ نے اسے دنیا کا سنگ دل ترین وحشی حکم ران قرار دیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ جوان عورتوں کو بے دردی سے اس کے خون پیا کرتا تھا۔ اس کی سنگ دلی اور بے رحمی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگی کہ وہ اپنے ایک جمالی اور دو چھوٹے بیٹوں کو مار کر کھا گیا تھا۔ اس کی موت 453ء میں ہوئی تھی۔

کالی غولا

یہ بھی دنیا کی قدیم تاریخ کا ایک کم رحم اور بے رحم کردار ہے۔

کالی گولا روم کا تیسرا بادشاہ تھا۔ اس نے 37ء سے 41ء تک 43ء تک روم پر حکومت کی۔

یہ شخص بلا کا جنسی وحشی تھا۔ اس کے مظالم کی داستانیں تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ جب وہ تخت نشین ہوا

تو دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے ڈیڑھ لاکھ جانوروں کی قربانیاں دی گئی تھیں۔ وہ روم کی ایک المناک بیماری میں مبتلا ہو گیا تھا جس سے ہر وقت اس کی تنظیف رہا کرتی۔ اس نے اپنے آپ کو خدا سمجھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ انسانوں کو تفریحاً مارا کرتا۔ خاص طور پر بچوں کو وہ انہیں روتا بلکتا اور تڑپتا دیکھ کر خوشی محسوس کیا کرتا۔

اس نے بہت سے خوفناک درندے پال رکھے تھے۔ یہ درندے پیتے وغیرہ وہ اپنے قیدیوں کو ان درندوں کے آگے ڈال دیا کرتا اور ان کی چیر پھاڑ ہوتے دیکھ کر خوش ہوتا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے دلی مسرت اس وقت ملتی ہے جب اس کے سامنے کسی قیدی کو اذیت دے کر مارا جائے۔

اس کے زمین میں یہ بات سما گئی تھی کہ بچوں کا خون ان کے لیے آب حیات ہے۔ اس لیے اس نے نہ جانے کتنے بچوں کو ہلاک کروا یا اور ان کا خون پی گیا۔

رسالے کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
یا گھر کی سے ہزارہا حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور یورپی ممالک کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کسی سال کے لیے ایک سے زائد رسالوں کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
بینک کی ظرف سے ملک کے بہترین بک ایجنٹ کی ہوسکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف منی آرڈر یونین بینکنگ کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری پبلیکیشنز ذمہ دار نہیں ہوگی۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: شعبہ خاص (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C، فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، فن کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

جوزف مینگلے

کہنے کو ایک ڈاکٹر تھا۔ ایک پڑھا لکھا شخص، ایک سمجھا جانے والا پڑھا لکھا انسان، لیکن یہ اپنی بربریت اور بے رحمی کی وجہ سے موت کے فرشتہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس نے ایسے ایسے انداز سے لوگوں کو مارا ہے کہ تاریخ حیران ہے کہ دنیا میں ایسے بھی سنگ دل ہو سکتے ہیں۔ اس شخص کے سینے میں شاید دل ہی نہیں تھا۔

جوزف مینگل نازیوں کا ڈاکٹر تھا۔ نازی ایسے قیدیوں کے حوالے کر دیتے کہ وہ ان سے جو چاہے وہ کرے اور یہ جنونی قاتل وہی کرتا جو اس کے دل میں آتا تھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا ڈاکٹر سائنس داں اور محقق ہے۔

وہ قیدیوں پر طرح طرح کے تجربات کیا کرتا۔ انہیں بے ہوش کیے بغیر اس کی چیر پھاڑ کرتا رہتا۔ وہ بے جارے میز سے بندھے ہوئے تڑپتے رہتے۔ چیختے رہتے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

ایک بار اس پر خبط سوار ہوا کہ وہ جڑواں بچوں پر تجربات کرے۔ یہ دیکھا جائے کہ اگر ایک کو تکلیف پہنچائی جائے تو دوسرے پر اثر ہوتا ہے یا نہیں۔ اس خبط میں مبتلا ہو کر اس نے بارہ ہزار کے قریب جڑواں بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

بہت سے بچے تو قیدیوں کے کیمپ میں موجود تھے اور بہت سوں کو اس کے ہرکارے ملک کے مختلف علاقوں سے اغوا کرا لاتے رہے۔

43 اے ڈی میں اس کا قتل ہوا کیا تھا اور لوگوں نے سکون کا سانس لیا۔

نیرو

تاریخ کا ایک بدترین اور ظالم کردار۔ اس کی بربریت اور بے حسی کے حوالے سے پوری دنیا میں یہ کہاوت مشہور ہوگئی ہے کہ روم جلتا رہا اور نیرو بانسری بجاتا رہا۔

جی ہاں یہ وہی نیرو ہے جو تنہا بیٹھا چور کے کارواشیر جلوا

دیتا اور خود تماشا دیکھا کرتا۔ اسے لوگوں کی چیخیں چلانے اور فریاد میں کرلاہٹ محسوس ہوا کرتی۔

نیرو نے مارنے کے لیے کوئی ایک طریقہ کو مستقل اختیار نہیں کیا۔ بلکہ مختلف انداز سے لوگوں کو مارا جیسے پھانسی دے کر، آگ میں پھینک کر، اذیت ناک پہاڑی سے گرا کر، تلوار سے گردن اڑا کر، زندہ رہتے کریا خونخوار جانوروں کے آگے ڈال کر۔

موت دینے کے سلسلے میں وہ طرح طرح کے تجربے کیا کرتا اور ایسے شکار کے مرجانے کی خوشی میں سوسائٹی سے لطف اندوز ہوا کرتا۔ اس نے تجربے کے طور پر اپنے کم عمر والدوں کو بھی ہلاک کروادیا۔ اس کی بیوی، اس کی ماں، اس کے بھائی سب کے سب اس کی بربریت کا شکار ہو گئے۔

نیرو کا زمانہ 54 اے ڈی سے 68 اے ڈی تک ہے۔ تاریخ میں شخص کو بھی ظالم ترین افراد کی فہرست میں سب سے اوپری درجے پر رکھتی ہے۔

ایک بار اس نے دو جڑواں بچوں کو الگ الگ میز پر لٹا دیا اور ایک کی آنکھوں میں تیزاب ڈال کر اسے اندھا کر دیا۔ صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ اگر ایک کی آنکھیں چلی جائیں تو دوسرا کیا کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس بے رحم ڈاکٹر نے موت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

جرمنی کی شکست کے بعد وہ اپنے گھر والوں کو لے کر جنوبی امریکا فرار ہو گیا تھا۔ 1985ء میں تیرا کی کرتے ہوئے اس کی موت واقع ہوئی۔

الزبتھ باتھوری

یہ مقام سنگ ہے کہ جنہیں اور خنیوں کی اس فہرست میں عورتوں کے نام بہت کم ہیں لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ عورت نے یہ میدان بالکل ہی خالی رہنے دیا ہو۔ تاریخ میں ایسی کئی عورتوں کا ذکر ہے۔

تو ظہور کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ہر شب ایک غلام کے ساتھ شب بسری کرنے کے بعد دوسری صبح اسے مروا دیتی تھی۔

ایسی ہی ایک ظالم عورت الزبتھ باتھوری تھی۔ یہ اپنے ملازمین کا خون پسینہ ایک کر دیتی تھی۔ یہ اپنے

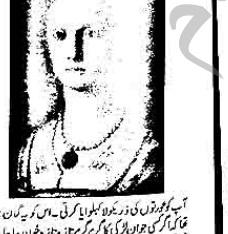

آپ کو گورتوں کی ذرہ برکہلوایا کرتی۔ اس کو یہ گن ہو گئی تھا کہ اگر کسی جوان لڑکی کا رنگ گہرا نہ تازہ خون پیا جائے تو جسم کی شادابی اور خوب صورتی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔

اس کے حکم پر اس کے کارندے جوان یا کم عمر لڑکیوں کو مختلف علاقوں سے اغوا کر کے لاتے۔ الزبتھ انہیں اپنے ذاتی قید خانے میں قید کر دیتی۔

وہ دن اس کے لیے بہت خوشی کا ہوتا جب کوئی جوان لڑکی اس کے ہاتھ لگتی۔ وہ دن بھر خوش گوار موڈ میں ہوتی۔ اپنے ان کارندوں کو انعامات دیتی جو اس کے لیے لڑکی اٹھا کر لاتے تھے۔ رات کے وقت وہ اس بدنصیب لڑکی کے پاس پہنچ جاتی۔ جسے ایک ستون کے ذریعے ہاتھ باندھا جاتا تھا۔ الزبتھ کے پاس ایک تیز دھار چاقو رہتا تھا۔ اب اس کا گمناؤنا اور وحشیانہ کھیل شروع ہو جاتا۔ وہ جسم کے مختلف حصوں میں چاقو کے ذریعے زخم لگا کر اپنے ہونٹ اس زخم پر لگا کر خون چوسنا شروع کر دیتی۔

اس بے چاری کی تکلیف اور اذیت کا صرف اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح اس لڑکی کے جسم پر کئی زخم لگائے جاتے اور الزبتھ ان کا خون پیتی رہتی۔ اور جب اس کا پیٹ بھر جاتا اور دوسری طرف، لڑکی بھی مر چکی ہوتی تو پھر اپنے کپڑے اتار کر پورے قید خانے میں وحشیانہ رقص کیا کرتی۔

اس وقت اس کی سرشاری دیکھنے والی ہوا کرتی تھی۔

اس عورت پر سب ذوالزلفا تو ہے تجنائی کی سزا دی گئی۔

جی ہاں یہ تھا انصاف، صرف سزائے تجنائی۔ اتنی بے درد اور درندہ صفت خاتون کی سزا صرف اتنی کہ اسے حبس بے جا دیا گیا تھا۔ اس نے اکیلے کمرے میں چار سال گزارے پھر اس کی موت واقع ہو گئی۔

میں نے دنیا کے جگر داروں پر داستان کیا ہے درندہ دنیا کی تاریخ میں ایسے بہت سے لوگ ہوں گے، جنہیں شیطان نے خاص اپنی تفریح کے لیے منتخب کیا ہوگا۔

یہ وحشی درندے آج بھی ہیں، یہ انسان کی بات ہے کہ آج خون بہانے کے انداز بدل چکے ہیں۔ آج گولیاں مار دی جاتی ہیں۔ جیسے یہ تیزاب پھینک دیتے ہیں۔ بم پھوں میں بنم کے تشدد کر کے مار دیتے ہیں۔

آخر کیا ہے یہ سب؟ کیوں ہے؟ کیا انسان کبھی جنگلی پن کے حصار سے باہر نہیں آسکا ہے۔ کیا وہ بھی آئندہ قبل انسان میں سکے گا یا نہیں۔

یہ ایک سوال ہے اور اس سوال کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں ہے۔ سوچنے والے ذہن اور محسوس کرنے والے دل صرف سوچ سکتے اور محسوس کرتے رہ سکتے ہیں۔

سراب

راوی : شہباز ملک
تحریر: کاشف زبیر

قسط نمبر 106

وہ بد اعتمی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور دشوار گزار صحرا سے اُسے کبھی پسپائی اختیار نہیں۔ اسے ان دیکھی آفات، کشش اور ایڈونچر سے بھرپور محسوس ہوتی کہ آؤ دیکھو نہ سوچو اور ہمہ تن سفر و حضر میں مصروف ہو جاؤ۔ اب یہ آفاقی سراب تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکا رہا تھا۔ جذبوں کو مہمیز دیتا تھا مگر اسود کی اور افلاطین جیسی لڑکا تھا۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر کہیں دبکی ہی مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراب ہی کے جیسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے ہچکولوں کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر ہو گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران میں نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ذیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جان نثار دوست۔ پھر ہیروں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ذیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جب تک پہنچا ہی تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زورو سنگی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم مانسہرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو چاہا تھی وہ لڑکی سیمرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زورو سنگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زورو سنگی ملا، وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پا لیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو غلیل جیسی والے پہنچ گئے۔ انھوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک بھیانک سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنی کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ وزیر کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ یا تو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر..... آگے بڑھے تھے کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا۔ اس نے ذیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ذیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ذیوڈ نے پُراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور چنگیز سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا کی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی ورل جی کی آواز سنائی دی "شاہی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ذیوڈ شا کا جواب میں نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائیک بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کر کے بے ہوش کر دیا اور کنویں میں پھینک دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ٹیلی فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور ہوشیار" ساوی کو لے کر چیمبر..... مگر حملہ ادھورا رہ گیا اور ساوی کی چیخ سنائی دی پھر منشی ورل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آ کر مجھے اور ساوی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیتو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا جو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ذیوڈ کی کال آ گئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا گیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شا کی قید میں شا نے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنا دیا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہر انجیکٹ کر دیتا۔ میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا۔ فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بنایا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا، فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائنائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شا نے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے پیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا ہی تھا کہ فتح خان کی آواز آئی کہ تم ٹھیک تو ہو پھر وہ مجھے قید کر کے لے چلا۔ راستے میں اس کے ساتھیوں نے غداری کی مگر میری مدد سے فتح خان فتح یاب ہو گیا۔ مگر آگے جا کر میں نے فتح خان کو گولی مار دی اور واپس وہاں آیا جہاں گاڑی کر کے گیا تھا۔ وہ لاش پڑی تھی۔ ابھی میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ پولیس والے آ گئے اور مجھے تھانے لے آئے۔ وہاں سے رشوت دے کر چھوٹا پھر راجا صاحب کے محل پہنچا مگر وہاں کے حالات بدل چکے تھے۔ میں واپس ہو گیا کہ راستے میں ایک عورت اور دو نوجوانوں نے مجھے گھیر لیا اور میرے سر پر کسی چیز سے وار ہوا۔ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ہوش آیا تو میں شیر خان کی قید میں تھا۔ وہ لوگ مجھے افغانستان کے راستے بھارت لے آئے تب پتا چلا کہ وہ لڑکی ذیوڈ کی کارندہ ہے لیکن اس نے ذیوڈ شاہ کے گلے لگ کر کہا "پاپا" تو میں حیران رہ گیا۔ میں نے خواب میں بھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ ذیوڈ نے ارشا کو بھی وہیں قید کر رکھا تھا۔ وہیں میری ملاقات ایک نیپالی سے ہوئی جو نیپالی کا کارندہ تھا اس نے مجھے ایک موبائل فون دیا جس سے میں نے ایمن سے باتیں کیں مگر اس کا راز کھل گیا اور شا نے اسے قتل کر دیا۔ دو دن کے بعد تاریک وادی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم..... چلے جا رہے تھے کہ باسو کا پیر پھسلا اور وہ ایک کھڈ میں گرنے لگا۔ ہم سب برف پوش پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے ایک ہی رسی میں خود کو باندھے ہوئے تھے اس لیے میرا توازن بگڑا اور میں آگے کی سمت گرا مگر زینی نے سنبھال لیا۔ کرنل نے باسو کو رسی پھینک کر بچا لیا۔ ہمارا سفر جاری رہا۔ ایک جگہ برفانی آدمیوں کے ایک غول نے گھیر لیا۔ ان سے بچ کر نکلا تو راستہ بھٹک گیا اور ایک سرنگ میں پہنچ گیا جو برف والے آدمی کی تھی۔ برف والے سے ملاقات ہوئی برف والے نے مجھے گدگدی دبا کر بے ہوش کر دیا جب ہوش آیا تو میرے سر پر تیر کمان سے لیس کچھ سپاہی کھڑے تھے۔ انھوں نے مجھے گرفتار کر کے وادی کے حکمران ریجات کی قید میں پہنچا دیا۔ وہاں ایک ہمدرد گیرٹ نے مجھے فرار میں مدد دی اور میں برف والے کے کہنے کے مطابق سامیرا کی فوج کی مدد کرنے کے لیے اس کے علاقے میں پہنچ گیا۔ میں نے فوج کو ازسرِنو تیاری کرانا شروع کر دی تھی کہ ریجات کے قلعہ آرگون کی طرف سے قرنا پھونکے جانے کی آواز بلند ہوئی سامیرا کا چہرہ زرد ہو گیا اور اس نے زیرِلب کہا "اعلانِ جنگ"۔ میں نے فوراً ہی سامیرا کی فوج کو منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج کو رسد کی اشد ضرورت رہتی ہے۔ رسد کے لیے مناسب انتظام کیا۔ ایک روز معائنے کے بعد واپس لوٹ رہا تھا کہ ایک بچے کے ہاتھ سے برف والے کا پیغام ملا کہ رات سے پہلے ٹھکانے پر لوٹ آیا کرو۔ رات باہر نہ گزارنا۔ میں روبیر کے ساتھ علاقے کو دیکھنے کے لیے نکلا تو پہاڑیوں کے درمیان مجھے کچھ ایسے گول پتھر نظر آئے جنہیں اسلحے کے طور پر استعمال کر سکتا تھا۔ ابھی میں اسے دیکھ رہا تھا کہ خونخوار اسمار نے گھیر لیا اور میں روبیر کے ساتھ ایک پہاڑی غار میں گھس گیا۔ پھر اسمار اور بندر نما جانور کے علاوہ ہارن سے بھی مڈبھیڑ رہی مگر اگلی صبح ہم بخیریت واپس سامیرا کے پاس آ گئے۔ سامیرا نے کہا کہ یہ بہت برا ہوا ہے۔ کبھی سومرو چند سپاہیوں کے ساتھ میرے کمرے میں داخل ہوا اور مجھے جکڑ لیا۔ مجھے ملزم قرار دے کر آبادی سے نکال دیا گیا۔ سامیرا جانتی تھی کہ یہ میرے خلاف سازش ہے۔ اس لیے اس نے خفیہ طریقہ زاد راہ کے علاوہ ایک رہبر کو بھی ساتھ کر دیا۔ پھر مجھے روبیر مل گئی جسے میری طرح علاقہ بدر کیا گیا تھا۔ ہم ایک ٹیلے پر آ گئے۔ سامیرا نے رہبیک کے ساتھ کچھ سپاہیوں کو بھی بھیجا تھا۔ ایک دن آرگون کے سپاہیوں نے حملہ کیا اور روبیر کو اٹھا لے گئے۔ اس کی تلاش میں گئے تھے..... ساشا کی جو گیرٹ کی بیٹی تھی۔ گیرٹ کو سزائے موت دی گئی تھی اور ساشا اس کی موت کا ذمے دار مجھے ٹھہرا رہی تھی۔ پھر بھی اسے ہم نے ساتھ رکھ لیا۔ ہم سب مل کر آرگون پر حملہ کرنے کے لیے چھاپہ مار جنگ کی تیاری کر رہے تھے کہ قرنوں کی آواز گونج اٹھی۔ آرگون والوں نے اعلانِ جنگ کر دیا تھا۔ گو کہ میں سامیرا کے قلعے میں جا نہیں سکتا تھا مگر برف والے کی منشا یہی تھی کہ میں سامیرا کی مدد کروں۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو تیاری کا حکم دے دیا اور چھاپہ مار جنگ پر تیار ہو گیا۔ آرگون کی فوج نے آ کر سامیرا کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ ہم نے فوج کے عقب میں کھڑی فصلوں کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے فوج کو کافی نقصان پہنچا۔ اب میں نے فیصلہ کیا کہ آرگون میں داخل ہو جاؤں اور میں اپنے ساتھیوں سمیت شہر میں داخل ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک مرد پر سپاہی تشدد کر رہے ہیں۔ اس مرد عورت اور بچے کو بچا کر اس کے گھر پہنچایا تھا کہ سپاہیوں کے دوسرے دستے نے مکان کو گھیر کر گھر والوں پر تشدد شروع کر دیا۔ حملے کا سن کر میں نے پاؤں کی تبدیلی کروا دی۔ ایڈورٹ نے ایک دستہ تیار کروا دیا پھر ہم خفیہ راستے سے اندر داخل ہوئے اور ریجات کے محل پر قابض ہو گئے۔ اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ریجات اپنے آدمیوں کے ساتھ تہ خانے میں جا چھپا ہے اور ذیوڈ شا باسو کے ہمراہ معبد میں چلا گیا ہے۔ اس کے تعاقب میں ہم نکلے تو ایک جگہ فصیل ٹوٹی ہوئی تھی جس سے ہارن اندر آ گیا تھا۔ ہم ایک درخت پر چڑھے ہوئے تھے کہ دیکھا کرنل نے ڈسک بجا کر جلتی بجھتی روشنی پیدا کر دی۔ گویا سگنل دے رہا تھا۔ تبھی ایمار کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر گری اس کی آواز سے ہارن بھڑک گیا اور درخت یوں ہلا جیسے کوئی چیز اس سے ٹکرائی ہو۔ ایمار پکڑ مضبوط نہ رکھ سکا اور نیچے گرتا چلا گیا۔

اب آگے پڑھیں

میں نے بہ مشکل خود کو روکا ورنہ میں ایمار کو آواز دینے جا رہا تھا۔ وہ گرا تھا۔ مگر ایسا لگ رہا تھا کہ شاخوں میں منتقل ہو گیا ہے۔ اس نے بھی سوائے پہلی چیخ کے اور کوئی آواز نہیں نکالی تھی۔ میں احتیاط سے چند شاخیں نیچے آیا اور میں نے ایمار کے حرکت کرتے ہیولے کو دیکھ لیا وہ خاموشی سے واپس اوپر آ رہا تھا اور شاخوں کو مضبوطی سے پکڑ رہا تھا۔ اس کا پورا امکان تھا کہ ہارن پھر درخت کو ٹکر مارے گا اور ایسا ہی ہوا۔ درخت پھر ہلا تھا مگر ہم سب ہوشیار تھے۔ اپنی جگہ قائم رہے اور کوئی آواز بھی نہیں نکالی تھی۔ ہارن اب بھاگ دوڑ کر رہے تھے کیونکہ ان کی ٹاپوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ انہیں چیخ سے یقین آ گیا تھا کہ اوپر انسان ہیں۔ مگر جب چند اور ٹکریں مارنے کے بعد اوپر سے کوئی ردِعمل نہیں ہوا تو ان کی وحشت کم ہوئی تھی اور اسی لحاظ سے ان کی بھاگ دوڑ بھی کم ہوئی تھی۔

اس دوران میں تاریکی مکمل ہو گئی تھی اور اب اوپر نیچے ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ شام کے چھ یا ساڑھے چھ بج گئے تھے۔ ایمار اوپر آیا اور میں اس کے ساتھ واپس اوپر کی طرف آیا۔ کوئی اسی یا نوّے فٹ کی بلندی پر ہم سب آ گئے تھے۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "وہ ہماری موجودگی سے تقریباً واقف ہو چکے ہیں اور اب یہاں سے نہیں نکلیں گے۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔"

"کیا؟" ربیک نے سوال کیا۔

"ہم تیروں کی مدد سے انہیں ہارنوں سے نہیں نمٹ سکتے اس لیے ایک ہی طریقہ سمجھ میں آ رہا ہے۔ ہم تیروں کو آگ لگا کر ان کے جسم کے ایسے حصوں پر ماریں جہاں سے یہ الگ نہ کر سکیں اور جب جلتے تیر ان کا جسم جلائیں گے تو اس کے بعد یہ یہاں سے بھاگیں گے۔"

"ترکیب اچھی ہے۔" ایڈرٹ نے کہا۔ "لیکن تیر مارنے کے لیے نیچے جانا ہوگا اور یہ آگ اور ہمیں دیکھتے ہی درخت گرانے کی کوشش کریں گے۔"

"اس کام کے لیے ہم میں سے دو سے تین افراد نیچے جائیں گے۔ خود کو رسی سے درخت کے ساتھ یوں باندھ لیں گے کہ جھٹکے سے نیچے نہ گریں۔ ایک آدمی آگ سے تیر جلائے گا اور ایک یا دو افراد ان تیروں کو ہارنوں پر آزمائیں گے۔ جیسے یہ ہی بھاگیں گے ہم بھی یہاں سے نکل جائیں گے۔"

میں نے اپنا منصوبہ بیان کیا تو ربیک نے مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "بہ شرط کہ مزید ہارن نہ

آجائیں۔ موجودہ صورت میں اس سے بہتر منصوبہ اور کوئی نہیں ہوسکتا ہے۔"

میں، مارٹ اور ربیک نیچے آئے۔ طے پایا تھا کہ میں آگ تیروں کو دکھا کر انہیں تھماؤں گا اور وہ ہارنوں کو تیر ماریں گے۔ ہم نے خود کو مختلف شاخوں پر رسی سے باندھ لیا میں ذرا اوپر تھا اور وہ دونوں ذرا نیچے تھے اس دوران میں ہارنوں کو یہاں ہماری موجودگی کا علم ہوگیا تھا اور وہ مسلسل درخت کے تنے پر زور آزمائی کر رہے تھے۔ میں نے ایک مشعل جلائی اور روشنی ہوتے ہی نیچے جیسے قیامت برپا ہوگئی تھی۔ غراہٹوں اور حیوانی چیخوں کا ایسا طوفان آیا تھا کہ درخت بغیر کسی ضرب کے ہی کانپنے لگا تھا۔ لیکن یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ ہارن انسانوں کی موجودگی دیکھ کر یوں ہی بھڑکیں گے۔ میں نے دو تیروں کے سرے سے ذرا اوپر والا حصہ مشعل پر رکھا اور چند لمحوں میں لکڑی نے آگ پکڑ لی۔ میں نے تیر مارٹ اور ربیک کو پکڑائے جب تک انہوں نے انہیں کمان پر چڑھایا ان کی آگ پوری طرح بھڑک اٹھی تھی اور جب انہوں نے تیر مارے تو ہوا کے زور سے آگ بجھی نہیں تھی۔

میں کیونکہ مزید دو تیر اسی طرح آتش گیر کر رہا تھا اس لیے دیکھ نہیں سکا کہ کس کا چلایا ہوا تیر ایک ہارن کی پشت میں یوں اتر گیا کہ وہ ہاتھ پیچھے لے جا کر اسے نکال بھی نہیں سکتا تھا تیر کی آگ اس کے سر اور پشت کے طویل بال جلانے لگی تھی۔ ہارن اب اذیت ناک انداز میں چلا رہا تھا۔ ایک ہارن اس کے گرد ناچ رہا تھا مگر وہ جلتا تیر نکالنے کے لیے کچھ نہیں کر رہا تھا۔ دوسرا تیر دوسرے ہارن کے شانے پر لگا۔ اسے زخم آیا تھا مگر اس نے ہاتھ مار کر نکال دیا۔ مارٹ نے میرا دیا ہوا دوسرا تیر اس کے سر پر مارا اور تقریباً تیس فٹ کے فاصلے سے تیر اس کی ایک آنکھ سے ہوتا ہوا کھوپڑی کی پشت سے نکل گیا۔ ظاہر ہے تیر میں لگی آگ بجھ گئی تھی مگر تیر نے ہارن کا کام تمام کردیا تھا۔ وہ ایک دھماکے سے نیچے گرا اور موت کے کرب میں اس کا دیو ہیکل جسم تھرتھرانے لگا تھا۔ ربیک کا چلایا ہوا تیر اس ہارن کی گردن میں اتر گیا جو جلتے تیر کا شکار ہارن کے گرد ناچ رہا تھا۔

میں تیروں کا تیسرا سیٹ مشعل پر رکھے ہوئے تھا کہ چوتھا ہارن موقع کی نزاکت دیکھ کر فرار ہوا اور باقی دو اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ ان کی غراہٹیں اور دور جاتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ صرف درخت سے دور نہیں گئے تھے بلکہ یہاں سے دوڑتے ہی چلے گئے تھے۔ ہمیں توقع نہیں تھی کہ اتنی بڑی بلا سے اتنی جلدی اور آسانی سے نجات مل جائے گی اور اب ہمارا جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ضروری تھا۔ میں پہلے نیچے اترا اور مردہ ہارن کا معائنہ کیا۔ اس کے جسم کی تھرتھراہٹ اب رک گئی تھی۔ میں نے پہلے بڑی مشعل جلانے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کردیا۔ بڑی مشعل کا مطلب ہوتا زیادہ روشنی اور یہ زیادہ دور سے جانوروں کو متوجہ کرسکتی تھی۔ میرے بعد مارٹ اور ربیک نیچے آئے۔ ایرٹ اور ایلا سامان نیچے اتار رہے تھے۔ انہوں نے رسیاں کھولنے میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انہیں کاٹ دیا اور سامان نیچے پھینکنے لگے۔ آخر میں وہ خود بھی نیچے آئے تھے۔ مردہ ہارن کو دیکھ کر سب نے مارٹ کی پیٹھ تھپکی۔ اس کے بعد سب نے اپنا اپنا سامان اٹھایا اور ہم آگے روانہ ہوگئے۔ جھاڑیوں کے نزدیک آکر میں نے ان سے کہا۔

"دوستو، ہماری خوش قسمتی کہ ہم ایک بہت مشکل صورتِ حال سے نکل آئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ہارن جلد اور زیادہ تعداد میں یہاں کا رخ کریں گے اور ہم ان کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ ان سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہم فصیل پار کرکے معبد میں داخل ہوجائیں۔"

"اس کے لیے ہمیں جھاڑیوں سے گزرنا ہوگا اور یہاں زہریلے کانٹوں والا پرندہ ہوگا۔" ربیک نے تشویش سے کہا۔

"ہم ڈھالوں سے اپنا دفاع کریں گے اور چاروں طرف ڈھال کرکے ان کے درمیان میں رہ کر فصیل تک جائیں گے۔" میں نے تجویز پیش کی۔ "ہم بڑی مشعلیں روشن کرلیں گے۔ یقیناً یہ پرندہ بھی آگ سے گھبراتا ہوگا۔ شاید آگ دیکھ کر وہ نزدیک آنے سے گریز کرے۔"

ہمارے پاس موجود ڈھالیں چار فٹ اونچی اور دو فٹ چوڑی تھیں۔ ہم نے جھاڑیوں میں داخل ہونے سے پہلے بڑی مشعلیں جلائیں اور ان کی تیز روشنی میں آس پاس کا منظر واضح نظر آنے لگا۔ اس کے بعد ہم یوں پاس آگئے کہ ہم میں سے دو کا رخ سامنے کی طرف تھا اور دو الٹے قدموں چلتے اور ایک درمیان میں رہ کر صرف مشعلیں اٹھاتا۔ اس کی ڈھال دوسرا اٹھاتا اور یوں ہم چاروں طرف سے ڈھالوں کی پناہ میں آجاتے۔ زہریلا پرندہ دیکھتے ہی ہم گھٹنوں کے بل جھک کر پوری طرح ڈھالوں کی آڑ میں آجاتے۔ بڑی مشعلیں جلانا اب مجبوری تھی۔ کیونکہ ان کے بغیر ہم آسانی سے فصیل تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہم ہر لمحہ

تیزی سے جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ میرا رخ سامنے کی طرف تھا اور میں راستے کا تعین کر رہا تھا۔ شروع میں جھاڑیاں اتنی گھنی نہیں تھیں مگر ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے یہ گھنی اور زیادہ نزدیک ہوتی جارہی تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ اچانک عقب سے ایک بلند چیخ سنائی دی اور یہ کسی حد تک انسانی چیخ سے مشابہ تھی۔

"ہارن۔" ربیک نے کہا۔ "وہ آگئے ہیں۔"

"مشعلیں نیچے اور ڈھالوں سے باہر کردو۔" میں نے حکم دیا۔ مشعلیں مارٹ نے تھام رکھی تھیں اور اس نے آگے پیچھے کرکے دونوں مشعلیں ڈھالوں سے باہر نکال لیں۔ اس سے راستہ زیادہ واضح ہوگیا اور اب مشعلوں کو دور سے دیکھ لینا آسان نہیں تھا۔ ہم اب گھنی اور اونچی جھاڑیوں کے درمیان تھے۔ یہاں سے فصیل نظر نہیں آرہی تھی اور ہم اندازے سے فصیل کی طرف جارہے تھے۔ پہلی چیخ کے بعد بین نما چیخیں رہ رہ کر بلند ہو رہی تھیں اور یہ رونا پیٹنا یقیناً مارے جانے والے ہارن کے لیے تھا۔ شاید اس کے لواحقین آن پہنچے تھے اور جلد وہ جوشِ انتقام میں بھرے ہوئے ہماری تلاش شروع کردیتے۔ اچانک ہی جھاڑیوں میں ہل چل سی مچی اور میں نے رکنے کا حکم دیا۔ فوراً ہی جھاڑیوں سے دو عدد خوش رنگ پرندے نکلے اور ان کے آنے سے پہلے ہی ہم گھٹنوں کے بل جھک کر ڈھالیں سامنے کرچکے تھے اس لیے جب انہوں نے رقص کے انداز میں کانٹے برسانے شروع کیے تو سارے کانٹے آکر ڈھالوں پر لگے۔

میں اس پرندے کا یہ رقصِ مرگ پہلے بھی دیکھ چکا تھا بلکہ اس کا زہریلا کانٹا بھی بھگت چکا تھا۔ وہ مشکل سے چند سیکنڈ رقصاں رہے اور دوبارہ جھاڑیوں میں گھس گئے۔ ان کے جاتے ہی میں نے سب کو پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور ہم سرعت سے پیچھے گئے تھے۔ یہ تو واضح تھا کہ ان جھاڑیوں میں شاید ان پرندوں کا گھونسلا اور انڈے بچے تھے تب ہی انہوں نے آگ اور زیادہ لوگوں کی پرواہ کیے بغیر حملہ کیا تھا۔ اس تنگ جگہ سے باہر آکر ہم دوسرے راستے سے آگے بڑھے۔ اس دوران میں سب نے تصدیق کردی تھی کہ وہ ٹھیک ہیں اور کسی کو زہریلا کانٹا نہیں لگا تھا۔ ایک کسی قدر کھلی جگہ میں نے ڈھالوں کا معائنہ کیا تو ان پر کئی زہریلے کانٹے پیوست پائے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ پرندے کس قوت سے کانٹے برساتے تھے کہ وہ سخت لکڑی والی ڈھال میں بھی پیوست ہوگئے۔ شاید ان کے پروں میں کوئی ایسا میکنزم تھا جو کانٹوں کو اتنی قوت سے پھینک سکتا تھا کہ وہ بیس فٹ کے فاصلے پر سخت لکڑی میں پیوست ہوسکیں۔ شاید یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہاں پائے جانے والے بیشتر جانوروں کی کھال بہت سخت تھی اور زور سے پھینکا گیا زہریلا کانٹا ہی اس میں اندر تک پیوست ہوسکتا تھا۔ قدرت نے بعض ایسے ہی نرم و نازک جانداروں کو جو دوسروں کا آسانی سے نشانہ بن سکتے ہیں زہر کی مدافعت سے مسلح کیا ہے جیسے جیلی فش کے لیے دھاگے نما حصوں میں زہریلے ڈنک اس طرح موجود ہوتے ہیں کہ وہ جیسے کمان پر چڑھے ہوں اور جیسے ہی کوئی جیلی فش کے ان دھاگوں کو چھوتا ہے ڈنک اتنی قوت سے چھوٹتے ہیں کہ جسم میں انچ بھر تک اتر جاتے ہیں۔ اس کے لیے جیلی فش کو خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا خود کار نظام یہ ڈنک پھینکتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم جس راستے پر گئے تھے وہ آگے سے بند ثابت ہوا۔ ہمیں واپس آنا پڑا تھا۔ ہم پہلے ہی ایک طویل راستے سے یہاں تک آئے تھے اور یہ راستہ آگے دوراہے میں بدل گیا تھا پہلے ہم پرندوں کے سامنے جانکلے اور جب واپس آئے تو دوسرا راستہ آگے سے بند نکلا تھا۔ ہمارے پاس واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر واپسی کی راہ پر ہارن سے ملاقات کا بہت زیادہ امکان تھا کیونکہ ہمیں اسی سمت جانا تھا۔ ان کی رہ رہ کر ابھرنے والی چیخیں اب زیادہ نزدیک سے سنائی دے رہی تھیں۔ ہم دوہری مشکل میں پڑ گئے تھے۔ شاید ایسے ہی موقع کے لیے کہا جاتا ہے کہ آگے کنواں تو پیچھے کھائی۔ زہریلا پرندہ اور ہارن دونوں ہی خطرناک تھے اور ان سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ہم فصیل پار کرجائیں۔ اگرچہ وہاں بھی ہمارے لیے کم خطرہ نہیں تھا بلکہ شاید زیادہ ہی تھا مگر ہم اسی خطرے سے نمٹنے کے لیے نکلے تھے۔

"اب ہم کہاں جائیں؟" یہ سوال ایرٹ نے کیا اور میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ہم اسی راستے پر خاصا پیچھے ہٹ آئے تھے اور میں جھاڑیوں سے باہر نکلنے کی بجائے کوئی متبادل راستہ دیکھ رہا تھا۔ مگر یہاں چاروں طرف دس بارہ فٹ اونچی جھاڑیاں تھیں اور ان کے پار کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ راستہ تلاش کرنا ضروری تھا۔ ایک چھوٹا درخت آیا تو ربیک اس پر چڑھا۔ چھوٹے سے مراد یہاں کے درختوں کے مقابلے میں چھوٹا تھا ورنہ یہ بھی کوئی پچاس فٹ اونچا تھا۔ وہ فصیل کی سمت کا تعین کرنے گیا تھا مگر اسے راستہ بھی

نظر آ گیا۔ جیسے آگ لینے جائیں اور پیغمبری مل جائے۔ اس نے نیچے اتر کر جوش سے کہا۔

”جناب ادھر راستہ ہے اور وہ فصیل تک جا رہا ہے۔“

ایرٹ نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ”تمہیں کیسے نظر آیا۔ یہاں تو اندھیرا ہے۔“

”اب مکمل اندھیرا نہیں ہے اور تم جانتے ہو میری نگاہ سب سے تیز ہے۔“ ریبک نے جواب دیا۔ ”میرے ساتھ آؤ۔“

”لیکن اسی ترتیب سے۔“ میں نے کہا۔ ”پرندوں کو مت بھولو۔ یہ ہاران سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اگر ہم ذرا بھی بے احتیاطی کرتے تو ان کا نشانہ بن جاتے۔“

انہوں نے اتفاق کیا اور ہم نے پھر اسی ترتیب و تنظیم کے ساتھ سفر شروع کیا۔ ریبک نے جو راستہ دیکھا تھا اس تک جانے کے لیے ہمیں ایک دس فٹ طویل مگر بہت تنگ راستے سے گزرنا پڑا تھا اور ہم جھاڑیوں سے رگڑ کھاتے اور انہیں کچلتے ہوئے گزر رہے تھے۔ اگر ان جھاڑیوں میں پرندہ نکل آتا تو ہم اس کا بہت آسان شکار ثابت ہوتے۔ کیونکہ یہاں سے گزرتے ہوئے ڈھالیں ہٹ گئی تھیں اور ہماری ترتیب ٹوٹ گئی تھی۔ مگر ہم بخیریت دوسری طرف پہنچ گئے اور یہاں آتے ہی ہم نے پھر سے ڈھالیں اپنے سامنے کرلی تھیں۔ ریبک نے درست کہا تھا کہ راستہ نہ صرف کشادہ تھا بلکہ فصیل تک جا رہا تھا۔ تقریباً بیس سے پچیس فٹ چوڑے اس راستے پر بڑی جھاڑیاں نایاب تھیں اور چھوٹے پودے اور گھاس وغیرہ اگی ہوئی تھی۔ جب میں نے اس پر قدم رکھا تو مجھے لگا کہ میں ڈھلان کی طرف گیا ہوں۔ شاید یہ کوئی نالا یا نشیبی جگہ تھی۔

یہ نشیبی جگہ فصیل کی طرف سے آ رہی تھی اور یہاں پانی بہنے کی وجہ سے جھاڑیاں پنپ نہیں سکی تھیں مگر وہ پودے تھے جو زیادہ پانی برداشت کر لیتے تھے۔ فی الحال نالے یا نشیبی جگہ میں پانی نہیں تھا کیونکہ بارش نہیں ہوئی تھی اس میں یقیناً بارش کا پانی آتا ہوگا۔ ہماری خوش قسمتی کہ ریبک نے یہ راستہ دیکھ لیا ورنہ ہم اب تک جھاڑیوں میں بھٹک رہے ہوتے۔ فصیل کے پاس کچھ جھاڑیاں تھیں مگر وہ زیادہ گھنی اور اونچی نہیں تھیں اور ان میں زہریلے پرندے کے پائے جانے کا امکان کم ہی تھا۔ اس کے باوجود ہم ڈھالوں سے اپنا ہی محاصرہ کیے ہوئے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں سے باہر آتے ہی بڑی مشعلیں بجھا کر ایک چھوٹی مشعل جلائی تھی جو اس جگہ کے لیے کافی تھی۔ اس سے زیادہ روشنی کرنا مناسب نہیں تھا۔ باہر آنے پر ہمیں ہاران نظر نہیں آئے تھے اور اب ان کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ یہاں سے دور ہیں۔

ہم کچھ دیر میں فصیل کے پاس پہنچ گئے تھے اور اس کی روشنی محدود کر لی کیونکہ اس کا امکان تھا معبد کے اندر احاطے میں کوئی موجود ہو اور وہ اس روشنی کو محسوس کر لے۔ ہم راستہ تلاش کرنے کے چکر میں گھومتے ہوئے معبد کے شرقی سمت نکل آئے تھے۔ یہاں سے وادی کی اونچی ہوتی دیوار زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اسی میں کہیں وہ راستہ تھا جو اوپر جاتا تھا۔ ریبک کے پاس مضبوط رسی نما لکڑی کی وہ کمند تھی جسے فصیل پر پھنسا کر ہم اس پر چڑھ سکتے تھے۔ میں نے ریبک سے کہا۔ ”اگر اوپر دیوار چوڑی ہوئی تو یہ کام نہیں کرے گی یہ صرف پتلی دیوار میں پھنس سکے گی۔“

”مجھے امید ہے دیوار اوپر سے پتلی ہوگی۔“ ریبک نے کہا اور رسی گھما کر کمند اوپر پھینکی وہ دیوار کے دوسری طرف چلی گئی اور جب ریبک نے اسے واپس کھینچا تو وہ آرام سے واپس آ گئی۔ اس نے پھر کوشش کی اور میں نے اسے کوشش کرتا چھوڑ کر آس پاس کا جائزہ لیا۔ یہاں جھاڑیاں دائیں بائیں قریب تھیں اور ان کے درمیان صرف پندرہ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس کے بعد پھر گھنی جھاڑیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو فصیل کو مکمل طور پر گھیرے ہوئے تھا۔ جائزے کے دوران مجھے دائیں طرف کی جھاڑی جو دیوار سے ذرا سی ہٹی تھی وہاں دیوار کے ساتھ کوئی چیز اوپر جاتی دکھائی دی۔ مشعل ایمار کے پاس تھی جب کہ مارٹ اور ایرٹ تیر کمان سنبھالے مستعد کھڑے تھے۔ یہ ضروری تھا زہریلے پرندے کے جھاڑی سے نکلتے ہی اسے نشانہ بنانا ضروری تھا اس سے پہلے کہ وہ زہریلے کانٹے برسائے۔ میں نے ایک مشعل لے کر ایمار کی مشعل سے اسے جلایا اور جھاڑی کی طرف بڑھا۔ ریبک نے مضطرب ہو کر کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں ان میں پرندہ ہو سکتا ہے۔“

”میں محتاط ہوں۔“ میں نے ڈھال آگے کرتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک چیز دیکھنا چاہ رہا ہوں۔“

”کیا چیز؟“ ایرٹ نے آگے آنا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

”اپنی جگہ رہو میں ابھی بتاتا ہوں۔“ میں نے کہتے ہوئے قدم آگے بڑھایا اور روشنی میں اس چیز کو دیکھا۔ ایک بڑی اور مضبوط ڈنٹھل والی بیل تھی جو فصیل کے اوپر تک

گئی تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر جھٹکا دیا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں نے پلٹ کر ان سب کو پاس بلایا۔ ”یہ چیز دیکھنا چاہ رہا تھا۔“

ریبک نے بیل کا معائنہ کیا اور وہ فوری سمجھ گیا کہ میں کیا چاہ رہا تھا اس نے سر ہلایا۔ ”یہ تو قدرتی کمند مل گئی ہے۔“

”ہمیں اسے استعمال کرنا ہوگا۔“ میں نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ریبک پہلے تم جاؤ گے اور اگر یہ گر جائے یا بوجھ سہارنے کے قابل نہ رہے تو تم ہمیں اوپر کھینچو گے۔“

ریبک نے سر ہلایا اور اپنا سامان اتار کر نیچے رکھ دیا۔ وہ سب سے ہلکا تھا۔ اوپر چڑھنے سے پہلے اس نے بیل کی مضبوطی جانچی اور پھر اس کی موٹی رسی نما ڈنٹھل پکڑ کر اوپر چڑھنے لگا۔ نیچے یہ کام آسان تھا کیونکہ یہاں صرف خشک ڈنٹھل تھے لیکن جب وہ اوپر پہنچا تو بیل پھیل گئی تھی اور اس کے ڈنٹھل نازک اور ہرے ہو گئے تھے جن پر زور آتا تو وہ آسانی سے ٹوٹ سکتے تھے۔ اس دوران میں ریبک کو دیکھ رہا تھا اور اس کے نیچے گرنے کی صورت میں اسے سنبھالنے کے لیے بھی تیار تھا باقی تینوں اپنی ڈیوٹی پر تھے۔ وہ تیر کمان سنبھالے ہوئے آس پاس سے چوکنا تھے۔ ریبک ہوشیاری اور عقلمندی سے اوپر جا رہا تھا وہ اوپر جانے سے پہلے بیل کے ہاتھ میں آنے والے حصے کی جانچ کرتا اور جب مطمئن ہو جاتا تب اوپر جاتا تھا۔ اب وہ فصیل سے مشکل سے پانچ فٹ نیچے رہ گیا تھا اور یہی سب سے مشکل حصہ تھا۔ یہاں بیل پھیل کر دیوار سے ہٹ رہی تھی۔

میری نظر اس پر مرکوز تھی اور میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ اس آخری مرحلے کو کسی نہ کسی طرح عبور کر لے۔ اس نے اوپر ہاتھ مار کر بیل کے کچھ حصے پکڑے اور ان کی مدد سے خود کو اوپر کر رہا تھا کہ وہ ٹوٹ گئے اور وہ جھٹکے سے نیچے آیا تھا خوش قسمتی سے اس کا پاؤں ایک جگہ پھنسا ہوا تھا اور اس نے فوری ہاتھ مار کر خود کو سہارا دے لیا۔ چند لمحے وہ اسی جگہ چپکا رہا اور پھر اس نے بتدریج خود کو پاؤں کے بل اوپر اٹھانا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس کے ہاتھ فصیل کے پاس ہوتے جا رہے تھے مگر اب مزید اوپر ہونے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ فصیل ڈیڑھ فٹ اوپر تھی اور اس موقع پر ریبک نے وہ کیا جو خطرات سے بے پرواہ لوگ ہی کرتے ہیں اس نے پاؤں کو پوری قوت سے بیل پر مارا اور دوسری طرف اس کے ہاتھ مسلسل چل رہے تھے وہ جو ہاتھ میں آ رہا تھا اس کی مدد سے خود کو اوپر کھینچ رہا تھا۔

یہ ایک مشکل ترین اسٹنٹ تھا جو شاید ریبک ہی دکھا سکتا تھا۔ آخری موقع پر ایسا لگا کہ وہ پلٹ کر نیچے آنے والا ہے کیونکہ اس کا جسم پیچھے کی طرف مڑا تھا۔ میں اسے پکڑنے کے لیے تیار تھا کیونکہ بیس فٹ سے گر کر اسے شدید چوٹ لگ سکتی تھی اور ہم اس وقت کسی کے ایسے زخمی ہونے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ وہ ناکارہ ہو جائے۔ مگر پیچھے آتے آتے اس کا جسم رکا اور پھر اس نے خود کو آگے کھینچ لیا۔ اگلے ہی لمحے وہ فصیل پر تھا۔ مگر وہ کھڑا نہیں ہوا بلکہ فصیل پر لیٹ گیا اور اس کے لیٹنے کا انداز بتا رہا تھا کہ فصیل اتنی چوڑی ہے کہ ایک آدمی آرام سے اس پر لیٹ سکتا ہے۔ میں نے درخت کی بلندی سے فصیل کو بہت دور سے دیکھا تھا اور مجھے اس کی چوڑائی کا درست طور پر علم نہیں تھا۔ مگر اب لگ رہا تھا کہ اس کی چوڑائی اندازے سے زیادہ تھی اور اسی وجہ سے اس پر ریبک کی تیار کردہ کمند نہیں پھنس رہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”اندر کوئی ہے؟“

ریبک اندر کا معائنہ ہی کر رہا تھا اور اس نے منہ اس طرف کر کے آہستہ سے کہا۔ ”نہیں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے مگر یہاں مشعلیں روشن ہیں۔“

”رہائشی عمارت روشن ہے؟“

”ہاں اس میں بھی روشنی نظر آ رہی ہے۔“ ریبک نے جواب دیا۔ اس دوران میں میں نے اندر جانے کا طریقہ سوچ لیا تھا جو آسان تھا اور سادہ بھی۔ میں نے رسی اس کی طرف اچھالی۔

”میں پکڑتا ہوں تم اندر اتر کر پکڑ لینا پھر یہاں سے ہم ایک ایک کر کے اندر آ جائیں گے۔“

ریبک نے سر ہلایا۔ ”اور سامان؟“

میں نے سوچا اور اس سے کہا۔ ”پہلے سامان اندر اتارو پھر خود اترنا۔“

اسے رسی میں باندھ کر سامان دینے لگے اور وہ اسے فصیل کے اندر یوں پھینکنے لگا کہ آواز پیدا نہ ہو۔ ہم رسک لے رہے تھے ممکن تھا کہ ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی نے اندر برقی نگرانی کا کوئی سسٹم لگا رکھا ہو اور ہماری کارروائی کا مشاہدہ کر رہے ہو اور جیسے ہی ہم اندر پہنچیں وہ ہمیں ہینڈز اپ کرا لیں۔ تقریباً سارے ہتھیار اور دوسرا سامان اندر اتار دینے کے بعد ریبک خود بھی اندر اتر گیا۔ ادھر سے میں نے رسی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈھیلی ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ وہ اتر گیا ہے۔ پھر ریبک نے اندر سے رسی پکڑ لی اور پہلے ایرٹ گیا۔

جب وہ فصیل کے اوپر پہنچا تو رسی میں نے تھام لی اور وہ دوسری طرف اتر گیا۔ اس کے بعد ایمار گیا اور آخر میں مارٹ تھا اس نے کہا۔

”آپ جائیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا اور اسی لمحے ہمیں عقب سے ہارن کی خوفناک غراہٹ سنائی دی اور پھر ٹاپوں کی آواز ابھری۔ ہارن نے روشنی دیکھ لی اور وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ اس دوران میں ہم ہارن کے خطرے سے تقریباً بے نیاز ہو گئے تھے۔ شاید اسی غفلت کی وجہ سے اس ہارن نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ میں نے مارٹ کو اوپر دھکیلا اور وہ تیزی سے چڑھنے لگا میں نے چلا کر کہا۔ ”ادھر سے دوسری رسی پھینکو۔“

ان تینوں نے بھی ہارن کی غراہٹ کے ساتھ اس کی ٹاپیں سن لی تھیں۔ کسی نے رسی پھینکی اور میں نے اسے تھامتے ہوئے دیوار پر پاؤں لگائے اور تیزی سے اوپر جانے لگا۔ میں نے ہارن کو دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا اس لیے مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھ سے کتنا دور ہے مگر اس کی ٹاپیں اور غراتی سانسیں بتا رہی تھیں کہ وہ زیادہ دور نہیں ہے اور بہت تیزی سے آ رہا ہے۔ مارٹ ہلکے جسم کا تھا اور مجھ سے پہلے چڑھنا شروع کیا تھا اس لیے وہ آگے تھا اور تقریباً فصیل تک پہنچ گیا تھا جب کہ میں ابھی درمیان میں تھا۔ مارٹ کی پھینکی مشعل زمین پر پڑی جل رہی تھی اور اس کی روشنی میں یقیناً ہم ہارن کو صاف دکھائی دے رہے تھے اور اس نے بجا طور پر ہاتھ سے نکل جانے والے شکار کے بجائے اسے منتخب کیا جو اس کی دسترس میں تھا یعنی کہ میں۔ مجھے لگا جیسے عقب سے تند ہوا کا کوئی جھونکا آیا ہو اور پوری قوت سے مجھ سے ٹکرایا ہو اور اس نے مجھے اڑا کر جھاڑیوں پر پھینک دیا ہو۔

یہ ہارن کا بیلچہ نما ہاتھ تھا جو عقب سے میری کمر پر لگا۔ اس میں اتنی قوت تھی کہ رسی میرے ہاتھ سے نکلی اور میں ہوا میں اڑ کر اس جھاڑی پر گرا جس کے ساتھ بیل تھی۔ ہارن کا ہاتھ انسان جیسا ہوتے ہوئے بھی اس سے مختلف ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کو اچھی طرح گرفت میں نہیں لے سکتا ہے شاید اسی وجہ سے ہارن نے مجھے پکڑنے کے بجائے ہاتھ مار کر گرانا مناسب سمجھا کہ ایک بار میں نیچے گر جاتا تو پھر اس سے بچ کر کہاں جاتا۔ درد کی ایک لہر اٹھی تھی مگر مجھے اس وقت فکر اس کی تھی کہ میں کہاں گرنے جا رہا تھا اور کسی چیز سے تصادم کی صورت میں مجھے کیا نقصان ہوتا۔ فطری طور پر میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور میرا جسم سکڑنے لگا مگر میں سیدھا نرم اور بنا کانٹوں یا سخت شاخوں والی جھاڑی پر جا گرا اور اس سے غالباً مجھے خراش بھی نہیں آئی تھی۔

مگر میری جان شدید خطرے میں تھی۔ ہارن جیسا خطرناک درندہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں جھاڑی پر گرا اور ہارن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ بہت تیزی سے آیا تھا اور مجھے پکڑنے کے لیے اس نے دیوار کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ نتیجے میں مجھے گراتے ہی وہ دیوار سے ٹکرایا تھا۔ یہ تصادم خاصی قوت سے ہوا تھا اور چند لمحے کے لیے وہ خود کو سنبھالتا رہ گیا۔ اسی بنا پر وہ دیکھ نہیں سکا کہ میں کہاں گرا تھا۔ وہ اب پاگلوں کی طرح جھاڑیوں کو جھنجوڑ رہا تھا اور ان میں گھسنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نیچے کہیں گھنی اور زیادہ سخت شاخوں والی تھیں۔ میں اس کے درمیان میں پھنسا ہوا تھا اور جھاڑی ہلنے کے ساتھ رفتہ رفتہ نیچے جا رہا تھا۔

میں از خود حرکت نہیں کر رہا تھا کہ اس سے ہارن کو پتا چل جاتا کہ میں کہاں ہوں اور پھر وہ اسی حصے پر ہاتھ ڈالتا۔ وہ جھاڑی کو ہلا رہا تھا اور میں اسی وجہ سے نیچے جا رہا تھا۔ دیکھا جائے تو وہ میری مدد کر رہا تھا۔ کیونکہ یہاں جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ میں ان کے جال میں پھنس کر رہ گیا تھا اور اگر ہارن نہ بھی ہوتا تو ان سے نکلنا بھی کسی آزمائش سے کم نہیں ہوتا۔ نیچے آتے ہوئے میری کوشش بھی تھی کہ جھاڑی کے اندر والے حصے کی طرف جاؤں اور ہارن سے دور رہوں۔ ایک طرح میں اپنی جان بچانے کی کوشش کر رہا تھا دوسری طرف میرے ساتھی بھی مجھے بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ مارٹ اوپر پہنچ گیا تھا اور وہ اندر والوں سے تیر کمان مانگ رہا تھا۔

بالآخر میں ہارن کے تعاون سے زمین تک پہنچا۔ اس نے اس دوران میں جھاڑیوں کا حشر کر دیا تھا۔ ان کا بیشتر حصہ اپنی جناتی قوت سے اکھاڑ پھینکا تھا اور باقی ماندہ کا حشر کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں مارٹ کی طرف سے چلایا ہوا پہلا تیر اس کے جسم میں اتر گیا اور وہ غرا کر ذرا پیچھے ہوا۔ میں رینگ کر دوسری جھاڑی تلے جانے کی کوشش کر رہا تھا اور مجھے قطعی علم نہیں تھا کہ وہاں کیا ہے۔ اس لیے جب میرے ہاتھ نیچے سوکھی گھاس اور پھر اس کے اندر موجود انڈوں سے ٹکرائے تو میرے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ یہ یقیناً اسی زہریلے کانٹوں والے پرندے کا گھونسلا تھا اور وہ بھی آس پاس کہیں موجود تھا۔ میں نے معبود حقیقی سے فریاد کی کہ یہ بھی

کہاں پھنس گیا ہوں جہاں آگے پیچھے ہر طرف موت ہے۔ کچھ دیر ساکت رہنے کے بعد میں سست روی سے پیچھے ہٹنے لگا۔ اس دوران میں مارٹ ہارن کو کئی تیر مار چکا تھا۔

میں اب فصیل کی طرف سرک رہا تھا۔ ہارن اکیلا تھا مگر اس کا پورا امکان تھا کہ اس کی چیخم دھاڑ سن کر دوسرے ہارن بھی دوڑے چلے آئیں۔ میں نے اندھیرے میں دیوار ٹٹولی اور کھڑا ہوا میں اندازہ لگا رہا تھا کہ ہارن کی ضرب نے مجھے کس حد تک نقصان پہنچایا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ تکلیف تھی مگر میں حرکت کرنے سے معذور نہیں ہوا تھا۔ ہارن مجھے جھاڑی میں نہ پا کر پہلے حیران تھا جب مارٹ نے اس پر تیر اندازی شروع کی تو اس کا اشتعال بڑھ گیا تھا مگر وہ مارٹ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ ہاں میں خطرے میں تھا اگر وہ جھاڑی میں مزید گھستا تو مجھے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا یا وہ اپنے بھاری وجود سے جھاڑی کچلتا تو گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح میں بھی پس جاتا۔ مارٹ تیر اندازی کے ساتھ مجھے آوازیں دے رہا تھا اور میں خاموش تھا اس موقع پر بول کر میں فوت ہونا نہیں چاہتا تھا۔

مگر صرف خاموش رہنا مسئلے کا حل نہیں تھا جب کہ دیگر نئے مسائل بھی جنم لے رہے تھے۔ جھاڑیاں ٹوٹنے اور ان کے ذرات کے اڑنے سے وہاں ایک غبار سا چھا گیا تھا جو ناک کے راستے دماغ میں جا کر ان حصوں میں تحریک پیدا کر رہا تھا جو چھینک لانے کے ذمے دار تھے۔ اگر میں اس وقت چھینک مار دیتا تو میری موت کی وجہ یقیناً چھینک قرار دی جاتی۔ اس لیے میں نے ناک بند کر لی تھی اور منہ سے سانس لے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مشکل سے کیسے نکلوں۔ رسیاں جہاں تھیں وہاں ہارن موجود تھا اور تیر کھانے کے باوجود وہاں سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس کے ہوتے ہوئے فصیل پر چڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اچانک کوئی نرم سی چیز مجھے چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ میں بدکا تھا مگر اپنی جگہ سے ہلا نہیں اور یہ اچھا ہوا۔

کیونکہ چھونے والی چیز وہی خوش نما پرندہ تھا اور غالباً اندر کی جھاڑی میں اسی کا گھونسلا وانڈے تھے جنہیں بچانے کے لیے وہ جان پر کھیل کر ہارن کا سامنا کرنے نکلا تھا۔ میری موجودگی کا اسے علم نہیں تھا اور وہ ہارن کو ہی در انداز سمجھ رہا تھا۔ اس کی جھلک مجھے اس وقت دکھائی دی جب وہ گری مشعل کے پاس سے گزرا۔ مشعل بدستور روشن تھی۔ ہارن نے بھی اسے دیکھ لیا اور وہ عجیب سے آواز نکالتا ہوا پیچھے ہٹا تھا۔ اسے بدکنا بھی کہا جا سکتا تھا۔ ظاہر ہے وہ بھی جانتا تھا کہ یہ پرندہ کتنا ہلاکت خیز ہے اور اس کے کانٹے ہارن جیسے دیو ہیکل جانور کو بھی فنا کے گھاٹ اتار سکتے تھے۔ ہارن بدحواسی میں پیچھے ہو رہا تھا اور پرندہ کرب سی آوازیں نکال کر اسے ڈرا رہا تھا مگر اس نے ابھی رقص مرگ شروع نہیں کیا تھا۔ شاید وہ بھی اس سے ڈر رہا تھا کہ کہیں کانٹے بازی کے جواب میں ہارن حملہ کرے تو اس کے بچنے کا امکان نہیں تھا اس لیے وہ ڈرا دھمکا کر کام نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ جنگل کے دو جانوروں کی باہمی آویزش تھی جو جانتے تھے کہ انہیں اسی جنگل میں ساتھ رہنا ہے اس لیے وہ لڑائی سے حتی الامکان گریز کرتے ہیں۔ یہاں بھی یہی ہو رہا تھا۔

پھر کسی طرف سے ایک پرندہ اور آیا اور آ کر پہلے والے کے ہمراہ اسی کی طرح دھمکی آمیز آوازیں نکالنے لگا یہ یقیناً جوڑا تھا۔ ہارن پیچھے ہٹ رہا تھا اور وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں ہارن فصیل سے خاصا پیچھے ہٹ گیا تھا اور اسی مناسبت سے پرندے بھی دور ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے لیے موقع تھا۔ اگرچہ پرندوں کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی کانٹے نہ برسانا شروع کر دیں۔ ہارن پر تیر برسانے والے مارٹ نے بھی دم سادھ لیا تھا اور یہ اچھا ہی کیا تھا ورنہ پرندے اس کی اور فصیل کی طرف متوجہ ہوتے تو شاید میں ان کی نظروں میں آ جاتا۔ ہارن اب فصیل سے کوئی تیس پینتیس گز دور چلا گیا تھا اور پرندے دس بارہ گز دور تھے۔ میں نے چند گہری سانسیں لیں اور اچانک بھاگا۔ رسیوں کے پاس آتے ہوئے میں نے چلا کر کہا۔ ”رسی پکڑ لو میں آ رہا ہوں۔“

مجھے خطرہ تھا کہ ان لوگوں نے رسیاں چھوڑ نہ دی ہوں اور میں رسی پکڑ کر فصیل پر چڑھنے کی کوشش میں منہ کی کھاؤں۔ پرندے جو پوری طرح ہارن کی طرف متوجہ تھے اور اسے ڈرا رہے تھے میری آواز سن کر خود بھڑکے اور ہارن کی طرف ہی بھاگے۔ میں ان کے عقب میں تھا۔ میں نے وہ رسی پکڑی جس سے مارٹ چڑھا تھا۔ وہ میری مدد کے لیے دوبارہ سے حرکت میں آ گیا تھا۔ اس نے تیر کمان سنبھال لیے۔ میں نے رسی پکڑی اور دونوں پاؤں دیوار سے ٹکاتے ہوئے اوپر چڑھنے لگا۔ اس وقت میں اپنی پوری قوت، صلاحیت اور مہارت استعمال کر رہا تھا۔ غلطی کی گنجائش نہیں تھی اور اگر میں غلطی کرتا تو وہ میری زندگی کی

آخری غلطی ہوتی۔ پرندوں کی طرف توجہ دیتے یا ان کی طرف سے ہوشیار رہنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ ناقابلِ بیان تیزی سے میں نصف سے زیادہ دیوار چڑھ گیا اور تب مارٹ نے تیر اندازی شروع کر دی۔ مجھے عقب سے پرندے کی زخمی آواز سنائی دی۔ اسے تیر لگا تھا۔

شاید انہوں نے مجھ پر کانٹے برسانے کی کوشش کی تھی اور مارٹ نے تیر مار کر انہیں روکا۔ فصیل کے نزدیک آنے سے میرا جسم اب چینٹ ہو رہا تھا اور مجبوراً مجھے اب ٹانگوں کے بجائے ہاتھوں کا سہارا لینا پڑا تھا۔ میں لٹک گیا تھا۔ عقب سے ہارن کی ٹاپوں کی آواز نزدیک آ رہی تھی اور اوپر سے مارٹ دبی آواز میں مجھے جلدی آنے کو کہہ رہا تھا پھر اس نے تیر مارا اور ہارن غرایا۔ غراہٹ زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں فصیل سے دو فٹ نیچے تھا اور میں نے پاؤں سمیٹتے ہوئے تیزی سے یہ دو فٹ کا فاصلہ طے کیا اور فصیل پکڑنے والا تھا کہ رسی کو شدید جھٹکا لگا۔ میں نیچے گیا تھا۔ ایک لمحے کو میرا دل رک گیا کہ رسی ٹوٹ گئی تھی مگر وہ اپنی جگہ قائم تھی۔ دوسرا جھٹکا لگا اور میں مزید نیچے گیا تو انکشاف ہوا کہ رسی ہارن نے پکڑ لی تھی اور وہ اسے کھینچ رہا تھا۔ میں فصیل سے ڈھائی تین فٹ نیچے آ گیا تھا۔ ہارن کی جناتی قوت کے سامنے اندر موجود تینوں افراد بھی کچھ نہیں تھے اور وہ اسے رسی کھینچنے سے نہیں روک سکتے تھے۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو ہارن کے ہاتھ میرے پیروں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رسی پکڑ لی تھی۔ ایک جھٹکے کی اور دیر تھی کہ میں اس کی حد میں پہنچ جاتا اور وہ جھٹکا دینے جا رہا تھا کہ میری نظر دیوار پر گئی اور ہمیشہ کی طرح مشکل ترین لمحات میں اوپر والے نے میرے ذہن میں جان بچانے کی ترکیب نازل کی، شاید اس لیے کہ میں کبھی اس کی ذات سے مایوس نہیں ہوا۔ میں نے جھٹکے کا انتظار کیا اور جیسے ہی نیچے گیا۔ میں نے اپنے پاؤں ہارن کے سر پر ٹکائے اور رسی چھوڑتے ہوئے خود کو پوری قوت سے بائیں طرف اچھالا۔ ہارن اس ضرب سے بوکھلایا تھا۔ اسے توقع تھی کہ میں نیچے گروں گا مگر میں اس کے سر پر لرا۔ شاید اسے ضرب سے چکر بھی آیا ہو اس لیے جب تک وہ سنبھلا میں نے دوسری رسی پکڑ لی تھی۔ یہ اصل میں میری رسی تھی جس پر چڑھتے ہوئے ہارن نے ہاتھ مار کر مجھے جھاڑی میں پھینک دیا تھا۔

میں نے اندھی چال چلی تھی یہاں روشنی کم تھی اور رسی برائے نام ہی نظر آ رہی تھی اگر میرا ہاتھ ذرا بھی غلط پڑتا تو میں نیچے گرتا جس کے بعد شاید اٹھنا نصیب نہ ہوتا کیونکہ ہارن اتنا پاس تھا کہ وہ پاؤں رکھ کر مجھے وہیں دبا دیتا مگر رسی میرے ہاتھ میں آئی اور میں ذرا بلندی تک بھی پہنچ گیا تھا۔ رسی پر گرفت مضبوط کرتے ہی میں نے پاؤں اوپر کرتے ہوئے خود کو ہارن کی پہنچ سے دور کیا اور اس کے بعد پھرتی سے نیچے رہ جانے والی رسی بھی سمیٹ لی۔ جب تک ہارن سنبھل کر میری طرف آتا میں یہ دونوں کام کر چکا تھا۔ اس نے ہاتھ چلائے اور اوپر کی طرف بھی اچھلا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ مجھ سے چند انچ ہی دور رہ گئے تھے۔ میں نے مارٹ سے کہا۔ ''اس مصیبت کو دور کرو، میں اوپر نہیں چڑھ سکتا جب تک یہ نیچے ہے۔''

مارٹ نے تیر کمان پر کھینچا ہوا تھا۔ میری بات سن کر اس نے تاک کر ہارن کی گردن کا نشانہ لیا اور تیر اس کی گردن سے ذرا نیچے اترا تھا۔ ہارن نے ڈکرانے کی بھیانک آواز نکالی اور ذرا پیچھے ہوا تھا۔ مجھے موقع ملا تو میں اوپر گیا اور اب میں ہارن کی پہنچ سے باہر تھا مگر مزید اوپر چڑھنے کے لیے مجھے سیدھا ہونا تھا اور اس صورت میں وہ میری ٹانگ پکڑ کر کھینچ سکتا تھا۔ مارٹ نے کہا۔ ''آپ حرکت مت کریں..... تم تینوں مل کر رسی کھینچو۔'' دوسرا جملہ اس نے فصیل کے اندر والی پارٹی سے کہا تھا۔ وہ رسی کھینچنے لگے اور میں آسانی سے اوپر جانے لگا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے میرے ہاتھ فصیل تک پہنچ گئے تھے۔ میں ہارن سے محفوظ ہو گیا تھا مگر اس دوران میں اس نے ایک اور زاویے سے حملہ کیا تھا۔ مارٹ نے بروقت مجھے ہوشیار کیا۔ ''بچیں وہ پتھر مار رہا ہے۔''

میں نے ہاتھوں کے بل خود کو پوری قوت سے اوپر اچھالا اور پتھر نیچے فصیل سے ٹکرایا۔ دھماکے کی آواز نے بتایا کہ پتھر خاصا بڑا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور پاؤں دوسری طرف کرتے ہوئے میں لٹک گیا تھا۔ مارٹ بھی پھرتی سے نیچے لٹک گیا تھا۔ اس کا خطرہ تھا کہ ہارن مزید پتھر پھینک سکتا تھا اس لیے میں نے اندر والوں سے کہا۔ ''دیوار کی آڑ میں آ جاؤ۔''

وہ سب دیوار کی آڑ میں ہو گئے تھے۔ میں نے نیچے دیکھا یہاں ہلکی سی روشنی تھی اور ہم ایک چھوٹے سے باغ میں تھے۔ یہ باغ چھوٹے درجے کے پجاریوں اور ملازمین کی رہائش گاہ والی عمارت کے پیچھے تھا۔ یہاں پھلدار درخت اور پھولدار پودے لگے ہوئے تھے۔ زمین پر نرم گھاس تھی۔ میں ایک پودے کے عین اوپر لٹک رہا تھا اس

لیے میں نے فصیل چھوڑ دی اور پودے پر آرام سے اتر گیا۔ خوش قسمتی سے اس میں کانٹے نہیں تھے۔ مارٹ بھی نیچے آ گیا تھا۔ فصیل کے باہر سے ہارن کے غرانے اور ڈکرانے کی آواز آ رہی تھی مگر فصیل کی بلندی کی وجہ سے یہ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ میں نے سرگوشی میں سب کی خیریت دریافت کی۔ ربیک میرے پاس آیا اور مجھے ٹٹولتے ہوئے بولا۔ ''خیریت تو آپ کی پوچھنی چاہیے۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟''

جہاں ہارن نے ہاتھ مارا تھا وہ جگہ دکھ رہی تھی مگر یہ دکھن اتنی نہیں تھی کہ میں بے قرار ہو جاتا۔ میں اسے نظر انداز کر رہا تھا اور مجھے امید تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کم ہو جائے گی۔ جھاڑی پر گرنے اور پھر اس کے بعد کی کشمکش میں کچھ چوٹیں اور خراشیں آئی تھیں مگر یہ قابلِ ذکر نہیں تھیں۔ البتہ حلیہ خراب ہو گیا تھا۔ مارٹ بھی بخیریت نیچے اتر آیا تھا۔ انہوں نے رسیاں اور اپنا سامان سمیٹ لیا تھا۔ ذرا سی دیر کی اس کشمکش نے میرا گلا خشک کر دیا تھا۔ میں نے چھاگل سے چند گھونٹ لیے اور عمارت کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ تین منزلہ عمارت تھی جو تقریباً سو فٹ چوڑی تھی اور اس کا عرض شاید چالیس فٹ تھا۔ کھڑکیوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہر فلور پر پیچھے کی طرف دس کمرے تھے اگر سامنے بھی اتنے ہی کمرے تھے تو یہاں کل ساٹھ کمرے ہو سکتے تھے۔ اگر ایک کمرے میں دو افراد رہائش رکھتے تھے تو کل تعداد ایک سو بیس یا سو تک بھی تھی۔ مگر مسئلہ یہاں موجود افراد نہیں تھے بلکہ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی تھی۔ ان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ابرام نما معبد میں ہوں گے۔ میں نے کہا۔

''ہمیں معبد تک جانا ہے لیکن اس سے پہلے اس عمارت کا جائزہ لینا ہے اور ممکن ہو تو اس پر قبضہ کرنا ہے۔''

''اس میں موجود افراد کا کیا کرنا ہے؟'' ربیک نے سوال کیا۔

''ہمیں فی الحال ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں سے غرض ہے۔'' میں نے پالیسی واضح کی۔ ''ان کے علاوہ صرف اس سے نمٹنا ہے جو ہمارے راستے میں آئے۔ مگر نہ تو کسی کو چھیڑنا ہے اور نہ ہی کسی کی مدد کرنی ہے۔ اصل افراد تک پہنچنے تک خاموش رہنا لازمی ہے۔ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنا ہے۔''

''ہم سمجھ گئے جناب۔'' ایرٹ نے میری بات کا [illegible] کر کے کہا۔ ''ہمیں ڈیوڈ شا اور اس کے آدمیوں کا حلیہ بتائیں تاکہ سامنا ہونے پر انہیں پہچان سکیں۔''

ایرٹ نے اچھا نقطہ اٹھایا تھا۔ میں نے انہیں تفصیل سے ڈیوڈ شا، کرنل جونز، وزیبی اور باسو کا حلیہ بتایا۔ پھر ان کے پاس موجود جدید ہتھیاروں کی ساخت اور ان کی تباہ کاری کے بارے میں بتایا۔ وہ حیرت سے ان ہتھیاروں کے بارے میں سن رہے تھے جو ان کے نقطۂ نظر سے جادوئی تھے۔ بم کے بارے میں وہ سن کر خوف زدہ ہوئے تھے مگر یہ عمومی خوف تھا۔ میں نے احتیاطی تدابیر بھی بتائیں۔ وہ سن رہے تھے اور ذہن نشین کر رہے تھے۔ میرا کرتا اس کشمکش کے دوران جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ خاص طور سے ایک آستین یوں بیکار ہوئی تھی کہ بس لٹک رہی تھی میں نے اسے کھینچ کر نکال دیا۔ ایک آستین کے ساتھ میں عجیب لگ رہا تھا۔ کرتے کا دامن بھی سامنے سے یوں چاک تھا کہ اس کے دو حصے ہو گئے تھے۔ مگر میں کسی تقریب میں نہیں آیا تھا جو لباس کی پرواہ کرتا۔

باہر سے ہارن کی آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ مارٹ نے مجھے بتایا کہ جب میں پرندوں کے پیچھے سے دیوار پر چڑھ رہا تھا تو انہوں نے مجھ پر کانٹے برسانے کی کوشش کی تھی اور مارٹ نے ان میں سے ایک کو تیر سے نشانہ بنایا تو وہ دونوں ہی ڈر کر جھاڑیوں میں گھس گئے تھے۔ لیکن وہ ہٹے تو ہارن کو حملہ کرنے کا اسے بھی مارٹ نے عین موقع پر نشانہ بنایا۔ درحقیقت اس نے دو بار میری جان بچائی تھی۔ دونوں مواقع پر میں مارا جاتا اگر وہ بروقت تیر نہ چلاتا۔ مگر یہ شکریے کا موقع نہیں تھا ہم سب ایک دوسرے کے لیے یہی کرتے جو مارٹ نے کیا تھا۔ ہم دبے قدموں اور پودوں اور درختوں کی آڑ لیتے ہوئے عمارت کی طرف بڑھے۔ ساری کھڑکیاں بند تھیں مگر چند ایک کی جھریوں سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اگر اندر روشنی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ کچھ لوگ بھی تھے ورنہ روشنی کون کرتا۔

سوال یہ تھا کہ یہ لوگ وہاں کس صورت میں تھے؟ یعنی آزاد تھے یا پھر یہاں قید کیے گئے تھے؟ یہاں عمارت کے پہلوؤں والے حصے میں مشعلیں روشن تھیں اور ان کی روشنی کسی قدر پیچھے بھی آ رہی تھی۔ مجھے ڈیوڈ شا سے اس رحم کی توقع نہیں تھی کہ اس نے کسی کو زندہ چھوڑا ہوگا اور اگر اس نے زندہ چھوڑا ہوگا تو اس کے پیچھے یقیناً کوئی مقصد ہوگا۔ معبد کے احاطے میں رن وے بنانے سے یہ تو واضح تھا کہ جلد یا بدیر باہر سے ڈیوڈ شا کے مزید ہرکارے یہاں آنے والے تھے۔ اگرچہ وہ چار ہی کم نہیں تھے لیکن مزید

لگ آنے کے بعد اس کا مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہیں رہ جائے گی۔ اس عمارت کے سامنے ایک چھوٹے باغ اور روش کے بعد اہرام نما معبد تھا۔ اس کے عقب میں وہ طویل اور مستطیل میدان تھا جو ہمارے دائیں طرف تک آرہا تھا۔ سامنے معبد کا خوب صورت اور وسیع باغ تھا جس کے پاس گودام اور قید خانے والی عمارت تھی جس میں ہارن بھی موجود تھا۔ باغ کے سامنے آرگون سے آنے والی سرنگ کا دہانہ تھا۔

اب میں کسی قدر سمجھ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا نے ریناٹ اور اس کے آدمیوں کو کیوں ہمارے رحم وکرم پر چھوڑا اور وہاں سے نکل گیا تھا۔ اس نے معبد کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ یہاں وہ خاموشی سے رن وے تیار کرا سکتا تھا جب کہ آرگون میں یہ کام ممکن نہیں تھا وہاں اسے بہت سے افراد کا سامنا کرنا پڑتا جب کہ معبد میں بہت کم لوگ تھے اور وہ زیادہ تر زندگی سے پیار کرنے والے وان میں مرنے مارنے والے کم تھے اور ایسے لوگوں سے نمٹنا مشکل کام نہیں تھا۔ یہاں کے حالات سے لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا کو یہاں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی اور اس کا بھی امکان تھا کہ پجاری اور دوسرے لوگ لائن بدل کر ڈیوڈ شا کی طرف ہو گئے ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے یہاں مارا ماری کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ جس حد تک بھی میں نے درخت کے اوپر سے اور پھر اندر آنے کے بعد دیکھا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ یہاں شرافت سے ہتھیار ڈالے گئے تھے اور اگر یہاں موجود افراد مارے بھی گئے تھے تو ڈیوڈ شا نے نہایت سکون سے ان کا خاتمہ کیا ہوگا۔

میں اور میرے ساتھی عمارت کی پہلی منزل کی عقبی کھڑکیوں کو دیکھ رہے تھے اگر ان میں سے کوئی کھلی ہوتی تو ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ بہ ظاہر ساری ہی کھڑکیاں بند تھیں۔ مگر مجھے امید تھی کہ کوئی نہ کوئی کھڑکی کھلی مل جائے گی اس کے لیے ہم زور آزمائی بھی کر رہے تھے مگر اس طرح کہ آواز پیدا نہ ہو۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا جب ایک کھڑکی بغیر زور آزمائی کے بلاو با آسانی کھل گئی۔ کیونکہ اس کی چٹخنی اندر سے ٹوٹ گئی تھی اور اس کے کواڑ بھنسے تھے اس لیے بہ ظاہر وہ مضبوطی سے بند تھی۔ کسی نے چٹخنی ٹھیک کرنے پر توجہ بھی نہیں دی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور سرگوشی میں کہا۔ ”کام بن گیا ہے پہلے میں جاتا ہوں جب تک میری طرف سے اجازت نہ ملے کوئی اندر نہ آئے اور پوری طرح ہوشیار رہنا۔“

ریبک نے سر ہلایا۔ میں اچک کر کھڑکی پر چڑھا اور اندر کود گیا۔ اندر تاریکی تھی مگر فوراً ہی مجھے محسوس ہوا کہ وہاں کوئی تھا۔ سانس کی آواز آرہی تھی اور پھر ایک سہمی نسوانی آواز نے کہا۔ ”کون ہے۔“

”روبیر۔“ میں نے بے ساختہ کہا تو کمرے کے تاریک گوشے سے ایک ہیولہ سا اٹھا اور مجھ سے آکر لپٹ گیا۔ وہ روبیر ہی تھی جو رو رہی تھی اور مجھے ٹٹول رہی تھی۔

”شہباز...... شہباز...... یہ آپ ہیں؟“

میں نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ہاں لیکن آہستہ بولو۔ کسی تک آواز نہ جائے۔“

ہیجان سے اس کا نازک جسم کانپ رہا تھا اور وہ مجھ سے لپٹی جا رہی تھی۔ اس وقت میں اس کا فطری ردعمل یہی تھا کہ اتنے دن بعد دشمن کی قید میں اسے کوئی اپنا ملا تھا۔ میں نے تسلی دینے کے لیے اس کی پشت کو تھپکا اور سرگوشی میں کہا۔ ”خود پر قابو پاؤ۔“

مگر اس نے قابو پانے کے بجائے یہ کیا کہ بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور میرے کان کے قریب ہونٹ لا کر بولی۔ ”نہیں پا سکتی، میری خواہش تھی کہ ایک بار آپ کو دیکھ لوں اس کے بعد بے شک مجھے موت آجائے۔“

حالات کی سنگینی اور موقع کی نزاکت نہ ہوتے ہوئے بھی میں روبیر کے الفاظ، اس کے لہجے اور خود میں پیوست لرزتے بدن میں چھپے پیغام کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے دل ہی دل میں بے ساختہ لاحول پڑھی۔ زمانے کے سرد وگرم نے مجھے بہت سے دوسرے معاملات کی طرح عورت کے معاملے میں بھی تجربہ کار کر دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب عورت کسی مرد کو یوں اپنے وجود سے روشناس کراتی ہے تو اس کے پس پشت کیا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا انداز بہت بے ساختہ تھا، مگر ساتھ ہی خود سپردگی کا بہت طاقتور جذبہ بھی کارفرما تھا۔ میں نے اسے خود سے جدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال مرنے کی بات مت کرو۔ ہم نے بڑی حد تک کامیابی حاصل کر لی ہے اور امید ہے کہ جلد وادی کے حالات ہمارے قابو میں ہوں گے۔“

میری کوشش سے زیادہ الفاظ نے اسے مجبور کیا اور وہ بادل ناخواستہ مجھ سے الگ ہوئی تھی۔ ”آپ یہاں کیسے آئے؟“

”یہ لمبی کہانی ہے مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے آئیں اور کیا تم یہاں قید ہو؟“

”ہاں۔“ وہ مغموم ہو گئی اور پھر سسکی سی لی۔ ”میں نے دھوکا کھایا۔ جسے محبوب سمجھا تھا وہ مکار نکلا اس نے مجھے استعمال کیا۔“

”شاہین۔“ میں نے افسوس سے کہا۔ ”اس نے تم جیسی معصوم لڑکی کو دھوکا دیا۔“

”ہاں وہی ان سپاہیوں کو لایا تھا جنہوں نے حملہ کر کے ہمارا ٹھکانہ تباہ کیا اور مجھے زبردستی ساتھ لے گئے۔ تب مجھے پتا چلا کہ اس نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ اپنی اس خدمت گزاری کے صلے میں وہ ریناٹ کی خاص فوج میں اعلیٰ افسر بن گیا ہے۔“

اگرچہ مجھے پہلے بھی اس فلمی قسم کی محبت پر یقین نہیں آیا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے اندر کھٹک سی تھی کہ شاہین شاید روبیر سے مخلص نہ ہو جو اس کے وہ کچھ کر گزری تھی جو کوئی لڑکی شاید ہی کر سکے۔ میں نے روبیر سے کہا۔ ”تم پر جو گزری میں بعد میں سنوں گا پہلے یہ بتاؤ کہ تم یہاں کے حالات سے واقف ہو؟“

”کسی حد تک۔“ اس نے جواب دیا۔ ”کل یہاں کوئی تبدیلی آئی ہے۔ باہر شور ہوا تھا اور بہت ہنگامہ ہوا پھر خاموشی چھا گئی۔ ایسا لگا جیسے بہت سے لوگوں کو لا کر اس جگہ بند کیا گیا ہو۔“

”آرگون پر ہمارا یعنی میرا اور شہر کے اندر موجود حریت پسندوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ لیکن معبد پر ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کا قبضہ ہے۔ وہ کل یہاں آئے تھے۔“

”آپ کے دشمن؟“ روبیر حیران ہوئی تھی۔

”ہاں اور اب وہ یہاں باہر سے مزید آدمی اور اسلحہ منگوائیں گے جن سے مقابلہ کرنا یہاں کے لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوگی۔“

”وہ لوگ کہاں ہیں؟“

”میرا خیال ہے کہ معبد میں ہیں۔“

”مگر وہ باہر سے لوگ اور اسلحہ کیسے منگوائیں گے؟“

”یہ بات تم نہیں سمجھو گی۔ مگر وہ منگوا سکتے ہیں اور انہوں نے اسی لیے معبد پر قبضہ کیا ہے۔“ میں نے کہتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے بند تھا۔ لازمی بات ہے اسے بند ہی ہونا چاہیے تھا۔ مگر تعجب کی بات ہے کہ کھڑکی کھلی تھی میں نے روبیر سے پوچھا۔ ”تمہیں پتا نہیں تھا کہ کھڑکی کھل سکتی ہے؟“

”مجھے معلوم ہے لیکن میں یہاں سے کہاں جا سکتی تھی۔ کوئی یہاں سے فرار ہو کر کہاں جا سکتا ہے۔ میں نے دو بار کوشش کی مگر پکڑی گئی اور مجھے سزا ملی تھی۔ انہوں نے میری پشت ادھیڑ دی تھی، یہ دیکھیں......“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی پشت پر رکھا جہاں مندمل ہوتے زخموں کا کھردرا پن موجود تھا۔ میں نے ہاتھ واپس کھینچا اور نرم لہجے میں کہا۔

”تم فکر مت کرو جب ہم ان پر حاوی ہوں گے تو سب سے حساب لیا جائے گا۔“ میں نے کہا اور اس کا بازو پکڑ کر کھڑکی تک آیا۔ ریبک پہلے ہی اندر جھانک رہا تھا اور اس نے روبیر کو دیکھ لیا۔ اسی نے سہارا دے کر اسے نیچے اتارا۔ جب میں کود کر باہر آیا تو وہ سب گرم جوشی سے اس سے مل رہے تھے اور اس کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ روبیر خوش تھی پھر اس نے راشتون کا پوچھا اور اس کی موت کا سن کر دکھی ہو گئی تھی۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر انہیں یاد دلایا۔ ”ہمیں عمارت کے اندر جانا ہے۔“

”حکم کریں جناب۔“ ایٹ نے مستعد ہو کر کہا۔ وہ روبیر کو زندہ دیکھ کر زیادہ ہی خوش ہو رہا تھا۔ خاصی کم روشنی میں بھی اس کی خوشی بہت واضح تھی۔ میں نے باقی رہ جانے والی دو کھڑکیاں چیک کیں اور وہ اندر سے بند ملی تھیں۔ ریبک نے تجویز پیش کی۔

”ہم آگے سے جا سکتے ہیں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس طرف سے جانا مناسب نہیں ہوگا۔ وہاں نگرانی کا خطرہ ہے۔“

”ہم دیکھ کر جائیں گے اور نگرانی کرنے والوں کو قابو کیا جا سکتا ہے۔“

”تم نہیں جانتے ہو یہ اس قسم کی نگرانی ہوگی جو بغیر آدمی کے ہی کی جا سکتی ہے۔ ہمیں دیکھ لیا جائے گا اور ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا۔“

انہیں میری بات پر تعجب ہوا تھا مگر انہوں نے اسے تسلیم کر لیا کہ میں کہہ رہا تھا۔ میں نے دیوار کے کنارے سے جھانک کر دیکھا۔ اس عمارت کے پہلو میں ایک چھوٹی سی خالی جگہ تھی اور پھر سپاہیوں کے لیے بیرک نما رہائش تھی۔ اس کے سامنے وسیع احاطہ تھا جس کے بیچ میں گول یا بیضوی باغ تھا اور اس باغ کے ایک طرف سرنگ سے آنے والا راستہ نکل رہا تھا اور دوسری طرف اہرام نما معبد تھا۔ اسی اہرام نما معبد تلے نہ صرف بڑے قید خانے تھے بلکہ یہیں اعلیٰ پجاریوں کی رہائش کا انتظام بھی تھا۔ سب سے خوفناک عمارت وہ تھی جو اصل میں گودام بھی تھی اور اس کے نیچے تہ خانے کے اندر ایک کنوئیں میں ہارن قید تھا جس کے سامنے پجاریوں کے معتوبوں کو پھینکا جاتا تھا اور وہ انہیں چیر پھاڑ کر

رکھ دیتا تھا۔ یہ سب یہاں سے نظر آ رہا تھا۔

مگر جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہاں لکڑی کے کھمبے نصب تھے جن پر مشعلیں جل رہی تھیں۔ ان مشعلوں کی روشنی سے ظاہر تھا کہ وہاں نگرانی کا کوئی بندوبست کیا گیا ہے۔ ورنہ جیسے یہاں روشنی نہیں کی گئی تھی وہاں بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ روشنی کرنے کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ کوئی ان کی نظروں میں آئے بغیر معبد کی عمارت میں داخل نہ ہو سکے۔ اس لیے میں پہلے اس عمارت کے اندر داخل ہونا چاہتا تھا۔ مگر یہاں ایک ہی کھڑکی کھلی تھی اور اس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے روبیر سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں مستقل بند رکھا جاتا ہے؟''

''نہیں دروازہ صرف رات میں باہر سے بند ہوتا ہے۔ صبح اسے کھول دیا جاتا ہے۔''

''تم دن میں باہر آ جا سکتی ہو؟''

''نہیں یہاں ہر راہداری میں ایک نگران ہوتا ہے اگر مجھے کہیں جانا ہوتا ہے تو اس کی نگرانی میں جاتی ہوں۔ مگر عمارت سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''فرض کرو تمہیں رات کو جانا ہو کسی ضروری وجہ سے تب تم کیا کرو گی؟''

روبیر میری بات کا مفہوم سمجھ گئی تھی اس نے جھجک کر کہا۔ ''میں دروازہ بجا کر رات کے نگران کو بلاتی ہوں اور وہ مجھے اپنی نگرانی میں لے جاتا ہے۔''

میں نے فوری فیصلہ کیا۔ ''تب تم یہی کرو گی۔ اندر چلو۔''

میں اور روبیر دوبارہ کمرے میں آئے۔ یہ رہائشی عمارت تھی قید کے لیے مخصوص نہیں تھی اس لیے یہاں خاص انتظامات بھی نہیں تھے۔ قید خانے والی عمارت میں اتنے لوگ نہیں آ سکتے تھے اور پھر اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ڈیوڈ شا اینڈ پارٹی کے خیال میں یہ خطرناک لوگ نہیں تھے۔ دوسرے وہ اس جگہ سے نکل کر کہاں جاتے۔ پھر سب کو دو یا تین عمارتوں میں رکھنے کے بجائے انہوں نے بہتر سمجھا کہ انہیں ایک ہی عمارت میں رکھا جائے۔ میں نے کھڑکی بند کر کے سرگوشی میں پوچھا۔ ''رات کو یہاں روشنی نہیں کی جاتی ہے؟''

''کی جاتی ہے دیوار میں ایک لیمپ لگا ہوا ہے مگر آج اسے جلانے کے لیے کوئی نہیں آیا۔''

''یہ اچھی بات ہے۔ اندھیرا مناسب ہے۔ جب تم اس کے ساتھ باہر جاتی ہو تو کیا وہ دروازہ پھر بھی باہر سے بند کرتا ہے؟''

''نہیں میرے باہر ہونے کی وجہ سے اسے ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔'' روبیر نے جواب دیا۔ میں سوچ رہا تھا اور ایک لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے تم دروازہ بجاؤ۔''

میں کھڑکی پہلے ہی بند کر چکا تھا۔ جب میں دروازے کے عقب میں دیوار سے لگ گیا تو روبیر نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد اس نے دوسری دستک دی تو باہر سے کرخت آواز آئی۔ ''کیا بات ہے؟''

''مجھے حاجت ہو رہی ہے۔'' روبیر نے جواب دیا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ پٹ میری طرف آیا تھا اس سے پہلے کہ نگران اندر آتا یا جھانکتا روبیر خود باہر نکل گئی۔ اس نے دروازہ کھینچ کر بھیڑ لیا اور نگران سے بولی۔ ''جلدی کرو۔''

روبیر نے ظاہر کیا تھا کہ اسے عجلت ہے۔ نگران اسے لے گیا۔ ان کے قدموں کی چاپ مدھم ہوئی تو میں نے دروازہ ذرا سا کھول کر باہر جھانکا۔ وہ بائیں طرف ایک راہداری میں مڑ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوئے۔ میں باہر آ گیا۔ یہاں راہداری میں آمنے سامنے کمرے تھے۔ دونوں طرف سروں پر مشعلیں روشن تھیں۔ میں نے ایک دروازے پر طبع آزمائی کی مگر وہ اندر سے بند تھا۔ چند دروازے دیکھنے کے بعد میں نے بہتر سمجھا کہ اس پلان پر عمل کروں جو میں نے سوچا ہوا تھا۔ میں راہداری کے سرے تک آیا اور اس سمت میں جھانکا جہاں روبیر اور نگران گئے تھے۔ یہ راہداری عمارت کے باہر کی طرف ایک دروازے پر کھل رہی تھی۔ مگر نگران اس سے پہلے ہی ایک جگہ کھڑا ہوا تھا اور یہ غالباً اس عمارت کا واش روم والا حصہ تھا۔ میں نے آرگون کے قید خانے کا واش روم دیکھا تھا اور وہ خاصا صاف ستھرا اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تھا۔ یہ رہائشی عمارت تھی اس لیے یہاں کا بھی کم سے کم اس معیار کا ہونا چاہیے تھا۔

خوش قسمتی سے نگران باہر کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے جھانکتے نہیں دیکھ سکا۔ نگران کی یہاں موجودگی ثابت کر رہی تھی کہ ڈیوڈ شا نے مقامی نظام کو اپنا تابعدار بنا لیا تھا اور اب معبد کے لوگ اس کے لیے کام کر رہے تھے۔ اگر سب نہیں تھے تب بھی کچھ لوگ اب ڈیوڈ شا کے ساتھ تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس نے گنے چنے

افراد کو ساتھ ملایا ہوگا اور باقی افراد فی الحال قید میں تھے۔ اگر زیادہ لوگ اس کے ساتھ ہوتے تو احاطے میں ویرانی نہ ہوتی۔ اس نے یقیناً اکثر افراد کو قید کر دیا تھا یا پھر ان سے مستقل چھٹکارا حاصل کر لیا تھا۔ وہ اس فطرت کا آدمی تھا جسے انسان صرف اپنی غلامی کے لیے ہی زندہ درکار ہوتے تھے ورنہ ان کا وجود بیکار تھا۔ روبیر کچھ دیر بعد واش روم سے نکلی اور اس کے ساتھ اس طرف آنے لگی۔ میں تیار تھا۔ روبیر آگے تھی۔

جیسے ہی وہ ذرا آگے نکلی میرا گھومتا ہوا ہاتھ اس کے پاس سے گزرا اور نگران کے حلق سے ٹکرایا۔ فطری طور پر اس کی سانس اور آواز دونوں بند ہو گئی تھی۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ گلے پر رکھا اور میں نے اطمینان سے اس کی کنپٹی پر گھونسا مار کر اسے لٹا دیا۔ اس کے پاس ایک عدد نیزہ تھا جو میں نے گرنے سے پہلے پکڑ لیا۔ اس کی بے ہوشی کا اطمینان کر کے میں نے اسے ٹانگوں سے پکڑا اور کھینچ کر روبیر والے کمرے میں لے آیا۔ روبیر ذرا پریشان ہوئی تھی مگر اب مطمئن تھی۔ میں نے اسے روشنی میں دیکھا۔ پشت کے زخموں سے قطع نظر وہ ٹھیک ٹھاک دکھائی دے رہی تھی اور اس کا لباس بھی مناسب تھا اگرچہ اس کا کرتہ طویل نہیں تھا بلکہ بمشکل اس کے کولہوں تک آ رہا تھا۔ آستین بھی کہنیوں سے اوپر تھی۔ اسے کرتے کے بجائے قمیص کہنا زیادہ مناسب تھا۔

پھر بھی یہ روبیر کی ستر پوشی کے لیے کافی تھا۔ شاید یہاں قیدیوں کو اتنا ہی لباس دیا جاتا تھا۔ اس کے پیروں میں چمڑے سے بنی ہوئی فیتوں والی چپل تھی جو اس کے گلابی پیروں میں اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے ریشمی بال ایک ریشمی سے کپڑے سے پونی ٹیل کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ خود پر پڑنے والی صعوبتوں سے قطع نظر اس کی صحت اچھی تھی۔ میں نے کمرے میں آنے سے پہلے اس کا معائنہ کر لیا اگرچہ یہ سرسری تھا مگر اس نے محسوس کر لیا اور اندر آنے کے بعد سرگوشی میں بولی۔ ''مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں۔''

''دیکھ رہا ہوں کہ تم ٹھیک ہو یا نہیں۔''

''تو پھر کیسی لگی؟'' اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی آ گئی۔

''اچھی لگ رہی ہو۔'' میں نے نگران کو فرش پر لٹایا اور پھر روبیک سے رسی لے کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اسے بنڈل کی صورت میں کھڑکی سے باہر پارسل کیا۔

روبیر میرے عام سے لہجے پر خاموش ہو گئی تھی شاید اسے اتنے سپاٹ سے جواب کی توقع نہیں تھی۔ مگر میں یہاں اس کی توقعات پوری کرنے نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں رکنے اور یہاں کی نگرانی کرنے کو کہا۔ اگر عمارت میں کوئی ہنگامہ ہو تو وہ فوری ہمیں مطلع کر سکے۔ اس نے مضطرب لہجے میں کہا۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''اس سے پوچھ گچھ کرنے اور یہ کام یہاں نہیں ہو سکتا ہے۔'' میں نے نگران کی طرف اشارہ کیا جو اب خود ہمارا قیدی بن گیا تھا۔ میں کھڑکی سے باہر نکلا تو روبیر نے کھڑکی بند کر لی۔ ہم نگران کو لے کر باغ کے بعید ترین حصے میں آئے اور پہلے اس کے منہ میں بھی ایک کپڑا ٹھونس دیا۔ وہ تقریباً تیس بتیس برس کا جوان آدمی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے وار کا اس پر زیادہ اثر نہیں ہوا تھا اور میں نے قوت بھی کم رکھی تھی اس لیے اب وہ کسمسانے لگا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی مشعل جلا لی اور ان چاروں سے کہا کہ وہ ہمیں گھیر لیں تاکہ مشعل کی روشنی دور سے نظر نہ آئے۔ انہوں نے یوں ہمارا احاطہ کر لیا کہ اب آسمان بھی مشکل سے نظر آ رہا تھا۔ میں نے مشعل کے شعلے پر نگران کے ایک ہاتھ کی انگلی رکھی تو وہ بلبلا کر ہوش میں آ گیا۔ اس نے رسی سے بندھے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی مگر میری گرفت کمزور نہیں تھی۔ چند سیکنڈ اور اس کی انگلیوں نے براہِ راست حرارت محسوس کی تو وہ تڑپنے لگا تھا۔ میں نے مونا نے پر اس کا ہاتھ چھوڑا اور روبیک کے توسط سے کہا۔

''تم سمجھ گئے ہو کہ تم مکمل طور پر ہمارے قبضے میں ہو اور ہم چاہیں تو اسی طرح تمہیں تھوڑا تھوڑا جلا کر مار سکتے ہیں۔''

اس خوفناک دھمکی پر اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں کیونکہ وہ اس سزا کو تھوڑا سا بھگت چکا تھا۔ وہ زور زور سے سر اثبات میں ہلانے لگا اور اس کا انداز التجا آمیز تھا۔ روبیک نے اس کا منہ کھولنے سے پہلے اپنا سنگی خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا اور بولا۔ ''اگر تمہاری آواز ذرا بھی بلند ہوئی تو دوسرے لمحے تمہاری گردن کٹ جائے گی۔''

اس بار اس نے احتیاط سے نفی میں سر ہلایا یعنی وہ آواز نہیں نکالے گا اس کے باوجود ہم پوری طرح محتاط تھے آدمی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ کب وہ احمقانہ انداز میں خودکشی پر تل جائے۔ میں نے اس کے منہ میں ٹھنسا کپڑا نکالا۔ اس نے چند گہرے سانس لیے اور بولا۔ ''میں بتاؤں گا مجھے مت مارنا۔''

"تم عقل مند آدمی ہو۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "پہلے تو یہ بتاؤ کہ تم کو اس عمارت کا نگران کس نے مقرر کیا؟"

"مہا پجاری آئی زور نے۔" اس نے جواب دیا۔

"وہ کب سے مہا پجاری بنا ہے؟"

"مہا پجاری فیرون کے مرنے کے بعد۔" اس نے جواب دیا۔

میرے پاس جاننے کا ذریعہ نہیں تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے یا نہیں اس لیے میں نے سوالات جاری رکھے۔ "کل یہاں کچھ اجنبی لوگ آئے اور اس کے بعد یہاں گڑبڑ ہوئی تھی۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں نے ایسے لوگ کبھی نہیں دیکھے ان کے پاس آگ اگلنے والے ہتھیار تھے اور انہوں نے دیکھتے ہی دیکھتے معبد کے تمام سپاہیوں کو ختم کردیا۔"

یعنی یہاں ہنگامہ ہوا تھا۔ مگر وہ بہت مختصر وقت کے لیے ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"پھر مہا پجاری آئی زور کے حکم پر سب نے ہتھیار ڈال دیئے اور ان لوگوں کی اطاعت قبول کرلی۔ مرنے والوں کو دفنا دیا گیا اور اس کے بعد تمام لوگوں کو اس عمارت تک محدود کردیا گیا۔ کوئی باہر نہیں جاسکتا ہے۔ میں بھی اس عمارت سے باہر نہیں جاسکتا۔"

"یہاں اکثر کمروں کے دروازے باہر سے بند ہیں کیا ان میں موجود لوگ قید ہیں۔"

"قید نہیں ہیں مگر انہیں باہر جانے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ رات کے وقت ان کے کمرے باہر سے بند کردیئے جاتے ہیں۔"

میرا اندازہ درست نکلا تھا کہ پجاری ٹولہ ڈیوڈ شا کے ساتھ مل گیا تھا اور اسے ایسا ہی کرنا تھا وہ ہر کمزور کے لیے فرعون مگر ہر طاقتور کے آگے جھک جانے والے تھے۔ معبد کے ناکارہ سپاہی مارے گئے تھے۔ ڈیوڈ شا نے شاید انہیں زندہ چھوڑنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مگر باقی افراد زندہ اور قید میں تھے۔ قید میں رکھنے کی وجہ بھی تھی۔ ڈیوڈ شا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کے اصل عزائم سے واقف ہوں کہ وہ باہر سے کمک منگوانے جارہا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ کمک کب یہاں آئے گی؟ کیا آج ہی رات طیارے اس وادی میں داخل ہوں گے اور یہاں اتریں گے؟ جب ہم فصیل کے پار آئے تو ساڑھے سات کا وقت تھا اور اب آٹھ بجے ہوں گے گویا پوری رات پڑی تھی میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تمہیں علم ہے کہ معبد کو آرگون سے ملانے والی سرنگ تباہ کر دی گئی ہے۔"

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "وہ کیسے؟"

ایسا لگ رہا تھا کہ یہاں کے لوگ اس سے ناواقف تھے۔ "یہاں کل کسی وقت بہت بڑا دھماکا سنائی دیا تھا؟"

"بہت بڑا تو نہیں مگر دھماکا ہوا تھا۔"

"اسی دھماکے نے سرنگ تباہ کردی اب سرنگ سے کوئی آسکتا ہے اور نہ جاسکتا ہے۔"

نگران کا نام نارس تھا۔ اس سے سوالات سے جو صورت حال سامنے آئی وہ کچھ یوں تھی کہ کل صبح اچانک ہی آسمان سے وہ چار افراد نازل ہوئے اور انہوں نے اترتے ہی یہاں موجود سپاہیوں کا قتل عام شروع کردیا۔ انہوں نے ستر کے قریب سپاہی اور کچھ دوسرے افراد کو ہلاک کیا اور یہ سلسلہ اس وقت رکا جب آئی زور نے آکر ان کی اطاعت قبول کرلی۔ ان چاروں نے پجاریوں کو اپنے قبضے کرلیا اور باقی افراد کے لیے حکم دیا کہ وہ اس عمارت تک محدود رہیں جو شخص باہر نکلا اسے ان دیکھی موت ملے گی۔ روشنی ہونے کے بعد انہوں نے اپنی نگرانی میں لاشیں اٹھوا کر ٹھکانے لگوائیں اور اس کے بعد تمام عمارتوں کا جائزہ لیا۔ انہوں نے سپاہیوں کی بیرک اور گودام کو بند کرا دیا۔ چونکہ جس عمارت میں نگران تھا وہاں سو کے قریب افراد رہتے تھے اور یہ سب ہی خادم اور خادمائیں تھیں۔ مارے جانے والوں میں کچھ خادم بھی شامل تھے اور کچھ بچنے والے سپاہی یہاں آگئے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ پجاری بھی تھے جنہیں یہاں رکھا گیا تھا۔ اس لیے اب بھی یہاں موجود افراد کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی۔

گویا معبد میں موجود تمام افراد جو ڈیوڈ شا کے لیے فی الحال بیکار تھے مگر خطرہ بھی نہیں تھے ان کو یہاں محدود کردیا گیا تھا۔ جب کہ تمام اعلیٰ پجاری، درمیانے درجے کے پجاری اور خادمائیں اور باہر سے آنے والے سب معبد میں تھے۔ اس طرف جانے کی بھی سختی سے پابندی تھی اور ایسا کرنے والے کو سزائے موت کی دھمکی دی گئی تھی۔ لیکن یہ دھمکی نہ بھی دی جاتی تو ان میں سے کوئی اس طرف جانے کی ہمت نہ کرتا۔ اول وہ لوگ آنے والوں کی سفاکی دیکھ چکے تھے اور دوسرے اب مہا پجاری بھی ان کے ساتھ تھا اور مہا پجاری جس کے ساتھ ہوتا وہ اس کے خلاف کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حالات ڈیوڈ شا کے لیے نہایت سازگار تھے۔ مگر اسے علم

نہیں تھا کہ میں یہاں آگیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "روبیر یہاں کیوں قید ہے؟"

"یہ بات صرف شامین جانتا ہے۔ وہ اب مہا پجاری کا قریبی آدمی ہے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شامین یہاں موجود تھا اور وہ مہا پجاری یا دوسرے لفظوں میں ڈیوڈ شا کے ساتھ تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو ڈیوڈ شا کے ساتھ ساتھ اس سے حساب برابر کرنے کا موقع مل سکتا تھا مگر سب سے پہلے ہمیں ڈیوڈ شا کی سازش ناکام بنانا تھی۔ وہ اپنے آدمیوں کو بلوا رہا تھا اور اسے ہر صورت روکنا تھا۔ آرگون میں اگرچہ ہمارا قبضہ ہوگیا تھا مگر آرگون کی اصل فوج باہر تھی اور اگر وہ واپس آجاتی تو ایزاورث کے لیے چند سو سپاہیوں کے ساتھ ان ہزاروں سپاہیوں کو روکنا مشکل ہوجاتا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جلد از جلد ریاٹ تک رسائی حاصل کرکے اس کا خاتمہ کردے۔ ایک کانٹے نکلے گا تب ہی وہ دوسرا قدم اٹھا سکے گا۔ ایزاورث کی طرف سے مجھے مدد کی امید نہیں تھی۔ اسی طرح سائیرا کی طرف سے مدد کا آنا محال تھا۔ برف والے کے توسط سے اسے شاید میرے حالات کا علم ہوسکتا تھا مگر وہ خود اس وقت محاصرے کی کیفیت میں تھی۔

گویا یہاں جو کرنا تھا وہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو کرنا تھا۔ میں نے سوچ کے اس وقفے کے بعد سوالات کا نیا سلسلہ شروع کیا اب میں اس سے اس عمارت میں موجود ان افراد کے بارے میں پوچھ رہا تھا جن پر اعتبار نہیں تھا اور انہیں خاص طور سے یہاں قید کیا گیا تھا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نے دس ایسے افراد کی نشان دہی کی جن کے بارے میں حکم تھا کہ انہیں کڑی قید میں رکھا جائے اور انہیں نقل و حرکت کی آزادی نہ دی جائے چاہے دن ہو یا رات ہو۔ وہ عمارت کی سب سے اوپر کی منزل میں قید تھے۔ پوری عمارت کے ایک درجن نگران تھے جو چوبیس گھنٹے کو تین حصوں میں تقسیم کرکے ڈیوٹی دیتے تھے۔ ہر منزل کا ایک نگران تھا اور ان تینوں کا ایک نگران اعلیٰ ہوتا تھا۔ گویا وہ ان کا افسر ہوتا تھا۔ سو افراد میں صرف تین عورتیں تھیں اور یہ سب قیدی تھیں۔ تمام خادمائیں اس وقت معبد میں تھیں۔ جب کہ مرد خادموں کے وہاں داخلے پر پابندی تھی اور وہ اسی عمارت میں تھے۔ یہ ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی کی چالاکی تھی کہ انہوں نے مردوں کی صورت میں خطرے کو دور کردیا تھا اور نیچے کرد عورتوں کو رکھا تھا جن سے نمٹنا نسبتاً آسان تھا۔ نارس کے منہ میں دوبارہ کپڑا ٹھونس کر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک طرف آیا۔ میں نے کہا۔

"اب سب سے پہلے ہمیں اس عمارت پر قبضہ کرنا ہے مگر اس طرح سے کہ عمارت سے باہر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔"

ربیک نے سر ہلایا۔ "اس کے لیے ہمیں ایک ایک کرکے تمام منزلوں پر خاموشی سے قبضہ کرنا ہوگا۔"

"اس کے لیے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ ایک درجن نگران کہاں مقیم ہیں؟"

یہ سوال نارس سے کیا تو اس نے بتایا کہ تمام نگران جن کی ڈیوٹی نہیں ہوتی تھی وہ نچلی منزل کے مختلف کمروں میں آرام کرتے ہیں۔ میں نے مٹی پر عمارت کا لے آؤٹ اور کمرے بنا کر اس سے پوچھا کہ نگران کن کمروں میں ہیں؟ اس نے نشان دہی کی۔ پھر اس نے اسی پیٹرن پر اوپری منزلوں کا لے آؤٹ اور کمرے بنا کر نشان دہی کی کہ کڑی نگرانی والے قیدی کن کمروں میں تھے۔ ہم دیکھ رہے تھے اور ذہن نشین کررہے تھے۔ آخر میں نارس کو خبردار کیا گیا کہ اس کی ایک بات بھی غلط نکلی تو اسے اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے ابھی وقت ہے اگر اس نے کوئی غلط بیانی کی ہے تو بتادے۔ بعد میں معافی نہیں ملے گی۔ اس نے یقین دلایا کہ اس نے ایک لفظ بھی غلط نہیں کہا ہے۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اسے وہیں ایک درخت سے اس طرح باندھ دیا گیا کہ وہ از خود حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا اور نہ ہی کسی کو مدد کے لیے پکار سکتا تھا۔ اس کی طرف سے مطمئن ہوکر ہم عمارت کے اندر آئے جہاں روبیر بے تابی سے ہمارا بلکہ میرا انتظار کررہی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی میرا بازو پکڑ لیا۔

"اب میں آپ کے ساتھ رہوں گی مجھے اکیلے میں ڈر لگتا ہے۔"

"تم ایک بہادر لڑکی ہو اور یہ وقت حرکت کا ہے اس لیے اگر کبھی الگ ہوجاؤ تو حوصلہ مت ہارنا۔ جیسے اب ملیں ہیں ایسے ہی آئندہ بھی ملیں گے۔"

"وعدہ کرتے ہیں۔" اس نے یوں کہا کہ میرے اندر پھر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"زندگی و موت کی اس جنگ میں میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا۔ دوسرے ہمیں اس عمارت پر قبضہ کرنا ہے اس لیے تم میرے ساتھ ہی رہو گی۔"

وہ فکرمند ہوگئی۔ "یہاں بہت سے لوگ ہیں صرف

چار افراد کے ساتھ آپ کیسے یہاں قبضہ کریں گے؟"

"تم دیکھتی جاؤ۔" میں نے کہا۔ وہ چاروں بھی اندر آ گئے تھے۔ مارث اور ایمار نے تیر کمان سنبھال لیے تھے جب کہ میں، ایرٹ اور ربیک نے نیزے ہاتھ میں رکھے تھے۔ روبیر کو کمرے میں رکنے کا کہہ کر ہم باہر آئے۔ پلان سادہ تھا کہ ایک ایک کر کے ان لوگوں کو قابو کیا جائے اور باندھ دیا جائے۔ پہلا کمرا روبیر والے کمرے کی قطار میں ایک کمرے کے بعد تھا اور نارس کے مطابق اس میں دو افراد تھے۔ میں نے دروازہ چیک کیا تو وہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ دونوں نگران بے خبری کی نیند سو رہے تھے اور سر پر پڑنے والی ضربوں نے ان کی نیند کو بے ہوشی میں بدل دیا تھا۔ صرف ایک کراہا تھا مگر اس کی آواز بھی زیادہ بلند نہیں تھی۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تھے۔ اگلے کمرے میں موجود نگران اعلیٰ بھی آسانی سے ہمارے قابو میں آ گئے۔ انہیں باندھنے کے بعد ہمارے پاس رسی اب ختم ہونے والی تھی اور ہمیں مزید رسی کی ضرورت تھی۔

اس سے اگلے کمرے میں آخری دو عام نگران تھے جب کہ رات کا نگران اعلیٰ عمارت کے سامنے والے حصے میں دفتر میں موجود تھا۔ نارس نے بتایا کہ ان تین نگران اعلیٰ کو ہنگامی صورت میں معبد جانے اور مہا پجاری سے رابطہ کرنے کی اجازت تھی۔ ان کے علاوہ کسی کو عمارت سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے عام نگرانوں سے نمٹنے کی ذمے داری ایمار، مارث اور ربیک پر چھوڑی اور خود ایرٹ کو لے کر نگران اعلیٰ کے دفتر تک آیا۔ اندر روشنی تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا میں نے اسے دھکیل کر اندر جھانکا اور پھر لاحول پڑھی کیونکہ نگران اعلیٰ ایک عورت کے ساتھ بستر پر مدہوش پڑا ہوا تھا۔ عورت کا اوپری جسم چادر سے باہر تھا اور نگران اعلیٰ کی ٹانگیں کھلی ہوئی تھیں اس نے غالباً سردی لگنے پر چادر اوپری جسم پر کھینچ لی تھی۔

ہم قریب آئے تو عورت کی چھٹی حس نے اسے چونکایا۔ وہ اٹھی تھی کہ میں نے نیزہ اس کی شفاف گلابی گردن پر رکھ دیا اور وہ ساکت ہو گئی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر بستر سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی عمر زیادہ تھی شاید چالیس کے آس پاس تھی مگر صورت و شکل اور جسمانی لحاظ سے وہ دلکش تھی۔ وہ چادر تلے سے نکلی تو میں نے ایک بار پھر لاحول پڑھی اور اسے ایک طرف پڑا ہوا لباس پہننے کا اشارہ کیا۔ اس دوران میں ایرٹ نے نگران اعلیٰ کے سر سے چادر ہٹائی اور پھر ہم دونوں ہی چونک گئے تھے۔ اس کی دائیں آنکھ میں ایک چھوٹی پنسل نما لکڑی گھسی ہوئی تھی اور اس کی بائیں کھلی آنکھ میں مرنے کے بعد تعجب تھا۔ عورت بھی کہ ہم لاش کی طرف متوجہ ہیں اور اس نے بھاگنے کی کوشش کی تھی مگر میں نے بر وقت اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا اور گھماتے ہوئے اس کی گردن اپنے بازو میں یوں دبائی کہ اس کی آواز بند ہو گئی۔ اس نے ابھی تک لباس نہیں پہنا تھا۔ میں نے ایرٹ کے توسط سے پوچھا۔

"اسے تم نے قتل کیا ہے؟"

میں نے گرفت بس اتنی نرم کی کہ وہ جواب دے سکے اور اس نے کہا۔ "ہاں اسے میں نے مارا ہے۔"

"اور تم اس کے ساتھ اس حالت میں سو رہی تھیں۔"

"یہ کون سی نئی بات ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ میری گرفت میں آنے کے بعد اس نے مزاحمت ترک کر دی تھی۔ "میں اس گھٹیا شخص کے ساتھ لاتعداد راتیں سو چکی ہوں۔"

"قتل کی وجہ۔"

"بتایا تو ہے کہ گھٹیا ترین شخص تھا۔ جان بوجھ کر مجھے اذیتیں دیتا تھا۔ اس لیے آج میں نے غصے میں آ کر اسے قتل کر دیا۔ میں نے پہلے سے نہیں سوچا تھا بس آج خیال آیا تو یہ لکڑی اس کی میز سے اٹھا کر اس کی آنکھ میں گھونپ دی۔"

"تم نے اچھا کام کیا ہے اب غور سے سنو۔ ہم باہر سے آئے ہیں ہمارے آدمیوں نے آرگون پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ جلد یہاں بھی آ جائیں گے۔"

"تم سامیرا کے آدمی ہو...... لیکن یہاں کیسے آئے؟...... سرنگ والا راستہ تو بند ہو گیا ہے۔" وہ چالاک عورت تھی اور خاصی باخبر تھی۔ مجھے اس کے اعصاب کی مضبوطی پر رشک آیا کہ اس نے جسے قتل کیا تھا اسی کی لاش کے ساتھ سو رہی تھی۔

"ہم جنگل کی طرف سے آئے ہیں۔ سرنگ کا راستہ کھولنے میں کچھ وقت لگے گا۔ بہر حال جلد یہاں بھی ہمارا قبضہ ہوگا۔"

"تب میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"میں بھی یہی سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہوں گا۔"

ایرٹ کو میری بات کا ترجمہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور وہ بے ہوش ہو گئی تو میں نے اسے نگران اعلیٰ کی لاش

کے برابر میں لٹا دیا۔ اسے باندھنے کی ضرورت نہیں تھی اس لیے صرف چادر سے ڈھک کر ہم باہر نکل آئے۔ نیچے کے تمام خاص لوگ ہمارے قابو میں آ چکے تھے اب اوپر کے نگرانوں کو قابو کرنا تھا۔ نگرانوں کو قابو کرنے کے بعد ہمیں ان لوگوں کو آزاد کرنا تھا جو شاید یہاں ہونے والی تبدیلیوں کے خلاف تھے۔ مگر ہم فوری ان پر بھی بھروسا نہیں کر سکتے تھے۔ اس کا فیصلہ بعد میں کرنا تھا۔ باقی افراد کے لیے طے ہوا کہ انہیں آخری منزل کے عقبی کمروں میں بند کیا جائے گا تاکہ وہ نہ وہاں سے فرار ہو سکیں اور نہ ہی کسی کو متوجہ کر سکیں۔ میں اور ربیک دوسری منزل پر آئے۔ سیڑھیاں نگران اعلیٰ کے دفتر کے پاس سے شروع ہو رہی تھیں۔

ہم دبے قدموں اوپر آئے تھے اور یہاں کے نگران نے ہماری مشکل خود آسان کر دی تھی۔ وہ ایک طرف دیوار کے ساتھ بیٹھا ہوا سو رہا تھا۔ میں نے ربیک کو اس سے نمٹنے کا اشارہ کیا اور خود آخری منزل کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے ہی سیڑھیاں ختم ہوئیں میرا سامنا غیر متوقع طور پر نگران سے ہو گیا۔ میں تو محتاط تھا ہی وہ بھی دبے قدموں چل رہا تھا اور مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنے پاس موجود لاٹھی استعمال کرنے کی کوشش کی۔ تنگ راہداری لیے اس لاٹھی کی ضرب خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے بروقت جھکائی دی اور اسی طرح جھکے جھکے سر اس کے پیٹ میں مارا۔ لاٹھی کا وار خالی جانے سے اس کا جسم غیر متوازن ہو رہا تھا۔ میں با آسانی اسے دھکیلتا ہوا راہداری تک لایا اور دیوار سے ٹکرا دیا۔

اس نے سنبھل کر اوپر سے میری پشت پر کہنیاں ماریں اور میں نیچے گرا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ دوسرا وار کرتا میں نے اس کی ٹانگیں کھینچ لیں۔ یہاں جگہ نہیں تھی اور وہ دیوار سے لگا ہوا تھا اس لیے گرا نہیں مگر توازن کھو دیا۔ اس کی مزاحمت توڑنے کے لیے میں نے نیچے سے اس کی ٹانگوں کے درمیان مکا مارا اور اس ضرب نے اسے پہلی بار منہ کھولنے پر مجبور کیا۔ اس نے چیخ ماری تھی میں نے اس کی پروا کیے بغیر دوسرا اور پھر تیسرا وار زیادہ قوت سے کیا۔ وہ بھی کراہتا ہوا نیچے ڈھیر ہو گیا۔ اس کی تکلیف ختم کرنے کے لیے میں نے دو بار اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ ابھی تک اس کی چیخ کا کہیں سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ میں اٹھا اور اس کا کرتا اتار کر اس کی پٹیاں کر کے اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ربیک نے سیڑھیوں کی طرف سے جھانک کر کہا۔ "سب ٹھیک ہے؟"

"ہاں، اب باقی کمروں کو دیکھنا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں اسلحہ خانہ بھی ہوگا وہ ہمارے قبضے میں ہونا چاہیے۔"

ہم نیچے آئے تو ایمار اور روبیر پہلے ہی یہ کام کر چکے تھے۔ اسلحہ نگران اعلیٰ کے کمرے میں ایک الماری میں تھا۔ جب میں دفتر میں داخل ہوا تو روبیر اپنے لیے اسلحہ نکال رہی تھی۔ اس نے تیر کمان اور ایک چھوٹے سائز کی لاٹھی منتخب کی تھی۔ اسے نیزہ استعمال کرنا نہیں آتا تھا مگر وہ اچھی تیر انداز تھی۔ اس نے چادر تلے موجود عورت کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا کیا کرنا ہے؟"

"میرا خیال ہے اسے بھی قید کر دیا جائے۔"

روبیر کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ "یہ بہت خراب عورت ہے مردوں سے بہت کھلے انداز میں ملتی ہے۔"

"ابھی یہاں موجود ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسا کرو تم اسے لباس پہناؤ پھر اسے یہاں سے منتقل کرتے ہیں۔"

روبیر نے سر ہلایا تو میں کمرے سے نکل گیا۔ ایمار، مارث اور ایرٹ نگرانوں اور اعلیٰ نگرانوں کو دو کمروں میں منتقل کر دیا تھا جہاں سے وہ نکل نہیں سکتے تھے۔ مزید احتیاط کے طور پر ابھی ان کے ہاتھ پاؤں بندھے رہنے دیے گئے تھے۔ نارس کو بھی باہر سے لے آئے تھے اور اسے بھی اس کے ساتھیوں کے ساتھ بند کر دیا۔ اس کے بعد اوپری منزل پر موجود ان دس افراد کو کمروں سے نکالا گیا جن کے بارے میں نگرانوں کو ہدایت تھی کہ ان کی سختی سے نگرانی کی جائے اور ان کے کمرے دن رات بند رہتے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر کچھ حیران تھے۔ میں نے ربیک کو پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ ان سے بات کرے گا اس موقع پر میں ایک اجنبی زبان بول کر اور سربراہ بن کر ان کو بدکانا نہیں چاہتا تھا۔ ربیک نے ان سے کہا۔ "ہم سامیرا کے لوگ ہیں اور جنگل کی طرف سے یہاں آئے ہیں۔ یہاں باہر سے آنے والے لوگ معبد پر قابض ہو گئے ہیں۔"

ان میں سے ایک جوان آدمی نے سر ہلایا۔ "ہاں اور یہ بات ہمیں پسند نہیں آئی۔ مہا پجاری آئی زوران کے ساتھ مل گیا ہے اور جب ہم نے احتجاج کیا تو اس نے ہم سب کو قید کرا دیا۔"

ربیک نے کہا۔ "تم سب اپنا تعارف کراؤ اور یہاں اپنی حیثیت بھی بتاؤ۔"

وہ تعارف کرانے لگے۔ ان میں سے چھ کا تعلق پجاریوں سے تھا اور جوان آدمی جس کا نام کورن تھا وہ

مہا پجاری کے نائبین میں سے ایک تھا۔ باقی چار افراد یہاں موجود سپاہ کے افسران تھے اور وہ اس بات پر کبیدہ خاطر تھے کہ ان کے آدمیوں کا بے دریغ قتل عام ہوا اور مہا پجاری نے ناگوں سے دوستی کر لی۔ وہ بھی احتجاج کی وجہ سے معتوب قرار دے کر یہاں قید کیے گئے تھے۔ ربیک نے تعارف کے بعد کہا۔ ”اب تم لوگ فیصلہ کر لو کہ ہمارا ساتھ دینا ہے یا پھر غیر جانبدار رہنا ہے کیونکہ ہم ان غیر لوگوں کا خاتمہ کرنے آئے ہیں جو ہمارے راستے میں آئے گا وہ بھی ہمارا دشمن ہوگا۔ چاہے وہ مہا پجاری کیوں نہ ہو۔“

ربیک کی بات پر کورن کسی قدر مضطرب ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے ربیک کی بات بری لگی تھی مگر اس نے کہا۔ ”آپ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے وہ بہت خوفناک ہتھیاروں سے مسلح ہیں جو آگ اگلتے ہیں اور آدمی کے جسم میں سوراخ ہو جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے۔“

”ہم جانتے ہیں وہ کیسے ہتھیار رکھتے ہیں لیکن تم فکر مت کرو ان سے نمٹنا ہمارا کام ہے۔“

ایک فوجی افسر بولا۔ ”انہوں نے ہمارے درجنوں سپاہی لمحوں میں مار دیے تھے۔ تم چند افراد کیا کر لو گے۔“

ربیک نے بے پروائی سے کہا۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ ہم کتنے ہیں اور ہمارے پاس کیا ہے۔ ہم جنگل سے گزر کر آئے ہیں جو ہارن اور اسمار سے بھرا ہوا ہے۔ کیا کوئی عام دستہ وہاں سے گزر سکتا ہے؟“

فوجی افسر اپنے طنز پر شرمندہ ہو گیا تھا۔ کورن نے کہا۔ ”میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”ضرور کرو۔“

کورن اپنے پانچ ساتھیوں کے ہمراہ ایک کونے میں چلا گیا اور وہ آپس میں سر جوڑ کر سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ فوجی افسران کسی قدر بے چین تھے۔ ایک فوجی نے کہا۔ ”کیا ہم بھی مشورہ کر سکتے ہیں؟“

ربیک نے میری طرف دیکھا تو میں نے خفیف سا اثبات کا اشارہ کیا اور اس نے انہیں بھی مشورے کی اجازت دے دی۔ جب میرے ساتھی ان لوگوں کو نکال رہے تھے اور نگرانوں کو قید کیا جا رہا تھا تو باقی افراد جو غیر متعلق تھے ان کے کمرے باہر سے بند کر دیے گئے تھے تاکہ کوئی نکل کر غیر ضروری مداخلت نہ کرے۔ بے ہوش عورت کو رودیر نے لباس پہنا دیا تھا مگر فی الحال وہ وہیں تھی۔ پجاری اور فوجی افسران رودیر کو ہمارے ساتھ دیکھ کر کسی قدر حیران ہوئے تھے۔ چند منٹ میں پجاری ہماری طرف آئے اور کورن نے کہا۔ ”ہم تمہارے ساتھ ہیں مگر ہم لڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔“

”اگر تم ہمارے ساتھ ہو تو تمہیں لڑنا تو پڑے گا۔“ ربیک نے کہا۔ ”صرف جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے پڑیں گے۔“

”وہ ہم کریں گے میں صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ہم تربیت یافتہ نہیں ہیں۔“

ربیک مجھے لے کر کمرے سے باہر آیا ہم اس وقت اوپری منزل پر تھے۔ ”اب کیا کرنا ہے جناب؟“

”سب سے پہلے یہاں کے لوگوں کو چھانٹنا اور انہیں عقبی سمت والے کمروں میں بند کرنا ہے۔ خطرناک افراد کو اسی منزل پر اور کم خطرناک افراد کو نچلی منزل پر۔“ میں نے منصوبہ سمجھایا اور ربیک فوری حرکت میں آ گیا۔ اس نے کمرے میں آ کر بتایا کہ کس کس نے کیا کرنا ہے۔ کورن اور فوجی افسران اس لحاظ سے ہمارے لیے کارآمد تھے کہ وہ قیدیوں کے بارے میں بتا سکتے تھے کہ کون ہمارے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ ویسے میرا ارادہ مزید افراد لینے کا نہیں تھا، یہ دس افراد بھی کافی تھے۔ اوپری منزل پر کل بتیس افراد تھے جن میں سے دس تو یہی تھے۔ باقی بائیس عام خادم تھے۔ ان کو دس دس کر کے دو کمروں میں بند کر دیا۔ اس کے بعد نچلی منزل پر آئے یہاں تیس افراد تھے ان میں سے اٹھارہ افراد کو اوپر پہنچایا گیا اور باقی کو اسی فلور پر عقبی کمروں میں بند کر دیا گیا۔

نیچے کل چوبیس افراد تھے۔ ان میں تین عورتیں بھی تھیں۔ ایک وہی تھی جو نگران اعلیٰ کے ساتھ سو رہی تھی۔ باقی اکیس افراد خدام میں سے تھے انہیں اور باقی عورتوں کو بھی اوپری منزل پر بند کرنے کا حکم دے کر میں دفتر والے کمرے میں آیا تو چونک گیا کیونکہ بے ہوش عورت غائب تھی۔ کمرے کی کھڑکی کھلی تھی اور یہ سامنے والے حصے میں کھلتی تھی۔ میں نے احتیاط سے ادھ کھلی کھڑکی سے باہر جھانکا تو عورت اپنے سفید لباس کی وجہ سے فوراً ہی نظر میں آ گئی۔ وہ جھکی ہوئی پودوں اور درختوں کی آڑ لیتی ہوئی سرنگ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بے خبر تھی کہ سرنگ بند ہے اور شاید وہ فرار ہو کر آرگون جانا چاہتی تھی۔ وہ زیادہ مغلوب نکلی تھی اور اسی وجہ سے اسے جلد ہوش آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے جانا حماقت ہوتی اس لیے میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ باہر نکلی تھی اور اب مجھے اندازہ ہوتا کہ ڈیوڈ شا نے نگرانی یا حفاظت کے لیے کیا

انتظامات کر رکھے ہیں۔ عورت نے باغ کراس کیا اور بھاگتی ہوئی سرنگ کی طرف چلی گئی۔ شاید وہ تصدیق کرنے گئی تھی کہ سرنگ سچ مچ تباہ ہو گئی ہے یا کوئی راستہ ہے۔ جلد وہ ناکام واپس آئی۔ اسی اثنا میں رودیر کمرے میں آئی اور عورت کو غائب اور مجھے کھڑکی کے ساتھ لگے دیکھ کر وہ تیزی سے آگے آئی۔

”کیا ہوا یہ کہاں گئی؟“ اس نے کہتے ہوئے باہر جھانکا۔

”وہ دیکھو۔“ میں نے تاریکی میں غائب ہوتی عورت کی طرف اشارہ کیا۔

”آپ نے اسے جانے دیا۔“

”فکر مت کرو۔ وہ سرنگ میں نہیں جا سکتی ہے سرنگ آگے سے بند ہے۔ اسے واپس آنا پڑے گا۔“

رودیر نے سرنگ کی بندش پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اس کا مطلب تھا کہ کوئی اسے بتا چکا تھا۔ یہ جگہ چھوٹی سی تھی اس لیے وہ مجھ سے لگ کر کھڑی تھی۔ اس نے کچھ دیر بعد آہستہ سے کہا۔ ”مجھے شامن کے بارے میں پتا چل گیا ہے۔ وہ یہیں ہے۔“

”آئی زور کے خاص آدمیوں میں شامل ہو گیا ہے۔“

”اگر وہ ہاتھ آیا تو کیا آپ اسے میرے حوالے کریں گے۔“

”یقیناً وہ تمہارا مجرم ہے اور تم اس کے بارے میں فیصلہ کرو گی۔“

رودیر نے گہری سانس لی۔ ”اس شخص کی محبت نے مجھے بہت دکھ دیے۔ میں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا۔“

اس کی بات سن کر مجھے خیال آیا اور میں نے جھجک کر پوچھا۔ ”تمہیں یہاں لانے والوں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کی میرا مطلب ہے......“

اس کا رنگ گلابی ہوا تھا اس نے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ ”نہیں اس حوالے سے میں محفوظ ہوں۔ میں اپنی جذباتی کیفیت کی بات کر رہی ہوں۔“

”مجھے تم سے ہمدردی ہے۔“

وہ میری طرف پلٹ گئی مگر دور نہیں ہوئی تھی بلکہ کچھ اور پاس آ گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ ”صرف ہمدردی؟“

”تم میری ساتھی ہو اور تم سے مجھے انسیت ہے۔ انسان اسی سے ہمدردی یا اپنائیت کا اظہار کرتا ہے جسے اپنا سمجھتا ہے۔“

یہاں ایک عدد لاش تھی اور اس کے ساتھ سونے والی عورت یہاں سے فرار ہو گئی تھی۔ اگرچہ ہم نے تسلی بخش انداز میں عمارت پر قبضہ کر لیا تھا مگر عورت کے فرار نے کسی قدر مشکل کو بھی جنم دیا تھا۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر رودیر مجھ سے کسی اور موضوع پر بات کرنا چاہ رہی تھی۔ میں اس سے اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ آفاقی حقیقت ہے کہ زبان اور رویے سے عورت پہل کرتی ہے اور مرد کو متوجہ کرتی ہے پھر عملی پہل مرد کرتا ہے اور اپنے سر پیش قدمی کی تہمت لیتا ہے۔ اس وقت وہ زبان اور رویے سے پہل کر رہی تھی۔ اس نے میرے بازوؤں پر ہاتھ رکھ دیے۔ ”شہباز میں اندر سے خالی ہو گئی ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں بالکل اکیلی ہوں اور جب سوچتی ہوں کہ میرا کون ہے تو میرے ذہن میں ایک ہی نام آتا ہے۔“

”کس کا نام؟“ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

”آپ کا نام۔“ اس نے کہا اور اس دوران میں اس کی بانہیں میرے گلے تک پہنچ گئی تھیں۔ اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔ ”شہباز میں نے آپ کے ساتھ خود کو ہمیشہ محفوظ سمجھا ہے جب آپ سے دور ہوئی مجھ پر کوئی نہ کوئی آفت آئی۔ مجھے خود سے دور مت کیجیے گا۔“

اسی لمحے دروازے پر آہٹ ہوئی اور ایرٹ اندر آیا تھا۔ میں نے رودیر سے دور ہونا چاہا مگر اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی اور اسی انداز میں مجھ سے لگی رہی۔ حالانکہ اسے پتا چل گیا تھا کہ کوئی اندر آیا ہے۔ ایرٹ چونکا تھا اور اس کا چہرہ متغیر ہوا تھا۔ چند لمحے ساکت رہنے کے بعد وہ تیزی سے واپس چلا گیا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگرچہ یہ رودیر کا اپنا فعل تھا مگر ایرٹ مجھے برابر کا شریک سمجھتا اور وہ حق بجانب ہوتا میں نے رودیر کو چھوٹ دی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کی بانہیں گلے سے الگ کیں اور باہر جھانک کر دیکھا۔ میں نے بروقت دیکھا تھا کیونکہ عورت واپس آ رہی تھی۔ اس نے سرنگ بند پائی ہوگی اور اب وہ باغ کے دوسری طرف سے پودوں اور درختوں کی آڑ لیتی ہوئی معبد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اگر میں ذرا تاخیر سے دیکھتا تو پھر اسے پانا مشکل کام ہوتا۔ وہ نظروں میں آ گئی تھی اس لیے اس کی معمولی لہراتی جھلکیاں بتا رہی تھیں کہ وہ کہاں تھی اور کس طرف بڑھ رہی تھی۔

”یہ کہاں جا رہی ہے؟“

"سعید کی طرف اور اب ہمیں معلوم ہو گا کہ وہ خلافت کے لیے... کیا کیا پیش..."

عورت بارچ کے ساتھ گھومتی ہوئی سعید کی طرف بڑھ رہی تھی جس کا دائیں راستہ اس قطعے کے عین وسط میں تھا۔ ایک ڈھلان اسی طرف جا رہی تھی اور نچلی کوئی دس بارہ فٹ اونچی پختہ آرائشی سعید میں داخل ہو رہی تھی یہ وہاں تک پہنچی دائی مشعلیں بھی تھیں اور سب سے زیادہ روشنی وہیں تھی۔ عورت سعید کے ساتھ آئی تو روشنی چھوڑ کر واپس جانے لگی۔ اپنی ابتدائی جذباتیت کے بعد وہ جب اب شاید شرمندہ ہو رہی تھی اور اس نے کہا تھا۔

"شہباز تجھے خدا کے حوالے کر دیں میں..."

"مثل..." میں نے کہا میری توجہ پوری عورت کی طرف تھی۔ وہ اب سعید کے داہنے راستے سے کوئی پچاس گز دور تھی۔ وہ یہاں نیچی تھی اس لیے اس کا اوپر کا دھڑ ہی دکھائی دے رہا تھا۔ صرف ایک صورت تھی کہ وہ ڈھلوان پر بنے ہوئے مکانوں کی چھتوں پر سے گزرتا ہوا راستہ اختیار کرتا۔ میں ان لوگوں کو اطلاع دے چکا تھا جو حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اب دو راستے سامنے تھے۔ دونوں میں کوئی زیادہ چوڑی گلی۔ یہاں ہاتھ سے ہاتھ ملا کر ایک راستہ بنایا جا سکتا تھا۔ عورت چھوٹے دو رخنے کی آڑ سے نکل کر روش پر آئی اور بھٹکنے کا اہم راستے کے عین اوپر سے کوئی شعلہ سا نکلا تھا جو شعلوں کی تیز روشنی میں غائب ہو گیا۔ دھماکے کی دبی ہوئی آواز ذرا دیر سے آئی اور عورت لمبا گر کر گری تھی۔ گرتے ہوئے اس کا چہرہ سیدھے رخ میری طرف ہوا تھا۔ وہ زیر کے سر سے نکلی گولی کی چیخ نکلی تھی۔ اس نے میرا بازو دبوچ لیا۔

"یہ کیا ہوا ہے؟"

"پھندہ جو وہاں لٹکا ہوا ہے اور عورت اسی کا نشانہ ہوئی ہے۔" میری نظروں میں منظر گھوم گیا جہاں سے شعلہ نکلا تھا۔ وہ داہنی راستے کے اوپر نیچے کے پیچھے کی طرف تھا۔ وہاں تک مشعلوں کی روشنی بڑا واسطہ نہیں جا رہی تھی صرف افکاس دہاں تک پہنچ رہا تھا۔ میں بصارت پر زور دے کر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا مجھے واضح نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں نے زیرک کی مدد حاصل کی۔ اسے بتایا اور اسے جگہ کا نشان دہی کر کے کہا۔

"وہاں نے کمرے میں جلنے والا لیمپ تھا دیا اور نظر جما کر دیکھنے لگا کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "ہاں ایک عجیب سی چیز ہے۔ اس میں کسی کی ڈنڈی نکلی ہے۔ پیچھے والا حصہ چکور سا ہے اور وہ تین ہاتھوں پر رکھی ہے۔"

میں سمجھ گیا تھا۔ خود کار استاپر رائفل تھی جو ہر قدم میں آنے والی حرکت کرتی شے پر فائر کرتی تھی اور ریموٹ کی مدد سے بھی آپریٹ کیا جا سکتا تھا۔ اس کا پہلے سے پیغام ڈھائے نے مجھے بتایا تھا جہاں قید رکھا تھا وہاں فرار کے لیے یہی ہتھیار لگایا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے بھی وہی اور میرے ساتھیوں کو بھی اس سے محفوظ رکھا تھا۔ درحقیقت میں پوشاک بہت تھوڑی دیر پہنے رہ سکا تھا کہ اس صورت حال میں وہ کیا کر سکتا ہے۔ میں نے اعاذے کو خالی کر دیا تھا۔ اسے خدشہ ہوا تھا کہ اس نے کوئی گولی ٹریگر کی گرانی کا سسٹم لگایا ہے تب ہی اس نے میرا بازو چھوڑا ہوا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اس نے صرف رائفل ہی لگائی ہے یا اب تک اس نے کچھ اور بھی لگا دیا ہے۔ اب میں نے کہا۔

"میں نے یہ کہنا تھا کہ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ تم نے اپنا کام کر دیا ہے۔ اب ہمیں اجازت دو۔"

"ڈیوڈ نے کہا تھا کہ میں ایک سے زیادہ ایسی رائفلز کی کوئی نہیں سمجھ سکی تھی۔ کیوں کوئی بھروسا نہیں کیا تھا اپنے اترنے سے پہلے اس نے کمک حاصل کر لی۔ طیارے میں جگہ کمک رسائی حاصل کر سکتے تھے اور وہ بیس اشوت سے کی کوئی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس صورت میں دوبارہ سامنا کے ساتھ بھی پہنچ سکتا تھا۔ بہر حال عورت کی موت سے ثابت ہو گیا تھا کہ سعید میں داخلے کا مطلب خود کشی ہی ہو گا اس لیے ہم نے سوچا تھا کہ عورت کی لاش اور اس کا ہر تقریباً اور اس سے کام لیا گیا تھا۔ اتنا طویل فاصلے کے بعد اس کا زندہ رہ جانا ناممکن تھا اور اس میں جان بھی نہ بچ سکتی تھی۔ زیرک نے پریشان اور اطمینان کا ملا جلا تاثر لیے کہا۔

"میں سمجھ گیا تھا۔ خود کار ہتھیار والی عورت وہی تھی جو یہاں سے فرار ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "اس کا سر بالکل بھٹ گیا ہے اگر یہ دشمن کے ہاتھ لگتی تو فوراً جائے بارے بک دیتی۔"

"میرا خیال ہے یہ کیلئے کی نیت سے وہاں جا رہی تھی۔"

زیرک نے تجسس سے پوچھا۔ "کیا چیز ہے جو اپنے یہ عورت اسی سے مری ہے؟"

"ہاں یہ خود کار خودکار رائفل والا ہتھیار ہے۔ جیسے اس کی حد میں کوئی حرکت کرتی چیز آتی ہے یہ اس پر فائر دیتا ہے۔"

زیرک کے حد، حرکت کرتی چیز کی شناخت اور نامانوس چیزیں تھیں اس نے سوالات کرنے چاہے لیکن

میں نے کہا۔ "جب ہم کامیاب ہو لیں گے اور یہ سادی چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں گی تو میں نہیں غلط سے سمجھا سکوں گا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

اس دوران میں باہر جا چکی تھی۔ زیرک نے سر ہلایا پھر پوچھا۔ "یہ ایرٹ سے پہلے یہاں آیا تھا اور وہاں کا آدمی کا سند لگا تھا۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "اس کی وجہ ہے۔"

مجھے یہ پوچھنا تھا اور وہ مجھے سمجھتا تھا اس لیے مجھے نے اسے تفصیل سے روبرو کی کیفیت اور اپنی طرف سے کی گئی تدبیر بتائی۔ "اس کیفیت میں ہے کہ اس کی جان نہیں نکل سکتا۔ میں اسے سمجھا رہا ہوں۔ وہ خود سے میرے پاس آنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ایسے وقت ایرٹ نے اتفاق... دیکھ لیا ہے۔ شاید اس کی سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ..."

زیرک نے سر ہلایا۔ "میں سمجھ گیا ہوں جناب۔ ایرٹ کو بھی سمجھا سکا ہوں لیکن وہ بہت ضدی ہے۔"

"مجھے لگتا ہے یہ مشکل کام مجھے ہی کرنا پڑے گا۔"

زیرک آہستہ سے بنسا۔ "میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ لوگوں سے دور بھاگتے ہیں۔"

"اس کے باوجود یہ صنف آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔" مجھے کہنے سے زیرک کا خیال آیا اس نے کہا تھا کہ اس کی ماں بھی بچی تھی۔ پھر بھی اس کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ اس کی ماں کی جان بچی آئی۔ مگر قدرت نے اس کی اور میری مشکل آسان کر دی تھی۔ میں سوچ میں گم تھا کہ زیرک کی آواز پر چونکا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"کیا کہا ہے کہ کہا؟"

"اس پر غور کرنا ہو گا۔ اس ہتھیار کے ہوتے ہوئے ہم ہیلی کاپٹر رسائی حاصل نہیں کر سکتے ہیں۔"

"یہی دوبیر کی بات کر رہا ہوں۔"

"ذی الاحمد سے کہا اور اس کی طرف اشارہ کیا۔" اسے ہمارے ساتھ لگا دیتے ہیں ممکن شاید وہ مدد دے سکے۔"

زیرک باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ دو نوجی افسران کے ساتھ آیا۔ ان میں سے اسے اسی چادر میں لپیٹا اور اٹھا کر لے

پوچھا۔ "اور لاؤں...... اتنے میں آپ کا پیٹ نہیں بھرا ہو گا؟"

"نہیں اتنا کافی ہے۔" میں نے کہا اور اس کی طرف دیکھا۔ "صاف ستھری ہو رہی ہو۔"

"ہاں جب سے یہاں آئی ہوں مجھے ایک بار بھی نہانے کا موقع نہیں ملا اس لیے ٹھنڈے پانی کے باوجود خود کو روک نہ سکی۔" اس نے بال گھما کر آگے کرتے ہوئے کہا اور انہیں جھٹک کر خشک کرنے لگی۔ اس کا بدن شاخ گل کی طرح لچک گیا اور ایسے زاویے میں آ گیا کہ میں نے بے اختیار نظریں چرا لیں۔ پتا نہیں یہ قدرت کی عطا تھی یا آزمائش کہ میری طرف آنے والی تمام ہی عورتیں حسن و جمال کا شاہ کار ہوتی تھیں اور آدمی کے لیے ان کی پیش قدمی سے بچنا اتنا ہی مشکل ہوتا جتنا کہ بارش کے بعد کیچڑ زدہ راستے پر پھسلنے سے بچنا۔ آزمائش میں نے اس لحاظ سے کہا کہ یہ عورتیں محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر میری طرف آتی تھیں اور آدمی محبت سے لڑ نہیں سکتا ہے۔ ورنہ زینی جیسی ہوس کی ماری عورتوں سے نمٹنا میرے لیے نہایت آسان تھا۔ جنگل میں ہونے والی گھمسان کی جدوجہد نے میرا حلیہ بھی خراب کر دیا تھا۔ اس لیے میں بھی نہانا چاہتا تھا۔ میں نے روبیر سے کہا تو اس نے سر ہلایا۔

"میں سمجھ گئی تھی۔ آپ کے لیے دوسرا لباس بھی نکال دیا ہے۔"

"جب تک میں سوتا رہا حالات میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی؟"

"نہیں ہم پوری طرح چوکنا تھے اور میں خود نگرانی کرتی رہی جب نہانے گئی تو ایمار کو نگرانی پر لگا دیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ اس دوران میں کوئی معبد سے باہر نہیں آیا نہ ہی اندر گیا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ورنہ اس طرح سے غفلت کی نیند سو جانا اور وہ بھی ایسے حالات میں مناسب نہیں تھا۔ واش روم میں نے دیکھ لیا تھا جہاں نہانے کا مکمل بندوبست تھا۔ اس میں مقامی طرز کا صابن بھی تھا جو بال اور جسم یکساں صاف کرتا تھا۔ مٹی کے پائپوں میں پانی نہ جانے کہاں سے آ رہا تھا۔ واش روم کی سہولت صرف گراؤنڈ فلور پر تھی۔ شاید یہیں تک پانی پائپوں سے پہنچایا جا سکتا تھا۔ غسل اور دوسری ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد میں باہر آیا تو صاف ستھرا لباس پہن کر میں نے خود کو خاصا بہتر محسوس کیا تھا۔ نہا دھو کر مجھے پھر بھوک لگنے لگی تھی۔ مگر میں پہلے اپنے ساتھیوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لڑائی کے فیصلہ کن مرحلے سے پہلے یہ ایک وقفہ تھا جس سے میں زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میرے تھکے ساتھی بھی یقیناً آرام کر رہے تھے اور کھا پی رہے تھے۔ میں نے واش روم سے نکل کر پہلے تینوں منزلوں کا ایک چکر لگایا تھا۔ ربیک نے فوجی افسروں والا ایک ایک کر کے ہر منزل پر گارڈ لگا دیا تھا۔ وہ مستعدی سے پہرہ دے رہے تھے۔ کورن سمیت تمام پجاری نچلی منزل کے ایک کمرے میں تھے۔

ربیک اور اس کے ساتھی دو دو کر کے آرام کر رہے تھے۔ پہلے ایمار اور مارث نے آرام کیا، اب ربیک اور ایرث کر رہے تھے کیونکہ میں نے کوئی حکم نہیں دیا تھا اس لیے انہوں نے آرام کر لیا تھا۔ ہر طرف سے مطمئن ہو کر میں اوپر والے کمرے میں آیا جو فی الحال میرا کمرا بھی تھا۔ وہیں روبیر کھڑکی سے لگی ہوئی جھری سے باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کمرے میں دوبارہ پھل اور رس لے آئی تھی۔ میں خوش ہو گیا شاید اسے بھی اندازہ تھا کہ کھانا میرے لیے کافی نہیں ہوگا اس لیے وہ مزید لے آئی تھی۔ میں نے ایک پھل اٹھا کر کھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا دیکھ رہی ہو؟"

"وہ اسے لے گئے ہیں اور اب وہاں کی صفائی کر رہے ہیں۔" روبیر نے اشارہ کیا مگر جب میں دیکھنے کے لیے کھڑکی کے پاس آیا تو اس نے جگہ نہیں دی تھی۔ غالباً وہ چاہتی تھی کہ اس کے پاس آ کر باہر دیکھوں۔ مجبوراً مجھے یہی کرنا پڑا تھا۔ میرے لیے یہ حربے نئے نہیں تھے میں پہلے ہی بارہا ان کا سامنا کر چکا تھا۔ لڑکی کہیں کی بھی ہو اگر وہ کسی سے محبت کرنے لگے اور اسے ہی اجتناب کچھ کچھ شروع کر دے تو اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے ایسے ہی حربے استعمال کرتی ہے۔ روبیر میں یہ تبدیلی مجھ سے بچھڑنے کے بعد یقیناً شامین کا اصل روپ دیکھنے کے بعد آئی تھی۔ مگر مجھ میں اس کے حوالے سے کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ میرے لیے پہلے کی طرح ایک ساتھی تھی۔ بات کہیں اور نکل گئی۔ میں کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا جہاں نچلے درجے کے پجاریوں کے لباس میں دو افراد اس جگہ پھیلے خون کی صفائی کر رہے تھے جہاں کچھ دیر پہلے عورت کی لاش پڑی تھی۔ لاش غائب تھی۔ میں پُرتشویش ہو گیا۔ اگر یہ باہر آئے تھے تو یقیناً احوال جاننے کے لیے وہ یہاں بھی آتے کہ عورت باہر کیسے نکلی۔ میں نے روبیر سے کہا۔

"ایمار کو بلاؤ۔"

وہ گئی اور اسے بلا لائی۔ میں نے روبیر کی مدد سے

اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک نگران اعلیٰ کو قید سے نکال لایا۔ ایمار نے اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے اگر وہ زندہ سلامت رہنا چاہتا ہے تو۔ اس نے یقین دلایا کہ وہ بالکل زندہ رہنا چاہتا ہے۔

کھڑکی سے نگرانی کرتے ہوئے میں ٹرے کے پھلوں اور رس سے بھی انصاف کرتا رہا تھا اور جب ایک پجاری نے اس طرف کا رخ کیا تو میں اور روبیر واش روم کی طرف آ گئے۔ نگران اعلیٰ اور ایمار جس نے اب نگران کی وردی پہن لی تھی داخلی دروازے کے پاس تھے۔ مارث دفتر میں تھا پوری طرح چوکس تھا۔ میں اور روبیر بھی کسی ہنگامی صورت حال میں حرکت میں آنے کو تیار تھے۔ آنے والا ایک عام سا اور کسی قدر موٹی توند والا پجاری تھا۔ میں نے یہاں سب سے بے ہنگم جسم والے افراد پجاریوں میں دیکھے تھے کیونکہ وہ عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے اور شاید چلتے پھرتے بھی بادل ناخواستہ تھے۔ شاہی خاندان کے بعد یہ واحد طبقہ تھا جو بیل گاڑیوں پر سفر کرتا تھا ورنہ یہاں پیدل چلنے کا رواج تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ایمار سے کرخت لہجے میں رات کے نگران اعلیٰ کے بارے میں پوچھا۔ "وہ اندر ہیں جناب۔"

ایمار نے کہا تو پجاری اس کی طرف توجہ دیے بغیر کمرے میں پہنچا اور نگران اعلیٰ پر گرج برسنا شروع کر دیا کہ وہ کیسے نگرانی کر رہا ہے۔ ایک قیدی عورت یہاں سے نکل کر بھاگی اور معبد کے باہر ماری گئی۔ نگران اعلیٰ نے فوری ایمار کو طلب کیا اور اس کمرے کا رخ کیا جہاں روبیر قید تھی۔ اس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ نگران اعلیٰ نے صفائی پیش کی کہ وہ سخت نگرانی والی قیدی نہیں تھی اس لیے اسے نیچے رکھا گیا اور وہ کھڑکی سے نکل گئی۔ پجاری نے آگ زور کا حکم گوش گزار کیا کہ اب نچلی منزل میں کوئی قیدی نہیں رکھا جائے گا سب کو اوپر منتقل کر دیا جائے۔ شکر ہے اس نے شک نہیں کیا اور نگران اعلیٰ کی سنائی اسٹوری آسانی سے تسلیم کر لی حالانکہ اس نے بہت بھونڈی اداکاری کی تھی۔ مگر لگ رہا تھا کہ پجاری کے سر پر نیند یا کچھ اور سوار تھا اور وہ بہت عجلت میں ادھر ادھر کر کے واپس روانہ ہو گیا۔ واش روم کے پاس سے گزرتے ہوئے وہ میرے اتنے پاس سے گزرا کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔ اس کے پاس سے وہ مخصوص بو آ رہی تھی جو یہاں شراب سے آتی تھی۔ وہ یقیناً پیے ہوئے تھا۔ اس کے جانے کے بعد ہم نے سکون کا سانس لیا اور روبیر بولی۔

"شکر ہے یہ دفع ہوا۔"

میں نے روبیر سے کہا۔ "کیا خیال ہے باہر کا ایک چکر نہ لگایا جائے۔"

وہ خوش ہو گئی۔ "میں بھی باہر جانا چاہتی ہوں قید میں رہ کر میں گھٹ گئی ہوں۔"

ہم اسی کمرے کی کھڑکی سے باہر آئے جہاں روبیر قید تھی۔ اس نے ایک چادر لے لی تھی جو گہرے سرمئی رنگ کی تھی اور اس میں اس کا سفید لباس چھپ گیا تھا۔ ورنہ ہلکی تاریکی میں یہ بہت نمایاں ہوتا۔ مگر گہرے رنگ کی چادر میں اس کا رخ روشن بھی بہت نمایاں ہو رہا تھا۔ میں نے کہا کہ وہ چادر کا کچھ حصہ چہرے پر بھی کر لے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں معبد کے عقبی حصے کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ میرے جسم پر بدستور خاص سپاہیوں والی سرمئی وردی تھی جو نیم تاریکی میں گھل مل جاتی تھی۔ ہم عقبی باغ سے ہوتے ہوئے ریوار تک آئے۔ میں نے روبیر کو وہ جگہ دکھائی جہاں سے ہم آئے تھے اور اس سے پہلے ہارن نے مجھے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی پھر زہریلے کانٹوں والے پرندے بھی نکل آئے تھے اور بس زندگی تھی جو بچ کر میں فصیل کے اس طرف آیا۔ روبیر اگرچہ میرے ساتھ بہت سے مشکل مواقعوں سے گزر چکی تھی مگر یہ سب اس کے لیے بھی حیران کن تھا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

"آپ اتنی مشکلوں سے گزرے اور میں سمجھ رہی تھی کہ میں ہی مشکل میں ہوں۔"

"ہم سب مشکل میں ہیں جب تک ان لوگوں پر قابو نہیں پا لیتے۔" میں نے معبد کی طرف اشارہ کیا۔ "تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو کہ وادی کے لوگ اس وقت کتنے سنگین خطرے سے دوچار ہیں۔"

"ڈیوڈ شا یہاں کیوں آیا ہے؟"

"میں نے بتایا تا کہ وہ باہر سے اپنے ساتھیوں کو بلوانا چاہتا ہے۔ وہ اڑنے والی مشین میں بیٹھ کر براہ راست یہاں پہنچ جائیں گے۔ معبد کا پچھلا حصہ اتنا بڑا ہے کہ وہ مشین آرام سے یہاں اتر سکتی ہے۔ اس میں بیک وقت کئی افراد آ سکتے ہیں۔"

"ویسی ہی اڑنے والی مشین جو میرے باپ نے بچپن میں دیکھی تھی جب وادی والے ایک تھے؟" روبیر نے کہا اس کا اشارہ یقیناً ولیم شا اور راجا عمر دراز کے طیارے کی طرف تھا جو انجن بند ہونے سے اتفاقیہ اس وادی میں آیا تھا

اور انہیں نے اس وادی کو دیکھ لیا تھا اسی طرح وادی کے لوگوں نے بھی اس پُراسرار ہوائی جہاز کو دیکھا ہوگا۔ میں نے سر ہلایا۔

"بالکل وادی سنسان، پھر اس سنسنی میں آنے والے چار افراد دو سرے طریقے سے وادی میں اترے تھے اور ان میں سے ایک یہ امر دادت راجا ہوسکتا ہے۔ وہ وادی میں بارہ سال پہلے آیا ہے۔"

"یہ ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے جیرت سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

"میں پہلے آنے والی ہر ٹکاب پر نظر رکھتا ہوں۔ وہ مر چکا ہے۔ اس کی بیوی ڈیڑھ سال قبل مری۔"

"تم نے کیسے پتا لگایا؟"

"میں نے اس کا جملہ نظر انداز کر کے آگے بڑھایا۔ وہ دیکھنے پر ہوا انداز ہوتا کہ اطمینان بخش سوگوار طویل سفر طے کر کے اس وادی کے اندر آنے کے بعد بیٹھ جانا چاہتا کہ یہ سازسامان بھی ٹھکانے لگ جائے اور اس پر کوئی چھوٹا موٹا ریڈیو آئیٹوشن والا ہو یا آسانی اتر سکتا ہے۔ اور پرواز بھی کر سکے۔ یہاں ایک اونچی جگہ کی طرف بڑھ گیا۔ اتر کر اہم چیز پارک ہو سکتے تھے۔ میرے حساب سے ڈیڑھ گھنٹہ کم سے کم لگنے چاہئے تھے۔ اسے یہ طیارے محل نما عمارت کے سامنے بنی سرکل کے دائرے میں کھلے سے محل میں اترنے والے طیارے سے بلند ہوتی ہی جاتی تھی۔ یہ پیٹرول ختم ہونے پر یہاں آسکتے تھے بلکہ واپس بھی جا سکتے تھے۔ یہ پیٹرول ختم ہونے والے طیارے میں ہوا فرشت کی بلندی بھی برقرار کیے جاتے۔ اس وادی تک آنے کے لیے طیاروں کو اتنی بلندی پر اڑنا پڑتا۔ جن طیاروں کے پیٹرول ٹینک بھرے ہوتے تھے عام طیاروں سے دس ہزار فٹ کی بلندی سے اترنا پڑتا تھا یہاں۔ ان کا فاصلہ لیول ٹینس جہاز برداشت کرتا ہے۔"

کرنل حوزی کی پارٹی اطمینان میں موجود تھی۔ ان کے بھی تھی چوتھے گھنٹے کے نوٹس پر وہ دنیا کے کسی بھی حصے وہاں تک پہنچ سکتی تھی اس کے بعد یہاں آنا ان کے بس کی بات نہیں تھا۔ یہ چونکہ سہل سہولت تھی اس لیے بھی ترجیح دیتے کرائے کے جہاز تھے جن کا کام ہی محض آنا جانا رہ گیا تھا۔ وہ ڈیڑھ شاہ کے مقاصد کے لیے نہایت موزوں تھے۔ ان سب انکشافات کے بارے میں سوچتے ہوئے میری نگر کرنے کی بھی ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے اپنا وہ کے عزائم کا درست انداز و نہیں لگایا تھا جس کے لیے اسے کی ضرورت تھی اور وہ اصل میں کہیں زیادہ بڑے تھے اور ان وادی کے لوگوں کے لیے جیسا کہ عزائم رکھتا تھا۔ پہلے یہ خیال تھا کہ وہ وادی تک رسائی حاصل کر کے یہاں کی غنائیات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے جیسے وہ ہجرہ اور ہمیں گھر سے گھر کے زخم بھر کر انسان کو جرات انگیز اور عالفت دیتا ہے۔ اس طرح یہاں اور بھی چیزیں تھیں۔ ڈیڑھ سو طیاروں کو یہاں حاصل کرنا یہاں پر اپنا تو یہ ان کا مکمل قبضہ چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ وادی کے

"چلو لگتا ہے میرے ساتھ رہو گی اور میری مرضی کے بغیر کوئی تم پر ہاتھ بھی اٹھانے کی۔"

"یہی تو میں چاہتی ہوں۔" اس نے شوخی سے کہا۔ "ہمیشہ آپ کے ساتھ رہنا اور آپ کی مرضی سے کرنا۔"

میں نے اس کا جملہ نظر انداز کر کے آگے بڑھایا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ دور سے ہی مجھے یہ دیکھنے پر پتا انداز ہوا تھا کہ اصل پتھر کی بڑی سوراخ طویل سے ہے۔ اس کے اندر آنے کے بعد بھی یہ پتا چلا کہ یہ سوراخ سامنے چھوٹا طویل ہے اور اس پر کوئی چھوٹا موٹا ریڈیو آئیٹوشن والا جہاز آسانی اتر سکتا ہے۔ اور پرواز بھی کر سکے۔ یہاں ایک اونچی جگہ کی طرف بڑھ گیا۔ اتر کر اہم چیز پارک ہو سکتے تھے۔ میرے حساب سے ڈیڑھ گھنٹہ کم سے کم لگنے چاہئے تھے۔ اسے یہ طیارے محل نما عمارت کے سامنے بنی سرکل کے دائرے میں کھلے سے محل میں اترنے والے طیارے سے بلند ہوتی ہی جاتی تھی۔ یہ پیٹرول ختم ہونے پر یہاں آسکتے تھے بلکہ واپس بھی جا سکتے تھے۔ یہ پیٹرول ختم ہونے والے طیارے میں ہوا فرشت کی بلندی بھی برقرار کیے جاتے۔ اس وادی تک آنے کے لیے طیاروں کو اتنی بلندی پر اڑنا پڑتا۔ جن طیاروں کے پیٹرول ٹینک بھرے ہوتے تھے عام طیاروں سے دس ہزار فٹ کی بلندی سے اترنا پڑتا تھا یہاں۔ ان کا فاصلہ لیول ٹینس جہاز برداشت کرتا ہے۔"

کرنل حوزی کی پارٹی اطمینان میں موجود تھی۔ ان کے بھی تھی چوتھے گھنٹے کے نوٹس پر وہ دنیا کے کسی بھی حصے وہاں تک پہنچ سکتی تھی اس کے بعد یہاں آنا ان کے بس کی بات نہیں تھا۔ یہ چونکہ سہل سہولت تھی اس لیے بھی ترجیح دیتے کرائے کے جہاز تھے جن کا کام ہی محض آنا جانا رہ گیا تھا۔ وہ ڈیڑھ شاہ کے مقاصد کے لیے نہایت موزوں تھے۔ ان سب انکشافات کے بارے میں سوچتے ہوئے میری نگر کرنے کی بھی ہوا اور میں نے محسوس کیا کہ میں نے اپنا وہ کے عزائم کا درست انداز و نہیں لگایا تھا جس کے لیے اسے کی ضرورت تھی اور وہ اصل میں کہیں زیادہ بڑے تھے اور ان وادی کے لوگوں کے لیے جیسا کہ عزائم رکھتا تھا۔ پہلے یہ خیال تھا کہ وہ وادی تک رسائی حاصل کر کے یہاں کی غنائیات سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے جیسے وہ ہجرہ اور ہمیں گھر سے گھر کے زخم بھر کر انسان کو جرات انگیز اور عالفت دیتا ہے۔ اس طرح یہاں اور بھی چیزیں تھیں۔ ڈیڑھ سو طیاروں کو یہاں حاصل کرنا یہاں پر اپنا تو یہ ان کا مکمل قبضہ چاہتا تھا۔ اس کے لیے وہ وادی کے

باسی ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے مشکل نہیں تھا کہ وہ ان کو پُرامن پھر تھکوا ان مسلط کر کے لوگوں کو اپنا مطیع بنا کر ان پر اپنی حکومت قائم کر سکتا تھا۔ اس کی آبادی جدا دے ایک ہی ہتھیاروں سے دنیا کے بہت بڑے حصے کو اپنا غلام بنا لیا تھا اور اپنی ذلت قائم کرنا مسلمت پر طانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اگر وہ ان کی سایہ میں کامیاب ہو جاتا تو یہ صرف برائے نہیں ہوتی بلکہ ان اور سب سے ساتھ شروع ہو جاتا۔ وہ جو کچھ ہو جاتے ہیں اور شاہوں اہل برف والے کے پاس بھی وہ دونوں ہی محفوظ ہو رہے۔ اس سب کو بچانے کے لیے وادی کے عزائم کو ناکام بنانا ضروری تھا۔ اسے یہ بھی محال تھا کیونکہ وہ معبد کو محفوظ نہیں کر سکتا تھا اور اس نے وہاں کی حفاظت کا تہیہ بھی کر رکھا تھا۔ میں نے دوبارہ سے کہا۔ "تم نہیں رکو گی میں اکیلا ہی آتا ہوں۔"

اس نے سہے انداز میں پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہیں؟"

"سامنے تک، تم دیوار کے ساتھ لگ کر رہو اور جب تک میں نہ کہوں یہاں سے حرکت مت کرنا۔"

"اللہ اللہ۔" میں نے کہا۔ اب ہم معبد سے تھی جیسے کے کنارے تک۔ آگے تھے تھکن وسلہ سے خاصا دور تھے۔ بھی جرت تھی کہ یہ دیوہیکل عمارت کیسے بنائی گئی ہوگی اور اس کی تعمیر میں کتنے سال لگے ہوں گے۔ مصر کے لوگ فولاد سے ناواقف تھے اور ان کے پاس کانسی جیسی بھی اچھ کر دور دھات تھی جس کی مدد سے انہوں نے اہرام مصر کے لیے پتھر تراشے تھے۔ مگر ان لوگوں کے پاس تو کانسی بھی نہیں تھی پھر انہوں نے اس معبد کے لیے پتھر کیسے تراشے تھے۔ اگر صرف گھسائی سے یہ کام کیا جاتا تو یہ انتہائی مشکل کام تھا۔ جتنا ایک پتھر کا چہرہ تھ کے کوئی مجسم انسان ذہم تیار کر لیتا۔ اہم مصر کے معبدوں کے بالکل سامنے تھے۔ یہاں کوئی دو سو گز چوڑا میدان تھا اور اسی میدان میں مرکز جوڑنے رہن دے والی لائنس لگائی گئیں۔ میں ان لائنس کو دیکھنا چاہتا تھا اور اس میں خطرہ تھا۔ میں نے روبیہ سے کہا۔ "تم نہیں رکو گی میں اکیلا ہی آتا ہوں۔"

اس نے سہے انداز میں پوچھا۔ "کہاں جا رہے ہیں؟"

"سامنے تک، تم دیوار کے ساتھ لگ کر رہو اور جب تک میں نہ کہوں یہاں سے حرکت مت کرنا۔"

میں نے اسے اکیلا کر دیا تھا۔ یہ تقریباً تین سو گز تھا اور ایک ایک انچ سوئی سیاہ رنگ کی گول ڈنک کی چوڑائی سے پلاسٹک اور ہر سے شفاف جیسی پلاسٹک کی تھی اور

اس کے اطراف ایسی ہی ڈیزائن تھیں جو سرخ رنگ میں بلتی تھیں۔ اس کا دھڑ کسی گرم سے زیادہ سرخ نظر آتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ہمارے ٹرک کے بعد والی ٹرک میں ہر رنگ کا تھا۔ چار سو گز کی لمبائی میں اس نے چار بس چار سو ٹرک روکی ہوئی تھی۔ پھر چند ہی منٹ میں دونوں طرف دس دس ٹرک روکی ہوئی تھیں۔ کیونکہ اس نے ایک سو سے زیادہ ٹرک یہاں روکی تھیں۔ ان کی روشنی سے چھوٹے طیاروں کے لیے بہترین مسکن تھا۔ ان کا خیال رہتا ہے کہ یہ خیال آیا کہ موقع ہے میں انہیں لے جا کر ضائع کر دوں۔

ہم پھر یہ خیال سوار کر دیا کیونکہ اس کا بھی امکان تھا کہ ان کے پاس ایسی حربہ لڑائیں ڈٹ کے ہوں اور وہ دوسری پارسل جاتی ہیں انتظامات کے ساتھ انہیں بیان لگا تھیں۔ کرتی ہے۔ اور سورج غروب ہونے تک میں ڈیرا تھا اس میں طیارے بہت تھے۔ مگر پہلے میرا خیال تھا کہ طیارے آج رات ہی آئیں گے۔ مگر طیارے اب تک نہیں آئے تھے اور میرا اندازہ تھا کہ صبح ہونے میں بھی دو تین بجے باقی رہ گیا تھا۔ شاید یا پانچ بجے تک ہو۔ اس دن یہاں روشنی سات بجے کے آس پاس ہوتی تھی۔ اب زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ اصولاً تو طیاروں کو پہلے پہر یا زیادہ سے زیادہ دوسرے پہر آجانا چاہیے تھا۔ اگر چہ ٹرک کو ابھی اور وقت لگ سکتا تھا لیکن اطمینان سے لینے تک کا وقت نہیں تھا۔ پہاڑوں کے اوپر پہنچنے کا کامل یقین ہو گیا ہو گا وادی کے کناروں سے دھندلا تارا شروع ہو گئی تھی۔

رات کے وقت طیاروں کی آمد میں بھی سرحد ہوا کرتا تھا کہ رات کے وقت تو آسان صاف ہوتا ہے اور اپنے دھندلکے ہوتی ہے۔ طیاروں کو تقریباً چودہ ہزار فٹ کی بلندی سے اندھیرے کونوں میں اترنا پڑتا ہے اور یہ بہت بڑا رسک ہوتا۔ یا وجود اس کے کہ وادی کا قطر تقریباً تیس میل تھا۔ اگر چھوٹے طیارے جو موسیل نامی گھنے کی رفتار سے بچے اڑ رہے ہوں تو ان کے لیے معمولی سی غلطی بھی حادثے کا سبب بن جاتی اور پھر کیا طیارے ہوتے تو ان کا آپس میں ٹکرانے کا امکان بھی ہوتا۔ اس لیے رات کے وقت اترنا ہی مناسب تھا۔ جب طیارے اپنی فاؤنس کی روشنی میں وادی کی دیواروں کو اور ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے۔

اگر طیارے آج نہ آتے تو مجھے ایک دن کی مہلت اور مل سکتی تھی۔ میں نے ڈبک والوں رکھتے ہوئے دعا کی کہ ایسا ہی ہو گر ساتھ ہی میں عمل کے لیے بھی تیار تھا۔ میں واپس آیا اور رویہ کے ساتھ واپس ہوئے۔ میں نے احتیاطاً کھڑکی بھیڑ دی تھی مگر جب ہم واپس آئے تو

وہ کھلی ہوئی تھی۔ میں غصہ آگیا اور اس پاس دیکھا۔ مجھے غصہ شروع کر کوئی قیدی یہاں سے نکل نہیں گیا ہے۔ میں اندر آیا اور ریک اور ایرٹ بھی جاگ گئے تھے۔ سگریٹ وہاں نہیں تھا۔ میں نے ریک سے کھڑکی کا پوچھا اور اس نے لاعلمی ظاہر کی تو اسے تمام تیدیوں کو چیک کرنے کو کہا۔ اس کے ساتھ ہی حکم دیا۔ "سب تیار ہو جائیں۔"

ریک چونکا۔ "کوئی خطرہ ہے؟"

"نہیں فیصلہ ہو چکا ہے۔" میں نے باہر کا رخ کرتے ہوئے کہا۔ ہوا بدلنے میں آتے ہی بھی اسی کمرے سے ایرٹ نکلا تھا اور اس کے ہاتھ میں ہتھکڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کہاں ہیں تم؟"

"میں کمرے میں دیکھنے گیا تھا کہ آپ لوگ آئے یا نہیں۔" اس نے جھوٹ کہا۔ اسے جھوٹ بولنا نہیں آتا تھا اس لیے لہجہ عجیب سا تھا۔ وہ کمرے میں نہیں گیا تھا۔ میرے اور رویہ کے پیچھے آیا تھا اور چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ ہماری واپسی اسی تیزی سے ہوئی کہ اسے اندر آنے کا موقع نہیں ملا تھا اور وہ واپس جانے کے لیے ہوئے خیالی میں کھڑکی کھلی چھوڑ آیا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا اور رویہ میرے پیچھے تھی۔ میں کسی کے پیچھے بھی نہیں تھا مگر ایک بات ضرور ہے کہ میں بھی ہوتا تھا۔ اس نے ان کی بات تسلیم کی اور اسے بھی تیار ہونے کو کہا۔ میرا اندازہ تھا کہ ریک اور ایرٹ کو ساتھ لے کر جائوں گا۔ ایرٹ اور مارٹ بیٹھی رہیں گے۔ میں فی الحال پہاڑیوں اور فی الحال انسان پر پورا اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔ ریک چیک کرکے آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ چودی کم ہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کمرے کی کس طرح کھلی رہ گئی تھی۔ اس نے میرے پیروی کی۔

"شاید میں ہی کھلی چھوڑ گیا ہوں گا۔"

ایرٹ اور مارٹ کو یہ بتلانا تو انہوں نے بھی ساتھ چلنے کا کہا میں نے انکار کیا۔ "یہاں بھی کام بنانا ضروری ہے۔"

"مارٹ اور رویہ رہ سکتے ہیں۔" ایرٹ نے جلدی سے کہا۔

"میں کیوں تم بھی رہ سکتے ہو۔" مارٹ نے کہا تھا کہ مجھے ایرٹ کی تجویز ناپسند تھی۔ رویہ کو اکیلا میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ کسی بھی صورت حال میں جاسوس ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں نے ایرٹ کو لے جانا مناسب سمجھا۔ ایرٹ میں نے ایرٹ رکھا کہ اس کے بعد کسی کے احترام کی توقع نہیں تھی۔ میں پوری طرح تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا۔ بیل والے

گران کی لاش بچھی ہوئی دور زمین میں گڑھا بھی کھود کر دفن کی گئی تھی۔ زمین کھدی ہوئی صاف نظر آرہی تھی پہلے اس جگہ کی لاش۔ یہ ان فوجی افسران کی قطعی بھی انہیں لاش ایسی جگہ دفنا چاہیے تھی جہاں کبھی بے زمین خالی ہو۔ یہاں تو کافی پانی مل رہا تھا۔ میں نے ریک سے کہا۔ "واپس آنے کے بعد اس پر کچھ گھاس وغیرہ ڈال دینا تاکہ نشانہ کھدی ہوئی نہ لگے۔"

ریک نے سر ہلایا اور پوچھا۔ "خطرہ کیا ہے جناب؟"

"میں نے ابتدا تھا کہ ڈیوڈ شاہ بہت سے لنگ منگوا رہا ہے۔ شاید وہ لنگ ابھی آجائے اور ہمیں اس سے نمٹنے کے لیے تیار ہونا ہے۔"

اگر چہ تو جیہ سے میں بھی واضح نہیں تھا کہ ابھی طیارے آگئے تو تین الٰہ ور کے لیے کیا کر سکوں گا۔ مجھے سوچنے کے لیے مہلت درکار تھی اس لیے میں چاہ رہا تھا کہ طیارے آج نہ آئیں۔ لیکن میرے چاہنے سے کب کچھ ہوتا ہے اور طیارے آجائے تو انہیں لینڈنگ سے روکنے کے لیے مجھے بہ ہر حال میں گرگز نہ تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ میں نے کھڑکی بند کی۔ آپا اور میں دونوں دروازوں کے پیچھے سو رہے تھے لے گئے۔ یہ تو اندازہ ہی تھا کہ طیاروں کی آمد پہلے ڈیوڈ شاہ یا بیڑا پار ہی ہوا آتی۔ طیارے ان کی مدد ہوتے۔ لیکن اپنے ساتھیوں کے حوصلے اور بہادری پر ذرا بھی شک نہیں تھا۔ گرفتاری کے بعد بھی گھنٹے میں انہوں نے جس طرح سے گن کر نہ کی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت میں ہتھیار نہیں ڈالنے والے ہیں۔ ولیں جلنے والوں شعلوں کی تعداد سے لگ جگ کی تھی اور ان سب کو بچانے میں شاید آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت لگتا۔ پہاڑی امداد ہی چکے تھے۔ ان میں سب سے آگے ایک عمر رسیدہ اور بی قد دبلا سا آدمی تھا۔ شاید وہ ان کا نائب تھا۔ ان کا سردار نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ ان میں شاہین نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ خاندان سے بالکل سفید رنگ کا حریری سا بارہ پہنا ہوا تھا۔ جوان کے جسم کے تناسب سے ڈھکا ہوا تھا اگر جسم چھپا رہا تھا تو ساتھ ہی جسمانی ساخت نمایاں بھی کر رہا تھا۔ کمر سے بے کی فرنگ تھا اور پیروں کے پاس آکر ٹراؤزر کی طرح تنگ ہو جاتا تھا۔ مارٹ نے رہا تھا کہ رویہ نے سب بھی کو چھپا لیا ہے۔

"اب تو خوب کپڑے پہن لیے ہیں۔"

نصف گھنٹے میں یہ دھندلکا چھٹ جائے گا۔ پھر ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔ میں نے دیکھا کہ کمرکس سے مسلح تھی ہوئی تھی اور وہ کمر اور اطراف کھلی تھی۔ میں نے اس سب کو اپنی جگہ سے کوئی اور خنجر تیزی سے گارچھ نکل آیا۔ اشارہ کرنے والی رویہ ہی تھی اور خاصی بے تاب تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"ہمارے ساتھی بھی ہیں۔"

میں کمرکی سے اندر گھسا اور میرے ساتھ ہی رویہ کے ساتھ اور منزل کے ایک کمرے میں آیا۔ میں کی کمرکی میں وہ قلی باہر اور معبد کے سامنے عمل رہا تھا۔ دشمن کی کمزوری کے بھائے ہوا۔ اب اسے آہستہ بیٹھی پوسٹ بنا لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ چادروں کے لباس میں کوئی ایک درجن افراد باہر آئے تھے ان کے ساتھ ایک اور شخص تھا جو ان کا سردار لگتا تھا۔ پجاری ترتیب سے اپنا احترام کی طرف کے کھڑے ہو گئے اور خادم ان کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ میں نے مارٹ اور رویہ سے پوچھا۔ "کچھ دکھائی دیا ہے؟"

"ہم تو دونوں ہی باتوں سے واقف ہیں۔" ہر بہال پجاریوں کے انعقاد سے لگے رہا تھا کہ وہ کوئی مذہبی رسم ادا کر رہے ہیں جو شاید ابھی ادا کی جانی ہو۔ کیونکہ وہ اس وقت تک ساکت کھڑے رہے جب تک دن کی روشنی نمودار نہیں ہونے لگی تھی۔ سورج کے نمودار ہونے تک۔ ڈاوی کے اور پجاریوں کے سورج نکلا تھا۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں صبح بھی روشنی ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی پانچ میں موجود مشعلیں بجھائی جانے لگیں۔ کام خادموں کو کرنا تھیں۔ وہ تاقلی کی صورت میں پہاڑی پر بنی ہوئی ایک سیڑھی کی طرف جانے لگے اور سب سے بجھا کر دوسری منزل کی طرف جانی تھیں۔ دیوان جلنے والی مشعلوں کی تعداد سے لگ بھگ کی تھی اور ان سب کو بجھانے میں شاید آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت لگتا۔ پجاری امداد ہی چکے تھے۔ ان میں سب سے آگے ایک عمر رسیدہ اور بی قد دبلا سا آدمی تھا۔ شاید وہ ان کا نائب تھا۔ ان کا سردار نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ خاندان سے بالکل سفید رنگ کا حریری سا بارہ پہنا ہوا تھا۔ جوان کے جسم کے تناسب سے ڈھکا ہوا تھا اگر جسم چھپا رہا تھا تو ساتھ ہی جسمانی ساخت نمایاں بھی کر رہا تھا۔ کمر سے بے کی فرنگ تھا اور پیروں کے پاس آکر ٹراؤزر کی طرح تنگ ہو جاتا تھا۔ مارٹ نے رہا تھا کہ رویہ نے سب بھی کو چھپا لیا ہے۔

"اب تو خوب کپڑے پہن لیے ہیں۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ ان خادماؤں نے جیسا لباس پہنا ہوا ہے کیا ایسا لباس یہاں بیچا جا سکتا ہے۔"

مارٹ چونکا۔ "بالکل ہو سکتا ہے، لیکن اس کا کیا کریں گے؟"

میں نے روبیر کی طرف دیکھا۔ "اگر تمہیں ایسا لبادہ پہنا دیا جائے تو تم ان خادماؤں جیسی ہو جاؤ گی۔"

"ہاں۔" اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ "کیا میں اس لباس میں زیادہ اچھی لگوں گی؟"

میں نے قائل ہونے والے انداز میں کہا۔ "کیا تم اس طرح آزادی سے باہر گھوم سکو گی اور معبد میں بھی جا سکو گی۔"

اب روبیر سمجھ گئی۔ اس نے سر ہلایا۔ "ایسا ہو سکتا ہے۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں ایسا کروں؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تمہیں خطرے میں ڈالوں لیکن ہمیں معبد کے اندر کے حالات کا پتا چلانا چاہیے۔" میں نے طنطے کو مخاطب کیا۔ "ہم سب ایک مقصد کے تحت یہاں ہیں اور اپنی مرضی سے ہیں۔"

روبیر نے بیری آنکھوں میں دیکھا۔ "بیری دی مرضی ہوگی جو آپ کی ہے۔"

"اگر تم بیری مرضی پوچھو گی تو میں کہوں گا کہ مت جاؤ۔ میں کسی ایسے فرد کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا جس نے اپنا سب کچھ ہمارا ہو۔"

"میں جاؤں گی۔" روبیر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور مارٹ کی طرف دیکھا۔ "ایسا لباس کہاں ہے؟"

"یہاں ایک کمرے میں کپڑے ہیں۔" مارٹ بولا۔ "مجھے دکھاؤ۔" روبیر نے کہا تو میں نے اس کا بازو پکڑلیا۔

"اتنی قلیت مت کرنا، اچھی طرح سوچ لو۔"

"میں نے سوچ لیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "وقت نہیں ہے کیونکہ خادماؤں کے گروہ میں اندر چلی جائیں گی۔ یہی وقت ہے کہ کسی طرح میں شامل ہو جاؤں۔"

میں ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا۔ روبیر مارٹ کے ساتھ چلی گئی۔ باقی ہم نے بالکنی سے طشتیں بجھادی تھیں اور باقی بجھانے کا عمل جاری تھا۔ نیچے کیوں خادمائیں یہ کام نہیں کر رہی تھیں۔ ان کی تعداد دو درجن کے لگ بھگ تھی اور الگ الگ وہ یہ کام مشکل سے ہی مت پھر کر سکتی تھیں مگر اس طرح باجماعت کام کرنے سے دیر لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس طرح جب تک وہ ساری طشتیں بجھاتیں تو دن کی روشنی اتنی ضرور ہو جاتی کہ اس

پاس صاف نظر آنے لگتا۔ اب اس کا امکان باقی نہیں رہتا تھا کہ شعار سے یہاں آئیں گے کیونکہ دھند تیزی سے چھٹ رہی تھی۔ کسی حد تک اوپر کا منظر واضح ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اور واپس آ کر کھڑکی سے ریک کو اوپر کا اشارہ کیا۔ وہ سب چند منٹ میں اندر آ چکے تھے۔ میں نے انہیں روبیر کے بارے میں بتایا تو اب تک فکرمند ہو گیا۔

"یہ بہت کہیں سوگا جناب! اب یہاں بہت سے لوگ جانے ہیں۔ شاہین بھی وہیں ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں خطرہ مول لینا ہے۔"

"روبیر کو خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" ایوٹ کی جھنجلاہٹ صاف ظاہر ہو رہی تھی۔ "اس کا بچہ کسی نہ کسی طرح ہو ہی جائے گا۔"

ریک نے اس کی طرف دیکھا۔ "مگر جو کام روبیر کر سکتی ہے وہ ہمیں یا تم نہیں کر سکتے۔"

"میں معبد کے اندرونی حالات کا علم ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ایسے میں روبیر کو خود فیصلہ کرنے کو کہا ہے اور رضا کارانہ طور پر جا رہی ہے۔"

"آپ کو جانے پر وہ کچھ نہ کچھ تو کہہ کر ہی جائے گی۔" چلانے لگا۔ "اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ اسے روک سکتے ہیں۔"

"وہ فیصلہ کر چکی ہے اور میرا نہیں خیال کہ میرے حکم پر اس کا ارادہ بدل جائے گی۔"

"شباز ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" روبیر کرے میں آتے ہوئے بولی۔ اس نے خادماؤں جیسا حریری لبادہ پہن لیا تھا۔ یہ ریشم جیسا لباد اوپر گر جانے والا کپڑا تھا۔ اس نے ڈھیلا ہونے کے باوجود اس میں روبیر کا جسم نمایاں ہوتا تھا۔ "میں جا رہی ہوں۔"

"لیکن۔" میں نے کہنا چاہا۔

"لیکن وکن کچھ نہیں۔" روبیر بولی۔ "میں فیصلہ کر چکی ہوں اور میں ضرور جاؤں گی۔"

"یہاں تمہارے لیے خطرہ ہے۔" ایوٹ تیز لہجے میں بولا۔ "اگر تمہیں پہچان لیا گیا تو۔۔۔"

"تو کچھ نہیں ہوگا۔" روبیر نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ مجھے سزائے موت نہیں دیں گے۔ وہ مجھے کہیں کہ میں فرار ہو کر واپس آ گئی ہوں اور جیسے دوبارہ یہاں بھگا دیا جائے گا اور مگرمچھوں کو کھانا پڑے گی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔"

"یہی تو مشکل ہے کہ اسے ہمارا جاسوس سمجھ کر اس پر شدید کریں۔" ایوٹ کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب میں نے فیصلہ کن لہجہ کیا تو میری حیثیت اور ساکھ متاثر ہوگی۔ میں نے کہا۔

"ایسا ہم جذباتی ہو رہے ہو اور اس وقت صرف روبیر نہیں ہم سب اپنی اور پوری دنیا کی خیر منا رہے ہیں۔ بچیں گے تو سب بچیں گے ورنہ سب مارے جائیں گے۔ ایسے موقع پر ہر فرد کو اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے۔ نہ کہ کسی دوسرے کو فرض ادا کرنے سے روکا جائے۔"

ایوٹ پھر ہونٹ کاٹنے لگا اور پھر سر جھکا کر مرے مرے چلا گیا۔ سب خاموش تھے اور یہ خاموشی پوری طرح چھا گئی۔ اب یہ لمحے تڑپتے ہوئے روبیر سے کہا۔ "سامنے سے جانا مناسب نہیں ہوگا۔"

میں پیچھے کھڑکی سے نکلوں گی۔" اس نے کہا۔ "مارٹ جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا فوراً بولا۔

"اب وہاں طرف آرہی ہیں۔"

خادماؤں نے باغ کی پیشتر طشتیں بجھادی تھیں اور اب اس عمارت کے سامنے اس قدر وہی طرف موجود طشتیں باقی رہ گئی تھیں۔ میں روبیر کے ساتھ تھا۔ ہم کھڑکی سے باہر گرے اور پھر کود کر عمارت کے دائیں پہلو پہنچ گئے۔ یہاں الٹی طرف تاریکی تھی۔ ذرا آگے خادماؤں کا ایک جتھا تھا۔ جتھے ہوئے اس طرف آ رہی تھیں کہ اچانک ہر طشتی بجھ گئی۔ یہاں سے روبیر کو الٹی قدم کے فاصلے پر تھی اور چند ہی لمحوں میں پوری روشنی کے یار باغ شروع ہو رہا تھا۔ روبیر کو یہیں چھپنا مشکل تھا مگر کیونکہ وہ سب ایک جیسے لباس میں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ پھر وہ سب سر کو معبد کے داخلی دروازے کے اندر بھگ رہی تھیں۔ روبیر کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ ہجوم کے درمیان میں رہے۔ روبیر تیز تیز ہو رہی تھی اور مناسب یہی تھا کہ میں اب اندر چلا جاؤں۔ تمکن نے خادماؤں کے بعد یہاں کوئی اور نکل آئے۔ میں لمحے لیے پیچھے مڑا اور عمارت کی آڑ میں آ کر الٹا۔ کھڑکی سے اندر آیا۔ وہ سب اوپری کمرے میں تھے اور ان کے چہرے اداس تھے۔ خاص طور سے ایوٹ زیادہ اداس تھا۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ "روبیر محفوظ رہے گی۔"

ریک نے کہا۔ "میں نے تارکس سے معلوم کیا ہے۔ شام کے وقت یہی خادمائیں طشتیں جلائیں گی۔"

"جب تک روبیر اندر کے حالات جان نہ لے گی اور اسی طرح واپس آ جائے گی۔"

ہوں۔ تصور اور آپ نہیں میں ہوں۔" اس نے کہا اور حسرت سے دیکھا۔ "شباز! آپ بھی یادر کھیں کہ۔"

"میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔" میں نے کہا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" اس نے کہا۔

اور اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا، وہ نکل گئی۔ ہم گنگ تھے اور کمرے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ایوٹ کی بڑبڑاہٹ بھی رک گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم کے ہر حصے سے پسینہ نکل رہا ہے۔ وہ کانپ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"ایوٹ تم بہت جذباتی ہو رہے ہو اور اس وقت صرف روبیر نہیں ہم سب اپنی اور پوری دنیا کی خیر منا رہے ہیں۔ بچیں گے تو سب بچیں گے ورنہ سب مارے جائیں گے۔ ایسے موقع پر ہر فرد کو اپنا حصہ ادا کرنا چاہیے۔ نہ کہ کسی دوسرے کو فرض ادا کرنے سے روکا جائے۔"

ایوٹ پھر ہونٹ کاٹنے لگا اور پھر سر جھکا کر مرے مرے چلا گیا۔ سب خاموش تھے اور یہ خاموشی پوری طرح چھا گئی۔ اب یہ لمحے تڑپتے ہوئے روبیر سے کہا۔ "سامنے سے جانا مناسب نہیں ہوگا۔"

میں پیچھے کھڑکی سے نکلوں گی۔" اس نے کہا۔ "مارٹ جو کھڑکی سے باہر جھانک رہا تھا فوراً بولا۔

"اب وہاں طرف آرہی ہیں۔"

خادماؤں نے باغ کی پیشتر طشتیں بجھادی تھیں اور اب اس عمارت کے سامنے اس قدر وہی طرف موجود طشتیں باقی رہ گئی تھیں۔ میں روبیر کے ساتھ تھا۔ ہم کھڑکی سے باہر گرے اور پھر کود کر عمارت کے دائیں پہلو پہنچ گئے۔ یہاں الٹی طرف تاریکی تھی۔ ذرا آگے خادماؤں کا ایک جتھا تھا۔ جتھے ہوئے اس طرف آ رہی تھیں کہ اچانک ہر طشتی بجھ گئی۔ یہاں سے روبیر کو الٹی قدم کے فاصلے پر تھی اور چند ہی لمحوں میں پوری روشنی کے یار باغ شروع ہو رہا تھا۔ روبیر کو یہیں چھپنا مشکل تھا مگر کیونکہ وہ سب ایک جیسے لباس میں ایک جیسی لگ رہی تھیں۔ پھر وہ سب سر کو معبد کے داخلی دروازے کے اندر بھگ رہی تھیں۔ روبیر کے لیے یہ مناسب تھا کہ وہ ہجوم کے درمیان میں رہے۔ روبیر تیز تیز ہو رہی تھی اور مناسب یہی تھا کہ میں اب اندر چلا جاؤں۔ تمکن نے خادماؤں کے بعد یہاں کوئی اور نکل آئے۔ میں لمحے لیے پیچھے مڑا اور عمارت کی آڑ میں آ کر الٹا۔ کھڑکی سے اندر آیا۔ وہ سب اوپری کمرے میں تھے اور ان کے چہرے اداس تھے۔ خاص طور سے ایوٹ زیادہ اداس تھا۔ میں نے انہیں تسلی دی۔ "روبیر محفوظ رہے گی۔"

ریک نے کہا۔ "میں نے تارکس سے معلوم کیا ہے۔ شام کے وقت یہی خادمائیں طشتیں جلائیں گی۔"

"جب تک روبیر اندر کے حالات جان نہ لے گی اور اسی طرح واپس آ جائے گی۔"

یہ سن کر ایرٹ کے چہرے پر ذرا رونق آئی تھی۔ ایمار اور مارٹ آرام کرنے لگ گئے۔ فوجی افسران بھی اب آرام کر رہے تھے اور ان کی جگہ پجاری نگرانی کا فرض انجام دے رہے تھے۔ میں نے ایرٹ اور ربیک کو روک لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''آنے والی رات فیصلہ کن ہے اور ہمیں رات سے پہلے پہلے ایک قابلِ عمل منصوبہ تیار کر لینا ہے۔''

''آپ جو حکم دیں۔'' ربیک نے مستعدی سے کہا۔

''ہم چار افراد کیا کر سکیں گے؟'' ایرٹ نے بجھے انداز میں پوچھا۔

''تم بھول رہے ہو ہم چار افراد اب تک بہت کچھ کرتے آئے ہیں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''دوسری طرف بھی اصل میں چار ہی لوگ ہیں اور ہمیں ان ہی سے نمٹنا ہے۔''

ربیک نے ایرٹ کو گھورا تو اس نے جھرجھری سی لی۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ بھی چار ہیں۔''

میں سوچ رہا تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہوگا۔ کل رات کے تجربے سے یہ تو میرے علم میں آ گیا تھا کہ معبد کے عقبی حصے میں نگرانی نہیں کی جا رہی تھی۔ ہمیں اسی سے فائدہ اٹھانا تھا۔ لیکن کیسے؟ یہ طے ہونا باقی تھا۔ ایک چیز میں نے سوچ لی تھی کہ طیارے یا طیاروں کو کسی صورت یہاں اترنے نہیں دینا ہے کیونکہ ایک طیارے کی آمد کا مطلب بھی ہوگا ڈیوڈ شا کی طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی۔ میں نے انہیں اپنے اوّل فیصلے سے آگاہ کیا تو ربیک نے سوال کیا۔ ''یہ چیز کس طرح کی ہوتی ہے اور ہم اسے کس طرح روک سکتے ہیں۔''

میں نے پہلے زبانی اور پھر ایک خالی کمرے کی دیوار پر سفید چاک نما پتھر سے طیارے کی تصویر بنا کر دکھائی۔ پھر اس کے مختلف حصوں کے بارے میں وضاحت کرنے لگا کہ وہ کیا کام کرتے تھے۔ ان کے لیے یہ دیومالائی شے تھی۔ مگر میں نے واضح کیا کہ اس میں کچھ بھی دیومالائی نہیں ہے یہ وادی میں بننے والے مختلف استعمال کی چیزوں کی طرح ایک مکمل انسانی تخلیق ہے اور اس کے پیچھے منطق کام کرتی ہے۔ وہ اس کی رفتار کا اندازہ نہیں کر پا رہے تھے کیونکہ یہاں پرندے کم تھے اور جو تھے وہ اتنی تیزی سے نہیں اڑتے تھے۔ کچھ تو سرے سے نہیں اڑتے تھے جیسے زہریلے کانٹوں والا پرندہ۔

''یہ جتنی مضبوط ہوتی ہے اتنی ہی آسانی سے تباہ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کی پرواز اور زمین پر اترنا سب توازن کا کام ہے۔ جیسے تم لوگ کسی پتلی سی لکڑی پر چلنے کی کوشش کرو تو توازن رکھنا پڑتا ہے۔ اس کی رفتار کی وجہ سے حادثہ پیش آنے کی صورت میں تباہی اور اس میں سوار افراد کی ہلاکت تقریباً یقینی ہوتی ہے۔''

ایرٹ نے کہا۔ ''اگر ہم کوئی ایسا بندوبست کریں کہ یہ زمین پر اتر نہ پائیں تو......''

''بالکل ہمیں یہی کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ڈیوڈ شا اور اس کے ساتھیوں کے خاتمے سے زیادہ ضروری یہ کام ہے ایک بار وہ ناکام ہو جائے تو اس کے حوصلے خود پست ہو جائیں گے اور تب ہم اس پر قابو پانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

ربیک نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا، اصل کام باہر سے مدد آنے سے روکنا ہے۔''

میرے ساتھی رفتہ رفتہ معاملے کی نزاکت سے باخبر ہو رہے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر میں نے انہیں آتشیں ہتھیاروں اور بم کی ساخت کے بارے میں بتایا کہ یہ کس طرح کام کرتے اور نقصان پہنچاتے ہیں۔ وہ حیران رہ گئے کیونکہ دونوں چیزوں کی منطق بہت آسان اور سمجھ میں آنے والی تھی۔ البتہ وہ بارودی مواد کی نوعیت نہیں سمجھ سکے تھے۔ مگر وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ ہمارے ہتھیار اور حفاظتی انتظامات ان کے خلاف بیکار تھے۔ میں اب سوچ میں معروف تھا۔ ان لوگوں سے بات کرتے اور طیارے کے بارے میں بتاتے ہوئے ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ رن وے ناکارہ کرنے کا آسان طریقہ تو یہ کہ کسی طرح لائٹس آن نہ ہونے دی جائیں مگر مسئلہ وہی تھا کہ یہ ریموٹ سے آن ہونے والی لائٹس تھیں اور اگر میں موجودہ لائٹس ہٹا لیتا یا تباہ کر دیتا تب بھی اس کا امکان تھا کہ ان کے پاس اضافی لائٹس ہوں۔

اس میں زیادہ خطرہ یہ تھا کہ یہاں ہماری موجودگی کا راز فاش ہو جاتا اور فی الحال میری کامیابی تھی کہ ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی میری آمد سے بے خبر تھی۔ غور کرتے ہوئے اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں نے ربیک سے کہا۔ ''یہاں بڑی رسیاں ہیں؟''

''بالکل ہیں جناب۔'' ربیک نے کہا۔ ''کیا لے آؤں؟''

''ہاں لے آؤ جتنی بھی ہیں سب لے آؤ۔''

ربیک ایمار کے ساتھ گیا اور کچھ دیر رسیوں کے بنڈل لے آیا۔ میں نے ایک بنڈل لے کر دیکھا۔ اس کی شاید وہ سوفٹ رسی تھی۔ باقی بنڈل اس سے چھوٹے تھے۔ پتلی پتلی چون انچ سوتی اور متعدد چھوٹی ڈوریوں کو بانٹ کر بنائی گئی تھی۔ یہ اتنی مضبوط تھی کہ ہارن جیسا طاقتور جانور بھی اسے نہیں توڑ سکتا تھا۔ رسی سفیدی مائل سرمئی رنگ کی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہاں سیاہ رنگ ہو گا۔ یہ لازمی ہے۔ کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے رسی کا رنگ سیاہ ہو جائے۔''

''میں معلوم کرتا ہوں۔'' ربیک نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ ایرٹ متجسس تھا۔ اس نے پوچھا۔

''آپ کیا کرنا چاہتے ہیں جناب؟''

''تم نے کہا تھا کہ کچھ ایسا... کرنا چاہیے کہ طیارے زمین پر نہ اترنے پائیں تو میں اسی کی کوشش کرنے جا رہا ہوں۔''

ربیک کچھ دیر بعد آیا۔ اس نے بتایا۔ ''یہاں ان لوگوں کے پاس وہ سفوف ہے جسے پانی میں گھول کر بالوں میں لگاتے ہیں تو سفید بالوں کا رنگ سیاہ ہو جاتا۔''

''وہی لے آؤ۔ بلکہ یہ رسیاں لے جاؤ اور سفوف کا گھول بنا کر اس میں ڈبو دو جب رنگ اچھی طرح چڑھ جائے تو رسیاں نکال کر کہیں لٹکا دینا کہ پانی نکل جائے۔ یہ کام جتنی جلدی ہو اتنا اچھا ہے۔''

ربیک اور ایمار رسی کے بنڈل لے کر چلے گئے۔ ایرٹ اور مارٹ عمارت کا چکر لگانے چلے گئے۔ میں نے کھڑکی کی جھری سے باہر جھانکا جہاں روشنی تقریباً مکمل ہو گئی تھی اور معبد کے سامنے والا باغ اور احاطہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ جیسا کہ نارس نے بتایا تھا کہ دن میں عمارت کے لوگ باہر جا سکتے تھے۔ یعنی دن میں خودکار گن بند کر دی جاتی تھی۔ نارس نے کوئی حد نہیں بتائی تھی اس کا مطلب تھا کہ دن میں جانے والے ہر جگہ جا سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اتنے بڑے کنبے کو خوراک کیسے دی جائے۔ ویسے یہاں خوراک کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا اور پکانے کی جگہ بھی تھی۔ مگر پکاتا کون؟ میں نے کچھ بعد ایرٹ کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ وہ قیدیوں میں سے معلوم کرے کہ کھانا کون بنا سکتا ہے۔ دو تین آدمی باہر ناشتہ کے لیے کچھ بنائیں۔ ایرٹ چلا گیا۔

میں روبیر کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس لڑکی نے پہلے شاہین کی محبت میں اتنا بڑا قدم اٹھایا، اپنی عزت اور زندگی دونوں داؤ پر لگا دی۔ شاہین نے اسے دھوکا دیا تو وہ میری طرف آئی اور اب میری محبت میں اس نے ایک بار پھر خود کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ خطرے کے منہ میں براہِ راست

ملک ملک کے دلچسپ قوانین

☆ آرکنساس میں اگر کوئی عورت دوسری شادی کر رہی ہے تو وہ سفید لباس نہیں خرید سکتی۔

☆ وکٹوریا (آسٹریلیا) میں آدھے دن کے بعد گلابی رنگ کی پینٹس پہننا قانونی جرم ہے اور اس پر جرمانہ ہو جاتا ہے۔

☆ کینٹکی میں آئس کریم کون جیب میں رکھ کر چلنا منع ہے۔

☆ انٹرنیشنل فالس میں سولا میں اگر آپ اپنے کتے کو ساتھ لے گئے ہیں اور وہ کتا اگر اس بلی کے پیچھے پڑ گیا ہے جو اس سے بچنے کے لیے ٹیلی فون کے کھمبے پر چڑھ گئی ہو تو آپ سزا کے مستحق ہیں۔ (اب کتوں کو کون سمجھائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہ صرف ٹیلی فون کے کھمبے پر بلی چڑھ گئی ہو تو۔ وگرنہ کچھ بھی نہیں ہوگا)۔

☆ امریکا کی بہت سی ریاستوں میں دوسری شادی جرم ہے۔

☆ یونان میں پولیس کو اس آدمی کو گرفتار کرنے کا حق حاصل ہے جو ایڈز کا مریض ہے۔

☆ ویتنام اور فلپائن میں طلاق دینا قانونا جرم ہے۔ پولیس شوہر کو گرفتار کر لیتی ہے۔

☆ سنگاپور میں چیونگ گم چبانا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس پر ایک ہزار ڈالرز تک کا جرمانہ ہو جاتا ہے۔

☆ چین میں ابھی حال ہی میں ایک قانون پاس ہوا ہے کہ بیٹا یا بیٹی شادی کے بعد والدین سے الگ رہ رہا ہے تو اس پر لازم ہے کہ مہینے میں دو بار والدین کے پاس جایا کرے ورنہ وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔

☆ آرکنساس میں بیوی کو مارنا جائز ہے لیکن مہینے میں صرف ایک بار مار سکتے ہیں۔ اس سے زیادہ بار مارنے کی کوشش کی تو شوہر اندر ہو سکتا ہے۔

☆ ایریزونا میں ایک گھر میں دو سے زائد Vibrators لگانا جرم ہے اگر ایسا ہوا تو اسے سخت جرم سمجھا جاتا ہے۔

☆ ورجینیا میں اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بستر سے نیچے پھینک دے تو یہ بہت بڑا جرم ہو جاتا ہے۔

☆ ورماؤنٹ کا ایک دلچسپ قانون سن لیں۔ وہاں اگر بیوی خرابی کی وجہ سے دانت نکلوا دے تو وہ شوہر کی تحریری اجازت کے بغیر نقلی دانت نہیں لگوا سکتی۔

☆ یوٹاہ میں کزن سے شادی کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ دونوں 65 سال سے زیادہ کے ہو چکے ہوں۔ اب بتائیں ہے کوئی جواب اس قانون کا۔

مرسلہ: منیزہ یاسمین۔ رحیم یار خان

چلی گئی تھی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس بار بھی اسے کچھ نہیں ملنے والا تھا چاہے وہ کامیاب واپس آتی۔ روبیر کی محبت کا جواب محبت سے دینا میرے بس میں نہیں تھا۔ مگر فی الحال میں اسے درپیش خطرات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تو اس کا سابق محبوب شاہین تھا۔ وہ معبد میں موجود تھا اور آئی زور کے خاص آدمیوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ روبیر خاصے دن سے یہاں تھی اور اسے پہچاننے والے افراد کی کمی نہیں تھی۔ وہ پکڑی جاتی تو ممکن ہے اس سے یوں معبد آنے کی وجہ پوچھی جاتی۔

پجاریوں سے مجھے زیادہ چالاکی کی اُمید نہیں تھی مگر وہاں ڈیوڈ شا جیسا شاطر اور مکار موجود تھا جو اپنے سائے سے بھی شک کرنے والا آدمی تھا۔ جب اسے پتا چلتا کہ روبیر اصل میں مجھ سے متعلق ہے تو وہ اصل بات اگلوانے کے لیے اس پر کسی قسم کا تشدد کر سکتا تھا۔ روبیر بہرحال ایک نازک لڑکی تھی وہ تکلیف ایک حد تک ہی برداشت کر سکتی تھی۔ اس کے بعد اس کے لیے زبان بند رکھنا مشکل ہو جاتا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہا تھا۔ میرے اندر اضطراب کی لہریں سی اٹھنے لگی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے معبد میں جانے کا کہہ کر غلط فیصلہ کیا تھا۔ دیکھا جائے تو معبد میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کے بارے میں میرا جاننا ضروری ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ وہاں ڈیوڈ شا ہے، اس کے ساتھی ہیں اور وہ کن ہتھیاروں سے مسلح ہیں۔ ان کے عزائم کیا ہیں میں سب کچھ جان چکا تھا۔

مگر میں نے اس خیال کو جھٹک دیا۔ جاسوسی کا مسلمہ اصول ہے کہ دشمن کے بارے میں وہ جاننے کی کوشش کرو جو آپ نہیں جانتے اور یقیناً میں ڈیوڈ شا اینڈ کمپنی کے بارے میں سب نہیں جانتا تھا۔ ان کی بہت سی باتیں مجھ سے چھپی ہوئی تھیں اور ممکن ہے روبیر وہاں کوئی ایسی بات جان لیتی جو ہمارے کام آتی اور ڈیوڈ شا کو شکست ہو جاتی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ایسا ہی ہو۔ روبیر کامیاب واپس آئے تاکہ میں اپنے ساتھیوں کے سامنے بھی سرخرو ہوں جو سوچ سکتے تھے کہ میں نے روبیر کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس دوران میں جب کہ ربیک اور ایمار رسی سیاہ کر رہے تھے۔ ایرٹ نے چند خادم تلاش کر لیے تھے جو کھانا بنانے کے ماہر تھے اور اب وہ باورچی خانے میں سب کے لیے ناشتا تیار کر رہے تھے۔ ناشتے اور کھانے کے بارے میں یہی فیصلہ ہوا تھا کہ وہ قیدیوں کو ان کے کمروں میں دیا جائے گا۔

یہ سب عام افراد تھے اس کے باوجود ہم [illegible] چاہتے تھے اگر ان میں سے کوئی یہاں سے نکلنے میں [illegible] ہو جاتا تو ہمارا منصوبہ تو چوپٹ ہوتا ہی ہماری [illegible] خطرے میں پڑ جاتی۔ میں صبح ہونے سے پہلے ہی [illegible] تھا مگر جب ناشتا تیار ہوا تو میں نے ناشتا کر لینے میں [illegible] نہیں سمجھا۔ آرام اور کھانے کا ہر موقع غنیمت تھا [illegible] بعد حالات نہ جانے کیا رخ اختیار کریں۔ میں مسلسل [illegible] سے معبد کی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے لیے بالکل تیار [illegible] اگر اس طرف سے کوئی آیا تو ہم نارس کو آگے [illegible] گے۔ مگر فی الحال اس طرف سے کوئی آتا نظر نہیں آ [illegible] بلکہ نہ ہی آتا تو ہمارے لیے اچھا تھا۔

دو گھنٹے بعد میں نے نگرانی کے لیے [illegible] لگایا۔ میں نے عمارت کا چکر لگایا اور ربیک کی کارگزاری [illegible] دیکھی۔ جس نے واش روم میں ایک بڑے سے [illegible] میں وہ محلول بنایا ہوا تھا جو بالوں کو سیاہ کرتا ہے مگر [illegible] یہ رسی سیاہ کر رہا تھا۔ ابھی تک رسی محلول میں بھیگ رہی [illegible] میں نے اس کا معائنہ کیا تو مجھے لگا کہ رسی بالکل سیاہ ہو [illegible] تھی۔ کچھ دیر میں اسے خشک کرنے کے لیے گٹھی [illegible] کر کسی درخت سے لٹکا دیا جاتا تو چند گھنٹوں میں اس کا [illegible] پانی نکل جاتا۔

"انہیں جوڑنا ہوگا۔" رسی خشک ہوئی تو [illegible] ربیک سے کہا اور گیلی رسی کا بنڈل بنانے لگا۔ جب [illegible] بنڈل بنا لیا تو ربیک نے دوسری رسی کا سرا اس سے گرہ [illegible] جوڑ دیا اور میں نے اسے بھی بنڈل میں شامل کیا۔ [illegible] رسی جوڑنے کے بعد بنڈل خاصا بڑا اور وزنی [illegible] تھا۔ میں نے اسے شانے پر لاد لیا اور ربیک کے ساتھ [illegible] درخت کی طرف بڑھا جس سے رسی باندھنی تھی۔ [illegible] عمارت کے کنارے تک آ کر میں نے پہلے ربیک کو [illegible] روانہ کیا کہ وہ دیکھے اگر کوئی معبد کے پہلو کی طرف [illegible] مجھے خبردار کرے۔ ربیک نے ایسی جگہ پوزیشن سنبھالی [illegible] جہاں وہ خود کو چھپا کر آنے والوں کو دیکھ سکتا تھا پھر اس [illegible] مجھے اشارہ کیا تو میں درخت کی طرف بڑھا تھا۔ میرا [illegible] کہ شام کے پانچ بج رہے تھے کیونکہ شام کا سا وقت [illegible] تھا اور روشنی میں تیزی ختم ہو گئی تھی۔ جو جگہیں اندر [illegible] میں تھیں وہاں ہلکا سا اندھیرا چھا رہا تھا۔

میں جھکا ہوا دوڑ کر درخت کے پاس پہنچا [illegible] کے قریب ہی ایک جھاڑی نما پودے کی آڑ میں [illegible] یہاں سے معبد کی طرف سے آنے والا راستہ دکھ[illegible]

رہا تھا۔ اہرام کی عظیم الشان عمارت یہاں سے بہت واضح تھی۔ بلکہ عین سر پر محسوس ہو رہی تھی حالانکہ اس درخت سے اس کا فاصلہ کم سے کم سو گز تھا۔ آڑ میں ہو کر میں نے اشارے سے ربیک کو بلایا تو وہ واپس عمارت کی آڑ میں ہوا اور پھر دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "رسی کو درخت کی ایسی شاخ پر باندھنا جو مضبوط ہو..... کیونکہ رسی کو لگنے والا جھٹکا بہت شدید ہو گا۔ اگر رسی شاخ سے نکل گئی یا شاخ ہی ٹوٹ گئی تو شاید اترنے والے طیارے کو نقصان نہ ہو۔"

ربیک نے سر ہلایا اور درخت پر چڑھ گیا۔ یہ درخت کم سے کم چالیس پینتالیس فٹ اونچا تھا۔ ہم رسی کو جتنا بلند باندھتے طیارے کا اس سے ٹکرانے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوتا۔ اگرچہ دوسری طرف اگر ہم رسی کو فصیل کے سرے بھی باندھتے تب بھی یہ بلندی تیس فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ دیوار اتنی ہی بلند تھی۔ ربیک نے رسی کا سرا مجھ سے لے لیا تھا اور اسے کھینچتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ کوئی تیس فٹ پر جا کر اس نے درخت کی شاخوں کا جائزہ لیا اور مزید اوپر جانے لگا۔ مزید پانچ یا چھ فٹ اوپر جا کر اس نے رسی ایک مضبوط شاخ پر باندھ دی۔ یہ تنے کا تقسیم ہو جانے والا حصہ تھا جو بدستور خاصا موٹا اور مضبوط تھا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اشارے سے کہا کہ اس نے ٹھیک کام کیا ہے۔ اس دوران میں تاریکی میرے اندازے سے زیادہ تیزی سے چھانے لگی تھی۔ شاید اوپر موسم اچھا نہیں تھا اور بادل تھے جنہوں نے سورج کی روشنی پہلے ہی روک دی تھی اور اس وجہ سے نیچے وادی میں بھی وقت سے پہلے روشنی کم ہونے لگی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر اوپر موسم خراب ہے تو شاید آج طیاروں کی آمد ممکن نہ ہو سکے۔ پروپلر انجن والے طیارے جیٹ انجن والے طیاروں کے مقابلے موسم سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں کیونکہ ان کی پرواز زیادہ تر توازن کے اصول پر ہوتی ہے۔ تیز ہوائیں اور کم یا زیادہ ہوتا ہوائی دباؤ ایسے طیاروں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔ خاص طور سے پہاڑی علاقے میں جہاں اونچی چوٹیاں خاص طور سے خطرناک ہوتی ہیں۔ اگر طیارے آج رات نہ آتے تو ہمیں صبح کی روشنی ہونے سے پہلے رسی دوبارہ اتارنی پڑتی ورنہ دن کی روشنی میں یہ سیاہ رسی صاف دکھائی دیتی۔ بہرحال یہ بعد کی بات تھی۔ پہلا مرحلہ تو رسی لگانے کا تھا۔ ربیک نیچے اتر آیا تھا۔ اس نے نیچے آتے ہی ایک چھوٹے درخت کی طرف اشارہ کیا جو اس درخت سے دائیں طرف فصیل کی مخالف سمت کی دیوار سے ذرا دور کھڑا تھا۔ "میں اس درخت سے چڑھ کر فصیل تک جا سکتا ہوں۔"

"اور اس کے بعد؟"

"دوسری طرف اتر کر رسی کو کہیں باندھنا ہوگا کیونکہ یہاں تو کوئی جگہ نظر نہیں آ رہی جہاں رسی باندھی جا سکے۔"

"دوسری طرف۔" میں فکرمند ہو گیا۔ "یہ خطرناک ہوگا۔"

"ہاں مگر اس کے سوا اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے رسی باندھنے کا۔" ربیک نے سوال کیا تو میں اس جگہ کا معائنہ کرنے لگا۔ فصیل کے ساتھ ساتھ باغ میں کچھ پودے تھے اور واحد درخت یہی تھا۔ اس کے بعد فصیل کے ساتھ گھاس کا تنکا بھی نہیں تھا اور دوسرے سرے تک مٹی کا میدان تھا۔ مجھے بھی سمجھ میں نہیں آیا کیونکہ فصیل اوپر سے سپاٹ تھی اور اس میں کہیں رسی باندھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے آس پاس ایسی جگہ تھی۔ دوسری طرف یقیناً جھاڑیاں تھیں اور ان میں رسی باندھی جا سکتی تھی۔ اسی لیے ربیک دیوار کے پاس جانے کی بات کر رہا تھا۔ مگر دوسری طرف ہارن اور زہریلے پرندے جیسے دشمن موجود تھے۔ اگر جھاڑیاں تھیں تو ہارن کا خطرہ اتنا نہیں تھا مگر زہریلے پرندے کا خطرہ پوری طرح تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ "ہاں یہاں گنجائش نظر نہیں آ رہی ہے اور فصیل کے پار ہی جا کر باندھنا ہوگا۔"

"آپ مجھ سے متفق ہیں؟"

"ہاں لیکن دیوار کے پار تم نہیں میں جاؤں گا۔" میں نے کہا تو اس نے جلدی سے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ کا جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ آپ کا جسم ذرا وزنی ہے اور میں آپ کی نسبت تیزی سے رسی چڑھ سکتا ہوں اور خطرہ ہوا تو میں تیزی سے ہی واپس بھی آ سکوں گا۔ اس لیے میں ہی جاؤں گا۔"

"میں بھی تیزی سے چڑھ سکتا ہوں۔"

"مجھ سے زیادہ تیز نہیں چڑھ سکتے۔" ربیک نے اصرار کیا۔ "آپ جانتے ہیں میں ان کاموں کا ماہر ہوں۔"

"ربیک اس میں خطرہ ہے۔"

"میں اس خطرے کا زیادہ بہتر سامنا کر سکتا ہوں۔" ربیک نے کہا تو میں نے خود کو لاجواب محسوس کیا۔ اس دوران میں اندھیرا تیزی سے چھا رہا تھا اور ایسا سماں ہو رہا تھا جیسے سورج غروب ہونے کے دس منٹ بعد

ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ حرکت میں آنے کا وقت تھا۔

میں نے ربیک کے پاؤں میں رسی باندھی۔

''تم زمین پر رینگتے ہوئے جاؤ گے میں رسی کھولتا رہوں گا.... جب دیوار کے پاس پہنچ جاؤ تو رسی کھینچنا جب تک یہ زمین سے اٹھنے نہ لگ جائے۔''

ربیک نے سر ہلایا اور چھپکلی کی طرح رینگتا ہوا فصیل کی طرف جانے لگا۔ اس طرف گھاس بھی اور پودے تھے اسے ان کی آڑ مل رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھ رہا تھا میں رسی کے بل کھولتا جا رہا تھا ایسا کرنا ضروری تھا ورنہ یہ آپس میں الجھ کر مشکل پیدا کر سکتی تھی۔ ابھی بنڈل کا کچھ حصہ باقی تھا کہ وہ دیوار تک پہنچ گیا اور اس نے درخت کی آڑ میں بیٹھتے ہوئے رسی کھینچنا شروع کر دی۔ ذرا سی دیر میں اس نے رسی اتنی کھینچ لی کہ اب وہ زمین پر تھی اور مزید کھینچنے پر ہوا میں معلق ہو جاتی۔ اب میں اسی طرح رینگتا ہوا اس کے پاس پہنچا۔ تاریکی اتنی ہو چکی تھی کہ دور کی چیز صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ ربیک نے کہا۔ ''اس سے پہلے کہ اندھیرا مکمل ہو ہمیں یہ کام کر لینا چاہیے۔''

رسی اچھی خاصی تھی۔ میں نے اس کا چھوٹا ٹکڑا نکال دیا تب بھی اتنی تھی کہ کئی گز اضافی ہو رہی تھی۔ ربیک درخت پر تھا وہاں سے دیوار پر چڑھا مگر اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ لیٹا رہا تھا میں نے اس کی طرف رسی اچھالی اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا ربیک آرام سے دوسری طرف اتر گیا۔ چند لمحے بعد رسی کھنچنے لگی۔ ربیک نے کوئی ایسی جگہ تلاش کر لی تھی کہ جہاں رسی کو مضبوطی سے باندھا جا سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یا کسی کو فصیل پر ہونا چاہیے تھا کہ ربیک پر کوئی مشکل آئے تو ہم اس کی مدد کر سکیں۔ مگر اب تو وہ اتر چکا تھا۔ ایک منٹ سے پہلے اس نے رسی کو پوری طرف کھینچ لیا تھا اور وہ درخت سے فصیل تک اس طرح تن گئی تھی کہ اس میں بہت معمولی سا لٹکاؤ نظر آ رہا تھا۔ ربیک نے رسی باندھی اور پھر وہ اسی کے سہارے چڑھ کر اوپر آیا اور درخت کے سہارے نیچے اتر گیا۔

''میں نے اتنی مضبوطی سے باندھی ہے کہ یہ ٹوٹ سکتی ہے لیکن کھل نہیں سکتی تھی اور نہ ہی جھاڑی کا تنا ٹوٹ سکتا ہے۔''

تاریکی خاصی بڑھ چکی تھی اور سیاہ رسی اسی وقت نظر آتی جب وہ بالکل پاس آ کر دیکھتا یا پھر تیز روشنی والی مشعل میں خاص طور سے اوپر دیکھتا تو اسے رسی نظر آتی۔ میں اور ربیک واپس عمارت کی طرف آئے تو یہاں مشعلیں روشن ہو چکی تھیں۔ مگر معبد کے سامنے والے باغ میں تاریکی تھی اور ابھی تک اندر سے خادمائیں برآمد نہیں ہوئی تھیں جو مشعلیں جلاتیں۔ مارٹ اور ایرٹ دفتر والے کمرے میں تھے اور کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد مارٹ نے اطلاع دی۔ ''وہ باہر آ گئی ہیں۔''

یہ سنتے ہی میں بھی تیزی سے کھڑکی کے پاس آیا۔ خادماؤں کا ایک مشعل بردار ہجوم تھا جو باہر باغ اور روش پر کھمبوں سے لگی مشعلیں روشن کر رہا تھا جس طرح وہ اجتماعی طور پر مشعلیں جلا رہی تھیں اسی طرح انہوں نے ایک ساتھ مل کر مشعلوں کو جلانا شروع کر دیا۔ ان کی تعداد حسب معمول دو درجن کے لگ بھگ تھی اور اتنی عورتوں میں روبیر کو تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ہم سب دھڑکتے دل سے دیکھ رہے تھے۔ خادمائیں رفتہ رفتہ مشعلیں جلاتی ہوئی ہماری طرف والی عمارت کی طرف آنے لگیں اور میرا خیال تھا کہ روبیر ان سے اسی وقت الگ ہو کر ہماری طرف آئے گی مگر خادمائیں آئیں اور انہوں نے اس طرف کی ساری مشعلیں بھی جلا دیں مگر ان میں کوئی الگ نہیں ہوئی تھی اور پھر وہ مڑ کر معبد کی طرف جانے لگیں۔

''یہ کیا روبیر باہر نہیں آئی۔'' مارٹ نے کہا۔ اسی لمحے اندر سے ایک لکڑی سے بنی ہاتھ گاڑی نکلی جسے ایک پجاری چلا رہا تھا اور گاڑی پر سفید لبادہ اور اس پر جا بجا سرخ رنگ نمایاں تھا۔ لبادے میں نسوانی وجود بھی اتنی دور سے صاف نظر آ رہا تھا اور وہ وجود بالکل ساکت تھا۔ میں، مارٹ، ربیک اور ایرٹ دم بخود سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پجاری ہاتھ گاڑی چلاتا ہوا مخالف سمت میں قید خانے والی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ ربیک نے ڈوبتے لہجے میں ہماری سوچوں کو زبان دی۔

''کیا یہ روبیر......؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا اور مڑ کر ایرٹ کو دیکھنا چاہا مگر وہ کمرے میں نہیں تھا۔ ربیک جواب کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اس کے منہ سے نکلا۔ ''ایرٹ۔''

میں جھپٹ کر آیا تو ایرٹ مجھے باغ میں دکھائی دیا وہ معبد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اتنا آگے جا چکا تھا کہ ہم اسے آواز بھی نہیں دے سکتے۔ ابھی وہ باغ کے وسط میں تھا۔ اسی لمحے معبد سے چند افراد برآمد ہوئے اور ہماری طرف آنے لگے۔ ان میں کرنل اور باسو نمایاں تھے۔ حالات یک دم ہی سنگین ہو گئے تھے۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(محمد فیضان بخاری ملتان کا جواب)

نیلوفر شاہین......اسلام آباد

دامن پہ کوئی چھینٹ نہ خنجر پہ کوئی داغ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو

نادیہ فیصل......جھنگ

دکھوں کے جنگل میں پھرتے پھرتے عجیب گزریں گے دن ہمارے
اداس راتوں کی خامشی میں تم اپنے آنسو پیا کرو گے

انور شمائلی......حیدرآباد

وہ عالم میں جس کی سمائی نہیں
وہ غم ایک دل میں سما جائے ہے

مرزا حمزہ بیگ......حیدرآباد

دل کو تمہارے نام کے آنسو عزیز تھے
دنیا کا کوئی درد سمونے نہیں دیا

(نوشین اختر پشاور کا جواب)

مجی الرحمٰن......بریٹ لیٹ یو ایس اے

روکتا تھا ناخدا کشتی کو طوفاں آ گیا
تم جہاں پر ہو بس اتنی دور تھے ساحل سے ہم

(روبینہ مشتاق کراچی کا جواب)

عنایت صبح......کراچی

جان اب کون لٹاتا ہے محبت کے لیے
وہ مری جان کوئی اور زمانہ ہو گا

(سلیم اور لیس ملتان کا جواب)

ایم عمران جونانی......کراچی

اس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

عبدالستار......ساہیوال

اس سے بڑھ کر کیا خوشی ہو باپ کو استاد کو
دیکھے بڑھتا ہے آپ سے، شاگرد کو اولاد کو

(نعیم ابرار خان پور کا جواب)

معراج محبوب عباسی......ہری پور ہزارہ

یہ اور بات کہ میں چھوڑ چکا ہوں کوزہ گری
ورنہ تیرے جیسے تو میں پتھر کے بنا سکتا ہوں

سیف اللہ......ملک وال

زخمی ہوئے جو ہونٹ تو محسوس یہ ہوا
چوما تھا میں نے پھول کو دیوانگی کے ساتھ

(مسرت سکھر کا جواب)

ہادیہ ایمان ماما ایمان......ہارون آباد

اے جانِ جہاں و صبح گیتی
مجھ سے تو یہ شب نہ کٹ سکے گی
یہ شب یہ اداسیوں بھری شب
یہ شب یہ وفا کی آخری شب

ناہید عباس......علی پور چٹھہ

اکسیر کے آ جاتے ہیں اوصاف بشر میں
سو فائدے ہیں ایک محبت کے جزو میں

(ناہید سلطانہ لاہور کا جواب)

عبدالحکیم ثمر......کراچی

کسی کو حسن دیا کسی کو مال دیا
غریب جان کے تو نے مجھی کو ٹال دیا

فرزانہ توحید......ساہیوال

کسی آواز کا جادو تعاقب کر رہا ہے
اجڑی سرزمین پر پھر کوئی سایہ اگا ہے

ابرار الحسن زیدی......ملتان

کل جس کو محبوب تھا سایہ قامت و گیسو
وہ دیوانہ آج حریفِ دار و رسن ہے

(نعیم الدین صدیقی کراچی کا جواب)

مرزا ہادی بیگ......لطیف آباد

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم

(حنا غفار بہاولپور کا جواب)

عبدالجبار رومی انصاری......لاہور

نقش اسی کے ہیں یکجا مجھ میں
میری آنکھیں بھی پرائی نکلیں

عبدالغفار.....جہلم

نبھانے دھوپ میں کیوں کر چلا ہے ساتھ مرے
اگرچہ سایہ سفر سے گریز پا بھی تھا
(شمع عزیز کے لڑوں کا جواب)

فیض الحسن.....کوٹ ادو

یہ جو پتھر ہے آدمی تھا کبھی
اس کو کہتے ہیں انتظار میاں
(ادھم خواص پنڈ گاکا جواب)

فلک شیر.....رحیم یار خان

وہ مجھ سے خفا بھی سہی مجھے منظور ہے لیکن
یارو اسے سمجھاؤ کہ میرا شہر نہ چھوڑے
(نصرت جاوید کا جواب)

نیب ربانی.....ملتان

نہ آیا ہوں نہ میں لایا گیا ہوں
میں خود بھیجا گیا ہوں
عشرت حسین زیدی.....پشاور

تقدیر اپنی ہنس رہا ہے جسم
ہاتھوں خار و خس رہا ہے جسم

نیلم نجیم.....چنیوٹ

روح کو ہر روز یہ پیغام دیتا ہے بدن
ملنے کو اب بھی شوق رہائی معذرت
(بھی مومن برف لیٹ امریکا کا جواب)

نجم الیاس.....اسلام آباد

یہ اور بات میں خود کو سنبھال بھی نہ سکا
قدم قدم پہ میں اندر سے ٹوٹتا بھی تھا
عارف شاہین.....سیالکوٹ

یہ کیسی سوچ ہے کیسا عمل ہے
خطا کر کے مزا سے لے رہا ہوں
عبدالسلام.....بہاولپور

یوں چونک اٹھے وہ سن کر میرا شکوہ
جیسے انہیں بھی کوئی گلہ یاد آگیا
نوشین اقرار عسم.....شیخوپورہ

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پر گرے اور زخم آئے مجھے

عارف آرائیں.....لعل آباد

ابر سیاہ صفت برسات میں
تشنہ دلوں کو رلا جائے ہے
(عبدالجبار رودی لاہور کا جواب)

شمی عزیز.....لندن و ہاری

اس نے جب پھول کو چھوا ہو گا
ہوش خوشبو کے اڑ گئے ہوں گے
محمد امین حسن.....لاڑکانہ

آپ کی خاطر زمانے سے کنارہ کر لیا
اب زمانے سے ملے ہیں آپ ہی کے شوق میں

نسرین حیدر اعوان.....مظفر گڑھ

اگر لاؤ و گل میں لطافتیں ہیں گر
کسی کا حسن شریکِ نگاہ ہوتا ہے
(فرووس حسن رحیم یار خان کا جواب)

شگفتہ مشتاق.....لاہور

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ ہم نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

بادبیا الیاس بابا لیان.....ہارون آباد

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

الھم حسین.....لاہور

یہیں کہیں میں کوئی گوشہ و جدال میں تھا
میں مشتعل ہوں سے پہلے بھی ایسے حال میں تھا
(ثاقب جلال رضوی کراچی کا جواب)

اشرف شبیم.....چک نمبر 100 جنوبی

سوئی راتوں میں میری یاد جو آئی ہو گی
کہ نہ کاندھے سے کبھی آنچل ڈھلکا ہو گا

حیا الکرام.....ملتان

خامیاں کیا ہم اپنے ارمان شکستہ دل کا افسانہ
نہایت تجربی سے تھی جو ناداں کے ہاتھ آئی

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہوا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ تبدیلی کے شعر نکف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو نظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

میرے خیال سے اس مرتبہ درجہ ذیل شخصیت کی حامل شخصیت کا نام.....ہے۔

نام:.....

پتا:.....

انعام پانے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ یا کہو ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

علمی کوئز نمبر 122
28 فروری 2016ء

آخری تاریخ 28 فروری 2016ء بعد میں آنے والی 12 درست کوپن کے حامل 982 قارئین میں سے 74200 روپے کے نقد انعامات کے حق دار قرار پائیں گے۔

ماہنامہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے ایک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام.....

پتا.....

محترم/محترمہ.....کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا/رہی ہوں/ہیں شاملِ اشاعت کر لیں

(شعر الگ کاغذ پر لکھیے)

82

ماہنامہ بیت بازی
آخری تاریخ 28 فروری 2016ء

اگر آپ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ و ماہنامہ سرگزشت

کے رسائل میں رائٹ اپ آرڈی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے کب اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

کمپلینٹ چیک کیجیے

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبرز میں بھی رابطہ کر سکتے ہیں

0301-2454188

سرکولیشن منیجر
آفس نمبر 35902552-35386783-35804200

سرکولیشن آفیسر
آفس نمبر 35902551

جاسوسی ڈائجسٹ اور سرگزشت کے ایجنٹ حضرات توجہ دیں!
ایجنسی کمیشن 25% ہے۔ پرچہ وصولی کے 15 دن کے اندر رقم ادا کرنا لازمی ہے۔
ایجنسی کے لیے رابطہ کریں: 35902552-35386783-35804200

علمی آزمائش-122

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 27 فروری 2016ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1980ء کی دہائی میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ جہاں جہاں بھی اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی اس کے گانے سنے اور پسند کیے جاتے تھے۔ اس کی پیدائش کراچی میں ہوئی تھی لیکن شہرت غیر ممالک سے ملی۔ ایک بزنس مین سے شادی ہوئی لیکن ازدواجی زندگی کامیاب نہ ہو سکی۔ نہایت کم عمری میں وہ انتقال کر گئی۔

علمی آزمائش 120 کا جواب

ٹیپو سلطان جنوبی ہندوستان کے تخت پر باپ کے بعد بیٹھا۔ انگریزوں نے اس کے اقتدار کو ختم کرنے کے لیے کئی حملے کیے۔ ناکام ہو جانے کے بعد ایک انگریز کو صوفی درویش کے بھیس میں اس کی ریاست میں بھیجا۔ اس نے تبلیغ دین کے نام پر لوگوں کو حکومتی اہلکاروں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا اور کئی اہم وزیروں کو رشوتیں دے کر اس کے خلاف کر دیا۔ جب بغاوت کی زمین تیار ہوئی تو پڑوس کی ریاستوں سے چڑھائی کرا دی۔ اس جنگ میں وہ شہید ہو گیا لیکن آج بھی وہ عوام کے دلوں میں زندہ ہے۔

انعام یافتگان

1- نعیمہ حسن خان، کوئٹہ 2- توصیف احمد، میرپور خاص 3- زاہد علی، پشاور
4- ارباز خان، جہلم 5- فرقان حیدر، سرگودھا

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے شبیہ کوثر، امداد امام رضوی، احمد حسن، فرقان مجیدی، احسن علی، کامران تقوی، صنوبر برجیس قزلباش، راؤ عمران، فیض الٰہی شمسی، محمد تقی کاظمی، رانا ممتاز الدین، صبیح مصطفیٰ، خلیق حسن، تاثیر حسین رضوی، نصیر سیالکوٹی، توصیف اختر توصیف، انعام اللہ خان، نعمت گل۔ لاہور سے بشیر مصطفیٰ، جاوید احمد، صدیق بٹ، خضر حیات، نوشین آرائیں، یاسمین بھٹ، وقار احمد، واثق حسن ترمذی، کلثوم بٹ، نیاز احسن زیدی، سلمان خاقان، شیر نواز، ظفر حیات، رفیق ناز مغل، منور صدیقی، بابر حیات خان، نیاز وٹو، فاضل حسین، محمد صلاح الدین، زاہد حسن خان، سراج الاسلام، سرفراز رفیق، کائنات جمال۔ ملتان سے انیس ضیائی، حیات محمد، شبر ملک، زاہد علی، اللہ بخش، صدف اشرفی، عزیز الدین، نصرت ملک، معراج ترمذی، کاظم علی سید، اعجاز الدین، عدنان احمد، کاشف مرزا، فہد الحسن۔ راولپنڈی سے سراج ثمان، ڈاکٹر سعادت علی خان، عائشہ نیاز، وردہ سلیم، فرقان حسن، نصیر الدین، مجاہد علی، مہوش نیاز، استراج احمد، موسیٰ علی، انعام الحسن، نور احمد، توصیف فاروقی، نعمت گل، عنایت حسین رزاقی۔ اسلام آباد سے نیلوفر شاہین، محمد ریاض راحیل، بشیر احمد شبیر (علی پلازہ)، رسول بخش کاودانی، عنایت جعفری سید، رحیم داد، طارق اسماعیل، تاثیر عباس، نبیل زبیری، ذوالفقار حسن خان، زاہد واسطی، عنایت علی عنایت، نوید الحق، کاشف بیگ، سلطان بھایانی، ذوالفقار اعوان، جاوید اسحاق بٹ۔ ڈیرہ غازی خان سے رفیق احمد ناز، ناہید سلطان، سلطان احمد خان، ابرار ظفر، یحییٰ شاہ۔ جامشورو سے منصور احمد نعمانی۔ گوٹھ غلام شاہ بدین سے سید ایس ڈی ساغر۔ حیدرآباد سے نسرین سیمین، مرزا حمزہ بیگ، ماہ رخ، عاشق حسین انصاری، نوید ظفر، کاشف حسین کاشف، ساجی نور اللہ، اشفاق میمن، جنید عباسی، نصر اللہ بھٹو، حسین علی۔ ساہیوال سے محمد افضل (فرید ٹاؤن)۔ رحیم یار خان سے محمد کاشف ملک (شاہ گڑھ)۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک، نیاز حسن، نصیر عباس، ممتاز الدین، عمران مصطفیٰ۔ لڈن وہاڑی سے بخشی عزیز گے۔ لاہور سے: امروز اسلم ملک، ثاقب سجاد، محمد عاقب جنید، سید محمد احسن نواز، عبدالخالق چوہدری، عبدالقادر، یاسمین ملک، فرزانہ مصطفیٰ، کائنات مرزا، شاہینہ اسلم چوہدری، روایت ثمان، کلثوم شہزاد، سرفراز اکرم خان، عنبرین شاہد، محمد اسلم۔ ٹالہ موسیٰ سے: بشریٰ امبر، منصور ملک، ارشد محمد ولی، صبیحہ نواز۔ کھاریاں سے: شعیب اقبالی۔ طاہر پورہ بہاولپور سے: شاہ رخ ہاشمی۔ کوٹلی آزاد کشمیر سے: لیاقت علی۔ بھمبر آزاد کشمیر سے: پروفیسر خالد جاوید۔ ڈڈیال میرپور آزاد کشمیر سے: محمد ہارون ...... خانیوال سے: گل لیاقت، اسما توحید، ملک فیروز، اعجاز حسین، محمد اقبال۔ ملتان سے: سید فیض الحسن شاہ گیلانی، نبی اور شاہ، امام بخش ملک، اویس سلمان، محمد معین چشتی، نازش فاروقی، خواجہ محمد حسین، محمد شفیق بھٹی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے: آصف اقبال، ڈاکٹر ایس اے اختر۔ سوئی ضلع ڈیرہ بگٹی سے: محمد اکمل خان۔ نوشہرو فیروز سے: نعمت اللہ سومرو۔ فرید ٹاؤن ساہیوال سے: محمد افضل۔ اٹک سے: محمد قیصر۔ سرگودھا سے: علی اصغر گوجر، محمد سعید قریشی۔ کوٹ ادو سے محمد احمد رضا انصاری، اشفاق حسین۔ سیانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)، حیات اللہ، انیس احمد، رفیق علی۔ بنوں سے معظم علی قریشی (حسین آباد)۔ سرگودھا سے نعت بانو (شورہ ٹیکری)، سید امتیاز حسین بخاری (چک 36) محمد بلال احمد، نوشین شاہ، بیاد احمد، شیر گل خان۔ منڈی بہاؤ الدین سے سلونی، ادریس علی خان، کشف احمد، سلطان احمد، ادریس علی، یحییٰ مجاہد، شعیب علی، آفاق احمد، عباس حیدر۔ سیانوالی سے صائمہ بخش، فرید الدین۔ چونیاں سے ضیاء عباس، فرحین آرائیں، اعتزاز احمد، ممتاز حسن بھٹو، نجمہ عباسی۔ بہاولنگر سے شمیم کنول، احسان علی خان، شازیہ اختر، سیرا الحسن۔ لیہ سے محمد اشفاق، شاہین عنبر بٹ۔ پاک پتن سے بریرہ حسن، نعمان چشتی، نگہت افتخار۔ حافظ آباد سے سیما نایاب، سراج الحق، اشفاق احمد، زویا احمد۔ میرپور آزاد کشمیر سے نیاز بھٹ، عرفان علی رائے، واحد الاسلام۔ میرپور خاص سے ضیاء الاسلام، اشفاق علی، اعتزاز خان، چونی لال اسرانی۔ پشاور سے کشمالہ مشتی، امام بخش، لیاقت علی، ذکیہ احمد گل، عابد حسن۔ خانیوال سے ملک فیروز۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے محمد افضل، مغیہ بلوچ، واحد شاہ، نصرت جاہ۔ اٹک سے نوروز عباس، ملک ادریس، شیخ محمد فرقان، حسن قادری۔ ٹالہ موسیٰ سے ارشد ولی مجید۔ کھاریاں سے طالب علی۔ راجن پور سے ظفر اللہ خان۔ مظفر گڑھ سے ارشد علی، سلطان بشیر، فرحت اسلام خان، نیاز علی، مظفر حسن شاہ، عباس حیدر، کرم اللہ واسطی۔ بالاکنڈ سے عبدالاحد۔ کوئٹہ سے نوشین فاطمہ کاظمی، صدیق بٹ، کاظم چنگیزی۔ تلہ گنگ سے فرقان عباس۔ ہری پور سے نیابت خان۔ کوٹری سے نصیر احمد عباسی۔ گجرات سے خاقان بٹ۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن، ناصر زیدی۔ صادق آباد سے عتیق احمد، عرفان علی خان۔ بیرون ملک غیر سے: عنایت بھٹو (شارجہ)، احمد عباس (عمان)، ناصر رند (جرمنی)، زویا علی شاہ (ٹورنٹو کینیڈا)، اسماعیل حسن، دلاور مرزا (بیڈفورڈ، یو کے)۔

فرض مرض اور قرض

مکرمی محذوم
السلام علیکم

مجھے نہیں معلوم کہ کہانی کیسے لکھی جاتی ہے یہاں اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کہانی پڑھی کیسے جاتی ہے اس لیے کہ میں آٹھویں کلاس سے سرگزشت پڑھ رہا ہوں اُمید ہے کہ میری کہانی بھی سرگزشت کے معیار کی ہو گی۔

ندیم قیصر
(کراچی)

میں نے کسی سیانے کا قول پڑھا تھا کہ مرض، قرض اور فرض آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں۔ اس وقت توجہ نہیں دی تھی مگر جب ان تینوں سے واسطہ پڑا تو اس قول کی عملی تفسیر بھی سمجھ میں آگئی۔ اپنا تعارف کراؤں میرا نام ندیم قیصر ہے۔ تعلق ایک متوسط اور مختصر سے خاندان سے ہے۔ خاندان میں صرف میں اور ابا جی تھے۔ دور پرے کے کچھ رشتے دار تھے جو ہمیں منہ نہیں لگاتے کیونکہ ان کے اور ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا۔ یہ فرق میری پیدائش کے وقت شروع ہوا اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا فرق بھی بڑھتا گیا۔ نتیجے میں ان لوگوں سے میل ملاقات بھی کم ہوتی چلی گئی۔ بڑے تایا ابا کے ہاں دو سال پہلے گیا تھا جب ان کی چھوٹی بیٹی روحی کی شادی ہوئی تھی۔ اماں کی خواہش تھی کہ میری شادی روحی سے ہو مگر چوں اماں کی یہ خواہش اماں کے ساتھ ہی دفن ہو گئی۔

چھوٹے تایا ابا کے ہاں گئے ہوئے بھی سال سے اوپر ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجھے بلایا تھا کہ ایک نوکری کے سلسلے میں۔ جب میں نے ان کی مدد چاہی تھی۔ میں خوش

انٹرمیڈیٹ کالج میں داخلہ مل گیا۔ کہنے کو اماں اتنی خوش نہیں تھی کہ مجھے انجینئرنگ پڑھانے کے حق میں نہیں تھی، اس لیے میں نے ڈپلوما کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد میں موقع ملتا تو میں اپنے بل بوتے پر انجینئرنگ پڑھ سکتا تھا۔ تین سالہ ڈپلوما کے بعد مجھے ایک کارخانے میں جاب مل گئی۔

اپنی جاب کے کارخانے میں ملازمت کرتے ہوئے پہلا ہی سال تھا کہ اماں ملازمت سے ریٹائر ہو گئیں۔ اماں کی زندگی ہے ریٹائرمنٹ ہو گئیں۔ اماں کی ملازمت ڈاکٹر کی تھی۔ مگر اماں کی وفات نے مجھے اور ابا دونوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ تین افراد کے گھر میں گھر کاٹنے کا کھوا ماں تھیں اور وہ نہ رہیں تو ہمیں لگا کہ ہماری زندگی کا محور نہیں رہا ہے۔ ہم اماں کے ساتھ بائیس برس کا ساتھ تھا۔ شادی کے تقریباً دس سال بعد میں پیدا ہوا اور اس کے بعد اللہ نے اماں ابا کو مزید اولاد نہیں دی۔ اس لیے میں ہی ان کی دونوں بیٹیوں اور چاروں کا مرکز بن گیا۔ اماں عام سی گھریلو خاتون تھیں۔ مجھے اتنا تجربہ نہیں ہے ان کو بیان کرنے کا مگر وہ ایک اچھی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی دوست بھی تھیں۔ ابا بنیادی طور پر ملازمت اور کم گو انسان تھے۔ ان کی زندگی میں اماں ہی ان کی ساتھی تھیں۔ اماں کے جانے کے بعد ابا کو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ وہ اماں کے بعد صرف تین سال زندہ رہے۔ پھیپھڑے کی کینسر بھی انہیں لے ڈوبی۔ اماں کی وفات کے بعد ابا کی صحت بہت گر گئی تھی۔ وہ بھائی سے اور مجھ سے بہت کرتی تھیں مگر شوہر سے بچھڑ گئی تھیں، جو ہم سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے انٹیس کا بہت خیال رکھتے تھے۔

کبھی کبھی بھی میں حیران ہوتا کہ خون کے رشتوں کے معیار زندگی میں بھی اتنا فرق ہوتا ہے۔ میں نے تو دیکھا تھا کہ گھر کا کوئی ایک فرد اور چلا جاتا ملک سے باہر نکل جاتا تو وہ کوشش کر کے دوسروں کو بھی اپنے پاس بلا لے جاتا۔ یہاں ایک بھائی کے لیے دو بڑے بھائیوں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ شاید اس میں قصور ابا کا تھا انہیں لیتے کا سلیقہ ہی نہیں آتا تھا۔ بہرحال ہم اپنی زندگی سے اتنے غیر مطمئن بھی نہیں تھے۔ بس اماں کی وفات ہمارے لیے بہت بڑا دھچکا تھی۔ اس سے سنبھلنے میں برسوں بعد ہی ہم سنبھل سکا تھا۔ ایک سال بعد ابا نے میری شادی کا سوچا مگر میں فی الحال اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے اپنے مکان کا کروں اس کے بعد شادی کا ڈول ڈالا جائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جس

طرح اماں ابا نے در بدر زندگی گزاری تھی اور ہر تیسرے چوتھے سال سامان لے کر بھاگ رہے ہوتے تھے میں بھی ایسا ہی کروں۔ بچپن سے اب تک میں بلا مبالغہ کوئی سات آٹھ گھر اور محلے دیکھ چکا تھا۔ بعض جگہوں پر تو سال سے بھی کم رہنا نصیب ہوا تھا۔

ابا کو فطری طور پر مکان کا خیال نہیں تھا۔ ایک تو وہ اس کے عادی تھے کہ کرائے کے مکان میں رہیں اور پھر ان کی عمر میں انسان کو دنیا کے سامان کی پرواہ ذرا کم رہ جاتی ہے۔ انہیں ریٹائرمنٹ پر جو رقم ملی تھی وہ انہوں نے فی الحال انکم اسکیم میں ڈیپازٹ کر دی تھی میری شادی کے لیے کام آتی۔ ابا کی پنشن، اسکیم کی آمدنی اور میری تنخواہ ملا کر اتنی رقم ہو جاتی تھی کہ اس کے نصف میں آرام سے ہمارا گزارا ہو جاتا تھا اور آدھی رقم بچ جاتی تھی۔ میں اس بچ جانے والی رقم کو کسی مکان یا فلیٹ میں تبدیل کرانا چاہتا تھا۔ مگر میں بکنگ اور انسٹالمینٹ کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا میں نے دیکھا کہ اس میں آدمی کو صرف خواری نصیب ہوتی ہے۔ میں رقم جمع کر رہا تھا اور اس چکر میں تھا کہ کوئی جگہ مل جائے۔ یا بڑی رقم دے کر قبضہ لے لوں اور باقی رہتے ہوئے ادا کر دوں۔

ان ہی دنوں ابا اپنے ایک کولیگ کے انتقال پر اس کے جنازے میں گئے۔ عرفان صاحب ابا کے ساتھ کام کرتے تھے اور ابھی ان کی جاب جاری تھی مگر اوپر سے بلاوا آ گیا۔ ابا نے آ کر بتایا کہ ان کی بیوی اور بیٹی بہت رو رہی تھیں۔ کیونکہ ان کا اب کوئی نہیں رہا ہے۔ بیٹی چھوٹی ہے اور حال ہی میں انٹر کیا ہے۔ اب اس بے چاری کو روزگار کے لیے بھاگنا پڑے گا۔ میں نے افسوس کیا۔ چند دن بعد ابا سوئم سے آئے تو سوچ میں تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا سوچ رہے ہیں؟ تو بولے۔ "بیٹا میں سوچ رہا ہوں کہ عرفان کی بیٹی رضوانہ کو تمہارے لیے مانگ لوں۔ اچھی پیاری بچی ہے اور یتیم ہو گئی ہے۔ اس کی ماں اب رشتے کے لیے بھی پریشان ہے۔ اپنا گھر ہے مگر کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے سوائے پنشن اور گریجویٹی کے۔"

"ابا ہمارا تو اپنا گھر بھی نہیں ہے کیا وہ مان جائیں گے؟"

ابا نے میری طرف دیکھا اور بولے۔ "کیا کمی ہے تم میں، اچھی شکل ہے اچھا کردار ہے اور ملازمت کر رہے ہو۔ اپنا گھر نہیں ہے لیکن ہو جائے گا۔"

میں نے سوچا اور کہا۔ "ابا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن جب تک اپنا گھر نہیں ہو جائے گا میں شادی نہیں کروں گا۔"

"ابھی بات کرتے ہیں۔ رضوانہ شاید آگے پڑھے گی۔ پھر باپ کا ابھی انتقال ہوا ہے۔ کچھ تو ... تو لگ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے آپ بات کر لیں۔"

ابا نے بات کی اور رضوانہ کی امی مان گئیں۔ عرفان صاحب کے انتقال کے دو مہینے بعد ایک سادہ سی تقریب میں ہمارا رشتہ طے ہو گیا۔ وہ لوگ بھی شادی دو سال بعد ... چاہتے تھے۔ ایک تو آنٹی عرفان صاحب کی ... گریجویٹی کی کچھ رقم سے اوپر گھر بنوا رہی تھیں کہ خود ... ہو جائیں اور نیچے والا پورشن کرائے پر دے دیں تو آمدنی کا ذریعہ بن جائے۔ پھر رضوانہ نے بی کام کے بعد ... داخلہ لے لیا تھا۔ اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے اس نے ٹیوشن پڑھانی شروع کر دی تھی۔ ... میں نے بھی اپنی کوشش تیز کر دی۔ ابا کے پاس کوئی ... روپے تھے اور میں نے بھی ایک لاکھ بچائے تھے۔ ... رہائشی سائٹ ایریا کے نزدیک ایک متوسط آبادی ...

ہم زیادہ تر اسی آبادی کے مختلف محلوں ... تھے۔ شاید ایک بار یہاں سے کچھ عرصے کے لیے ... مگر دوبارہ یہیں آ گئے۔ اس وقت میں چھوٹا تھا ... ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔ لیکن جب آبادی بڑھی ... دیکھتے مکانوں کی اوپری منزلیں بڑھتی چلی گئیں ... پاس بڑے پلاٹ تھے انہوں نے پرانے گھر گرا ... بلڈنگز کھڑی کر لیں اور فلیٹ بنا کر بیچنے لگے۔ ... زیر تعمیر بلڈنگ میں مجھے دو کمروں اور لاؤنج کا فلیٹ ... آیا۔ یہ دوسری منزل پر تھا اور ویسٹ اوپن تھا ... بھی خوب آتی۔ بلڈنگ اسٹرکچر کے لحاظ سے ... میں تھی۔ بلڈر کا کہنا تھا کہ وہ ایک سال کے ... قبضہ دینا شروع کر دے گا۔ زیادہ سے زیادہ ... مجھے فلیٹ مل جاتا اور قیمت بھی وارے والی تھی ... پہلے دینے تھے اور باقی دو لاکھ رہتے ہوئے ... دینے تھے۔ بلڈر کو میں جانتا تھا اسی علاقے میں ... ایک درجن عمارتیں بنا کر فروخت کی تھیں۔ ... اچھا کام کرنے والا آدمی تھا۔

میں فلیٹ بک کرانے کا سوچ رہا تھا مگر ... نوبت نہیں آئی۔ ابا کی طبیعت خراب تو کچھ عرصے ...

رہی تھی۔ انہیں کھانسی اٹھتی تھی اور بڑی مشکل سے ٹھیک ہوتی تھی۔ دوا اور علاج کراتے تھے مگر کچھ عرصے بعد دوبارہ شروع ہو جاتی تھی۔ ابا نے بڑی سادہ زندگی گزاری تھی۔ سگریٹ انہوں نے جوانی میں چند ایک بار پی ہو گی۔ اس لیے ان کی بیماری کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ مگر ایک دن میں کارخانے سے واپس آیا تو ابا زرد چہرہ لیے بیٹھے تھے اور سینہ دبا رکھا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ "کیا ہوا ابا؟"

"کچھ نہیں۔" انہوں نے بہت مشکل سے کہا۔ "سینے میں درد ہو رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے اندر کوئی نوکیلی چیز چبھ رہی ہے۔"

میں ابا کو محلے کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تو اس نے کچھ دوائیں اور ہدایت دی۔ "اگر ان سے فائدہ نہ ہو تو ان کو چیسٹ اسپیشلسٹ کے پاس لے جانا۔"

دو دن بعد میں نے یہی کیا کیونکہ ابا کو ذرا بھی افاقہ نہیں ہوا تھا۔ اسپیشلسٹ نے چند ٹیسٹ فوری کرانے کو کہا۔ میں یہ دیکھ کر ٹھٹکا کہ ایک ٹیسٹ ایک مخصوص اسپتال سے کرانے کو کہا تھا جو کینسر کے علاج کے لیے مشہور تھا۔ میں ابا کو لے کر وہاں گیا اور ٹیسٹ کرایا پھر چپکے سے وہیں کے ایک ڈاکٹر سے اس ٹیسٹ کے بارے میں پوچھا تو اس نے تصدیق کی کہ یہ ٹیسٹ کینسر کی موجودگی جاننے کے لیے کرایا جاتا ہے۔ یہ سن کر میرے ہوش اڑ گئے تھے مگر ابا کو میں نے یہی بتایا کہ انہیں ٹی بی کا ٹیسٹ کرانے لایا ہوں کیونکہ ڈاکٹر کو شبہ ہے کہ انہیں ٹی بی ہو رہی ہے۔ ابا اپنی بیماری کے حوالے سے زیادہ فکر مند نہیں تھے۔ انہوں نے کہا۔ "اس عمر میں کیا ٹی بی اور کیا کینسر موت کسی بہانے تو آنی ہے۔ مجھے تیری فکر ہو رہی ہے۔"

"میری فکر کیوں کرتے ہیں ابا؟"

"یہ جو تو علاج پر خرچ کر رہا ہے اسے بچائے گا تو تیرے کام آئے گا۔"

"ابا کیسی بات کر رہے ہیں میرے لیے آپ اہم ہو، پیسا نہیں۔"

"بیٹا آج کل پیسے کی قدر ہے اور مجھے آج نہیں تو کل مرنا ہے۔" ابا مایوسی سے بولے۔ شاید ان کی چھٹی حس نے انہیں بتا دیا تھا کہ انہیں کوئی بڑی بیماری ہے۔ مگر میں نے ان سے سچ کہا تھا۔ میرے لیے ابا سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر ان کے علاج کے لیے ضرورت پڑتی تو میں خود کو بھی بیچ سکتا تھا۔ ایک ہفتے بعد آیا تو اس میں کینسر نکلا تھا۔ ابا کو پھیپھڑوں کا کینسر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے مزید کچھ ٹیسٹ لکھ دیے جن سے یہ پتا چلتا کہ کینسر کس درجے کا ہے اور اس کا علاج کس طرح ممکن ہے۔ یہ سارے ٹیسٹ کرانے پر کوئی چالیس ہزار روپے خرچ ہو گئے۔ جب نتیجہ سامنے آیا تو پتا چلا کہ ابا کے دونوں پھیپھڑوں میں کچھ کچھ حصے کینسر زدہ ہو رہے تھے اور ان کا ایک ہی علاج تھا کہ ان حصوں کو آپریشن کر کے نکال دیا جاتا۔ جب ڈاکٹر نے مجھے بتایا تو میں پریشان ہو گیا۔

"پھیپھڑوں کے بغیر انسان زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟"

"پورے پھیپھڑے نہیں نکلیں گے ان کا صرف کینسر زدہ حصہ نکالا جائے گا اس کے بعد آپ کے والد باقی ماندہ پھیپھڑوں پر زندہ اور صحت مند رہ سکیں گے۔"

میں نے سکون کا سانس لیا مگر فوراً ہی خیال آیا۔ "ڈاکٹر صاحب خرچ کتنا آئے گا؟"

"تقریباً چھ سے سات لاکھ روپے۔"

"یہ تو بہت زیادہ ہے۔" میں نے کہا۔

"زیادہ تو ہے لیکن اگر آپ سرکاری یا کسی خیراتی اسپتال سے علاج کرائیں گے تو بہت زیادہ امکان ہے کہ آپریشن کے بعد بھی مسئلہ حل نہ ہو۔ کینسر دوبارہ ہو سکتا ہے۔ اگر کسی اچھی جگہ سے کرائیں گے تو شفایابی کی امید نوے فیصد سے زیادہ ہو گی۔ آپ یہ مت سمجھیں کہ میں آپ کو کسی کے پاس جانے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ آپ خود دیکھ لیں اور فیصلہ کر لیں۔"

"ڈاکٹر صاحب میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کون سے سرکاری یا خیراتی اسپتال علاج کرتے ہیں پرائیویٹ ڈاکٹرز کا میں کیا جانوں گا؟"

"آپ دیکھ لیں۔" ڈاکٹر نے ایک لسٹ میری طرف بڑھائی۔ "یہ سرکاری اور ٹرسٹ اسپتال اس نوعیت کے کینسر کو آپریٹ کر سکتے ہیں۔ پہلے آپ ان سے بات کر لیں اگر سمجھ میں نہ آئے تو میرے پاس آیئے گا۔ میں کچھ پرائیویٹ سرجنز کے بارے میں بتاؤں گا مگر ذہن میں رکھیے گا کہ پھر خرچ اس سے بھی زیادہ ہو گا۔"

میں پہلے ابا کی رپورٹس لے کر سرکاری اسپتالوں میں گیا اور وہاں جو حال دیکھنے کو ملا تو میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا۔ زندگی و موت اللہ کے ہاتھ میں ہے ممکن ہے کسی اچھی جگہ سے آپریشن کے باوجود وہ بچ نہ پاتے لیکن میں ان کو اس ذلت و خواری سے نہیں گزاروں گا جس سے یہاں موجود

مریض گزر رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے ٹرسٹ اسپتالوں کا رخ کیا مگر وہاں بندہ تجھے طاہر انتظامات نظر آئے اور پھر وہ بھی لاکھوں میں بھی افراجات بتاتے ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ابا کو دو مہینے کے اندر اندر ڈی آپریشن کرالینا چاہیے ورنہ شوگر بہت پھیلنے کا خدشہ تھا۔ ایک مہینا ان ہی چکروں میں گزر گیا اور مجھ سے میں نہیں آیا تو مجبوراً میں نے ڈاکٹر کا رخ اور اس سے پرائیویٹ سرجنوں کے بارے میں پوچھا۔

"جی! معلوم تھا کہ آپ میرے پاس آئیں گے۔ ہمارے پاس لیٹسٹ کا آپریٹ بھی زیادہ تر عام آپریشن کی طرح کیا جاتا ہے اور اس سے دوبارہ کیلیر ہونے کا بہت زیادہ امکان ہوتا ہے۔ میں جن تین سرجنوں کے پاس آپ کو بھیج رہا ہوں یہ اس شعبے میں بہت دیرینہ تجربے کے حامل ہیں اور ان کے پاس بہت اپ ٹو ڈیٹ اچھا ہے۔ ہنگامی میں کہ آپ کوشش کریں تو کچھ رعایت ہو سکے گی۔"

ان تین سرجنوں سے اپائنٹ منٹ لینا بھی ایک مہم سے کم نہیں تھا۔ جب ابا کی بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور میں ان کو لے کر ڈاکٹروں کے پاس بھاگ دوڑ کر رہا تھا میں نے اپنی شفٹ ڈیوٹی کے کرائی تھی۔ سچ میں ڈاکٹروں اور اسپتالوں کے چکر کاٹنا تھا۔ وہاں سے تھکا ہارا آتا تو ملازمت پر جانا اور وہاں سے تھکا ٹوٹا تا ہوا تو سونے سے پہلے ابا کی چیزیں دیکھنا کہ انہیں کوئی ضرورت تو نہیں۔ کہ چہ و بچھ سے کہنے تجھ کہ میں آرام کروں مگر مجھے اس کے بغیر سکون سے نیند نہیں آتی تھی۔ ان دنوں میں مشکل سے چھ گھنٹے سو پا تھا۔ ابا کی بیماری کی اطلاع میں نے بھائیوں تک پہنچ کر بھی تھی مگر انہیں اپنی فرصت نہیں تھی کہ بھائی سے آکر مل لیتے انہوں نے فون پر اپنا فرض پورا کر لیا تھا۔ پیسے بھی کم ہی آئی تھیں اور ابا سے لپٹ کر روتی رہی تھیں۔ جاتے ہوئے چپکے سے مجھے ایک لفافہ دیا اور کہا۔ "اگر ضرورت ہو تجھے کال کر دینا۔"

لفافے میں بیس ہزار روپے تھے۔ جب لاکھوں کا معاملہ آیا تو میں نے سوچا کہ ان سے مانگ کروں مگر پھر میری غیرت نے گوارہ نہیں کیا۔ میری غیرت نے تو یہ بھی گوارہ نہیں کیا تھا جب آنٹی نے مکان کی بات پر دبے الفاظ میں کہا تھا کہ ان کے بعد مکان رضوانہ کا ہوگا اور رضوانہ کا ہوگا تو میرا بھی ہوگا۔ مگر میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ میں اپنے زور بازو پر بھروسا کرنے والی لڑکی ہوں۔ اس لیے میں نے

پھیپھڑے نہیں کھلوا اور تاویلوں سے کہنے کا تو سوال ہی نہیں ہوتا تھا۔ میں نے ان تین سرجنوں کو ابا کی رپورٹ کھائیں اور انہوں نے کہا کہ ابا کا علاج ہو جائے گا مگر ٹھیک بھی ہو جائیں گے مگر جب بات اخراجات کی آئی تو انہوں نے اس میں کمی سے انکار کر دیا۔ تینوں نے بہت تخمینہ دیا تھا اور مقررہ سیاست کے آس پاس تھا۔ ایک آپریشن احسان کے برابر بشمول پونے سات لاکھ آتا۔ اس کے لیے۔

"اس میں سب شامل ہوگا۔ ایک مہینے تک دوائیں بھی۔ یہ بہت مشکل ہوتی ہیں اور غریب لوگ آپریشن کرا لیتے ہیں مگر دواؤں کا کورس پورا نہیں کراتے جس سے بعض اوقات کینسر دوبارہ آجاتا ہے یا کوئی اور مسئلہ ہو جاتا ہے اور بدنامی ساری سرجن کی ہوتی ہے۔"

میرے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ بہت مشکل چھ لاکھ تک میں نے منت سماجت کر کے ڈاکٹر احسان کو راضی کر لیا۔ وہ اور وعدہ کیا کہ باقی کے پیسوں کا انتظام کر کے ایک مہینے کے اندر اندر ادا کر دوں گی۔ ڈیوٹی کے ایک ہفتے بعد آپریشن تھا۔ میں نے باقی رقم کے لیے ابھی سے بھاگ دوڑ شروع کر دی تھی۔ سب سے بات کی مگر اس نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اپنا کیا کچھ رضوانہ ہمارے گھر پر چھوڑ آئی ہے۔ اباد بھی نہیں ہیں جبران کے گھر گئے ہوئے تھے۔ میں مشکل سے ہفتہ بھر کا وقت لے کر گئی تھی۔ ان دنوں میں ہاسپٹل کا تھکا دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ دوست احباب تھے مگر میں نے کسی کو ان سے قرض لینا کیا۔ اب ضرورت آن پڑی تھی اور میں کر بھی کس سے رہا تھا کہ اچانک رضوانہ ہمارے گھر پہنچ آئی۔ اباد اور جبی بھی حیران رہ گئے تھے۔ میں مشکل کے عہد میں پاس کے گھر گیا تھا اور وہ میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ اس نے لیے اس کی آمد غیر متوقع تھی۔ اس نے آتے ہی اباد اور جبی کو کام پر لگا دیا تھا۔ وہ کاغ سے آئی تھی۔

"میں انکل کو دیکھنے آئی ہوں۔"

ابا نے خوش ہو کر اس کا استقبال کیا اور مجھے اس مدارات کا حکم دیا۔ میں موسم کی مناسبت سے کولڈ ڈرنک کچھ اور بغیر شکست نے آیا وہ آدھے گھنٹے کی ابا اور اس سے کرتی رہی پھر جبی کے ساتھ لگے تو دروازے پر اس نے اپنا سے ایک چھوٹا سا بیگ نکال کر مجھے دیا۔

"یہ لے لو۔ میں نے سلائی کڑھائی کا کام کیا تھا۔ کچھ پیسے ہیں۔ کام آئیں گے۔"

میں جھجکا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے بھی؟"

"ہے۔ اس نے تجھے کی ہے کہا۔" جب تک کھول کر دیکھیں گے تو آپ کو پتا چل جائے گا۔"

میں نے سامنے سے رضوانہ کو سنگی یار مع دالے دن ہی دیکھا تھا تو اس سے بات ہوئی تھی اور نہ ہی میرے پاس اس کا موبائل نمبر تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کے پاس موبائل ہے یا نہیں۔ دوسری بار میں آنٹی کی دعوت پر گیا تھا اور اس میں رضوانہ کی جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ دیکھا جائے تو یہ آج کل کے رشتوں سے بالکل مختلف ہے جس میں سگیتر یہ صرف آپس میں رابطے میں رہتے ہیں بلکہ ملتے ہیں اور جو ذرا آزاد خیال ہوں ان کے تو اطوار ہی دوسرے اور دوسرے ہیں ہاں باپ کے انگلے تھے۔ جو بنیے انگلے ہوں وہ عام سیٹلڈ ہی سے ذرا ہٹ کر ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے رضوانہ کا یوں آنا اور جاتے ہوئے مجھے تحفہ دے کر جانا مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ گر جب اس کے جانے کے بعد میں نے اپنے کمرے میں آکر اس کا گفٹ بیگ میں لپٹا ہوا تحفہ کھولا تو اس میں خلاف توقع کپڑے کی رقوم کے بجائے ہزار ہزار اور پانچ سو کے نوٹوں کی ایک پتلی ہوئی گڈی اور ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔ میں نے رقعہ اٹھایا تو اس پر تحریر تھا۔

"شاید آپ مجھے آج کل کی عام لڑکیوں کی طرح سمجھ رہے ہوں جو سگیتر سے غیری ہوتی ہیں اور اس سے جتنی اور جتنے فاصلے رکھتی ہیں اتنی ہی محفوظ گردانتی ہیں اور اسے ہی مثبت سمجھتی ہیں مگر آپ ایسا نہیں ہیں۔ آپ نے مجھے اپنا سمجھا ہے اور میں نے بھی اپنے سمجھا ہے۔ اس لیے میں یہ تحفہ دے رہی ہوں۔ یہ میرا خلوص پہنچانا تھا۔ یہ وہ رقم ہے جو میں نے کئی سالوں میں جمع کی ہے۔ ابو دبئی تھے۔ کبھی آئی ہی نہیں۔ میں کیمٹرک کے وقت سے بیوٹن پر مارہی ہوں۔ ضرورت کی ساری چیزیں امی ابو لا دیتے تھے اور مجھے فضول خرچی کی عادت نہیں ہے۔ امی کے بعد میں جوں ہوتی رہی اور جب سے انکل کا پتا چلا تو میں نے سوچا کہ شاید یہ چھوٹی سی رقم آپ کے کسی کام آ سکے جب آپ خود کو بہت اکیلا محسوس کریں گو آپ کو یاد دلانے کو آپ کو اکیلا نہیں ہیں کوئی آپ کے ساتھ ہے۔"

تحریر پڑھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میرا اور رضوانہ کا رشتہ صرف سگیتر والا نہیں رہا ہے بلکہ اس میں محبت بھی شامل ہو گئی ہے اس کے ایک ایک لفظ سے میرے لیے محبت ٹپک رہی تھی اور یہ عام سی محبت نہیں تھی بلکہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی محبت تھی جو انسان کو اپنی سب سے بھی سگی سوچ قربان کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ میری آنکھوں سے آنسو آ گئے۔ جب میں نے رقم دیکھنا چاہی تو دھندلا سا بہت سے آنسو تھے۔ میں نے آنسو صاف کر کے رقم گنی جو تیس ہزار

سے شادور دیا گیا جو جراثیم کش ہوتی ہے۔ ابا کو بولنے سے منع کیا ہوا تھا کہ اس سے پھیپھڑوں پر زور آتا اور ابھی زخم تازہ تھے۔ مگر مجھے دیکھ کر ابا کی آنکھوں میں روشنی آگئی تھی۔ میں صرف پانچ منٹ رک سکا کہ بس اتنی ہی اجازت تھی۔ مگر دو دن بعد جب ابا کو عام کمرے میں شفٹ کیا گیا تو ان کی حالت بہت اچھی تھی۔ انہوں نے بات کی تھی اور اس روز انہیں کھانے کو دیا گیا تھا۔

ابا پانچ دن اس کلینک میں رہے مگر ان کی بہترین دیکھ بھال اور بہترین علاج کے باعث جب وہ گھر جا رہے تھے تو لگتا ہی نہیں تھا کہ ان کا اتنا مشکل اور خطرناک آپریشن ہوا ہے۔ ڈاکٹر احسان نے خود مجھ سے مل کر مجھے تمام احتیاطی تدابیر زبانی بتائیں اور ان کا چارٹ بھی بنا کر دیا۔ حسب وعدہ انہوں نے ابا کے لیے پورے مہینے کی دوائیں فراہم کیں اور ان کے دینے کے اوقات کی سختی سے پابندی کرنے کو کہا تھا۔ اس طرح ابا کی خوراک اور آرام کا چارٹ بھی تھا کہ کب آرام کرنا ہے اور کب چہل قدمی کرنی ہے۔ کسی ہنگامی صورتِ حال کے لیے آکسیجن کی بوتلیں دی گئی تھیں جن کی نوزل پر ماسک لگا ہوتا ہے۔ گرد مٹی سے بچانے کے لیے ابا کو منہ پر دو ہفتے تک ماسک پہننا تھا۔ ایک ماسک چوبیس گھنٹے بعد بدل دیا جاتا اور نیا ماسک پہننا پڑتا۔

اب مجھے احساس ہوا کہ پرائیویٹ علاج اور سرکاری علاج میں کیا فرق ہے۔ میں نے جو دیکھا تھا سرکاری اسپتالوں میں مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ وہاں آپریشن کے بعد مریض کو خاص ماحول میں رکھنے کے بجائے اسے وارڈ میں بھیج دیا جاتا تھا جہاں صفائی کا حال سب کو پتا ہے۔ ابا کو جو دوائیں دی جا رہی تھیں ان میں کینسر کے دوبارہ ہونے کے امکان کو ختم کرنے والی دوائیں بھی تھیں۔ دواؤں کا کورس مکمل ہونے کے بعد ان کے دوبارہ ٹیسٹ ہوتے جس میں دیکھا جاتا کہ کینسر ختم ہوگیا ہے یا اس کا کچھ حصہ باقی ہے۔ ایک ہفتے تک ان کی حالت ٹھیک رہی تھی مگر پھر ان کو سینے میں دائیں طرف درد شروع ہوگیا۔ ڈاکٹر احسان نے کسی قسم کے درد کی صورت میں فوری کلینک لانے کو کہا تھا۔ اس لیے میں ابا کو اسی دن کلینک لے گیا۔ ڈاکٹر احسان کے پاس جدید ترین ایم آئی آر کی سہولت تھی۔ انہوں نے ابا کا ایم آئی آر کیا اور اس سے یہ بات سامنے آئی کہ دائیں پھیپھڑے میں ایک جگہ گلٹی نمودار ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر احسان نے ہنگامی آپریشن کا فیصلہ کیا اور مجھ سے کہا۔

"شاید یہ حصہ نکالنے سے رہ گیا تھا۔"

میں پریشان ہوگیا "ڈاکٹر صاحب کیا کینسر پھر سے پھیل رہا ہے؟"

"نہیں ایسی کوئی علامت نہیں ہے۔ یہ حصہ پہلے سے کینسر زدہ تھا مگر نکالنے سے رہ گیا۔ اب گلٹی نمایاں ہوئی ہے۔ اسے نکالنا ہوگا۔"

ابا کی طرف سے اطمینان ہوا تو پریشانی کا رخ اخراجات کی طرف مڑ گیا۔ "ڈاکٹر صاحب اس کے اخراجات؟"

"میرے اور کلینک کے کوئی اخراجات نہیں ہیں کیونکہ یہ میری ذمے داری ہے۔ ہاں آپ کو دواؤں کا خرچ برداشت کرنا پڑے گا۔"

"یہ خرچ کتنا ہوگا؟"

"دو لاکھ روپے ہوں گے۔" ڈاکٹر احسان نے آرام سے کہا۔ "اگر آپ چاہیں تو میں منگوا دوں ورنہ آپ خود منگوا لیں۔"

میں کہاں سے منگواتا۔ میں نے پہلے بھی مارکیٹ سے ان دواؤں کی قیمت معلوم کی تھی تو ڈاکٹر احسان کی منگوائی دوائیاں ہی سستی پڑ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا۔ "آپریشن کب کرنا ہے؟"

"جلد از جلد اس سے پہلے کہ یہ کینسر میچور ہو جائے اور بڑے حصے پر قبضہ کر لے۔" انہوں نے کہا۔ "میرے اندازے کے مطابق پانچ دن کے اندر ہو جانا چاہیے۔"

میں ابا کو لے کر گھر آیا تو میرا سر چکرا رہا تھا اور مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں دو لاکھ کہاں سے کروں گا۔ کارخانے سے پہلے ہی پچاس ہزار لے چکا تھا۔ ابا کی اسکیم والی بچت ختم ہو گئی تھی۔ اب میری تنخواہ کٹ کر آتی تھی اور ابا کی پنشن تھی۔ اس سے گزارا ہو سکتا تھا ابا کا علاج نہیں۔ ایسے میں مجھے ایک ہی امید نظر آئی تھی مگر وہ امید بہت خوفناک بھی تھی۔

☆☆☆

میں ایوننگ شفٹ کر کے کارخانے سے نکلا تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ شفٹ بارہ بجے ختم ہو جاتی تھی۔ مگر دوسرے بندے کو چارج دے کر باہر نکلتے نکلتے پندرہ بیس منٹ ہو جاتے تھے۔

سڑکوں پر آمد و رفت اور چہل پہل جاری ہوتی ہے۔ میں جیسے ہی کارخانے سے باہر نکلا دو بائیکس پر سوار چار لڑکوں نے مجھے روک لیا۔ میرا دل ڈوب گیا کہ وہ لوٹنے اور بائیک چھیننے آئے ہیں۔ ایک لڑکا اتر کر میرے پاس آیا۔

"تجھے ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔"

سوال کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ میرے پیچھے بیٹھ گیا اور پستول کی نال سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میری حالت زیادہ خراب ہو گئی کہ نہ جانے یہ مجھے کیوں لے جا رہے ہیں۔ یہ آج سے کئی سال پہلے کی بات ہے جب شہر کے حالات کی خرابی عروج پر تھی۔ روزانہ دس بیس لوگ قتل ہو رہے تھے اور اکثر اندھے قتل تھے یعنی قاتلوں کا کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کون تھے اور کیوں مار گئے تھے۔ مرنے والوں کو اکثر ٹارگٹ بنا کر یا پھر ساتھ لے جا کر مارا جاتا اور ان کی لاشیں پھینک دی جاتی تھیں۔ اس لیے میرا پریشان ہونا لازمی تھا میں نے گھبرا کر کہا۔ "تمہیں بائیک چاہیے تو لے جاؤ مجھے کیوں لے جا رہے ہو۔"

"بکواس نہ کر۔" میرے پیچھے بیٹھے لڑکے نے غرا کر کہا۔ "شرافت سے چل ورنہ بائیک کے پیچھے باندھ کر گھسیٹ کر لے جائیں گے۔"

وہ ایسا کر بھی سکتے تھے۔ مجبوراً میں نے بائیک آگے بڑھائی۔ کچھ دیر بعد ہم سائٹ کے ساتھ موجود ایک کچی آبادی میں داخل ہوئے جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جرائم پیشہ افراد اور قاتلوں کی پناہ گاہ ہے۔ یہاں آ کر میری حالت مزید خراب ہو گئی۔ پتا نہیں میں بائیک کو کیسے قابو کیے ہوئے تھا۔ تاریک اور گندی گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک بڑے احاطے میں داخل ہوئے۔ ایک بائیک والے نے مخصوص انداز میں ہارن دیا تو دروازہ کھل گیا تھا۔ احاطے میں ایک دو منزلہ پکا مکان تھا۔ یہاں بجلی نہیں تھی مگر جنریٹر چل رہا تھا اور احاطہ روشن تھا۔ مجھے لانے والے پستول کی نوک پر ہی دھکیلتے ہوئے اندر لے گئے۔ دوسری منزل کے ایک پرتعیش کمرے میں ایک شخص صرف نیکر میں اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اور ایک آدمی اس کے جسم کی تیل سے مالش کر رہا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے نے اس آدمی سے کہا۔ "جاجی بھائی بندہ آگیا ہے۔"

یہ نام سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جاجی بھائی ایک معروف جرائم پیشہ، منشیات فروش، بھتہ خور اور ٹارگٹ کلرز کی ٹیم کے حوالے سے جانا جاتا تھا۔ میں نے اس کا نام بہت سنا تھا مگر دیکھا پہلی بار تھا۔ اس نے سر گھما کر میری طرف دیکھا تو اس کی سرخ آنکھوں میں سفاکیت جیسے تیر رہی تھی۔ وہ پچاس کے آس پاس کا تنومند شخص تھا۔ نزدیک ہی دیوار کے ساتھ اسلحہ یوں سجا ہوا تھا جیسے لوگ شوپیس سے اپنا ڈرائنگ روم سجاتے ہیں۔ اس میں جدید ترین خودکار اسلحہ بھی تھا۔ میرا خوف کسی قدر کم ہوا تھا کہ وہ مجھے مارنے نہیں لائے تھے ورنہ یہاں لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ایک گولی مار کر کہیں بھی پھینک دیتے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے جاجی بھائی نے بلایا ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا اور میرا جائزہ لیا۔ "تو سیٹھ شفیق دلدار کے کارخانے میں کام کرتا ہے؟"

"جی جاجی بھائی۔"

"تیرے کارخانے میں مال بن کر کہاں جاتا ہے؟"

"کچھ گودام میں جاتا ہے کچھ آرڈر کا ہوتا ہے وہ کارخانے سے براہِ راست چلا جاتا ہے اور کچھ بیرونِ ملک کا ہوتا ہے جو بندرگاہ جاتا ہے۔" میں نے وضاحت سے بتایا۔ اب میرا خوف اور کم ہو گیا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ معاملہ میرا نہیں بلکہ سیٹھ شفیق کا ہے۔ جب جاجی بھائی نے اگلا سوال کیا۔

"مال ہفتے میں کتنے دن جاتا ہے؟"

"عام طور سے جمعے یا ہفتے کی شام کو نکلتا ہے کبھی رات میں بھی جاتا ہے۔"

جاجی بھائی نے اسلحے میں سے ایک پستول اٹھا لیا اور بولا۔ "تجھے اپنی زندگی کتنی پیاری ہے؟"

میرا دم خشک ہو گیا اور میں نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ "جتنی سب کو پیاری ہوتی ہے۔"

"تب زندہ رہنا چاہے گا۔" جاجی بھائی نے پستول میری طرف کیا۔ "اس کی ایک ہی صورت ہے۔ اگلے ہفتے جب کارخانے سے مال نکلنے لگے تو مجھے بتائے گا۔"

جاجی بھائی کی انگلی ٹریگر پر تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ میں نے انکار کیا تو وہ ٹریگر دبا دے گا۔ تب اللہ نے میرے ذہن میں ایک بات ڈالی اور میں نے ہمت کر کے کہا۔ "جاجی بھائی اگر تم نے مجھے مارنا ہے تو مار دو، لیکن میری ایک بات سن لو تمہاری مہربانی ہوگی۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر پستول نیچے کر لیا۔ "بول۔"

"جاجی بھائی، میں بہت غریب گھر سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے باپ نے مجھے ہمیشہ رزق حلال کھلایا ہے۔ آج وہ کینسر سے جنگ لڑ رہا ہے اور میں اسے بچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جاجی بھائی شفا دینے والا اللہ ہے اور میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ اگر میرے باپ کی زندگی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں یہ بات نہ کہتا اپنی جان بچانے کے لیے تمہاری بات مان لیتا مگر اپنی جان میں اپنے باپ کی جان کے بدلے نہیں بچا سکتا۔"

"تجھے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔" جاجی بھائی کا سخت لہجہ ذرا نرم ہوا تھا۔ "اس کے تجھے پیسے ملیں گے۔"

میں نے ہاتھ جوڑ دیے۔ "جاجی بھائی خدا کے لیے، اس کارخانے میں ڈیڑھ سو بندے کام کرتے ہیں۔ تم کسی کو بھی بلوا سکتے ہو وہ تمہارا کام کرے گا۔"

جاجی بھائی ہنسا۔ "اگر اس کے باپ کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نکل آیا۔ اب کیا میں بندے ہی پکڑواتا رہوں گا۔"

میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے اس کے فیصلے کا انتظار تھا۔ اگر وہ پھر کہتا تو میرے لیے انکار ممکن نہیں تھا مگر اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا اور اس نے اپنے آدمی سے کہا۔ "اسے باہر تک پہنچا دے کل کسی اور کو لانا۔"

"چل۔" اس تنے آدمی نے بدمزہ ہو کر کہا۔ اسے جاجی بھائی کی رحم دلی پسند نہیں آئی تھی۔ ہم باہر نکلنے لگے تو عقب سے جاجی بھائی نے کہا۔

"اگر پیسوں کی ضرورت ہو تو ادھر آ جانا۔"

میں حیران تھا کہ ایک بدنام زمانہ جرائم پیشہ مجھ پر یوں مہربان ہوا تھا کہ پہلے تو اس نے میری بات مان کر مجھے جانے دیا اور پھر مدد کی پیشکش بھی کر رہا تھا۔ اس کے آدمی مجھے آبادی کے باہر چھوڑ گئے اور جانے سے پہلے دھمکی دی کہ اگر میں نے اس بات کا کسی سے ذکر کیا تو وہ پھر آئیں گے اور میری لاش گرا کر جائیں گے۔ میں نے یقین دلایا کہ میں اپنے باپ سے بھی نہیں کہوں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ میں رات دو بجے گھر پہنچا تو ابا جاگ رہے تھے مجھ سے پوچھا تو میں نے بہانہ کر دیا کہ نائٹ شفٹ کا سپروائزر دیر سے آیا تھا اس لیے مجھے وہاں رکنا پڑ گیا اور آتے آتے دو بج گئے تھے۔ اس کے بعد جاجی بھائی نے کسی اور کو بلایا یا نہیں مجھے اس کا پتا نہیں چلا تھا۔ کئی دن میں سہما رہا کہ میری شامت نہ آ جائے مگر جب دوبارہ جاجی بھائی کے آدمی نظر نہیں آئے تو میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ احاطے کا فولادی دروازہ بجایا۔ چند لمحے بعد اندر سے کسی نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

"میں جی ندیم ہوں۔ جاجی بھائی کے پاس آیا ہوں۔"

جواب میں دروازہ کھلا اور ایک مجرم صورت نوجوان نے باہر جھانکا اور ناک سکیڑ کر میرا جائزہ لیا۔ "کون ہے تو اور جانتا ہے جاجی بھائی کون ہیں؟"

"میں ایک بار ملنے آیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ اگر مجھے ادھار کی ضرورت ہو تو اس کے پاس آ جاؤں۔"

یہ سنتے ہی اس کے تاثرات بدل گئے اور وہ اندر غائب ہو گیا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پہلے میں ایک کیمرے کے سامنے رکا اور جب اس کے ساتھ لگا ہوا سبز بلب روشن ہوا تو وہ مجھے لے کر آگے بڑھا اور ایک منٹ سے بھی پہلے میں جاجی بھائی کے سامنے اسی نشست گاہ میں تھا۔ وہاں دیوار کے ساتھ سجا ہوا اسلحہ تک ویسا ہی تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آج جاجی بھائی مکمل لباس میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے شیشے کی میز پر شیشے کی بوتل اور گلاس میں ام الخبائث موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پہلے گلاس سے ایک گھونٹ لیا اور پھر بولا۔ "کیوں آئے ہو؟"

"جاجی بھائی مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ آپ نے کہا تھا....."

"کتنی رقم کی ضرورت ہے؟" اس نے بات کاٹ کر پوچھا۔

"دو لاکھ روپے۔"

اس نے مجھے لانے والے کی طرف دیکھا تو وہ گیا اور چند منٹ بعد ہزار کے نوٹوں والی دو گڈیاں لا کر جاجی بھائی کے سامنے رکھ دیں۔ اس بار بھی میں حیران رہ گیا تھا۔ اس نے ایک بار کہنے پر رقم میرے سامنے رکھ دی تھی۔ پھر اشارہ کیا کہ میں رقم اٹھا لوں۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے گڈیاں اٹھائیں تو اس نے کہا۔ "چیک کر لے۔"

"ٹھیک ہے جاجی بھائی۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "میں جلد یہ رقم واپس کر دوں گا۔"

"تین مہینے میں۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "...

...گر..." میں گھبرا گیا۔ "جاجی بھائی اتنی جلدی میں نہیں کر سکتا ...گا..."

"واپس چار لاکھ کرنے ہیں۔" اس نے دوسرا بم ...گرایا۔ "تین مہینے کے اندر چار لاکھ واپس کرنے ہیں۔"

"جاجی بھائی میں کہاں سے کروں گا۔" میں نے کہا ...پھر گڈیاں واپس رکھ دیں۔

"رقم میں دے چکا ہوں اگر واپس کرنے ہیں تو دو ...کو دو۔"

اس سے پہلے میں کچھ کہتا۔ اس نے اپنے آدمی سے ...کہا۔ "ایک منٹ بعد اسے باہر کر دینا۔ جا کر اس کا گھر دیکھ ...بھی یہ رقم نہیں لے جاتا تو تین مہینے بعد اس سے دو ...لینے ہیں ورنہ چار لاکھ۔"

"سن لیا۔" مجھے لانے والے آدمی نے کہا۔ "ایک ...منٹ ہے تیرے پاس۔"

میں نے ایک منٹ سے پہلے فیصلہ کر لیا۔ میں نے ...گڈیاں اٹھا لی تھیں کیونکہ ان سے میرے باپ کی زندگی ...وابستہ تھی۔ جاجی بھائی کا آدمی میرے ساتھ میرے گھر تک ...آیا اور پھر واپس چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ گھر نہ بھی دیکھتا ...تب بھی با آسانی میرا پتا چلا سکتا تھا۔ کارخانے میں دسیوں ...میرے جاننے والے تھے اور یہ سارا علاقہ ہی مجھے جانتا ...تھا۔ مجھے تلاش کرنا بہت آسان تھا۔ اب مجھے لگا کہ جاجی ...بھائی نے اس طرح مجھ سے انتقام لیا تھا کہ میں نے اس کا ...کام کرنے سے انکار کیسے کیا؟ وہ ٹھنڈے دماغ کا آدمی تھا ...اور اسے معلوم تھا کہ میرے باپ کو ایسی بیماری ہے کہ مجھے ...رقم کی ضرورت پڑ جائے گی تب ہی اس نے فراخ دلی سے پیش کش کی تھی۔ اسے امید تھی کہ میں اس کے جال میں ضرور آؤں گا۔ جب میں رقم لے کر وہاں سے نکل رہا تھا تو جاجی بھائی نے کہا تھا۔ "ایک بات یاد رکھنا تین مہینے بعد مجھے چار لاکھ روپے یا تیری جان دونوں میں سے کوئی ایک ...چاہیے ہوگی۔"

...ان دنوں میں ڈبل شفٹ میں کام کر رہا تھا۔ فیکٹری ...مینیجر طاہر صاحب نیک فطرت آدمی تھے جب انہیں میرے ...مسئلے کا پتا چلا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ تنخواہ سے ہر مہینے چار ...ہزار روپے کٹ رہے ہیں تو انہوں نے میری شفٹ ڈبل کر ...دی تھی۔ اب میں صبح آٹھ بجے سے رات بارہ بجے تک ...کارخانے میں ہوتا تھا اور صرف اس دن ایک شفٹ کرتا جب ابا کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوتا تھا۔ یوں چار ہزار کٹنے سے جو کمی ہوتی تھی وہ پوری ہو جاتی تھی بلکہ مجھے اضافی کچھ رقم بھی مل جاتی تھی۔ یہاں سارے غریب گھروں کے لوگ کام کرتے تھے اور سب کو اوور ٹائم درکار ہوتا تھا اس لیے یہ پالیسی بنا دی تھی کہ کسی بھی ورکر کو مہینے میں اسی گھنٹے سے زیادہ اوور ٹائم نہیں ملے گا۔ لیکن طاہر صاحب نے میری مجبوری کی وجہ سے مجھے اس سے مستثنیٰ قرار دیا تھا اور میں چاہتا تو پورے مہینے بھی اوور ٹائم کر سکتا تھا۔

رقم ملنے کے دو دن بعد ابا کا دوبارہ آپریشن ہوا اور پھیپھڑے کا کینسر والا باقی حصہ بھی نکال دیا گیا۔ اس بار بھی ابا پانچ دن کلینک میں داخل رہے اور تمام احتیاطوں سے گزرنا پڑا۔ ڈاکٹر احسان نے ان کی دوائیں منگوا دی تھیں اور ان کا یہ بھی احسان تھا کہ دوبارہ آپریٹ کے پیسے نہیں لیے ورنہ میں نے دیکھا ہے کہ ڈاکٹر اور خاص طور سے سرجن فیس نہیں چھوڑتے ہیں۔ ایک مہینے بعد ابا ٹھیک ہو گئے تھے کیونکہ اس بار ان کے ٹیسٹ کلیئر آئے تھے اور کینسر مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا مگر ڈاکٹر احسان نے مجھ سے کہا کہ میں چھ مہینے بعد ان کا دوبارہ چیک اپ کراؤں اور اس کے بعد سال میں کم سے کم ایک بار ان کا چیک اپ کراتا رہوں۔ مگر جب ابا نے سنا تو صاف انکار کر دیا بولے۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے یہ سب ان ڈاکٹروں کے چکر ہوتے ہیں۔ لاکھوں لے کر بھی ان کا دل نہیں بھرا۔"

ابا کو میں نے اضافی دو لاکھ کا بتایا نہیں تھا ورنہ وہ ٹینشن میں آ جاتے اور یہ چیز ان کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں تھی مگر اندر سے فکر مجھے کھائے جا رہی تھی کہ میں دو مہینے میں چار لاکھ کہاں سے کروں گا۔ مہلت ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جاجی بھائی کہہ چکا تھا کہ اسے رقم یا میری جان میں سے کوئی ایک چیز چاہیے ہوگی۔ کسی سے چار لاکھ ملنا اس سے بھی زیادہ محال تھا۔ میری فکر اتنی بڑھی کہ میں بیمار نظر آنے لگا۔ ابا جن کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی وہ مجھ سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکے کہ مجھے کیا ہوا ہے اور میں اتنا کمزور کیوں ہو رہا ہوں۔ مگر میں انہیں ٹال گیا اور کمزوری کی وجہ کام کی زیادتی کو قرار دیا۔ دو شفٹوں میں کام کرنے کے بعد مجھے گھر کے بہت سے کام دیکھنا پڑتے تھے اور آرام کا موقع کم ملتا تھا۔ ایک مہینے بعد ابا نے یہ کام سنبھال لیے جیسے کھانا بنانا، گھر کی صفائی اور باہر سے سودا وغیرہ لانا۔

گھر کی ذمے داریاں کم ہوئی تھیں مگر جاجی بھائی والا

مطالعہ صوت کے فریضے کی طرح میرے سر پر سوار تھا۔ میں دو بار اس کی منت سماجت کرنے اس کے فلیٹ پر گیا تھا مگر اس کے گارڈوں نے مجھے وہاں سے بھگا دیا۔ میری کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس آفت سے کیسے چھٹکارا حاصل کروں۔ ان دنوں کارخانے میں کام بڑھ رہا تھا۔ کچھ نئی مشینیں بھی تھیں جو ملکوں ملکوں کے پرزے بناتی تھیں۔ پہلے یہ مشینیں باہر سے آتی تھیں اور ان کے لیے تربیت یافتہ لڑکے رکھے گئے تھے۔ ان کے سیر وانٹر بھی دور سے آئے تھے۔ مشینیں تھکنے ہی ان پر ہمارا ہجوم کام شروع ہوگیا اور بڑے بن بن کر نہ کسی کے گودام میں جانے لگے۔ یہاں تک مشغولیں میں کام ہو رہا تھا۔ میں اپنے کام سے کام رکھنے والا آدمی ہوں اس لیے میں نے جیسی تیسی کیا کرنے پرزے کہاں جارہے ہیں اور ان کے بنانے آرڈر کیوں دیئے آرہے۔ شافی آفرز کارخانے سے بیک ہو کر براہ راست جانے تھے اسی طرح میرا دن ملک جانے والے پرزے بھی یہیں سے بیک ہو کر جاتے تھے۔ صرف گودام میں کھلا بال جانا تھا اور صرف ضرورت وہیں سے بیک ہو کر آگے جاتا تھا۔

دوسرا مہینا بھی ختم ہونے والا ہوا تو میری فکر بھی سوا ہوگئی تھی اب میرے پاس صرف ایک مہینہ رہا تھا۔ اب مجھے اپنے بچائے لیا کا خیال آنے لگا تھا کہ میرے بعد ان کا کیا ہوگا۔ میری موت کے صدمہ تو انکی ہوگا مگر جب میری تنخواہ نہیں ہوگی تو وہ گزارا کیسے کریں گے۔ صرف چھ ماہ گزارا ہوا تو مکمل نہیں تھا اس میں تو ایک آدمی تین وقت سستا ترین کھانا بھی پیٹ بھر کر نہیں کھا سکتا تھا۔ ایا کے بھائیوں سے تھلی اُمید نہیں تھی جو ان کی محنت پالنا پر بھی انہیں دیکھنے نہیں آئے تھے۔ پھپھو کو ابا سے محبت تھی مگر وہ اپنے شوہر کی وجہ سے مجبور تھیں اور ان سے بھی میرا دل نہیں کہ وہ بھائی کا خیال رکھیں گی۔ ابا بالکل اکیلے رہ جائے ان کی دیکھ بھال کرنے والا کون رہ جائے گا شاید وہ چند ہفتے بھی زندہ نہ رہ پائے۔ میں جانتا تھا کہ وہ مجھ سے کتنی محبت کرتے تھے۔ امکان تھا کہ میری موت کا صدمہ سہی ان کے لیے جان لیوا ہوگا۔

دوسرا خیال مجھے رضوانہ کی آمد کا تھا۔ جب سے وہ ہمارے ہاں سے ہو کر گئی تھی اور اس نے انوکھے انداز میں اپنی چاہت وخلوص کا اظہار کیا تھا جب سے میرے اندر اس کی محبت دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی۔ میرا اس سے رابطہ نہیں تھا مگر اس کا خیال ذہن سے جاتا نہیں تھا۔ کبھی کبھار یہ خیال آیا کہ اس سے ملوں مگر ہمت نہیں ہوتی تھی۔ کہاں میں اپنی ایک عام سی حیثیت رکھتا تھا اور کہاں وہ ایک فل لوڈ اور اسٹیٹس کو۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید ہمارا رشتہ کبھی شادی کی منزل تک نہ پہنچ سکے گا معلوم تھا کہ اس کے دل پر کیا گزرے گی۔ یہی خیال مجھے خبر بھی رکھنا چاہتا تھا۔ اب اس کا کیا ارادہ تھا اس نے اس سے ملنے کے لیے اپنے اندر ہمت پیدا کرنے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کس کالج میں پڑھتی ہے اور رضوانہ کا گھر اس کالونی میں تھا اور اس کا کالج شاید دو تین میل کے فاصلے پر تھا۔ ایک دن میری اچانک شفٹ کبھی تھی اور وہ تائم ٹیبل تھا۔ میں دوپہر کے قریب گھر سے نکلا رضوانہ کے کالج پہنچ گیا۔ چھٹی ہونے تو لڑکیوں کا ایک ان میں سے شرمایا شرمایا ہوں جیسے نے نہ جانے کیا قدرت مدد پر آمادہ تھی۔ اچانک کسی لڑکی نے زور کہا۔ "رضوانہ گل آئی ہے؟"

"ہاں۔" ایک لڑکی نے مڑ کر جواب دیا۔ "وہ گئی۔"

وہ رضوانہ تھی جو پیدل ہی اس اسٹاپ کی طرف رہی تھی۔ اس کے ساتھ اور لڑکیاں بھی تھیں۔ وہ رہی تھی۔ میں بائیک پر اس کے قریب گیا اور ایک جگہ رکھ گیا۔ جب رضوانہ نزدیک آئی میں نے اسے آہستہ سے آواز دی۔ اس نے چونک کر طرف دیکھا اور پھر اس پاس کا جائزہ لیا مگر اس طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں ایک بڑے سے درخت کے عقب میں تھا۔ وہ بھی اس کے طرف آگئی۔ "آپ....."

"رضوانہ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ پلیز صرف چند منٹ کی بات ہے پھر میں پاس چھوڑ دوں گا۔" تم زیادہ دیر سے گھر نہیں خود رضوانہ بھی محسوس کر رہی تھی کہ کوئی کی گاڑی کھڑے ہو کر بات کرنا مناسب نہیں تھا وہ پیچھے بیٹھ گئی اور میں نے ایک طائرانہ نظر میں آگیا۔ گرمی تھی اور جلدی تھی اس لیے ڈرنگ کنگوانی۔ ویٹر کے جانے تک میں کوئی بات نہ کی بلکہ اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ویٹر کے جانے کے بعد ہی میں نے بات کا آغاز کیا۔

"ان کی طبیعت ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ اس دوران میں ویٹر کولڈ ڈرنک کی بوتلیں لے آیا۔ اس نے بوتلیں اور اسٹرا میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے اسٹرا لگاتے ہوئے کہا۔ "ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ میری نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جب میں نے یہ کہا تو اس کی آنکھوں میں حیرت کی دو ڈوریں بھی ہوئی تھی۔

"مرد ہم کیا ہوگا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں جانتا لیکن ڈاکٹروں کا یہی کہنا ہے۔"

"پلیز ایسا مت کہیں۔" وہ روہانسی ہوگئی۔

"مجھے حوصلے سے کام لینا ہوگا۔ شاید اللہ کوئی سبیل نکال دے۔"

"میں ابھی سے بات کرتی ہوں انہوں نے میرے لیے کچھ پریئر کرنا کہا ہے اور پھر ملاقات۔"

"رضوانہ پلیز۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم میری بات سن لیا ہے۔"

"مشکل میں ایسے ہی کرتے ہیں۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے منع مت کریں۔"

"نہیں تم سے تم اس کو بات نہیں کرو گی۔ میں یہ چاہتا کہ بات آگے تک پہنچے اور وہ مشکل میں پڑ جائے۔"

"کیسی مشکل؟"

"رکھو وہ پہلے تمہاری ماں ہیں اور کوئی ماں اپنی بیٹی کا رشتہ ایسے آدمی سے کیسے برداشت کرسکتی ہے جس کے آگے پیچھا کوئی نہ ہو۔ اگر انہوں نے رشتہ توڑ دیا اور یہاں میرے سمجھ کوئی حل نکل آتا تو تم سوچ سکتی ہو کہ سہارا ملاپ پھر بھی کہیں ہوگا؟"

اس کا چہرہ مزید زرد پڑ گیا تھا۔ رضوانہ بہت حسین اور خوبرو لڑکی تھی مگر اس میں ایک معصومانہ دلکشی بالکل بچوں کی سی تھی۔ جسم نمایاں نہیں تھا مگر وہ بھرے بھرے جسم کی مالک تھی۔ جب سے میری اس سے ملاقی ہوئی تھی وہ مجھے دنیا کی حسین ترین لڑکی لگنے لگی تھی۔ جب میں رضوانہ کے بارے میں سوچتا تو میرے ذہن میں پہلے ابال آجاتا تھا شاید یہی محبت تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں نمی آئی تھی۔ کچھ کہنے سے پہلے وہ رونے لگ جاتی۔

"رضوانہ پلیز۔" میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم میرے لیے آنسو ضائع کرو۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ ابھی میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔ میں ابھی ہار نہیں مانا ہوں۔ میں ابھی ہار نہیں مانا ہوں۔"

"میں دل مضبوط رکھوں گا۔" میں نے ایک نوٹ نکال کر بل کے لیے رکھا اور رضوانہ نقاب درست کرنے لگی جو اس سے بہت بار اتار چکا تھا۔ ہم باہر آئے اور اس نے اسے دس منٹ سے پہلے پہلے اس کی گلی کے پاس اتار دیا تھا۔ اس نے جانے سے پہلے کہا۔

"اپنا خیال رکھنے گا میں آپ کے لیے بہت دعا کروں گی۔"

"شاید تمہاری دعائیں میرے کام آگئیں۔ میں نے کہا اور بائیک آگے بڑھا دی۔ اس وقت میں کارخانے پہنچا تو وہاں کچھ ہنگامی صورت حال تھی۔ لگتا یہ کوئی ہی بات نہیں تھی جہاں ایک وقت میں ساتھ سے اور پر لوگ کام کرتے ہوں وہاں کوئی نہ کوئی ہنگامہ اٹھتا رہتا ہے۔ میں اپنے سیکشن کی طرف جارہا تھا کہ انجینئر فرخ صاحب نے مجھے بلالیا۔ میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا۔

"یار ایک مسئلہ ہوگیا ہے جی مشینوں کا سپروائزر بیمار پڑ گیا ہے تم اس کی جگہ کام کرلو گے۔"

"لیکن سر مجھے تو ان مشینوں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"یار مشینوں کو لوڈ اور کوئی مسئلہ ہو تو سمجھ میں نہ آئے تو میرے پاس آجانا۔ کام کرو گے تو سیکھو گے۔"

مجھے اس کی یہ بات اچھی لگی مگر میرے پاس وقت کہاں تھا جو میں کچھ سیکھ سکتا۔ بہرحال مجبوراً میں جی مشینوں والے سیکشن میں آگیا۔ یہاں کل چھ مشینیں تھیں جو مختلف پرزے بناتی تھیں۔ چھ بڑے کام کررہے تھے اور ساتواں میں پیرو وائر تھا۔ میں نے مینول دیکھا اور مجھے بالکل آسان لگا تھا۔ ظاہر ہے میں ایسی مشینوں کے برسوں سے کام کر رہا تھا یہ مشینیں فوخدری سے ڈھلے ہوئے پرزوں کو پالش کرتی تھیں۔ کام جاری تھا میں بنے والے پرزوں کو چیک کررہا تھا۔ یہ ظاہر یہ اگلی دو رجے کے میٹریل سے اگلی دو رجے کے پالش کیے ہوئے پرزے تھے جو

پالش کے بعد چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ اتنے عرصے کام کر کے مجھے کسی قدر پتا چل گیا تھا کہ کون سا پرزہ کس کام آتا ہے اور اس کی مالیت کیا ہوسکتی ہے۔ مجھے لگا کہ یہ پرزے بہت مہنگی گاڑیوں کے تھے۔

مگر اس قسم کی گاڑیوں میں ہمیشہ جینوین پرزے لگتے ہیں اور یہ پرزے گاڑیاں بنانے والی کمپنیاں خود تیار کر کے اپنے مخصوص ڈیلرز کے ذریعے فروخت کرتی ہیں۔ کیونکہ کمپنیاں ان سے بہت کماتی ہیں اس لیے وہ ان کی تیاری کا ٹھیکا کسی دوسری کمپنی کو بھی نہیں دیتی ہیں۔ میں حیران تھا کہ ہمارے کارخانے میں اس قسم کے پرزے کیسے بن رہے ہیں اور ان کا خریدار کون ہوگا۔ ایک بار ایک بڑی ورکشاپ کا مالک ہمارے کارخانے آیا تھا اور وہ بہت باتونی آدمی تھا۔ اتفاق سے میں ہی اس کے ساتھ تھا۔ اسے کچھ پرزے چاہیے تھے جو مارکیٹ میں دستیاب نہیں تھے اور وہ ہم سے بنوانا چاہتا تھا۔ اس کے پاس ری کنڈیشن لگژری گاڑیاں آئی تھیں۔ ان میں مرمت کا کچھ کام تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مارکیٹ دستیاب پرزے بہت ہلکی کوالٹی کے تھے اور ایک نمبر باہر سے منگوائے جاتے تو بہت مہنگے پڑتے اس لیے وہ بنوانے کے لیے ہمارے کارخانے آیا تھا۔

اس سے مجھے اس بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا تھا۔ ہم نے اسے پرزے بنا کر دیے تھے جو اچھی کوالٹی کے تھے مگر ان کی فنشنگ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ لیکن اس وقت یہاں جو پرزے بن رہے تھے وہ بین الاقوامی کوالٹی کے حامل تھے۔ باقی اندر کا مال مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسا تھا کیونکہ ابھی تک میں نے دیکھا نہیں تھا۔ ایک کھیپ نمٹانے کے بعد جب ڈھلے ہوئے پرزوں کی دوسری کھیپ آئی تو میں نے دیکھا کہ یہ عام سے میٹریل کے تھے یعنی صرف فنشنگ ہی تھی ورنہ اندر سے کوالٹی مقامی ہی تھی۔ گویا یہاں دو نمبر کام ہو رہا تھا اور ایسا میں نے پہلی بار ہوتے دیکھا تھا۔ ورنہ یہاں جس کوالٹی کی چیز بنائی جاتی تھی فنشنگ بھی اسی کوالٹی کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے مستقل گاہکوں کو دھوکا نہیں دیا جاسکتا تھا اس لیے جو وہ قیمت دے رہے تھے اسی قیمت کی فنشنگ کر کے چیز ان کو دی جارہی تھی۔ لڑکے خاموشی سے اپنا کام کر رہے تھے اور دوسرے لڑکوں کی طرح وہ آپس میں ہنسی مذاق یا باتیں نہیں کر رہے تھے۔ شفٹ رات بارہ بجے ختم ہوئی اور اس دوران میں اس شفٹ کا سپروائزر اور دوسرے لڑکے آگئے تھے۔ جانے سے پہلے مجھے انجینئر فرخ صاحب نے بلایا اور آہستہ سے کہا۔ ''یہاں جو بن رہا ہے اس کے بارے میں کسی سے بات مت کرنا۔''

''جی سر۔''

''اس شفٹ کے تمہیں دو سو روپے اضافی مل جائیں گے۔''

''جی سر۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں خوش ہو جاتا لیکن اس وقت دو سو روپے مجھے بے وقعت لگ رہے تھے۔ کیونکہ مجھے چار لاکھ روپے ادا کرنے تھے اور میرے پاس ایک مہینے کا وقت رہ گیا تھا۔ میں جانے لگا تو انجینئر صاحب نے روکا۔

''اتنی جلدی کیا ہے، پوری بات تو سنتے جاؤ۔ اگر کل شفٹ تمہیں ہی دیکھنی ہے کیونکہ اس کا سپروائزر بیمار ہے جب تک وہ نہیں آتا تم اس کی جگہ کام کرو گے۔''

''یس سر۔'' میں نے تیسری بار کہا اور کارخانے سے نکل آیا۔ اگرچہ یہ خاصی انوکھی بات تھی اور اگر جانی بھائی کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اس میں بہت دل چسپی لیتا۔ اگلے روز میں نے ایک شفٹ نارمل کی اور پھر اوور ٹائم شفٹ میں یہاں آگیا۔ اس روز بھی خاموشی سے کام ہوتا رہا۔ میں نے ایک دو بار لڑکوں سے بات کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے خاص ردِعمل نہیں دیا۔ مجھے لگا جیسے انہیں منع کیا گیا تھا کہ آپس میں یا مجھ سے بات نہ کریں۔ اگرچہ وہاں اور مجھے بلانے والا کوئی نہیں تھا مگر انجینئر صاحب وقفے وقفے سے اس کا چکر لگا رہے تھے اور کام دیکھ رہے تھے۔ فنش ہونے والے پرزے سادہ پیکنگ میں گودام بھیجے جا رہے تھے اس لیے مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ اصل میں کہاں کے لیے بنائے جا رہے تھے۔

کئی دن میں اسی جگہ لگا رہا پھر اس شفٹ کا سپروائزر ٹھیک ہو کر آگیا اور میں اپنی جگہ واپس آگیا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ دس دن رہ گئے تھے۔ ابھی جانی بھائی کے کسی کارگے نے نہ تو مجھ سے رابطہ کیا تھا اور نہ ہی ان میں سے کسی کی صورت دکھائی دی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ آخری دن وہ آئیں گے اور مجھے لے جائیں گے۔ اگر میں کہیں چھپ بھی جاؤں تو کتنے دن چھپا رہوں گا۔ پھر ابا کو لے کر کہاں جاتا۔ اگر انہیں چھوڑ جاتا تو میری جگہ جانی بھائی کے آدمی ابا کو لے جاتے۔ وہ لوگ رضوانہ اور امی کے گھر تک بھی پہنچ سکتے تھے اور میں ایک اپنی ذات کے لیے اتنے لوگوں کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخری دن خود ہی جانی بھائی کے سامنے پیش ہو جاؤں۔ اپنی تقدیر کا لکھا ہوا فیصلہ قبول کر لوں۔ یہی سوچتا ہوا اگلے دن کارخانے پہنچا تو وہاں پھر ہنگامہ ہو رہا تھا۔ ہنگامہ گیٹ پر ہی ہو رہا تھا۔ پتا چلا کہ گودام سے آنے والے سپروائزر نے طاہر صاحب سے بدتمیزی کی تھی اور نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ گاڑی تیار کھڑی تھی اور سامان گودام تک پہنچانا تھا مگر اب صرف ڈرائیور تھا اور گاڑی اس کے سپرد نہیں کی جاسکتی تھی۔ میں اندر پہنچا تو طاہر صاحب کی نظر مجھ پر پڑی اور انہوں نے بلا لیا۔

''ندیم تم گاڑی کے ساتھ جاؤ اور سامان گودام کے انچارج کے سپرد کر کے آؤ۔''

''میں سر؟''

''ہاں یار سپروائزر نے جاب چھوڑ دی ہے۔'' انہوں نے گالی دی حالانکہ وہ بہت کم گالی دیتے تھے مگر اس وقت غصے میں تھے۔ ''اسے بھی ابھی جاب چھوڑنی تھی۔''

میں نے سامان کی لسٹ لی جو چھوٹی سی فائل کی صورت میں تھی اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ یہ شہزور تھی۔ عقب میں لکڑی کی پیٹیوں میں پرزے موجود تھے۔ گودام سائٹ ایریا میں ہی تھا۔ کچھ دیر میں گاڑی وہاں پہنچی۔ ریکارڈ کیپر نے مجھ سے فائل لی اور بولا۔ ''میری مدد کرو آج دو بندے شارٹ ہیں۔''

''مجھے واپس جانا ہے۔''

''کیسے جاؤ گے؟'' اس نے منہ بنا کر کہا۔ ''یہی گاڑی لے جائے گی اور جب تک گاڑی خالی نہیں ہوگی کیسے جاؤ گے۔''

مرتا کیا نہ کرتا اس کے ساتھ لگ گیا۔ مزدور سامان اتار رہے تھے اور وہ میری مدد سے اس کو ویری فائی کر رہا تھا۔ یہ سارا وہی دو نمبر پرزوں پر مشتمل مال تھا جو گودام کے ایک خاص حصے میں پہنچایا جا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے سرسری سے انداز میں ریکارڈ کیپر سے کہا۔ ''کیا یہ مال بھی باہر جائے گا؟''

میں نے تکا مارا تھا اگر یہ مال واقعی باہر جانا تھا تو وہ سمجھتا کہ مجھے علم ہے اور وہ مجھے اس کے بارے میں بتاتا۔ ریکارڈ کیپر نے چونک کر مجھے دیکھا اور سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں یہ باہر جائے...... سارا ہی باہر جاتا ہے۔''

''مڈل ایسٹ؟'' میں نے پھر تکا مارا تو وہ بیزاری سے بولا۔

''کیوں پوچھ رہے ہو یار، سارا وہیں تو جاتا ہے۔''

گویا یہ مال سارے کا سارا مڈل ایسٹ جاتا تھا۔ مگر اس کا وہاں کیا کام ہوسکتا تھا۔ کیونکہ وہ مارکیٹ تو ساری ہی لگژری گاڑیوں والی تھی اور وہاں کے لوگ اپنی گاڑیوں میں دو نمبر پرزے کیوں لگاتے اور جو لگاتے وہ پکڑے جانے سے کیسے بچے ہوئے تھے کیونکہ قانون وہاں بہت سخت ہے۔

کچھ دیر بعد ریکارڈ کیپر نے خود ہی رازدارانہ انداز میں مجھے بتایا کہ یہ پرزے اصل میں ان ری کنڈیشن گاڑیوں میں لگتے ہیں جو مقامی استعمال کے بعد اونے پونے خرید لی جاتی ہیں اور پھر انہیں ری کنڈیشن کر کے برصغیر اور آس پاس کے ممالک بھیجا جاتا ہے۔ اصل پرزے بہت مہنگے ہوتے ہیں اس لیے دو نمبر پرزے تیار کرا کے بھیجے جاتے ہیں۔ یہاں صرف ہمارا کارخانہ ہی نہیں اور بھی بہت سے کارخانے یہ پرزے تیار کر رہے ہیں۔ ریکارڈ کیپر مجھے رازدار سمجھ رہا تھا اس لیے کھل کر بات کر رہا تھا اور اس نے تقریباً سب کچھ ہی بتا دیا تھا۔

جہاں مزدور پیٹیاں اتار کر رکھ رہے تھے وہاں پہلے سے مزید پیٹیاں موجود تھیں۔ ریکارڈ کیپر نے بتایا کہ دو ہفتے بعد یہ سارا سامان ایک کنٹینر میں پیک کر کے بندرگاہ پہنچے گا۔ جہاں سے کسی جہاز پر بار کر کے اسے مڈل ایسٹ کے ایک ملک بھیجا جائے گا۔ ایک گھنٹے بعد شہزور کے ڈرائیور نے مجھے کارخانے پر اتار دیا۔ میں دو شفٹیں بھگتا کر گھر پہنچا تو تھکن سے چور تھا۔ ابا جاگ رہے تھے انہوں نے میرے لیے چائے بنائی تھی کیونکہ دوپہر اور رات کا کھانا میں کارخانے میں کھاتا تھا۔ صبح گھر سے ناشتا کر کے جاتا تھا۔ ابا نے کہا۔ ''کیوں اتنی جان مار رہا ہے۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ دیکھ تو نے اپنی حالت کیا کر لی ہے۔''

میں ابا سے کیا کہتا کہ میں سچ مچ جان سے جانے والا تھا۔ زبردستی مسکرایا اور ابا سے کہا۔ ''بس اس مہینے کی حد تک مسلسل اوور ٹائم ہے اس کے بعد آرام ہوگا۔''

میں نے دل میں کہا تھا کہ آرام ہمیشہ کا ہوگا۔ ابا خوش ہو گئے۔ ''اچھا ہے، میں تو سوچ رہا ہوں کہ میں کوئی چھوٹا موٹا کام تلاش کر لوں سارا دن گھر میں فارغ بیٹھا رہتا ہوں۔''

''نہیں ابا آپ کام نہیں کریں گے ابھی میں زندہ ہوں۔'' میں نے چائے کا کپ خالی کیا۔ ''میں نہ رہوں پھر دیکھ لینا۔''

''اللہ نہ کرے۔'' ابا گھبرا کر بولے۔ ''ایسی باتیں

جائے۔" میں نے کہا اور کمرے سے نکل آیا۔ کارخانے کے مالکان کے بارے میں ظاہر صاحب نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی تم کے لوگ تھے۔ اگر ظاہر صاحب نہ ہوتے تو وہ پچاس ہزار بھی دے سکتے، مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ رقم انہوں نے ظاہر صاحب کی امانت پر دی تھی۔ ایک واحد آمدنی کمی گئی گراب وہ بھی نہیں رہی تھی۔ ظاہر صاحب نے فوائی طور پر ڈیڑھ لاکھ کی پیشکش کی تھی مگر اس سے میرا مسئلہ کہاں حل ہوتا؟ جاتی بھائی کو پورے چار لاکھ درکار تھے۔ ایسا ہوتا کہ میں اسے ڈیڑھ لاکھ دے کر مہلت مانگتا تو تم نے کہہ کر پھر مجھے تین مہینے کی مہلت اور ڈیل رقم کا کہہ دیتا تو پھر میں پانچ لاکھ روپے کہاں سے لاتا۔ اگر مقدر میں مرنا ہی لکھا تھا تو ڈیڑھ لاکھ خرچ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ دن ایک ایک کرکے گزرتے رہے اور آخری دن آگیا۔ اس دن میں نے نکلنے سے پہلے ایک کوئیٹ کر پارکیا تو وہ حیران رہ گئے۔

"کیا ہوگیا ہے بیٹا؟ آج تم اپنے پرانے وہی پیارا رہا ہے؟"

"ابا جی آپ سے دنیا میں ہر فرد سے زیادہ محبت ہے۔ بس اظہار نہیں کر پاتا۔ آج خیال آیا کہ شاید میری زندگی کا آخری دن ہو۔"

"پھر بکواس کی۔" ابا نے ڈانٹا۔ "تجھ میں میری زندگی ہے۔ تجھے کچھ ہوا تو میں بھی زندہ کہاں رہوں گا۔"

اس روز میں بائیک لے کر نہیں گیا تھا کہ اگر میں نہ آسکا تو بائیک ابا یا کسی اور سے۔ ایسا نہ ہو میرے ساتھ بائیک بھی جائے۔ ابا سے بہانا کیا کہ اس کا انجن مسئلہ کر رہا ہے۔ میں پیدل گلی اور کارخانے جانے کے بجائے رضوانہ کے کالج کی طرف چل پڑا۔ حالانکہ ابھی اس کی چھٹی میں بہت وقت تھا۔ میرے پاس موبائل تھا مگر میں رضوانہ کے پاس اور نہ اس کی امی کے پاس موبائل تھا اس لیے وہ رابطہ نہیں کر سکتی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک ایک سانس میں مجھے یاد کر رہی ہوگی۔ میں کالج سے ذرا دور ایک چائے ہوٹل میں بیٹھا رہا۔ پھر چھٹی کا وقت آیا۔ میں انجن کو کالج کے نزدیک آیا اور میں سوچ رہا تھا کہ آج رضوانہ کو کیسے پہچانوں گا۔ اس لیے میں نے یہ کیا کہ خود اپنی نشانیاں بتا کر کھڑا ہو گیا کہ کالج سے نکلنے والی لڑکیاں مجھے دیکھ لیں۔ میں ظاہر کر رہا تھا جیسے میں کسی لڑکی کو لینے آیا ہوں۔ وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے اس لیے میں الگ سے بھی نہیں لگ رہا تھا۔ اچانک ایک عبایا پوش لڑکی میرے پاس سے گزرتی ہوئی بولی۔ "ندیم میں رضوانہ۔"

میں اس کے پیچھے چل پڑا اور کچھ دور جا کر وہ بائیں کی طرف مڑ گئی جو عام آبادی کی طرف جارہی تھی۔ کالج کی لڑکیاں نہیں تھیں۔ میں اس کے آگے آگیا۔ "رضوانہ کیا ہوا؟"

"کیسی ہو سکتی ہوں۔" اس نے بھیگے آنچل سے کہا۔ "جو روز ذلیل ہوکر مرتا ہو وہ کیا ہو سکتا ہے؟"

"کبھی میرا حال بھی آج آخری دن ہے۔ ملیر سوچا کہ تم سے مل لوں۔"

اس نے تعجب کر میرا ہاتھ تھام لیا۔ "ملیر الیاس کہاں ہیں؟ ہم اس ریسٹوران میں آئے۔ اس نے جھوٹ سے نقاب ہٹایا تھا۔ دیئر آپ تھیں پہلے ہی بھگتی تھی اب پھر اسی کے پیچھے لگ گئے۔ دیئر اتو اس نے چہرہ نیچے کرلیا۔ میں نے ڈرنک اور چکن رینز منگوائی۔ رضوانہ نے منع کیا تھا۔ میرا بھی موڈ نہیں تھا مگر یہاں بیٹھنے کا کچھ جواز چاہیے تھا۔ وہ روتی رہی اور میں اسے حوصلہ دلاسا دیتا رہا۔ کولڈ ڈرنک اور چیزیں آئیں اور ایسے ہی پڑی رہیں۔ پھر رضوانہ نے کہا۔ "مجھے جاتی بھائی کے پاس نہیں جانا میں اس کی منت کرلوں گی۔"

میں نے دو ٹوک انکار کردیا۔ "وہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ تم وہاں جاسکو اگر مجھے یقین ہوتا کہ جاتی بھائی تمہاری کہنے پر مجھے معاف کردے گا تب بھی نہیں جانے دیتا۔"

"ندیم کوئی راہ تو ہوگی۔ آپ اس سے بات کریں اسے کوئی پیشکش کردیں۔ اسے کہہ دیں کہ آپ فلموں میں کام کا فرض اتار دیں گے۔"

"اس نے مجھے جان بوجھ کر پھانسا ہے۔ وہ کہاں مانے گا۔" میرے لہجے میں مایوسی تھی۔

"جان کا کوئی بدلہ نہیں ہوتا ہے روپے کے ڈھیر بھی ہو سکتے ہیں۔"

رضوانہ کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "کولڈ ڈرنک ہوا ہی نہیں گرم سی چائے پیتے ہیں۔ چلو میں چل جاؤں گی۔"

"نہیں بس وین میں اور دیر ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔ ہم کولڈ ڈرنک ختم کرکے باہر آئے اور میں نے ایک رکشا روکا اور اسے اس کے گھر کے پاس اتارا وہ ابا خود ہی رکھنے میں روانہ ہوا مگر میرا رخ کارخانے کی طرف نہیں تھا۔ رضوانہ کی بات نے مجھے ایک خیال دیا تھا اور میں اس پر عمل کرنے جارہا تھا۔ جب ہم پکی آبادی کے پاس پہنچے تو سے

والے نے اندر جانے سے انکار کردیا۔ اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے وہیں اترنے اور کرایہ دینے کو کہا۔ میں نے کرایہ دیا اور پیدل روانہ ہوگیا۔ جاتی بھائی کا ٹھکانہ زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے گیٹ بجایا تو اندر سے اسی عورت کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"میں ہوں ذیلی بی۔" مجھے دیکھ کر اس نے دانت نکالے۔ "آج خود آگیا۔ اچھا ہوا ورنہ تمہیں لانا پڑتا۔ آج آخری دن ہے۔ قرض کا پیسہ۔"

ایک منٹ بعد میں جاتی بھائی کے سامنے تھا۔ وہ ٹی وی پر ایک واہیات سی فلم دیکھ رہا تھا۔ یہ کوئی بیالیس اڑتالیس سال کا بدہیئت سا شخص تھا۔ جاتی بھائی میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ "کیا لایا ہے؟"

"جانی جان۔" میں نے کہا تو جاتی بھائی نے ریموٹ سے ٹی وی بند کرکے اور میری طرف متوجہ ہوگیا۔ "خود مرنے آگیا ہے؟"

"ہاں آدمی موت سے بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے۔" "یہ تو نے ٹھیک کہا ہے۔" جاتی بھائی نے ہنتول اٹھا لیا۔ "اس لیے میں چاہوں گا تجھے تکلیف نہ ہو اس ایک گولی لگے اور تو ختم ہو جائے۔"

دو پوری تیمیز کی سے کھیرہ رہا تھا اور میں لرز گیا۔ "جاتی بھائی تمہیں میری جان ملے گی مگر تم کچھ نہیں ملے گی۔ میرے پاس تم سے کام کی ایک چیز ہے جو ادا کرنے کے لیے۔"

"کیا چیز ہے؟"

"میں بتاتا ہوں لیکن پہلے تم وعدہ کرو کہ اگر وہ تمہارے کام کی ہوئی تو مجھے معاف کردو گے اور پھر کبھی مجھے نہیں مجبور کرے۔"

جاتی بھائی آگے جھکا اور سرد لہجے میں بولا۔ "منظور ہے پر کوئی چالاکی ہوئی تو ایک گولی سر میں نہیں ملے گی۔ کم سے کم تین گولیاں ماروں گا اور تو پھر بھی فوری نہیں مرے گا۔ بہت اذیت سے مرے گا۔"

میں نے سر ہلایا اور اسے بتانے لگا۔ وہ غور سے سن رہا تھا۔ جب میں نے بات ختم کی تو اس نے دل پھینکی سے کہا۔ "مجھے یقین ہے وہ مان جائیں گے؟"

"بالکل مانے گی میں انہیں جانتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر نہ مانے تو ظاہر ہے تم مجھے پکڑ لو گے۔"

وہ کچھ سوچ رہا تھا اور پھر سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے..... اگر جاتی بھائی مجھے مرتا دیکھ نہیں چاہتے۔ بس اپنی زندگی

جام درک Jam Durrak
اطہار ہیں صدی کے بلوچی شاعر۔ ذوقی تعلیے سے تعلق رکھتا تھا۔ میر نصیر خان نکسر والی ریاست (1750ء تا 1795ء) کا ملک الشعرا تھا۔ اس نے نہ صرف فوجی کمانیوں کو منظم کیا بلکہ بلوچی شاعری میں تغزل کو معراج تک پہنچایا۔ اس کی زبان، تشبیہات اور استعارات عالمتاً بلوچی ہیں۔ اس نے عرب اور ایران کی روایاتوں، مثلی بحثوں اور شیریں فرہاد کو بلوچی نظم میں ایسے گلدار کیا کہ یہ کردار بلوچی معلوم ہونے لگے۔ اس کی مشہور ترین نظمیں مجبور کی پریاں اور مسل کرتی عورتیں ہیں۔
مرسلہ: نازش خیاز۔ کراچی

جہاز کرالنٹ ٹرک جا چکا تھا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی میں نے بائیک گھمائی اور قالف بہت میں روانہ ہو گیا۔ میں نے آج بھی بارنگ شفٹ نہیں لی تھی۔ شام کی شفٹ میں گیا تھا۔ اگلی رات شفٹ کر کے نکلا تھا کہ چاچی بھائی کے اسی گرگے نے روک لیا۔ جو پہلی سرخ بھے نے لیا تھا تھم آج وہ اکیلا تھا۔ اس نے کہا۔ "چاچی بھائی نے بلایا ہے ابھی۔"

میں اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ میں منٹ بعد چاچی بھائی کے سامنے تھا حسب معمول ناش کروا رہا تھا یہ وقت شاید ناش کے لیے مخصوص تھا۔ برابر میں تپائی پر ایک کھلے برائف کیس میں نوٹوں کی گڈیاں جگمگا رہی تھیں اور یہ خاصی رقم تھی۔ دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ چاچی بھائی نے سر گھما کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "دس نہیں لے لے پینسٹھ لاکھ ہیں۔ پچاس مانگے تھے میں نے کنٹینر سے زیادہ اسے راز گھلنے کی فکر تھی۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یعنی میں اب آزاد ہوں۔"

"ہاں اور اس میں سے جتنی چاہے رقم لے لے۔"

میں نے ایک نظر کھلے برائف کیس کو دیکھا اور پھر بولا۔ "چاچی بھائی تمہارا شکریہ اور بہت بہت مہربانی کہ تم نے مجھے آزاد کر دیا ہے۔ رقم کے لیے بھی معافی دو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "روح ہو جا اور زبان بند رکھنے گا تو سب ٹھیک رہے گا ورنہ....."

"میں سمجھتا ہوں چاچی بھائی۔" میں نے کہا اور وہاں سے ہمیشہ کے لیے نکل آیا۔ قارئین شاید حیران ہوں کہ جب میں نے پہلے چاچی بھائی کو اغوا کیا تھا تو اب خود اسے کیوں پیشکش کی۔ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو میری زندگی پر تلی ہوئی تھی اور جب جان خطرے میں ہو تو حرام بھی حلال ہو جاتا ہے۔ دوسرے جب میرے کارخانے کے مالکان دوسروں کو دھوکا دے رہے تھے تو میں نے ان کو دھوکا دینا برا نہیں سمجھا۔ گھر آ کر میں نے شکرانے کے نفل پڑھے اور واپسی حیران تھے کہ یہ میں کون سی نماز پڑھ رہا ہوں۔ اگلے دن میں پھر رضوانہ کے کالج کے باہر موجود تھا۔ میرے بتانے سے پہلے وہ سمجھ گئی تھی۔ جب ہم ریستوران میں بیٹھے تھے تو اس بار اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ میں نے اس سے کہا۔ "رضو میں اب یہیں جلد از جلد اپنے گھر لے جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میرا مکان کرائے کا ہے اور میری تنخواہ بھی زیادہ نہیں ہے۔"

وہ شرمائی۔ "یہ تو امی سے کرنے والی بات ہے۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے تو میرے لیے آپ کے ساتھ سے بڑھ کر بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"کیا؟"

"کچھ گھریلو چیزیں تو مکمل کرنے دیں گے نا۔ آخر بچی دو خوش نصیبیاں لی ہیں۔"

"دوسری کون سی؟"

"میرا پہلا کام پارٹ ون کوالیفائی آ گیا ہے اور میری سیٹنگ سیون پر سیٹ آئی ہے۔"

"مبارک ہو تو مصطفیٰ الاکبس ہے۔"

"گھر آئیں گے تو ملاؤں گی۔" اس نے بچوں جیسا خوشی سے کہا تھا۔

ایک سال بعد وہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی میں آ گئی۔ میں نے شادی کے دو سال بعد اس جگہ سے ملازمت چھوڑ دی کیونکہ مجھے گورنمنٹ کی نوکری مل گئی تھی۔ دو سال گزر چکے تھے کہ تنخواہ اچھی تھی کہ میں نے دو سال میں ایک گھر بنا لیا تھا۔ رضوانہ اور امی کا دل بہلانے کو ایک عدد بچی آ گئی تھی۔ مجھے ہر دو سال کا ٹکٹ ملا اور اس کے علاوہ بھی ہر چھے دو ماہ بعد میں کہیں نہ کہیں جاتا رہتا تھا۔ میں نے اس کے لیے ایک بہت اچھی جاب تلاش کر لی تھی۔ وہ بس اسی کا انتظار کر رہے تھے مجھے دیکھا اور سکون سے دنیا سے گزر گئے تھے۔ رضوانہ نے بچی کی طرح ان کی خدمت کی تھی۔ تو ہاں اے سائبان بن کر میری ہر ممکن اس کی حفاظت کی تھی۔ وہ نرس تھی۔ اکیلی عورت کا جہان کے ساتھ رہنا بہت مشکل ہے۔

بچی کے بعد ایک بیٹا ہوا اور اب ایک بیٹا اور تو میں نے اپنا کے نام پر اس کا نام قیصر رکھا۔ کہا ہے کچھ بگڑ بگڑ ملا تھا اور میں نے یہاں کوریئن گاڑیوں کی مرمت کی ورکشاپ کھول لی۔ ورکشاپ ڈیسنٹ سی ہے کافی نفع ہے اور اللہ کا فضل ہے۔ چند دن پہلے ہی وہی اور اخبار میں چاچی بھائی کے حوالے سے خبر آئی تھی کہ وہ ڈان بائز کرنے والے اداروں کے ساتھ مقابلے میں چوراہے سمیت مارا گیا ہے۔ اسے بھولا بھی نہیں تھا۔ ان دنوں ہے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ مگر تو اپنا وہ دھمکی اور پورا کیا تھا۔ شاید اچھا ہی کیا تھا۔ مگر تو اپنا وہ دھمکی اور پورا کیا تھا۔ کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ میں نے سوچا کہ اب یہ کہانی ختم سامنے لے آؤں چاچی بھائی تو مرا ہوا نہیں تو زندگی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

علم عروض

مکرمی معراج رسول
آداب عرض

ایک اور صبح بیاتی ارسال کر رہا ہوں۔ یہ میرے واقف کار کے پیار کی داستان ہے۔ بہت ہی سادہ ہے۔ اس کی زندگی میں پیار نے کس طرح جھپ دکھایا آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ناظم بخاری
(لیاقت آباد)

اکیس دن میں نے اپنی فیس بک آئی ڈی آن کی تو تیس عدد فرینڈ ریکویسٹ بھی آئی ہوئی تھی۔ میں نے سب سے پہلے میسج دیکھے۔ ان میں سے ایک میسج ایک شاگرد نے عروض کے حوالے سے کیا تھا اور ایک کسی ٹیچر کی آئی ڈی سے اس کی ای میل آئی ڈی پر اپلوڈ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ میں نے اس میسج کو نظر انداز کیا اور شاگرد کے سوال کا جواب دینے کے اندر ٹیکسٹ میسج دیکھنے لگا۔ ان میں سے کچھ ٹیکسٹ میسجز دوستوں کی

پوسٹ کے حوالے سے تھے جو قارئین نے مجھے لیٹر کی شکل میں اور کچھ میرے گروپ کے حوالے سے تھے۔ آگے کے بڑھنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ میں ایک چھوٹا سوشل سائز اور انسانہ نگار ہوں۔ انسانہ نگار تو خیر آپ مجھے معمولی سمجھتے کہہ سکتے ہیں مگر شاعری پر میری گرفت، بقول میرے احباب کے بہت مضبوط ہے۔ وہ دیکھے بہت اچھا شاعر سمجھتے اور مانتے تھے اور میری پوسٹ کی گئی ہر غزل پر کہے گئے، دو سو سے تین سو تک کمنٹس، میرے لیے بہت اچھے سمجھنے کے لیے کافی ہوتے تھے کہ احباب میرا کلام کس درجہ قبول ہے اور پسند کیا جاتا ہے۔ نیں تک دو سو تک کے اتنے زیادہ کمنٹس، اتنی محبت میرے لیے وجہ افتخار تھی۔ اتنے زیادہ کمنٹس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نیس بک پر صرف میں ہی ایک اچھا اور برا شاعر تھا۔ نہیں، ایسا نہیں تھا۔ نیس بک پر مجھ سے بھی بڑے اور اچھے شاعر موجود تھے۔ مگر میری ہر پوسٹ پر اتنے زیادہ کمنٹس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں "آؤ عرض کریں" کا استاد تھا۔ میرے بے شمار شاگرد تھے اور "آؤ عرض کریں" کا نام لے کے میں نے اپنا ایک گروپ بنایا ہوا تھا، جہاں میں نئے اور پرانے شعراء کی جنہیں عرض سیکھنے کی ضرورت ہوتی، بغیر کسی لالچ اور معاوضے کے یہ علم سکھاتا تھا۔ یہ علم عرض کس چڑیا کا نام ہے، اس سے شاید کوئی عام فرد بالکل بھی واقف نہ ہو مگر شاعری کرنے اور سیکھنے والا فقرہ یا ہر فرد ہی اس سے واقف ہے۔

آپ کی معلومات کے لیے بتاتا چلوں کہ علم عرض ایک ایسے علم کا نام ہے جس سے آپ با وزن اور بے وزن شعروں میں با آسانی فرق کر سکتے ہیں۔ وزن، شاعری کی بنیادی شرائط میں سے پہلی شرط ہے۔ آپ کے کلام میں، باور کی خوبی ہو یا نہ ہو مگر اس میں وزن کی پابندی ضرور ہونی چاہیے۔ اگر آپ کا کلام وزن سے ہی خارج ہوگا تو اس کی نہ ساتذہ اور پڑھنے والوں کے ہاں کوئی اہمیت اور وقعت نہیں ہوگی۔ جس طرح حروفِ تہجی سے مل کر لفظ بنتے ہیں اور لفظوں سے مل کر جملے بنتے ہیں اسی طرح بحور "اسباب" سے ارکان بنتے ہیں اور ارکان سے بحریں بنتی ہیں۔ وزن کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کا کلام ایسی کسی نہ کسی مانوس اور مستعمل بحر میں ہونا چاہیے جو کہ اساتذہ کے ہاں مقبول ہیں۔ کسی بھی بحر میں کہا گیا کلام اپنا ایک تخصیص آہنگ اور روم و ہم رکھتا ہے، جسے مطلع سے لے کر مقطع تک پوری غزل میں تہ نظر رکھا جاتا ہے۔ یعنی جو وزن پہلے مصرع کا ہوگا وہی وزن پوری غزل کا ہونا چاہیے۔ اکثر نئے لکھنے والے اسی پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے ارکان، بحر، وزن کس شے کا نام ہوتا ہے، وہ ایسے نوزائیدہ بات کو لفظوں کا روپ تو دے سکتے ہیں مگر وہ صرف ایک نثر بن کر رہ جاتی ہے۔ شاعری کا روپ اختیار نہیں کر پاتی۔ کبھی میں بھی انہی مشکلات سے گزرا تھا جن سے اکثر نئے شعراء گزرتے ہیں۔ پھر میں نے محنت کی ایک اور استاد سے لگا کر عرض سیکھا۔ اور پھر اتنا سیکھا کہ اشاروں کا انداز ہو گیا۔ عروض کی مشکلات کو دور کرنے کے لیے میں نے اپنے گروپ کا تشکیل دیا تھا جس کا نام میں نے "آؤ عرض سیکھیں" رکھا اس گروپ کو احباب نے پسند بھی کیا سنہ شکریہ اور بہت سے عروض کے طالب علم وہاں عروض سیکھنے اور مجھے اپنی نیکیوں سے نوازنے لگے۔ مجھے گروپ کو بنائے چھ ماہ ہی عرصہ ہوا تھا۔ وہاں میں وزن کے علاوہ دوسرے موضوعات سخن (سخن کے عیب) کے بارے میں بھی دوستوں کو بتاتا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ عروض سے متعلق بھی بھی کچھ نہ کچھ یا کسی بھی قبیل کا وزن معلوم کیا جاتا تو میں اس کا بھی فوراً جواب دیتا۔ اس دن میں سارے تو نہیں مگر کچھ دیر کے لیے اپنے گروپ میں پہنچا ہی تھا کہ چاٹ کی صدا، ڈوبکی کا تانیہ آیا۔

"السلام علیکم ورحمۃ۔"

"وعلیکم السلام۔" میں نے جواب دیا۔

"سر! کیسے ہے آپ کو فرینڈ ریکویسٹ بھیجی گئی ہوئی ہے اگر ایکسیپٹ کر لیں تو نوازش ہوگی۔"

مجھے اپنا ایک ہی آئی ڈی فرینڈ ریکویسٹ کا بتایا تھا۔ ارادہ تھا کہ فرینڈشپ دیکھنے کے بعد اسے دیکھوں گا مگر پھر خیال میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ میں نے اسے فرینڈ میں شامل کرنے کے بعد ہائے میں اس کے متعلق جاننا چاہا وہاں مجھے کچھ خاص معلومات نہیں ملیں۔

پکچرز میں بھی صرف دو تین فوٹو تھے جو کہ گلاب کے پھولوں کے تھے۔ اس کی وال پر بھی مجھے کچھ خاص دیکھنے کو نہ ملا۔ میں نیس بک پر پچھلے تین سال سے تھا اور اس عرصے میں میں نیس بک کی دنیا کو اچھی طرح سے جان گیا تھا۔ یہاں جو لوگ بھی ہیں، جو بھی ہیں، ایسے ہی ہیں اور ویسے ہی ہیں جیسے وہ اپنی وال پر دکھتے ہیں۔ ایک بھی شے اور بھی کسی بھی آئی ڈی میں جا کر میری سوچ بدلا یا بڑھا نہیں کرتا ہے۔ ہر آئی ڈی کے بارے میں میرا اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ ایک بے بدل ہیں۔ اس کے

میں بھی یہی گمان ہوا کہ وہ ایک جعلی آئی ڈی ہے۔ وزنِ رنگل آئی ڈی والے خود کو وزن چھپا کر نہیں رکھتے۔ اسے دوستوں کی لسٹ میں شامل کرتے ہی اس کا نتیجہ آ گیا۔

"تھینک یو سر۔"

میں نے صرف مسکراتے پر اکتفا کیا۔ یعنی اسے مسکراتا ہوا ایک اسٹیکر بھیج دیا۔

"سر! مجھے شاعری پڑھنے کا جنون ہے۔ میں نے بہت سے شاعروں کو پڑھا بھی ہے اور ان کو پڑھ پڑھ کے کچھ کچھ سیکھا بھی ہے مگر جو شاعری کا شوق ہوا ہے کہ مر جب میں نے آپ کے گروپ کو جوائن کیا تو سوچا تھا کہ میرا سارا کلام غلط ہے۔ وزن سے ہے۔ کیسے ہے وزن سے؟ میں خود اس بات کو نہیں سمجھتی۔ کسی بھی احباب نے ان باتوں کو سمجھ کر کے بتایا کہ آپ کا کلام بے وزن ہے۔ آپ پلیز وزن سیکھ لیں۔ اگر آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کریں گے تو ممنون رہوں گی۔"

باتیں کیوں مجھے یقین ہو چلا کہ یہ فیک آئی ڈی ہے۔ طارق کے نام کا سہارا لے کر عروض سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے کہا۔

"پکھیں، اس طرح بات میں کسی کو سکھانا میرے بے بس نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی کو یہاں سکھا سکتا ہوں۔ میرے پاس وقت کی بہت کمی ہے۔ البتہ آپ میرے گروپ میں شامل ہو سکتی ہیں جو میں نے عروض سکھانے کے لیے بنایا ہے۔ وہاں آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ وہاں اور بھی بہت سے دوست سیکھ رہے ہیں، آپ بھی سیکھ سکتی ہیں۔"

باتیں اس نے میرے گروپ کا کنفرمڈ کیا تھا۔ اس لیے کہ نئے لوگوں کو ایڈمن کے بغیر کسی کو ایڈ نہیں کیا جاتا تھا۔

اس بات کو ابھی دو دن ہی ہوئے تھے کہ اگلے دن اس نے پھر میسج آ گیا۔ دعا سلام کے بعد اس نے اپنی ایک وال سینڈ کر دی۔

"سر! اگر اس کی اصلاح کر دیں تو آپ کی بہت نوازش ہوگی۔ اصل میں، آپ جانتے تو ہیں کہ مجھے شاعری کی..... مگن زبان کی اتنی کچھ پتا ہو نہیں ہے۔"

اس کا کلام، سرسری نظر سے دیکھنے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ صرف دو بے وزن ہے۔ بلکہ اس میں خیالات کی بھی کمی بھی تھی ہے۔ بہت سے شعراء کی طرح اس نے بھی کچھ شعر نکالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا۔

"پکھیں، میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ اس طرح

ایسا کس میں اصلاح کرنا میرے بے لیے ممکن نہیں ہے اور آپ کے کام کو اصلاح کی ضرورت ہے۔ میں بلک آپ کو وزن سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ہر آپ میرے گروپ میں جائیں۔ وہاں ہر پوسٹ کو مکمل سے دیکھیں سمجھیں اور اگر کوئی بات سمجھ نہ آئے تو بلا جھجک پوچھ لیں۔"

جواب میں اس نے ایک منہ چھپایا ہوا اسٹیکر سینڈ کیا اور اس کے کچھ دیر بعد لکھا۔

"پچھلے دو دنوں سے میں آپ کے گروپ میں ہی ہوں مگر وہاں ہر پوسٹ اسی طرح پڑھنے کے بعد بھی مجھے کسی شے کی سمجھ نہیں لگی۔ اور پھر سر عام، سب کے سامنے کچھ پوچھتے ہوئے مجھے اچھا بھی نہیں لگتا۔ اگر آپ مجھیں سکھا دیں تو ممنون رہوں گی۔"

"سوری میں پہلے ہی اس بارے میں عرض کر چکا ہوں۔"

"اچھا اب آپ ایک کام کریں۔ آپ معاوضہ یا فیس کر کچھ بھیجیں سکھانا شروع کر دیں۔ آپ جو فیس یا معاوضہ کہیں گے۔ وہ میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔"

اور وہ کچھ بھیجی، پھر اس کی اس بات نے مجھے یہ سوچنے پر ضرور مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس اور کچھ ہو یا نہ ہو، کم سے کم فیک نہیں ہے۔ اگر وہ فیک ہوتی تو مجھے اس طرح فیس دینے کی بات نہ کرتی۔ میں نے جواباً کہا۔

"دیکھیں، بھئی پیسا نہیں چاہتا اور دوسرا میں فیس لے کر سکھانے کے حق میں بھی نہیں ہوں۔ میں دن میں نے یہ علم سیکھا تھا اسی دن میں نے دل میں ارادہ باندھ لیا تھا کہ میں جتنے بھی یہ علم سکھاؤں گا۔ بغیر کسی لالچ اور پیسے کے سکھاؤں گا اور میں آج تک اپنی اس بات پر قائم ہوں۔....."

اس نے مجھے مجھے ہوئے چہرے جیسا ایک اور اسٹیکر سینڈ کیا۔

"اس کا مطلب ہے آپ یہاں نہیں سکھائیں گے؟"

"میں اپنی مجبوری بتا چکا ہوں۔"

"چلیں تو ایک اور کام کر دیں، پلیز۔ اپنا موبائل نمبر دے دیں مجھے۔"

میں اس کی بات پر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کچھ سوچ کر لکھا۔

"اگر آپ عرض کے حوالے سے رابطہ کرنا چاہتی ہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ میری عرض کی دنیا صرف نیس بک تک ہی محدود ہے۔ معذرت خواہ ہوں، میں آپ کو اپنا نمبر نہیں

دے سکتا۔"

اس نے مجھے ویسے ہی بیسیوں دوچار اسٹیکر مزید سینڈ کیے اور پھر لیس بک سے آف ہوگئی۔

میں اپنے گروپ میں چلا گیا۔ تین دن بعد مجھے اپنے موبائل پر کسی انجانی نمبر سے کال آئی۔

"السلام علیکم سر!" میرے کانوں سے ایک لفظتی ہوئی آواز ٹکرائی۔

"وعلیکم السلام۔"

"سر! پہچانا آپ نے مجھے؟"

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ "سوری، مجھے یاد نہیں آ رہا۔"

دوسری طرف سے ہلکی سی آواز سنائی دی۔

"پہچان بھی کیسے سکتے ہیں؟ ہم موبائل پر ایک دوسرے سے پہلی بار مخاطب ہو رہے ہیں۔" میں صرف بات کر رہی ہوں۔ وہی صوف جس نے لیس بک پر آپ کا سر کھایا ہوا ہے۔ آپ نے تو اپنا نمبر نہیں دیا مگر دیکھیں، آخر دھونڈ ہی نکالا میں نے۔"

میرے دل میں اس کے ٹیلنٹ ہونے کا جو راز ہاسا شک تھا اس دن وہ بھی ختم ہو گیا۔ میں اپنی سوچ پر مسکرا کر رہ گیا۔ میں ایک اصل ہم اور شخصیت کو تیک سمجھتا رہا تھا۔ اصل میں اسے ان باکس عرض نہ سکھانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ مجھے شک ہی نہیں، یقین تھا کہ وہ ٹیک ہے اور اسی لیے میں نے اسے ٹال دیا تھا۔

اب اس کی سچائی کا پتا چلا تو میں یہ سوچنے کے لیے مجبور ہو گیا کہ اسے عرض سکھا دیا جائے یا نہیں۔

"سر! آواز آ رہی ہے؟" اس کی آواز مجھے خیالات کی دنیا سے صحیح لائی۔

"جی... جی آ رہی ہے۔"

"سر پلیز مجھے عرض سکھا دیں، میں آپ کی بہت ممنون رہوں گی۔ پلیز پلیز سر..... آپ نہیں تو کسی اور کو نہیں بھی دینے کو تیار ہوں۔"

میری ساعتوں سے اس کی آواز ٹکراتی رہی۔ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اسے عرض نہ سکھانے کی وجہ بتا دی۔ میری بات سن کر وہ بہت زور سے ہنسی۔

"اوہ مائی گاڈ..... آپ مجھے ٹیک سمجھتے اور اسی لیے نہیں سکھا رہے تھے مجھے؟"

"کیا لیس بک پر ایسا نہیں ہو رہا؟"

ملینا مسرت گشت

"جی، بالکل ہو رہا ہے۔ آپ اپنی جگہ ٹھیک تھے سر، تو آپ کا شک دور ہو گیا؟"

"جی بالکل، اسی لیے تو آپ سے دل کی بات کر دی۔"

"تو پھر آپ عرض سکھا رہے ہیں نا مجھے؟ دیکھیں پلیز اس بار انکار نہیں سمجھے گا، پلیز....." اس کے لہجے میں ایک التجا سی تھی۔

"جی ضرور، سکھاؤں گا اگر آپ کو واقعی شوق ہوا تو۔"

"اوہ..... یہ ہوئی نا بات۔ آپ نے میرا دل خوش کر دیا۔ شوق تو مجھے بہت زیادہ ہے اسی لیے تو یہ سب کر رہی ہوں۔ اچھا اب اپنی نیس بھی بتا دیں۔"

"دیکھیں، میں نے اس دن بھی آپ کو بتایا تھا کہ میں نہ کسی کو نیس دے کر سکھاتا ہوں اور نہ ہی سکھ سکتا ہوں۔ میں بغیر نیس کے آپ کو سکھا دوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر۔" اس کے لہجے میں ممنونیت تھی۔

"تو پھر کب اسٹارٹ کریں؟ آج سے؟"

میں نے ہاتھ روکھا۔ "آج تو خاتم نہیں ہے، کل سے شروع کرتے ہیں۔"

"نہیں ایک پرسنل نیس دے دیں، ابھی سیکھ لیں گے۔"

"جو حاتمی سمجھانے کی میں وہ میں آپ کو فون پر سمجھا دوں گا، باقی سبق نیس بک پر سینڈ کر دیا کروں گا۔ دراصل حل کرنے کے لیس ایک پر ان باکس کر دیا کیجیے تبھی دیکھ کر اس کا حل بتا دوں گا۔ اس میں جو کمی بیشی ہوگی اس پر بعد میں بات کر لیں گے ہم۔"

"اوکے سر فیئر بک پر ہی ملے گا۔"

"اچھا، اب اجازت دیں، بقیہ تھوڑا بہت کل تفصیل سے بات ہوگی آپ سے..... اللہ حافظ۔"

"اوکے سر اللہ حافظ۔"

اس سے بات کرنے کے بعد میری کچھ عجیب سی کیفیت تھی۔ مجھے اچھا لگا تھا۔ کچھ ہلکا ہلکا، خوبصورت سا احساس ہوا تھا۔ میں اپنی اس کیفیت پر خود ہی مسکرا دیا۔ ایک بات تو طے تھی کہ اس کی آواز بہت خوبصورت تھی۔ سلجھی ہوئی، وہ خود بھی کافی اور پڑھی لکھی لگتی تھی۔ اس کی شکل کیسی ہے مجھے پتا نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چوبیس پچیس سال کی ہوگی۔ اگلے دن اس کی کال آئی تو ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں کافی کچھ پتا چلا۔ اس نے وہ لیس بک پر جو پوچھا۔

"سر اگر برا نہ مانیں تو میں آپ کی ایج پوچھ سکتی ہوں؟"

"آپ نے میری آئی ڈی نہیں دیکھی؟"

"دیکھی ہے، پر اس میں تو لکھا ہے کہ آپ صرف چوبیس سال کے ہیں۔ میں اس بات پر یقین نہیں کر پائی کہ آپ ایج میں چوبیس برس کے ہیں۔ مجھے ڈاؤٹ ہے اس بات پر۔"

"میں اب کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہی سچ ہے کہ میں چوبیس برس کا ہوں۔"

"مجھے اب بھی یقین نہیں ہو رہا۔ آپ علم عرض کے اتنے استاد ہیں۔ اتنی کم عمر میں آپ نے یہ علم کیسے حاصل کر لیا؟"

"اگر انسان محنت کرے تو کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ ویسے یہ علم اتنا مشکل نہیں ہے جتنا لوگوں نے اسے سمجھا ہوا ہے۔ میں نے صرف تین ماہ میں یہ سارا علم سیکھا تھا۔"

"صرف تین ماہ میں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"آپ کمال ہیں سر! سچ میں کمال ہیں۔" اس کے لہجے میں ستائش تھی۔ "سر! ویسے میں کتنے عرصے تک یہ علم سیکھ پاؤں گی؟" اس کے لہجے میں بچوں کا سا اشتیاق تھا۔

"زیادہ عرصہ نہیں لگے گا، دو سے تین ماہ میں آپ سیکھ جائیں گی۔"

"سچ میں؟"

"جی بالکل۔"

"وہ خوش ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"اب میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی ضرور پوچھیں۔"

"آپ کی ایج کتنی ہے؟"

"ہنس مکھ سا ہے سر!"

"کس شہر میں رہتی ہیں؟"

وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی اور پھر کہا۔ "میں..... آپ کے علاقے ہی کی ہوں۔"

مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا۔

"آپ پنڈی میں رہتی ہیں؟"

"جی سر۔"

"کہاں پر؟"

"صدر میں۔"

"اچھا کیوں اس بات پر سر اتنا خوش ہو گیا تھا۔ "اچھی بات ہے۔"

میں نے بمشکل اپنے جذبات چھپائے۔

"آپ باؤس وائف ہیں؟"

میری اس بات پر وہ زور سے ہنسی۔ "آپ کا دل کیا کہتا ہے؟"

"میرا دل..... اسے چھوڑیں، وہ تو پاگل ہے۔"

"پھر بھی، آپ کچھ اندازہ تو لگائیں۔"

"آپ باؤس وائف لگتی ہیں۔"

میں نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔ وہ میرے لہجے کی شرارت کو بھانپ گئی۔

"جی نہیں..... آپ کا انداز غلط ہے۔ اصل تو بڑی آپی کی شادی نہیں ہوئی، میری کہاں سے ہو گئی ہوگی؟"

میں بنسا۔ "میں مذاق کر رہا تھا۔"

"میں سمجھ گئی تھی۔"

"اچھا آپ کے والد صاحب کیا کرتے ہیں؟" میں نے ایک اور سوال پوچھا۔

"وہ ایک بینک میں منیجر ہیں۔"

"ماشاء اللہ..... اللہ ابھی اور عروج دے۔"

"سر! آپ کیا کرتے ہیں؟"

اس بار اس نے سوال کیا۔

"میں ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہوں۔"

"ویری گڈ..... تو بہت اچھا اور سلجھا ہوا کام ہے۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"اچھا سر! اب عرض اسٹارٹ کریں؟" کافی باتوں کے بعد وہ اصل بات پر آ گئی۔

مجھے بھی احساس ہوا کہ ہم نے فضول میں کافی وقت گنوا دیا ہے۔ جس مقصد کے تحت اس نے مجھ سے رابطہ کیا تھا، اس کی تو ابھی ہم نے ابتدا بھی نہیں کی تھی۔

"جی بالکل۔"

"تو بتائیں سر۔"

"دیکھیں، سب سے پہلے تو آپ کو تمام لفظوں میں متحرک اور ساکن حروف کی پہچان کرنا ہوگی۔ آپ اس میں کامیاب ہو گئیں تو ہم اس کے بعد آگے بڑھیں گے۔"

"تھنک..... کیسے؟"

"دیکھیں، مثال کے طور پر، ہم ایک تین حرفی لفظ شام لیتے ہیں۔ اس میں تین متحرک یا الف اور ہم ساکن ہیں۔"

"جی بالکل۔"

"آپ ایک اور لفظ لیتے ہیں۔ مثلاً قہم..... اس میں قاف اور لام شوشے ہیں اور سمجھ سکا ہیں۔"

"جی آپ کی بات ابھی طرح سمجھ آ گئی ہے مجھے۔"

"یہاں..... اب مزید کچھ آپ کو سمجھانا تھوڑا مشکل ہوگا۔ میں ایسا کرتا ہوں، آپ کو نیس بک پر پہلا سبق سینڈ کرتا ہوں۔ آپ اسے ایک دو بار سمجھ سے پڑھیں اور پھر اسے حل کر کے مجھے دکھائیں۔ جب تک آپ پہلا سبق حل نہیں کر لیں گے، تب تک دوسرا سبق نہیں پڑھیں گے۔"

"جی سر بالکل، آپ کہہ رہے تو آپ سبق ابھی سینڈ کر دیں نیس بک پر، میں اسے حل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"میں ابھی سینڈ کرتا ہوں۔"

میں نے نیس بک آن کی اور اپنے موبائل میں بھی کیے ہوئے اسائنمنٹ میں سے پہلا سبق اسے سینڈ کر دیا۔ وہ بھی اسی وقت آن لائن ہو گئی تھی۔ میں نے سبق سینڈ کرنے کے بعد نوٹیفکیشن دیکھے اور پھر اپنے گروپ میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد مجھے صدف کا میسج موصول ہوا۔

"سر میں نے اپنی طرف سے درست سبق حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھیں، اس میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں۔"

میں نے میری توقع سے پہلے ہی سبق حل کر لیا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی میں کا سبق ناقابلِ تصور درست تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بہت جلد عروض سیکھ جائے گی۔ اس نے کامیابی سے کامیابی کی طرف پہلا قدم بڑھا لیا تھا۔

"بہت خوشی ہو رہی ہے کہ آپ نے تمام جواب درست دیے ہیں۔ صرف ردیف کی کوآپ نے تحریف لکھا ہے یہ تحریف نہیں، ساکن ہے۔"

"او سوری، شاید جلدی میں غلطی ہو گئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ آپ مجموعی طور پر اس سبق میں کامیاب رہی ہیں۔"

"تو دوسرا سبق اسائنمنٹ کریں؟"

اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔ میں اس کی بے تابی پر مسکرا دیا۔

"دیکھیں، ہم روزانہ ایک سبق پڑھیں گے اور حل کریں گے۔ آپ نے پہلا سبق حل کر لیا بہت اچھا کیا، آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ دوسرا سبق کل ملے گا آپ کو۔ اب دھیرے دھیرے آگے بڑھیں گے۔"

جواب میں اس نے پہلے تو مدہ سوجا اور انگیجر سینڈ کیا،

پھر مسکرانا ہوا۔ جواباً میں نے بھی اسے اسی جیسا مسکراتا ہوا اسٹیکر سینڈ کر دیا۔

"آپ تھوڑا گروپ کو بھی وقت دیں۔ اس کی مسلسل کوچنگ میں۔ آپ کو کافی فائدہ ہوگا۔"

"جی ضرور سر۔ ویسے آپ کے بے شمار فین ہیں اب گروپ میں جانی راجی ہوں اور وہاں پوسٹ کیا گیا کلام پڑھتی رہتی ہوں۔ میں خاص کر آپ کا اصلاح کیا ہوا کلام لیے جایا کرتی ہوں۔ کیسی بار یک سے بار یک غلطی بھی نہیں لیتے ہیں آپ۔ میں تو دنگ رہ جاتی ہوں آپ کا اصلاحی ہنر پڑھ کر قسم سے مزہ آ جاتا ہے۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"اگر آپ کے تحت جاری رہگی تو ایک دن مجھے بھی آگے نکل جانا ہے کیا؟"

"اف..... کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میں آپ کے قدموں تک بھی نہ پہنچ سکوں، اتنا کافی ہے۔"

"دیکھیں، ایسی باتیں کر کے آپ مجھے شرمسار مت کریں۔ آپ نمونہ و میعار ہیں، جو میں پانا چاہتی ہوں۔ قابلِ اسی طرح خوش اور گمن سے سیکھتی رہیں۔ آپ بہت آگے جائیں گی۔"

"بہت شکریہ سر! اگر آپ کا ساتھ رہا تو انشاء اللہ ضرور آگے تک جاؤں گی۔ اچھا سر مجھے موبائل پر بات کرنے میں ابھی امی بلا رہی ہیں، نیس بک آف کرنی پڑے گی۔ اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

اگلے دن وہ اس بحر میں ایک غزل لکھ کر لائی تھی مگر صرف ایک مصرعہ ہی بے وزن تھا۔ اس نے فقط ایک ہی لفظ متحرک کیا تھا جب کہ یہ ساکن تھی۔

میں نے اس کی غلطی کی نشاندہی کی اور اسے کہا۔ "دیکھیں درست لفظ اس طرح باندھنا چاہیے۔ جس طرح اس کی اصل ہے جیسے وہ پڑھا جاتا ہے۔ بالی آپ نے خوب لکھا ہے اس کے لیے بہت سی داد..... زبان کے حوالے سے آپ کا کلام بھرپور ہے البتہ میں اس کے علاوہ آپ کے کلام میں کچھ اور خامیاں ضرور موجود ہیں جن کے بارے میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ جب آپ ساری بحروں کا وزن تول جائیں گی۔"

"جی ہتر سر۔"

میں نے اس سے، اس بحر میں ایک دو اور غزلیں

لکھوائیں جو اس نے ٹھیک لکھیں۔ اگلے دن میں اسے "بحر متدارک" کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ اس بحر میں بھی اس نے شروع میں ایک دو غلطیاں کیں اور پھر اس بحر کا آہنگ اور وزن بھی اس کی سمجھ میں آ گیا اور وہ اس بحر میں بھی مزے مزے کی غزلیں لکھنے لگی۔

عروض کے حوالے سے یہ دوسری کامیابی تھی جو اس نے حاصل کی تھی۔ میں اسے اگلے دن "بحر رمل" کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔

یہ بحر بھی وہ سیکھ گئی تو میں نے اسے ایک اور بحر سے آشنا کیا۔ وہ بھی جیسے تیسی بحریں سیکھتی جا رہی تھی اور ان میں غزلیں کہتی جا رہی تھی۔ ایسے میرا دل خوش ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے یقین کر لیا تھا کہ ایک دن وہ ضرور اپنا نام بانوں اور مستقل بحروں میں لکھنے لگے گی۔

کہ میرے اس یقین کی دیوار میں دراڑ اس دن پڑی جس دن وہ چار آسان بحروں کے بعد مشکل بحروں کی باری آئی اور میں نے اسے اس بارے میں سمجھایا۔ اس دن میں نے اسے اس بحر کے بارے میں ہر طرح سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا مگر اسے وہ سمجھ کر بھی نہ سمجھ سکی۔ بحر کا آہنگ کسی طور سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ جب آدھے گھنٹے تک سمجھانے کے باوجود بھی وہ اس بحر کا آہنگ نہیں سمجھ سکی اور اس بحر میں ایک بھی درست مصرعہ نہیں لکھ سکی تو اچانک ہی مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اسی وقت موبائل نکالا اور اس کا نمبر ڈائل کر دیا۔

کال ہونے پر تیسری بیل پر اس نے میرا پھٹ پڑا۔

"آپ کا دماغ کہاں غائب ہے؟ میں نے آپ کو سمجھایا نہیں، آپ کی سمجھ میں کچھ آتا ہے۔ جتنے آسان طریقے سے میں نے آپ کو سمجھایا ہے اگر آپ کی جگہ کوئی مقفل سے جاہل انسان بھی ہوتا تو وہ بھی اس بحر کے آہنگ کو سمجھ کر اس وزن میں مصرعے لکھ لیتا اور ایک آپ ہیں کہ....."

"سر میں واقعی بہت پریشر محسوس ہو رہا ہوں شاید اس لیے اگر بحر کا آہنگ سمجھ نہیں پا رہی۔"

اس سے زیادہ سننے کی میں کہاں اور پھر سسک سسک کر رونے کی آواز کیوں نہ سنتا۔ میں گھبرا گیا۔

مجھے اچانک ہی احساس ہوا کہ میں اس کے ساتھ کچھ زیادتی کر رہا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے اپنی کن پٹاخوں میں آگ لگانا ہی تھا کہ....."

"سر اسے..... ایم سوری بھی، ایم سوری سو۔"

ملبنا مصر گزشت

پریشان ہیں۔ ورنہ میں آپ سے اس طرح بات نہیں کرتا۔"

"تصور آپ کا ہے میرے سر پر۔ اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی ایسی کوتاہی کرتا۔ نیس آج کل جاہی طور پر اتنی پریشان ہوں کہ آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔" اس نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا پرابلم ہے آپ کو؟ مجھے بتائیں، میں شاید آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔"

"کچھ کی مدد کر سکتے ہیں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔" اس کے لہجے میں شدید بے بسی تھی۔

"مجھے ایک دو دن کی رخصت دیں سر جب ذہنی طور پر فٹ ہو جاؤں گی تو پھر ہی کچھ سیکھ پاؤں گی ورنہ اس طرح بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے آپ ایکسپٹ دو دن آرام کریں جب آپ کا ذہن پر سکون ہو جائے تو آپ سیکھیے گا۔"

"جی اللہ الحمد..... ٹھینک یو..... اللہ حافظ۔"

"اللہ حافظ۔"

دو دن کی بجائے چار دن گزر گئے۔

نہ ہی صدف ان چار دنوں میں نیس بک پر آئی تھی اور نہ ہی اس نے موبائل پر مجھ سے رابطہ کیا تھا اور ایک میں تھا کہ جو پچھلے کئی دنوں سے صدف کا اس کی آواز کا اور اس کی کال کا عادی ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے ایک ایسا خیال آیا کہ میں اپنے اس خیال پر مچل اٹھا۔ ایک سوچ نے اشعور کا سہارا لے کر سر گوشی کی۔

"میں صدف کو چاہنے لگا ہوں، مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔"

مجھے نہیں معلوم کہ میری اس سوچ میں صداقت تھی یا نہیں مگر میں اپنی اس سوچ پر تصحیح ضرور اٹھا تھا۔ میں نے کوشش کی تھی کہ میں اپنی اس سوچ کو جھٹلا دوں اور اگر میرے دل میں سچ میں کوئی ایسا جذبہ ہے اور وہ پنپ رہا ہے تو اسے اپنے دل سے کھرچ پھینکوں، مگر..... تین چار دن تو میں اپنی اس سوچ سے لڑتا رہا۔ جب میں کامیاب نہیں ہو سکا تو میں نے فلکت مان کر اس سوچ کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ یہ بات تسلیم کر کے گزرے ہوئے شب و روز میں کسی دن وہ "مخلتی ہوئی آواز والی لڑکی" چپکے سے میرے دل میں اتر گئی ہے اور مجھے پتا بھی نہیں چلا۔ اس سچائی کا احساس اور ادراک ہوتے ہی میں اور بے چین ہو گیا تھا۔ آٹھ دن ہونے کو آئے تھے اور صدف کا مجھ سے

رابطہ منقطع تھا اور میرا دل تھا کہ اس کی آواز سننے کو مچل رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا لوں مگر میں اس میں زیادہ دیر تک کامیاب نہ ہوسکا۔

اس دن میں نے اپنا موبائل نکالا اور صدف کا نمبر ڈائل کردیا۔

کال ریسیو ہوتے ہی مجھے اس کی بجھی بجھی سی آواز سنائی دی۔ یوں، جیسے اس کی آواز کی دلکشی کسی نے چھین لی ہو۔

”السلام علیکم سر۔“

”وعلیکم السلام، کیسی ہو صدف؟“

”جی اچھی ہوں۔“

”مگر مجھے تو ایسا نہیں لگ رہا۔“ میں نے اس کے لہجے سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ میں انتظار کرتا رہا کہ وہ کچھ بولے گی مگر کافی دیر گزرنے کے بعد بھی وہ چپ رہی تو میں نے اسے مخاطب کیا۔ ”کیا بات ہے صدف! خاموش کیوں ہوگئی ہو؟“

”جب کہنے کو کچھ نہ ہو تو خاموش ہی ہونا پڑتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“ اچانک اس کی آواز بھیگ گئی۔

”آپ رو رہی ہیں؟“

”نہیں سر۔“

مجھے صاف پتا چل گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

اس کے لہجے میں نمی کا احساس ہوتے ہی میرا دل بے چین ہوگیا۔

یقیناً اسے کوئی پریشانی تھی۔ کوئی بڑی پریشانی تھی جسے وہ پوری کوشش کرکے چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔

میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی پریشانی کو فوراً دور کردیتا۔ ”دیکھیں صدف! مجھے صاف محسوس ہورہا ہے کہ آپ کو کوئی بڑی پریشانی لاحق ہے۔ اگر سچ میں ایسی کوئی بات ہے اور آپ مجھے اپنا سمجھتی ہیں تو پلیز بتائیں مجھے۔ میں آپ کی پریشانی حل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہی اور پھر بولی۔ ”اچھا سر، موبائل کی بیٹری لو ہے پھر بات ہوگی آپ سے۔ آج میں فیس بک پر آپ کے لیے ایک میسج چھوڑوں گی۔ شاید میں اس میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کرسکوں، خدا حافظ۔“

اس کے ساتھ ہی اس کی کال منقطع ہوگئی۔ میری بے چینی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس وقت دن کے دو بجے تھے، میں ایک گھنٹے بعد فیس بک پر گیا تو وہاں صدف کا کوئی میسج نہیں آیا تھا۔ میں پھر ایک گھنٹے بعد گیا تو وہاں نہ ہی صدف تھی نہ ہی اس کا میسج۔ اس کا موبائل بھی آف جارہا تھا۔ میں ... تو تھا، ایک ایک گھنٹے بعد فیس بک پر جاتا رہا مگر ... یہاں تک کہ رات کے دس بج گئے تھے۔ میرے سونے کا وقت ہوگیا تھا۔ میں مایوس ہوکر فیس بک آف کرہی رہا تھا کہ ... اسی وقت صدف کا ایک طویل میسج موصول ہوا تھا۔ اس نے سلام کے بعد لکھا تھا۔

”مجھے لگتا ہے سر، شاید ہماری جدائی کے دن قریب آگئے ہیں۔ آپ شاید میری بات کا یقین نہ کریں اور میں ... بھی نہیں کہ آپ یقین کریں مگر حقیقت یہی ہے کہ پچھلے کچھ دنوں میں جب سے میں نے آپ سے عروض سیکھنا شروع کیا ہے آپ پتا نہیں کب چپکے سے میرے دل میں آکر بیٹھ گئے۔ میں اپنی اس پسندیدگی کو احترام سے منسوب کرتی رہی مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ ہر لڑکی یا عورت کا کوئی نہ کوئی آئیڈیل ہوتا ہے میرا آئیڈیل آپ جیسی ہی کسی شخصیت کو ہونا تھا۔ ... نہیں میں کب آپ کو اپنا آئیڈیل سمجھنے لگی اور اگر بات یہیں تک ہی رہتی تو بھی ٹھیک تھا، پر کچھ دن بعد مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی اس آئیڈیل شخصیت سے محبت کرنے لگی ہوں، اسے چاہنے لگی ہوں۔“

میں نے اس سچائی کو کئی بار جھٹلانا چاہا مگر جھٹلا نہیں پائی۔ بالآخر مجھے یہ بات تسلیم کرنا ہی پڑی کہ میرے دل کو آپ کی سحر انگیز شخصیت نے تسخیر کرلیا ہے۔ معلوم نہیں آپ مجھے گری پڑی لڑکی سمجھیں یا کچھ اور مگر حقیقت یہی ہے جو میں آپ کو بتا رہی ہوں۔

میں نے پچھلے کچھ دنوں میں بہت کوشش کی کہ اپنے دل کی اس بات کو خود تک ہی محدود رکھوں مگر مجھے آپ کے خلوص اور محبت بھرے رویے نے یہ بات کہنے کے لیے مجبور کر ... ہے۔ اب کم سے کم مجھے اس بات کا افسوس نہیں رہے گا کہ ... آپ تک اپنے دل کی بات نہیں پہنچا سکی۔

اپنے دل کی بات خود تک محدود رکھنے میں، میں ... گئی تھی اور ذہنی طور پر کس قدر ڈسٹرب ہوگئی تھی اس بات کے آپ خود شاہد ہیں۔

صرف یہی وجہ تھی جو میرا ذہن ڈسٹرب تھا اور آپ کی پوری کوششوں کے باوجود بھی میں عروض میں آگے نہیں بڑھ پائی تھی۔

آپ کے اتنا مجبور کرنے پر ہی میں اپنے دل کی بات لفظوں کا روپ دے پائی ہوں۔ اب آپ کی مرضی ہے کہ اس سچائی کو تسلیم کریں یا انکار کردیں۔

بس مجھے اپنے تلخ یا شیریں جواب سے ضرور آگاہ کیجیے گا تاکہ میری خوش فہمیوں کا سلسلہ ختم ہوسکے۔ ورنہ مجھے یقین ہے آپ اتنا بھی نہیں کریں گے۔

ہمارے درمیان جو عروض کا سلسلہ چلا تھا مجھے یقین ہے اس کے اختتام کا وقت قریب آگیا ہے۔ اس دوران اگر میری کسی بات سے آپ کا دل دکھا ہو تو معافی چاہتی ہوں۔ خدا کے لیے معاف کردیجیے گا۔“

میں اس کا میسج پڑھ کے گم صم سا ہوکر رہ گیا تھا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ پریشان ہے مگر اسے یہ پریشانی لاحق ہے اس کا مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ صدف نے اپنے دل کی بات کہہ دی تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بھی پتا نہیں کب سے اسے دل ہی دل میں چاہنے لگا تھا۔

مجھے اکثر اس کا، اس کی کال کا بیتابی سے انتظار رہتا تھا۔ میرے دل نے کئی بار مجھے احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا ہوں مگر میں نے ہر بار اپنے دل کی اس بات کو جھٹلانے کی کوشش کی تھی۔ شاید مجھے یہ خوف لاحق ہوگیا تھا کہ اگر میں نے اپنے دل کی یہ بات درست مان لی اور صدف سے اپنے دل کی بات کہہ دی تو وہ کیا سوچے گی کہ ایک معروف شاعر، اور عروض کا استاد، وہ ایسی سوچ کا مالک ہے۔ اگر میں اس سے اپنے دل کی بات کہہ دیتا تو شاید اس کی نظروں سے بھی گر جاتا اور مجھے اس کی محبت بھی نہیں ملتی اور اس کے ساتھ اس سے وہ تعلق بھی ٹوٹ جاتا جو بنا ہوا تھا مگر اب، جب صدف نے خود محبت کا اظہار کیا تو مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں اس کی اس بات کا کیا جواب دوں۔

گو اس کا یہ میسج پڑھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا تھا مگر میں جلد بازی میں کوئی ایسی بات یا حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میں اس کی نظروں میں چھوٹا ہوجاتا۔ مجھے اس کی محبت کے بدلے محبت سے ہی جواب دینا تھا مگر مجھے سوچ سمجھ کر لفظوں کا انتخاب کرنا تھا۔ مجھے ایسی کوئی بات نہیں کرنی تھی جس سے عامیانہ پن جھلکتا ہو۔ بالآخر بہت سوچ سمجھ کر میں نے ایک چھوٹا سا مضمون لکھا۔ جس میں، میں نے دوسری باتیں لکھتے ہوئے اپنے دل کی بات بھی کہہ دی...... اور وہ میسج صدف کو سینڈ کردیا۔

قصہ مختصر، اس دن سے ہم دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے اور ہمارے درمیان تکلف کا جو پردہ تنا ہوا تھا وہ کسی حد تک چاک ہوگیا۔

ہماری ہر صبح کا آغاز ایک دوسرے کے گڈ مارننگ کے میسج سے ہوتا اور رات گڈ نائٹ کے میسج سے۔ ہمارے دن سہانے ہوگئے اور راتیں رنگین۔ زندگی اچانک بہت ہی خوبصورت ہوگئی تھی۔

وہ عروض جو ہم دونوں کو ملانے کا سبب بنا تھا ہم دونوں سے بہت دور چلا گیا اور اس کی ہمارے نزدیک کوئی وقعت نہ رہی۔

ہمیں جب جب فرصت ملتی، ہم ایک دوسرے سے بہت ساری پیار بھری باتیں کرتے اور ایک دوسرے کو اپنی اپنی پسند اور مشاغل کے بارے میں بتاتے۔

ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کافی حد تک جان گئے تھے۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں کافی کچھ بتایا تھا اور میں نے اسے اپنے بارے میں۔ میرے اصرار پر اس نے مجھے ان باکس میں اپنی دو چار اچھی اچھی تصویریں بھی سینڈ کیں جنہیں دیکھ کر میری محبت میں مزید اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ خوبصورت تھی، حسین تھی، سچ میں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

جس دن اس نے مجھے اپنی تصویریں سینڈ کی تھیں اس دن میں نے اس کی خوبصورتی پر لفظ چن چن کر ایک بہترین غزل تخلیق کی تھی اور اسے اس کے نام کرکے ان باکس میں سینڈ کردی تھی۔

اپنی ایسی تعریف پر وہ شرما گئی تھی۔

”کیا میں سچ مچ اتنی حسین ہوں؟“

اس نے پوچھا۔

”آئینہ تو روز دیکھتی ہوں، پر خود کو حسین تو نہیں دکھتی۔“

مجھے بے اختیار عدم کا ایک شعر یاد آگیا۔

”یہ آئینے ترے حسن کی کیا دید کریں گے
تو دیکھ مری آنکھ سے تو کتنا حسیں ہے“

اس نے شرما جانے والا ایک اور اسٹیکر سینڈ کیا۔

”ہمارا وہ عروض کا سلسلہ کہاں تک پہنچا تھا؟“

اسے اچانک ہی اس دن عروض یاد آگیا۔

”کیوں؟ یہ اچانک پھر عروض کا شوق کیوں چرانے لگا تمہیں؟ اس طرح سکون سے ٹھیک نہیں ہوگیا؟“

”اگر عروض سیکھوں گی تو وزن میں شاعری کرنا آئے گی ناں۔ ورنہ تو تمام عمر بے وزن شعر ہی کہتی رہوں گی۔“

"اس کی اب ضرورت نہیں ہے۔"

بس جو کام لکھنا تھا مجھے میسج کر دیا کرنا میں اس کی اصلاح کر دیا کروں گا۔"

"یعنی اب عروض میں مضاربہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے؟"

"نا بالکل نہیں۔"

"پلوجان پھولی۔"

میں اس کی بات پر مسکرا دیا۔

"تج پر چھیں تو عروض مجھے مذاب لگتا تھا۔ دو چار بحریں بھی، میں پتا نہیں کیسے سیکھ گئی تھی۔ اب آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

اس کے بعد وہ مجھے اپنی نئی نویلی پھولی غزلیں اور شعر روزانہ بھیجنے لگی تھی۔ جس کی میں اصلاح کر کے اسے پہلے سے بھی تیز بھیج دیتا تھا۔ وہ میری اصلاح دیکھ کر خوش ہو جاتی اور میں اس کی خوشی میں خوش ہو جاتا۔

کچھ دن بعد اس نے ایک نئی بات کی۔ "میں اپنی کتاب چھپوانا چاہتی ہوں۔"

مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی۔

"کیوں اس کی کیا ضرورت ہے؟"

وہ میری بات پر خفا ہو گئی۔ "ضرورت کیوں نہیں ہے؟ میں اتنا اچھا لکھتی ہوں میرا کلام دنیا کے سامنے آنا چاہیے اور دوسرا صاحب کتاب ہونا ایک اعزاز کی بات ہے کیا تجھے یہ اعزاز حاصل نہیں کرنا چاہیے؟"

"مگر ابھی تو چار ہی مہ۔۔۔"

"مگر کیا؟"

میں اسے حقیقت بتا کر اس کی خوشی اور اس کا دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میں اسے یہ نہ بتا سکا کہ صاحب کتاب ہر کسی انسان کو کوئی آسان کے تارے نہ توڑیں لاتا، نہ ہی دنیا اسے سر آنکھوں پر بٹھاتی ہے۔

میں خود دو کتابوں کا مصنف تھا۔ دونوں کتابیں اپنے ذاتی خرچے پر شائع کروائی تھیں مگر کیا ملا تھا مجھے؟ صرف آس پاس کی سستی شہرت اور بس کب تک دنیا۔ میں نے اس کا دل توڑنے کی بجائے کہا۔ "کتنی غزلیں ہو گئیں ہیں تمہاری؟"

"تیس ہو گئی ہیں۔"

"کتاب کے لیے کم سے کم بھی پچاس ساٹھ غزلیں ہونی چاہئیں۔"

"وہ میں کر لوں گی۔"

"کیسے؟"

"میں روزانہ دو دو، تین تین غزلیں لکھا کروں گی۔"

میں اسے یہ کچھ بھی نہ کہہ سکا کیوں کہ وہ روزانہ اس طرح اس کے بعد دو روز ایک دو دو، تین تین غزلیں لکھ کر بھیجتی رہی اور اس سے زیادہ لکھنے کے چکر میں وہ بہت محنت سے تیار کی گئی غزلوں میں ڈھالنے لگی تھی۔ ان غزلوں کی اصلاح کرنا میرا کام تھا۔ میں خود اسے اپنی طرف سے نئی غزل لکھ کر دینا چاہتا تھا مگر میں کسی قابل تو ہوتی۔

میں نے اس سے اس دن یہ بات کی تو اس نے کہا۔ "میں کیا کروں، مجھے جو تو جو بتاتا ہے، وہ لکھ کر بھیج دیتی ہوں۔ اس سے بہتر میں نہیں لکھ سکتی۔ ویسے آپ کی بہت سے لوگوں سے کہیں بہتر ہے آپ مجھے کسی غزل کو دے دیا کریں بہتر ہے گا۔"

مجھے اس کی بات معقول ہی لگی۔ میں نے اپنی ایک مثال دینے کے لیے یہ بات کی تھی اور اس نے کہہ دیا کہ ویسے مجھے اس کے کلام میں تبدیلی کرنے میں کوئی اعتراض کسی قسم کا تغافل نہیں تھا۔ کیوں کہ شاعری کسی کو ذہنی طور پر وہ اچھی ہو یا بری۔ اور ویسے بھی شاعری میرے لیے عسر کی بائیں ہاتھ کا کھیل تھی۔ دو کتابوں کی اشاعت کے درمیان سے گزرنے کے بعد، میرا دل اور کوئی کتاب شائع کرانے کا، جو کہ غزل ہو گی تو ہو گی، اور میرا زیادہ تر وقت دوسروں کو عروض سکھانے میں ہی بسر ہوتا تھا۔ اس دن بھی، میں روزانہ ایک غزل صرف اور صرف اس کو لکھ کر دے رہا تھا۔ بے وہ مجھے کبھی بھی گاہے بگاہے کرتی تھی جیسا اسے ہر مہینے پریشانی تھی، اس کی پریشانی ہی خوشی ہو جاتی۔ میری خوشی اس کی خوشی میں تھی۔ میری بھیجی ہوئی غزل پڑھ کر وہ میری اتنی تعریف کرتا کہ میرا دل خوش ہو جاتا۔

اگلے دن میں اس سے بہتر غزل تخلیق نہ کر پاتا۔ اگر کرتا۔

اگلے دو ماہ میں اتنا کلام جمع ہو گیا کہ اس کی کتاب بن ہو سکتی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں جلد ہی اس سے اس بارے بات کروں گا مگر میرے بات کرنے سے پہلے ہی ایک دن اس نے یہ بات چھیڑ دی تھی۔

"اسی غزلیں ہو گئی ہیں میرے پاس، اب تو کتاب شائع ہو سکتی ہے؟؟"

"ہاں ہو سکتی ہے۔"

"کیسے۔۔۔ مجھے بتا تو۔"

اس کی چٹکتی ہوئی آواز آئی۔

"تم نے پیسے سنبھال کر لیے ہیں کتاب کی اشاعت کے لیے؟"

"کی۔۔۔ کتاب شائع کرانے کے بھی پیسے لگتے ہیں؟"

میرا دل چاہا کہ میں اس کی سادگی پر کھل کر ہنسوں مگر میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ "جی ہاں اور اچھے خاصے لگتے ہیں۔"

"جو چاہے شاعری معیاری ہو یا غیر معیاری؟"

"غیر معیاری شاعری، اگر کسی کا دل ہو تو چل جاتی ہے ہر گزرا وہ غیر معیاری ہو تو پبلشرز اسے شائع ہی نہیں کرتے زیادہ کام اشاعت کے قابل اور مصنف کی پہلی کتاب ہو تو مثلاً کتنا خرچا آتا ہے ایک بک پر؟"

"یہ یار، نہیں تو کم سے کم پچاس ہزار تو آ ہی جاتا ہے۔"

اس کے لہجے میں بے یاد حیرت تھی۔

"جی ہاں، پچاس ہزار کے لگ بھگ خرچا ہو جاتا ہے۔"

ایک بک اس کی بھی بھی آواز سنائی دی۔

"پھر تو یہ خواب، خواب ہی رہ جائے گا۔ میں نے کیسے سوچ لیا کہ میری کتاب بھی شائع ہو جائے گی۔ ہم۔۔۔"

پانچ منٹ تک وہ کچھ نہ بولی تھی پھر۔

"میں اپنی اشاعت کے خواب، ان رکے خواب۔۔۔ پانچ منٹ کیوں، اسے افسوس محسوس کر کے میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔

"اچھا تم جو یہ کتاب شائع کرانا چاہتی ہو؟"

"ارادہ تو یہی تھا پھر کتنا ہے اب یہ خواب بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔"

"کچھ بچانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔ کتاب شائع کرانے کے لیے پیسے تو لگتے ہی ہیں۔"

ایسے میری ایک پبلشر سے دعا سلام ہے میں اس سے بات کروں گا شاید وہ پانچ دس ہزار چھوڑ دے۔ ویسے تمہارے پاس کتنے پیسے ہیں؟"

"میرے پاس زیادہ سے زیادہ دس بارہ ہوں گے۔"

اس کی بری بری کی آواز سنائی دی۔ "جب بچانے میرا بینک اکاؤنٹ کھلوایا تھا تو صرف پانچ ہزار تھے اس میں۔

پانچ جمع ہزار میں نے اپنا پاکٹ منی سے بچایا تھا کہ سیو کیے ہیں۔"

"اچھا تمہارے پاکٹ منی ملتی ہے تمہیں؟"

"اس پچاس روپے روزانہ کے ملتے ہیں۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اچھا دل چھوٹا مت کرو۔ کچھ کرتے ہیں اس سلسلے میں۔ اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر بتا اور یہ بھی کہ کس بینک میں تمہارا اکاؤنٹ ہے؟"

"کیوں۔۔۔ وہ کیا کرنا ہے؟"

"بس کچھ کرنا ہے۔ کیا مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔"

"تو بتا دو مجھے۔"

اس نے مجھے اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر بتا دیا جو میں نے سیو کر لیا۔

اگلے دن میں نے اپنے اس پبلشر دوست سے بات کی وہ پچاس کی بجائے چالیس میں کتاب شائع کرنے پر تیار ہو گیا۔

کتاب کی اشاعت کے بعد وہ سو کتابیں ہمیں دیتا باقی خود سیل کرتا۔ صرف یہ پوچھنے کے بعد ایک دن میں نے صوفے کی بھی کاغذ فٹس کا مل گیا۔ اس سے بات کرا دی۔ ہم کافی دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ اس نے کہا کہ پیسے ملتے ہی جلد وہ دس میں کتاب مارکیٹ میں آجائے گی۔

اگلے دن میں نے صوفے کو کال کی تو اس نے کہا۔ "ہم صاحب تو کہہ رہے تھے کہ کتاب چالیس ہزار میں شائع ہو جائے گی اور آپ بھی کہہ رہے تھے کہ ہم دو دن میں پیسے دے دیں گے مگر میرے پاس ابھی تو فی الحال اتنے پیسے نہیں ہیں۔" میں مسکرایا۔

"میں آج ہی تمہارے بینک اکاؤنٹ میں تیس ہزار جمع کرا دیتا ہوں۔ سارا سٹاف مل ہو جائے گا۔"

"ارے۔۔۔ نہیں نہیں۔ میں آپ سے ایک پیسا بھی نہیں لوں گی۔" اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

"کیوں، کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟"

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔"

"تو بس جیسے میں کہتا ہوں، ویسا کرو۔ میں آج ہی تمہارے اکاؤنٹ میں رقم جمع کرا تا ہوں۔ تم اکیلے پاکستی کے ساتھ جا کر اپنے صاحب سے مل لو تا کہ جو ضروری ابتدائی کام ہے وہ مکمل ہو جائے۔ میں خود تمہارے ساتھ چلتا مگر میں

پرسوں کسی کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں آٹھ دس دن لگ جائیں گے واپسی میں۔"

"جی بہتر۔"

میرے بینک اکاؤنٹ میں کچھ رقم موجود تھی۔ میں نے اس میں سے تیس ہزار نکال کر صدف کے بینک اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کر دیے۔ شام کو صدف نے بتایا کہ وہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ وسیم صاحب سے بھی مل آئی ہے اور ان سے بات بھی کر آئی ہے۔ اب صرف مسودہ اور رقم دینے کی دیر ہے انہیں۔ پھر بولی۔ "کیا غزلوں کا مسودہ اور رقم دے آؤں انہیں جا کر؟"

اچانک میرے دل میں ایک عجیب سی خواہش نے کروٹ لی۔ "تمہاری ساری غزلیں کہاں ہیں اس وقت؟"

"میرے پاس ایک ڈائری میں محفوظ ہیں۔"

میں ایک لمحے کو رکا۔

"صدف! میری ایک بات مانو گی؟"

"جی کہیں۔"

"میں تم سے ایک ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ کسی پارک میں، کسی ہوٹل میں، کسی کھلی اور پر رونق جگہ پر، جہاں تم مناسب سمجھو۔ اپنے ساتھ اپنی ڈائری بھی لیتی آنا۔ میں دوبارہ سے ایک نظر سب غزلوں کو دیکھ لوں گا۔ جہاں ترمیم و اضافے کی ضرورت ہوگی، وہاں وہ بھی کر لیں گے۔"

وہ ایک لمحے کو چپ ہو گئی۔ میں سمجھا کہ وہ تھوڑی دیر میں جواب دے گی۔ مگر جب خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تو میں ہی اسے مخاطب کرنے پر مجبور ہو گیا۔

"کیا ہوا؟ چپ کیوں ہو گئی ہو؟"

مجھے یوں لگا، جیسے اس نے ایک گہری سانس لی ہو۔

"کچھ نہیں، بس ویسے ہی۔ چلیں ٹھیک ہے آپ جہاں کہیں میں آ جاؤں گی۔"

"نہیں، جہاں تمہیں سہولت ہو میں آ جاؤں گا۔"

"ملنے کی بات آپ نے کی ہے جگہ بھی آپ بتا دیں میں آ جاؤں گی۔ مجھے آپ سے کوئی خوف نہیں ہے۔"

میرا دل خوشی سے بھر گیا۔

میں نے اسے ایک معروف ہوٹل میں شام چھ بجے آنے کا کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کل وقت سے پہلے ہی وہاں آ جاؤں گی مگر میں آپ کو پہچانوں گی کیسے؟" اس نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

وہ اپنی جگہ بجا تھی۔ ہماری یعنی میری اور اس کی فیس بک آئی ڈیز پر، ہماری اصل تصویریں نہیں تھیں۔ میں نے جب سے اپنا فیس بک اکاؤنٹ بنایا تھا۔ تب سے اس پر کوئی مخصوص تصویر ہی لگائی ہوئی تھی جسے میں نے کبھی تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میرے کہنے پر صدف نے تو مجھے اپنی کچھ تصویریں بھیج کر دی تھیں مگر اس کے لاکھ کہنے کے باوجود میں نے اسے اپنی ایک تصویر بھی نہیں بھیجی تھی۔ وہ زیادہ اصرار کرتی تو میں کہتا۔ "میں بہت بدصورت ہوں۔ تمہیں اپنی تصویر دکھا کر کھونا نہیں چاہتا۔"

میری بات پر وہ خفا ہو جاتی۔ معلوم نہیں اس نے میری بات کو سنجیدگی سے لیا تھا یا مذاق سمجھا تھا البتہ ایک دو بار پھر کے بعد اس نے دوبارہ مجھ سے یہ بات نہیں کی تھی۔

میں نے کہا۔ "ہمارے پاس موبائل فون ہیں، یہ ہماری پہچان بنیں گے۔"

"چلیں، یہ بھی ٹھیک ہے۔"

مزید کچھ دیر بات کرنے کے بعد میں نے کال منقطع کر دی۔ اس دن میں بہت خوش تھا۔ صدف، جس کی محبت نے پچھلے کچھ عرصے سے میرے دل کو اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا، میں کل اس ماہ جبیں سے ملنے والا تھا، اسے دیکھنے والا تھا۔ نجانے ہماری محبت میں آگے کیا ہونے والا تھا۔ ہماری محبت کا کیا انجام ہونا تھا۔ مگر میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ کل میں صدف سے ملنے اس سے بہت سی باتیں کرنے والا تھا۔

☆☆☆

میرا نہ تو صدف کی جاسوسی کرنے کا ارادہ تھا اور نہ ہی میں نے ایسی کوئی کوشش کی تھی۔ البتہ میرا یہ ارادہ ضرور تھا کہ میں اپنی شناخت کو چھپائے کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے اسے بہت دیر تک دیکھنا ضرور چاہتا تھا۔ میں نے صدف کو جہاں بلایا تھا وہ بڑا خوبصورت اور تھوڑا مہنگا ہوٹل تھا۔ تھوڑا مہنگا کا مطلب کچھ زیادہ ہی مہنگا تھا۔ وہاں متوسط طبقے کے لوگ بھی جانے سے کتراتے تھے۔ صرف امیر طبقے کے لوگوں کا ہی وہاں آنا جانا تھا۔

میں نے صدف کو اپنے بارے میں یوں تو سب کچھ ہی بتایا تھا مگر اس سے ایک دو باتیں چھپائی بھی تھیں۔ وہ یہ کہ کچھ پہلے تک میں ایک پرائیوٹ اسکول میں ٹیچر تھا مگر تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے میں نے کچھ ہفتے پہلے وہ نوکری چھوڑ کر اسی ہوٹل میں ویٹری کی نوکری حاصل کر لی تھی۔ اس ہوٹل میں ویٹری کی نوکری

حاصل کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ اس کے لیے مجھے کہیں دور سے سفارش کرانا پڑی تھی۔ میں نے صدف کو اسی ہوٹل میں بلایا تھا۔ میں وہاں پہلے سے ہی موجود تھا اور میرا انگ انگ آنکھیں بنا صدف کا راستہ تک رہا تھا۔ وہ چھ بجنے سے پندرہ منٹ پہلے ہی وہاں پہنچ گئی۔

میں نے اسے دیکھا تو سچ مچ میرا سانس سینے میں تھمنے لگا۔ اس نے مجھے ان باکس جو تصویریں سینڈ کی تھیں وہ ان سے کئی گنا زیادہ حسین تھی یا پھر مجھ سے ملنے کے لیے وہ خاص طور پر تیار ہو کر آئی تھی۔ نیلے کلر کے لباس میں اس کا دودھ جیسا سفید چہرہ دل میں کھب رہا تھا۔ وہ ایسی خوبصورت لگ رہی تھی کہ اس سے نگاہیں ہٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

میں جو ہر پل لفظوں سے کھیلتا رہتا تھا، اس وقت ان لفظوں نے، اس کی خوبصورتی کی صحیح تعریف کے لیے مجھ سے بغاوت کر دی۔

صدف کے ساتھ کوئی اور لڑکی بھی تھی، غالباً اس کی کوئی دوست تھی۔ وہ ہوٹل میں داخل ہوئی اور تین نمبر میز پر جا کر بیٹھ گئی۔

اس وقت اس ہوٹل میں کچھ فاصلے پر ایک فیملی کے دو ممبر موجود تھے یا پھر صدف اپنی دوست کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ باقی سارا ہوٹل خالی تھا۔ پورے ہال میں خاموشی اور سناٹے کا راج تھا۔ وہ دونوں باتوں میں مصروف ہو گئیں تو میں بمشکل خود کو سنبھالتا، ان کے قریب جا پہنچا۔

میرے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ تھی۔

"گڈ آفٹرنون میم!"

"گڈ آفٹرنون۔"

صدف نے جواب دیا۔ میں نے لسٹ مینو اس کے سامنے کرنا چاہی تو اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔

"ہمارے ایک گیسٹ آنے والے ہیں، ان کے ساتھ ہی کچھ لیں گے۔"

"جی میم۔"

میں نے احتراماً کہا اور دھیرے سے واپس پلٹا۔ ابھی میں نے ایک قدم اٹھایا ہی تھا کہ میرے کانوں سے صدف کی آواز ٹکرائی۔

"سچ کہا تھا یار، فیس بک پر ایک سے بڑھ کر ایک بے وقوف پڑا ہے۔"

اس کے لفظوں نے میرے قدموں میں زنجیریں ڈال دیں۔ نجانے وہ کس کی بات کر رہی تھی مگر میں اس کی پوری بات سننے کے لیے بے چین ہو گیا۔

مگر میں وہاں رک کر انہیں کسی قسم کے شک میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے وہاں سے قدم اٹھائے اور دوسری طرف ایک چھوٹا سا چکر کاٹ کر ان کے بالکل قریب آ کر بیٹھ گیا۔

میرے اور ان کے درمیان پردے کی ایک دیوار حائل تھی۔ وہ دونوں پردے کے دوسری طرف تھیں اور میں اس طرف۔

"بھئی میں تو استاد مان گئی ہوں تمہیں۔ اگر اس دن تم مجھے وہ مشورہ نہ دیتیں تو آج شاید ایسا کچھ نہیں ہوتا۔"

مجھے صدف کی آواز سنائی دی۔

"تو پھر مٹھائی کھلاؤ اس بات پر۔"

صدف کی ساتھ والی لڑکی نے کہا۔

"مٹھائی بھی کھلا دیں گے، بس ذرا وہ میرے بدھو عاشق صاحب آ جائیں، سب اسی کے خرچے پر ہوگا۔"

اس بات پر وہ دونوں کھلکھلا کر ہنسیں۔

نجانے کیوں، میرا سانس سینے میں رکنے لگا۔ وہ دونوں غالباً میرا ہی ذکر کر رہی تھیں۔

"ویسے میں ایک بات اب بھی کہوں گی۔" صدف کے ساتھ آئی لڑکی کی آواز سنائی دی۔ "اس شاعری وائری میں کچھ بھی نہیں پڑا، یہ سب وقت کی بربادی ہے اور کچھ نہیں۔" یہ بات اس نے درست کہی تھی۔

"مجھے تمہاری بات سے اتفاق نہیں۔" صدف کی آواز سنائی دی۔

"بس ایک بار میری کتاب شائع ہو جائے پھر ہر طرف دیکھنا، اردو شاعری میں میرا بھی ایک نام ہوگا۔ میری شہرت ہوگی۔ لوگ دیوانے ہو جائیں گے میرے۔"

"صرف کتاب شائع ہونے سے شہرت نہیں مل جاتی اس میں کچھ دم بھی ہونا چاہیے۔"

"دم تو بہت ہے شاعری میں۔ دم کیسے نہیں ہوگا؟ ساری شاعری ہی اسی کی لکھی ہوئی ہے۔ میری تو صرف دو چار غزلیں ہوں گی۔ سچ میں، بہت کمال کی شاعری ہے، پر بیچارہ......"

اس بات پر پھر ایک ہلکا سا قہقہہ پڑا۔

"ویسے ایک بات ہے۔" صدف کی ساتھ والی لڑکی نے کہا۔

"تم اچھی شاعرہ ہو یا نہیں، مگر اچھی اداکارہ ضرور ہو۔ کیسے محبت کا ڈھونگ رچا کر اس سیدھے سادے بندے کو اپنے

جال میں پھنسا لیا جواب نہیں تمہارا۔"

"اور یہ مشورہ دیا کس نے تھا تم نے۔"

اس بات پر پھر قہقہہ سنائی دیا۔

"یار! میں شاید ایسا نہ کرتی، یہ یہ چوروں کی طاقتی تا، اس نے میرا دماغ چاٹ لیا تھا۔ اتنا تھکا ہوا تھا کہ ظلم تو کاٹج پیو نہ دیکھی میں بھی نہیں ہوتا ہوگا سب، وہ، ہائے کوٹا، ہائے بلند... ہائے نے کن کن بیماریوں کے نام تھے۔ میرے پاؤں کچھ نہیں پڑا تھا۔ پھر ارکان، وزن... پتا نہیں کیسے کیسے عذاب تھے۔ جب تک یہ نہ سنتا، شاعر نہیں بن سکتے تم۔ جب میں نے تم سے اس پریشانی کا ذکر کیا تھا تم نے مجھے وہ مشورہ دیا تھا۔ دو چار ہفتوں کے بعد مرض میں اتنی شکل آ گئی تھی کہ مجھے مجبوراً تمہارے مشورے پر عمل کرنا پڑا تھا اور اس دن کے بعد میری عرض سے جان چھوٹ گئی تھی۔"

موصوف نے کہا، یا تھا کہ "بس اب تمہیں میری عرض سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ہوں نا، میں اصلاح کر دیا کروں گا۔ کوئی اس سے پوچھے۔ گلو کے پہلے۔ یہ اصلاح محبت کے ذرائے سے پہلے کیوں نہیں کی؟ اس وقت تو جناب کا فرہاد تھا جب تک آپ عرض نہیں سیکھیں گی، آپ کو وزن میں شاعری کر نہیں آئے گی۔ پہلے عرض سیکھیں، پھر شاعری سیکھیے گا..... اور اب نہ عرض کی ضرورت ہے نہ شاعری کی۔" موصوف خود ہی ساری خرچیں تھوکر دیتے رہے اور تو اور کتاب کی اشاعت کے لیے بھی نہیں ہزار میرے بینک میں جمع کرائے ہیں۔ سچ میں، دنیا میں ایسا بے وقوف انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔"

صدف اپنی ہنسی کے بے جا ہی اور اس کے الفاظ سے سہ بن کر میرے کانوں میں اترتے جا رہے تھے۔ میرا ذہن دل اچانک ایک ایسی آگہی کی زد میں آ گیا تھا کہ میرا سانے ہوش وحواس میں رہنا مشکل ہو گیا۔ میں نے جس کے لفظوں کا اعتبار کر کے جس کے لیے اتنا کچھ کیا تھا، اس نے مجھے بے وقوف بنا کر میری سادگی کا بہا پھر میرے جذبات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میرا ذہن دل اس وقت کیسی اذیت سے دو چار تھا۔ میرا دل چاہا کہ ہمیں زور زور سے روؤں، چیخوں، اپنا سر پھاڑوں، سے چراؤں، مگر میں خود پر جبر کے، مشکل اس بات پر عمل کرنے سے باز رہا۔ اچانک مجھے صدف کی ہنسی کی آواز سنائی۔

"تمہارا پہ ڈراما کامیاب تو ہو گیا پر مجھے یہ بتاؤ، اس ڈرامے کو جاری رکھنے کا ارادہ کب تک ہے؟"

"بس یہ کتاب شائع ہو جائے اس کے بعد اگلی کتاب آ جائے۔ پھر اس ڈرامے کا دی اینڈ کر دوں گی۔"

"گڈ... اچھا یار، اتنی دیر ہو گئی ہے، وہ ابھی تک نہیں؟ اس نے چھ کا کہا تھا، سوا چھ ہونے والے ہیں، اس معلوم تو کرو، کہاں مر گیا؟ ایک دو گھنٹے تو روا کر کہ کہا ہے تمہاری خریلیں بھی دیکھنی ہیں اس نے۔ کب شپ ملے گی کہاں۔"

اچانک میرے موبائل کی اسکرین جلنے بجھنے لگی۔ دہاں سے کوئی آواز برآمد ہو گی۔ ان کے آنے سے پہلے میں نے اپنا موبائل سائلنٹ پر کر لیا تھا۔

"یار! شپ تو جا رہی ہے، یہ وہ اغا نہیں ہے۔"

"شاید! ایک بے ہودہ راستے میں ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔"

اس کی کال آنا بند ہوئی تو میں نے اپنا موبائل اٹھا کر اور وہاں سے اٹھ کر اپنی جگہ پر چلا آیا۔ میری آنکھوں میں نمی کو کوئی چیز چبھن دے رہی تھی۔ میں اپنے آپ پر جبر کیے، بہت سی آنسو اندر ہی اندر کہیں گرتے رہے۔ میں ولگا فون کی ایک اور کی نظران پر ڈال لیتا اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ ایک دو بار ہی نے دیکھا، صدف اپنا موبائل فون کان سے لگائے ہوئے تھی کہ شاید وہ میرا نمبر ملا رہی تھی مگر میرا فون آف تھا۔ نہیں نے ایک گھنٹے تک میرا انتظار کیا اور پھر وہاں سے چلی گئیں۔

اس رات میں کب تک پڑا رہا تو صدف کے کئی تاثرات پاس میں آتے ہوئے تھے جنہیں میں نے دیکھا بھی گوارا نہیں کیا۔

اس دن میں نے اپنے گروپ کا ایڈمن ایک دوست کو بنایا، جو کئی دہائیوں تک عرض جانتا تھا۔ گروپ اس کے حوالے کیا اور اپنے فیس بک اکاؤنٹ کو بیشہ کے لیے ڈی ایکٹیویٹ کر دیا۔ اس دن سے میں نے شاعری، عرض اور افسانہ نگاری ترک کر دی اور اپنا موبائل بھی ہمیشہ کے لیے لیا۔ کبھی کبھی دوستوں کی محفل میں محبت کا ذکر ہو اور کوئی دوست اپنی محبت اور محبوب کا ذکر کرے تو میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ سی آ جاتی ہے اور کسی کا لکھا ہوا یہ شعر بے اختیار میرے لبوں پر مچل جاتا ہے۔

گزرے ہیں زندگی میں کچھ ایسے مقام سے
نفرت سی ہو گئی ہے محبت کے نام سے

گیدڑ اور جنیل

جناب معراج رسول
السلام علیکم

میں نے پہلی بار کہانی لکھی ہے جو میری اپنی ہے اگر اس میں کوئی خامی نظر آئے یعنی صحیح طور پر الفاظ کا استعمال نہ ہوا ہو تو پلیز اسے کسی اچھے رائٹر سے دوبارہ لکھوا لیجیے گا لیکن اسے ردی کی ٹوکری کی نذر نہ کریں۔

وقار الحسن
(کراچی)

تب نا تجربہ کار آباد نیا نیا آباد ہوا تھا۔ تعمیراتی کام جاری تھا۔ کافی دور دور مکانات تعمیر ہو رہے تھے۔ درمیانی جگہ میں خالی پلاٹ تھے جن پر خودرو جھاڑ اگ آئی تھی۔ ہمارے بلاک میں خاصے مکان آباد ہو گئے تھے۔ سے ایک مڈل کلاس آبادی تھی۔ اسے آپ خوش حال اور کھاتے پیتے افراد کی آبادی سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں چار سو اور چھ سو مرلے کے پلاٹ تھے۔

میری عمر ان دنوں یہ شکل دس سال رہی ہوگی۔

خالی پلاٹ ہمارے لیے میدان کا کام دیتے تھے۔
ہم سب بڑے لڑکوں نے تو یہاں کرکٹ کھیلنے کی تج بنائی ہوئی تھی۔ ہر اتوار کو یہاں کرکٹ میچ ہوتا جنہیں حضرات بھی آن بیٹھتے کہ دیکھتے ہیں اور صبح استغاثت کرکٹ ٹیموں کی سرپرستی بھی کرتے تھے۔ یعنی کبھی کبھی ہم کو اسے بیٹ، پیڈ اور بال خرید کر دیتے تھے۔ ورنہ ہمیں کسی اور کے انتظار کرنا پڑتا۔
غرض یہ کہ وہ دور ہماری زندگی کا سنہری دور تھا۔
ہم سب لگی میں رہتے تھے اس کی طرف والا ویسج و عریض پلاٹ خالی تھا۔ اسکولوں میں گرمیوں کی تعطیلات تھیں۔ چنانچہ سوائے کھیلنے، کھانے اور نت نئی شرارتیں کرنے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی کام نہیں تھا۔ ایک دن میں ناشتا کر کے گھر سے باہر نکلا تو کار زار والے پلاٹ پر مجھے کچھ مزدور نظر آئے جو پلاٹ کے ایک کونے کو ہموار کر رہے تھے۔ یا قادر خیل کے ایک صاحب شیرانی میں ملبوس ان لوگوں کو کچھ ہدایات دے رہے تھے۔
پھر ان مزدوروں اور مستریوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں بھی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔
دعا ختم کر کے شیرانی والے صاحب ایک گاڑی تک گئے اس میں سے بڑا سا صفائی کا ایک ڈبا نکالا اور واپس آکر مزدوروں اور معماروں میں صفائی بانٹنے لگے۔ اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی تو انہوں نے بہت اپنائیت سے مجھے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔
میں کچھ شرمندہ ہو گیا کہ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ کیسا ندیدہ لڑکا ہے۔ صفائی پر سے نظریں ہی نہیں ہٹا رہا ہے۔ میں نے جھجکتے ہوئے انکار میں سر ہلا دیا۔
"ارے آجاؤ بیٹا!" وہ بلند آواز میں بولے۔ "ہماری خوشی میں تم بھی شریک ہو جاؤ۔" پھر وہ مسکراتے ہوئے خود ہی میری طرف آنے لگے۔
میرا دل چاہا کہ میں وہاں سے بھاگ جاؤں۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں موجود ہر شخص مجھے تشکیک آمیز انداز میں دیکھ رہا ہے۔
شیرانی والے صاحب میرے نزدیک آگئے اور بولے۔ "بیٹا دوسروں کی خوشی میں ہمیشہ خوش ہونا چاہیے۔ لو اس میں سے اپنی پسند کی صفائی نکال لو۔ شرماؤ مت۔" پھر انہوں نے خود ہی فلاٹ کی ایک بڑا سا انگوٹھا لیا اور میرے ہاتھ میں رکھ دیا۔ اب میں کچھ فیصلہ بھی نہیں کر سکا تھا کہ انہوں نے میرے دوسرے ہاتھ پر چمچ تھما کر کھودی۔ اس کے شیرے سے میرا ہاتھ لتھڑ گیا۔
وہ مسکرا کر بولے۔ "ارے میاں آم، مٹھائی اور پائے کھانے کا مزہ بھی جب آتا ہے جب ہاتھ اور منہ گندے ہوں۔"
میں یہ سوچ کر مٹھائی کھانے لگا کہ کہیں ہم اکرا دوست مجھے اس حال میں نہ دیکھ لے۔ خاص طور پر مجھے صفدر سے خطرہ تھا۔ وہ قریبی اسکول جاتا تھا، مانا کہ میرا بھائی ہونے کے ناتے وہ ہمارے قابو صاحب بھی تھے وہاں پہنچ کر شکایت کر دیتا۔ میں ڈر گیا اور انہوں نے مارے ہوئے کے دونوں ہاتھ پر دیے۔ صفدر کے یہ جملے ٹھیک اڑ گئے تھے میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ وہ اس طرح بات کا بتنگڑ بنایا کرتا تھا۔
پھر وہی ہوا۔ صفدر اچانک ہی وہاں آگیا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا میں نے جلدی سے کہا۔ "صفدر! دھوکا آؤ۔"
شیرانی صاحب کی نظر اس پر پڑی تو انہوں نے اسے بھی بلایا اور مٹھائی کے دو ٹکڑے اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے۔
"بیٹا نام کیا ہے تمہارا؟" شیرانی والے صاحب نے مجھ سے پوچھا۔
"میرا نام وقار ہے، وقار الحسن۔" میں نے جلدی سے کہا۔
"اور تمہارا نام تو مجھے معلوم ہی ہوگا ہے۔" انہوں نے صفدر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دو گھر سے اکٹھی نہیں معذور کر آؤ اور دی کیسی تھی نا؟"
"جی ہاں۔" صفدر نے کہا اور دوبارہ مٹھائی کھانے میں مصروف ہو گیا۔
"میرا نام حسان الدین بھی ہے۔" وہ بولے۔ "اب ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اسلام آباد میں یہاں آبا ہوں۔" انہوں نے خود ہی اپنا تعارف کرایا۔
یہ بیگ صاحب سے ہماری پہلی ملاقات تھی۔
پھر دو مہینے کے اندر اندر اس خالی پلاٹ پر بڑی بڑی دو منزلہ عمارتیں کھڑی ہو گئیں۔
بیگ صاحب بیٹھ عشرے میں ایک دفعہ ضرور آتے تھے۔ ان کا بنگلا تو کوئی فلیکے دار بنا رہا تھا۔
مزید دو سال بعد اس خالی پلاٹ پر ایک شاندار بنگلہ بن چکا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ بیگ صاحب۔۔۔ وہاں منتقل ہو گئے۔ مجھے یہ جان کر بہت تعریف ہوئی کہ وہ بالکل تنہا ہیں۔ شادی انہوں نے نہ کی تھی کبھی اور دور دور تک کوئی رشتے دار بھی نہیں تھا۔
بیگ صاحب خاصے زندہ دل آدمی تھے۔ وہاں آتے ہی انہوں نے ہماری کرکٹ ٹیم کی سرپرستی شروع کر دی۔ وہ مہینے میں ایک دو میچ ضرور ہی کرکٹ کی دو نئی ٹیموں کا کیا جواز ہے۔ کرکٹ کی ایک مضبوط ٹیم بناؤ اور شہر کی دوسری ٹیموں سے میچ کھیلو۔
بیگ صاحب بچوں اور نوجوانوں میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ انہوں نے اپنے گھر کے سامنے خاصا بڑا لان بنوا لیا تھا۔ شام کو کرکٹ اور نوجوان ان کے لان میں اکٹھے ہو جاتے۔ وہ کھیل بھی کھیلتے اور مذاق بھی مذاق میں ایسی نصیحت آموز باتیں بتاتے کہ ہمارے دل میں اتر جاتیں۔
کھلے کے بزرگ بھی بیگ صاحب کا احترام کرتے تھے۔ وہ ہر فرد کے کام آنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے۔
اس وقت تک کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن نے ہمارے گھروں میں بجلی کی سپلائی کا کام نہیں لگائے تھے۔ لگے نے الیکٹرک کمپنی کا ایک اہلکار ہر ماہ وہاں کی تاریخ کو آتا اور ہر گھر سے ایک مقررہ رقم کے کر رسید دے جاتا۔
اچانک ایک روز وہاں الیکٹرک کمپنی کے کچھ بڑے افسران آگئے ان کے ساتھ پولیس بھی تھی۔ پھر الیکٹرک کمپنی کی گاڑی آئی اور پھلے تو اس نے ہر گھر کے گنڈے نکالے ہر گھر میں موجود کسی نہ کسی لائٹ کے کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ سب بڑے تو اس وقت دفتروں میں یا اپنے کام دھندے پر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں صرف امی اور میری چھوٹی بہن وہ تھی۔ پولیس کے ایک سپاہی نے مجھے بھی پکڑ کر گاڑی میں بٹھا دیا اور بولا۔ "بجلی چوری کرتے ہو، اب معلوم ہوگا کہ چوری کیا ہوتی ہے؟"
میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے کبھی تھانے نہیں دیکھی تھی۔ میں نے کبھی وہاں کے بارے میں واقعات سنے تھے کہ پولیس والے الٹا لٹکا دیتے ہیں اور الٹی مار مارتے ہیں کہ مار کھانے والا مہینوں اپنے بچوں پر چلنے کے قابل نہیں رہتا۔
بچوں کو پولیس کی تحویل میں دیکھ کر خواتین گھروں سے نکل آئی تھیں اور وہ سب چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں کہ چور تو آپ ہو، تمہارا ایک افسر ہر مہینے ہم سے پیسے لیتا ہے۔
"میں ایسے کسی افسر کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔" ایک افسر نے جواب دیا۔
ابھی یہ ہنگامہ جاری تھا کہ اچانک بیگ صاحب وہاں آگئے۔ اس وقت وہ تہری پیس سوٹ میں تھے۔ آنکھوں پر نفیس فریم کا چشمہ اور ہاتھ میں سگنل ہوا سگار، ان کی شخصیت کو مزید بارعب بنا رہا تھا۔
"کیا بات ہے آفیسر؟" انہوں نے پولیس کے سب انسپکٹر کو مخاطب کیا۔ "ان بچوں کو کیوں پکڑا ہے؟"
"الیکٹرک کمپنی کی رپورٹ پر۔" سب انسپکٹر نے جواب دیا۔
"کیا مطلب ہے تمہارا؟" بیگ صاحب درشت لہجے میں بولے۔
"تم جانتے ہو کہ پاکستان پینل کوڈ کی فلاں دفعہ کے تحت کسی نابالغ کو پکڑنا کتنا بڑا جرم ہے۔"
"ہمیں قانون مت پڑھائیں بڑے صاحب۔" سب انسپکٹر نے کہا۔
"ہاں ڈیوٹی آن انسپکٹر۔" بیگ صاحب چیخے۔ "چلو تم ہی بتاؤ کہ ان بچوں کو کس جرم کی کس دفعہ کے تحت گرفتار کیا ہے۔ تم تو بچے ہیں جانتے ہو گے کہ میں تمہارے آئی جی صاحب ضرور جانتے ہیں۔ میں ابھی ان سے بات کرتا ہوں۔" پھر الیکٹرک کمپنی کے افسر کی طرف دیکھ کر۔ "سب سے بڑے چور تو تم ہو۔ یہ تمہارے ہی آدمی کی دی ہوئی رسید ہے نا؟"
"اس قسم کی رسیدیں تو کوئی بھی بنا سکتا ہے۔"
"اس کا مطلب ہے کہ سید احمد شاہ کا کوئی آدمی نہیں ہے تمہارے دفتر میں؟"
وہ سب انسپکٹر سے مخاطب ہوئے۔ "انسپکٹر! بچوں کے بجائے تم ان لوگوں کو گرفتار کرو اور یہ بقیہ کسی آرڈر کے یہاں آئے کیسے؟"
"بچوں!" وہ ہم لوگوں سے بولے۔ "ان لوگوں کو پکڑ کر پہلے تو انہی طرح دھنائی کرو پھر انہیں پولیس کے حوالے کر دو۔"
بیگ صاحب کی جیبہ سے ہمارے حوصلے بلند ہو گئے۔ سب سے پہلے صفدر پولیس کی گاڑی سے کود، پھر تو سب کا ہڑ بڑ کا کود کر گاڑی سے باہر آگیا۔ پولیس والے "ٹھہرو

رک جاؤ۔" کہتے رہ گئے۔ لڑکوں نے اچانک الیکٹرک والوں پر دھاوا بول دیا۔

نیک صاحب خواتین سے بولے۔ "آپ لوگ تماشا کیا دیکھ رہی ہیں گھروں سے بیلن، جھاڑوں اور ڈنڈے لے کر آئیں اور ان لوگوں کی ایسی خاطر کریں کہ یہ دوبارہ یہاں نہ آئیں۔"

"بھائی صاحب۔" اس نے کہا۔ "پہلے ان سے ہمارے گھروں کے الیکٹرک کنکشن لگوائیں۔"

"لگائیں گے ضرور لگائیں گے۔" انہوں نے الیکٹرک کمپنی کے سوٹ پوش افسر سے کہا۔ "کنکشن لگاؤ اور جلدی کرو۔"

"لگاؤ کنکشن۔" سوٹ پوش بے بسی سے بولا۔

"ہن لوگوں کو یہاں سے جانے مت دینا۔ میں ان کے آفیشل سے بات کرکے آتا ہوں۔" نیک صاحب نے کہا۔

"ہر ہم نے تو کوئی مداخلت نہیں کی۔" سب انسپکٹر سمجھ گیا کہ نیک صاحب سے دھاندلی نہیں ہوگی بلکہ وہ واقعی آفیشل سے بات کرنے جارہے ہیں۔

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ہم راہوں کہ مداخلت کیوں نہیں کی۔ ان کا ایک آدمی چوری پر آمادہ کرتا ہے اور اس چوری کو قانونی بناتا ہے، دوسرے صاحب آتے ہیں اور لوگوں کو ہراساں کرنے لگتے ہیں۔ تم نے ان کو تھانے میں پرمداخلت کیوں نہیں کی؟"

بس منٹ کے اندر اندر پورے محلے کی بجلی بحال ہو گئی۔

"اب ان لوگوں کو گرفتار کرو، تھانے لے جاؤ اور رشید کو بھی تھانے لے آؤ۔" میں اس سے پوچھوں گا کہ اس رسید پر اس کے دستخط ہیں یا نہیں؟"

الیکٹرک کا پورا عملہ دفع کرکے پرامادہ ہوئے۔

صاحب معاملہ رفع دفع کرکے پرامادہ ہوئے۔

اس واقعے کے بعد تو محلے کے تمام بڑوں نے انہیں اپنا لیڈر تسلیم کرلیا۔ پھر ایک ہفتے کے اندر اندر محلے کے ہر گھر میں الیکٹرک سپلائی گئی۔

نیک صاحب میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اس ان کی ایک خامی بھی کہ وہ محلے کی لڑکیوں کو دیکھ کر کوئی نہ کوئی شعر ضرور پڑھتے تھے۔ لڑکیاں بھی ان کی عادت سمجھ گئی تھیں اس لیے مسکراتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ یہ گویا ان کا نذرانہ تھا۔ ہم میں سے اگر کوئی کسی لڑکی کو پرایک کے بعد دوسری نظر کرتا یا تو نیک صاحب اس سے خفا ہو جاتے۔

وہ انتہائی پڑھے لکھے آدمی تھے اور ہر موضوع پر ہی گفتگو کرلیتے تھے۔ معلومات عامہ، سیاست اور بازار کی ہر چیز کی بھی انہیں خاصی نظر تھی۔ امتحان کے دنوں میں اکثر لڑکے ان سے پڑھنے بھی آتے تھے۔

دو نوجوانوں کے ساتھ تو جوان، بچوں کے ساتھ بچے اور بزرگوں کے ساتھ بزرگ بن جاتے تھے۔ غرض ہر کسی کے آنے سے محلے والوں کے بہت سے مسائل حل ہو گئے تھے۔

وہ صبح گھر سے نکلتے اور اکثر گھروں کے سودا سلف بھی لا دیا کرتے تھے۔ صدیقی صاحب کی بیگم میں بھی ملازم تھے۔ ان کی بیٹی کی شادی کے موقع پر بیگ صاحب نے سارا انتظام اپنے ذمے لیا۔ اس دوران سیج لان یا شادی ہال کا کنسپٹ نہیں تھا۔ شادیاں عموماً گھر کی چھت پر شامیانے تانے لگا کر کی جاتی تھیں۔ بیگ صاحب نے شادی کا ایسا بہترین انتظام کیا تھا کہ ہر مہمان ان کی تعریف کررہا تھا۔ پھر انہوں نے مرحوم صاحب سے ایک پیسا بھی نہیں لیا۔

فارغ اوقات میں انہوں نے محلے کے بچوں کو باقاعدہ پڑھانا شروع کردیا تھا۔ لڑکے صبح کی شفٹ میں اسکول جاتے تھے۔ انہیں وہ سہ پہر کے وقت پڑھایا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو صبح کے اوقات میں پڑھایا کرتے تھے۔

ایک دن اچانک میرا ایک دوست ناصر کم ہو گیا۔ لوگ اس کی تلاش میں نکل پڑے۔ نیک صاحب تو اس پریشانی میں جیسے ناصر ابنی کا بیٹا ہو۔

سب لوگوں نے رات تک اسے تلاش کیا۔ پھر محلے والوں نے بیگ صاحب کے ساتھ مل کر پولیس میں رپورٹ درج کرادی۔

میں نے ناصر کا آخری بار گلی کے کونے پر کھڑا دیکھا تھا۔ شاید وہ گھر کا کوئی سودا لے کر آرہا تھا۔ پھر اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ ناصر کی والدہ کی حالت صدمے سے خراب تھی۔ ناصر کے ماموں خالہ کو خبر دے دی گئی۔ بھی ناصر کے والد کو بھی پولیس کو ٹیلی فون کرکے ناصر کے بارے میں معلوم کرنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اب ان لوگوں نے لڑکیاں چھوڑ کر لڑکوں کی تلاش شروع کردی تھی۔

پھر دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔ ناصر کے گھر والوں کو بھی صبر آ گیا۔

پھر اچانک ہمارے محلے میں ہلچل مچ گئی۔ رشید صاحب کی بیٹی سلمٰی اسکول سے آتے ہوئے غائب ہو گئی۔ محلے کی ایک اور لڑکی صائمہ کے ساتھ اسکول جایا کرتی تھی۔ اس دن صائمہ اسکول نہیں گئی تھی۔ اسکول کی لڑکیوں اور ٹیچرز کا کہنا تھا کہ صائمہ چھٹی کے بعد گھر چل کر بھی نہیں وہ گھر نہیں پہنچی۔

محلے والے ایک مرتبہ پھر سلمٰی کی تلاش میں نکل پڑے۔ نیک صاحب کو اس کا بہت صدمہ تھا۔ وہ کہتے تھے تم سلمٰی میری اسٹوڈنٹ بھی رہی ہو اور اچھی ذہین بچی تھی۔

ایک مرتبہ پھر پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ اس مرتبہ تو نیک صاحب تھانے کے گھیلے پر بہت گئے اور انہی کی مدد سے گلی کی کرکٹ کھیلنے کے اندر لڑکی نہ ملی تو تم سب کو بند کروادوں گا۔"

سلمٰی کے گھر میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ یوں بھی وہ بلا کی خوبصورت لڑکی تھی۔ محلے کا ہر فرد اسے پسند کرتا تھا۔

اس واقعے پر بھی وقت کی گرد پڑ گئی۔ ناصر کی طرح سلمٰی کے والدین نے بھی صبر کرلیا۔ زندگی پھر اپنے معمول پر آگئی لیکن یہ سکون زیادہ دن برقرار نہ رہ سکا۔ اس مرتبہ ماہ صاحب کی جوان بیٹی صائمہ غائب ہو گئی۔ صائمہ میٹرک کا امتحان دینے والی تھی اور بہت خوش اخلاق تھی۔ اس کی کشش کا کشش اس کے والدین کو تھا ہی ان لڑکوں کو بھی تھا جو صائمہ کے ایک طرفہ عشق میں مبتلا تھے۔

اس مرتبہ نیک صاحب کے چہیتے چلّانے پر پولیس والوں نے بہت سرگرمی دکھائی۔ انہوں نے محلے میں آکر تفتیش کی اور کئی لڑکوں کو اٹھایا جو صائمہ کی محبت کا دم بھرتے تھے۔

ان لڑکوں کے والدین روتے پیٹتے نیک صاحب کے پاؤں پکڑتے اور ان سے کہتا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ ہمیں کچھ پتا نہیں ہے لیکن وہ تاثیر ہاتھ نہیں کرسکتے۔"

محلے کے ہر فرد کا ریہ بھی خیال تھا کہ وہ لڑکے کسی جوان لڑکی کو اغوا نہیں کرسکتے۔

نیک صاحب کے کہنے پر پولیس والوں نے ان لڑکوں کو چھوڑ دیا۔ ان سے چاروں کی حالت ایک ہی رات میں تباہ ہو گئی تھی۔ اب ان لوگوں نے لڑکیاں چھوڑ کر لڑکوں کے تعاقب میں لگ گئے۔ ناصر کی طرح صائمہ کا بھی کچھ سراغ نہ ملا۔ نہ جانے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا تھا۔

نیک صاحب اسے بیٹی سمجھتے ہوئے کہ ان ہونی نے اعلان کردیا، اب میں بچوں کو نہیں پڑھاؤں گا۔ ان ہونی کو دیکھ کر مجھے گھر شدہ بچے یاد آتے ہیں۔

محلے والوں کے بھروسہ کرنے پر وہ بہت مشکل سے مان گئے کہ دوبارہ پڑھانے پر راضی ہوئے۔

اب ایک بارہ سال کا بچہ گیا تھا اور جسے ایک بڑے میں تیز کا فرق بھی معلوم ہو گیا تھا۔

فاخرہ ہمارے محلے کی بہت پُراثر لڑکی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور اتنی ہی ذہین بھی تھی۔ بھائی جان اور اس میں نہ جانے کب قطعی پیدا ہوا۔ دونوں ایک دوسرے سے چھپ چھپ کر ملنے لگے۔ میں سب جانتا تھا لیکن خاموش تھا۔

بھائی جان ان دنوں ایس ای ڈی کالج میں پڑھ رہے تھے۔ کالج سے آتے ہی وہ سائیکل پر گلی میں نکل جاتے۔ ان بالوں میں خورد بھائیوں اور درختوں کا ایک جنگل سا اگ آیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ فاخرہ وہاں پہلے سے موجود ہوگی یا پھر وہ آکر بھائی جان کے جانے کے بعد پیچھے پیچھا اسی طرف جاتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ یہ کھیل خطرناک ہے لیکن بھائی جان کے ذہن میں کنکشن کا ایسا بھوت سوار تھا کہ انہیں فاخرہ کے علاوہ کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔

فاخرہ اکثر ہمارے گھر بھی آجاتی تھی۔ باجی سے اس کی دوستی تھی لیکن باجی کو اس کی آزاد خیالی اور بے باکی کی ابھی نہیں پتا تھی۔ وہ جب بھی آتی اپنے ساتھ کوئی فلمی رسالہ لے کر آتی اور باجی کو بتاتی کہ آج کل کون سا ہیرو یا ہیروئن کس شادی کے چکر میں ہے یا کس کی فلم نے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔ ابا جی کو اس بات سے چڑ ہوگی۔ بھائی جان البتہ اس کی آمد سے بہت خوش ہوتے تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے کہا۔ "میں فاخرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

امی بھنچے سے انداز میں بولیں۔ "عرفان تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ فاخرہ اچھی لڑکی نہیں ہے، اتنائی پھوڑ اور بدمزاج ہے۔ صرف خوب صورتی سے کیا ہوتا ہے؟"

بھائی جان اپنی بات پر اڑے رہے۔

درختوں کے جھنڈ میں ان کی ملاقاتیں اب بھی جاری تھیں۔ ایک دن میں نے بھائی جان کے پیچھے فاخرہ کو جاتے

دیکھا لیکن میں کیا کہہ سکتا تھا۔ وہ مجھ سے بڑے تھے۔

اچانک میری نظر فاخرہ کے ابا پر پڑی۔ وہ کسی فکر کی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ غصے کے بھی بہت تیز تھے۔ میں نے انہیں بھی اس طرف جاتے دیکھا جدھر فاخرہ اور بھائی جان گئے تھے۔

میرا دل انجانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔

اچانک درختوں کے جھنڈ کی طرف سے چیخ پکار اور ہنگامے کی آوازیں آئیں۔ وہ آوازیں سن کر میں بھی دوڑا۔ میرے سامنے منظر کے کئی اور لوگ بھی تھے۔

وہاں کا منظر ہی عجیب تھا۔ بھائی جان اور سلمٰی کے والد گتھم گتھا تھے اور فاخرہ ایک طرف کھڑی تھی۔

لوگوں نے ان دونوں کو الگ کیا اور لڑنے کی وجہ پوچھی۔

''اجی صاحب!'' فاخرہ کے والد نے کہا۔ ''اس کمینے نے تو وہ گھٹیا حرکت کی ہے کہ کچھ کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔''

''میں نے کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی ہے۔'' بھائی جان چیخے۔

''یہ فاخرہ کو ورغلا کر اس طرف لے آیا اور اگر میں کچھ دیر اور نہ آتا تو میری بچی کی زندگی تباہ ہوجاتی۔''

''تم بتاؤ۔ کیا بات ہے؟'' نیک صاحب وہاں پہنچے تو ہر شخص چیخے بہت گیا۔

''عرفان مجھے یہاں وضو کے لیے لایا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ تمہیں مور کے بچے دکھاؤں گا۔'' فاخرہ نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''اور تم اس کی باتوں میں آگئیں؟'' نیک صاحب ناگواری سے بولے۔ پھر وہ فاخرہ کے والد سے بولے۔

''ارشاد صاحب! اس معاملے کو یہیں ختم کردیں۔ زیادہ کریدیں گے تو آپ ہی کی رسوائی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ عرفان ایسا لڑکا نہیں ہے۔''

اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے لیکن محلے والوں کے ہاتھوں ایک موضوع آگیا۔ بھائی جان الگ شرمندہ شرمندہ سے رہنے لگے۔ انہیں فاخرہ سے اس بھی اور ڈھٹائی کی توقع نہیں تھی۔ پھر وہ سب کچھ بھول بھال کر اپنی پڑھائی میں لگ گئے۔ میں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔

ایک دن پھر محلے میں بھونچال آگیا۔ فاخرہ سچ کالج کے لیے گھر سے نکلی تھی لیکن وہاں پہنچی نہیں تھی۔ اس نے بتایا کالج میں ایڈمیشن لیا تھا۔ میں نے اکثر اسے دوسرے سینئر لڑکوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور بات چیت کرتے دیکھا تھا۔ بھائی جان تو اس واقعے کے بعد فاخرہ کے نام سے بھی چڑنے لگے تھے۔ محلے کے ہر فرد کی زبان پر یہی بات تھی کہ فاخرہ گھر سے بھاگ گئی۔

اس کے باپ نے فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرا دی کہ اس کی بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے اور اس میں عرفان کا ہاتھ ہے۔ وہ کافی عرصے سے میری بچی کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

بھائی جان اس وقت کالج میں تھے۔ انٹرمیڈیٹ کی آخری سال تھا۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی مصروف رہنے لگے۔ رات کو دیر تک پڑھتے رہتے یا پھر اپنے کسی دوست کے پاس پڑھنے کے لیے چلے جاتے۔

شام کا وقت تھا جب پولیس ہمارے گھر پہنچی۔ اس وقت تک ابو بھی آفس سے آچکے تھے۔ دو وہاں سے پراری گئے تھے۔

پولیس کے اے ایس آئی نے اکبر لیے میں پوچھا۔

''عرفان گھر پر ہے؟''

''نہیں وہ تو کالج گیا ہوا ہے۔'' ابو نے جواب دیا۔

''عرفان سے کیا کام ہے آپ کو؟''

''اس نے ارشاد صاحب کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔'' اے ایس آئی نے بےتحاشا کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ وہ گھر نہیں ہوگا۔ وہ تو فاخرہ کو لے کر کہیں اور جا چکا ہوگا۔''

''آپ کیسی باتیں کررہے ہیں؟'' ابو بے ساختگی سے کہا۔ ''وہ کالج گیا ہے اور ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔''

''جب تک وہ نہ آئے، آپ ہمارے ساتھ چلو۔'' اے ایس آئی نے کہا۔

''تم ہوش میں تو ہو؟'' ابو کو ایک دم غصہ آگیا۔ ''میں کوئی خریرے پیچے والا یا بیوڑی نہیں ہوں کہ تم کو ہوا میں تمہارے ساتھ چل دوں گا۔ میں اخبار گزیٹڈ آفیسر کا ری الٹر ہوں۔ میرے ساتھ تمیز سے بات کرو۔''

''بزرگوار! ہی کیئر لیس یو بچوں کو بھی تو سکھائو۔ اس نے کوئی معمولی جرم نہیں کیا ہے۔ ایک لڑکی اغوا کی ہے۔''

اس وقت بھائی جان کالج سے آگئے۔ وہ پولیس کے اے ایس آئی کو دروازے پر دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے ابو سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے ابو؟''

''اوئے تو عرفان ہے؟'' اے ایس آئی نے پوچھا۔

''ہاں میں ہی عرفان ہوں۔'' بھائی جان نے کہا۔

''چل تجھے انچارج صاحب نے تھانے میں بلایا ہے۔''

''تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔'' بھائی جان نے کہا۔

''اوئے ہمارے ساتھ چل، نواب کی اولاد تو ہمیں اتنا بے وقوف سمجھتا ہے۔ میں تجھے چھوڑ کر جاؤں اور تو فرار ہوجائے۔''

بھائی جان نے اپنی کتابیں اور فائل میرے ہاتھوں میں دے دیں اور بولے۔ ''چلو کہاں چلنا ہے۔''

''میاں تم گھر انا صاف، میں بھی آرہا ہوں۔'' ابو نے کہا۔

بھائی جان کے جانے کے بعد ابو تو بیگ صاحب کے گھر کی طرف چلے گئے۔ میں نے بھائی جان کی کتابیں رکھیں اور تھانے کی طرف بھاگا۔ تھانہ ہمارے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔

اے ایس آئی نے بھائی جان کو لاک اپ میں بند کردیا اور بولا۔ ''ابھی انچارج صاحب نہیں ہیں۔ وہ آئیں گے تو بات ہوگی۔''

فاخرہ کا باپ تو پہلے سے وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیک صاحب، الہٰداد تھانے کا انچارج آگئے۔

انچارج نے بھائی جان کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ ''کیا ہے پیکر بھائی؟''

''ایک سال پہلے اس نے مجھ سے اظہار عشق کیا تھا۔ میں بھی اس کی باتوں میں آگیا۔ پھر جب اس نے سب لوگوں کے سامنے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا تو میں نے اس سے ملنا چھوڑ دیا۔'' بھائی جان نے کہا۔

پھر انچارج نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ جس وقت فاخرہ بھاگی ہے بھائی کالج میں تھے۔ پھر بیگ صاحب اور ابو کی کوششوں سے بھائی جان کو اس کیس سے رہائی ملی۔ پولیس کو ان کے خلاف ثبوت نہیں مل سکا تھا۔ ظاہر ہے کہ فاخرہ غائب تھی تو بھائی جان کو بھی غائب ہونا چاہیے تھا۔

اس واقعے کے بعد سے تو بھائی جان بالکل ہی مہم ہو گئے۔ وہ خود کو قصوروار سمجھتے تھے کہ ان کی چھوٹی سی بھول کی وجہ سے پورے گھر کی بدنامی ہوئی۔

آہستہ آہستہ اس واقعے پر بھی وقت کی گرد پڑ گئی۔

کالج سے فارغ ہو کر بھائی نے ایک بینک میں نوکری کرلی۔ سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا کہ محلے میں کشیدگی پھیل گئی۔ اس مرتبہ جمعہ چاچا کی بیٹی کلثوم گھر سے غائب تھی۔ وہ میٹرک میں پڑھتی تھی۔ ان سب واقعات میں سوائے ایک واقعے کے یہ بات مشترک تھی کہ غائب ہونے والی ہر لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ صرف ناصر لڑکا تھا ورنہ لڑکیاں ہی اغوا ہوئی تھیں۔

کلثوم شام کو اپنی خالہ کے گھر سے آرہی تھی کہ راستے سے غائب ہوگئی۔ ایک سرتھ پھر محلے میں ہاہا کار مچ گئی۔ پولیس میں رپورٹ درج کرائی گئی۔ کلثوم کو ہر طرف ڈھونڈا گیا لیکن دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی نہ ملی۔

محلے والوں نے اپنی بیٹیوں کے تحفظ کا ہاتھ میں ڈنڈے پکڑ لیے۔

نگہداری

باجی کی شادی ہو چکی تھی۔ ویسے امی کو زیادہ فکر نہیں تھی۔ البتہ وہ میری طرف سے فکرمند رہتی تھیں۔ لڑکیوں کو اسکول اور کالج چھوڑنے کی ذمے داری بیگ صاحب نے اپنے ذمے لے لی۔ وہ محلے کی تمام لڑکیوں کو صبح کے اپنے ساتھ لے جاتے اور انہیں اسکول اور کالج چھوڑ کر کے واپس لوٹ آتے۔ چھٹی کے وقت انہیں لینے بھی جاتے تھے۔ محلے والے بھی کچھ مطمئن ہوگئے۔

ان ہی دنوں ہمارے محلے میں ایک فیملی کرائے پر آکر رہنے لگی۔ اس میں ایک دو جوان لڑکیاں اقبال اور مائرہ تھیں۔ ایک میرا ہم عمر لڑکا آصف تھا اور ایک بچی تھی جس کی شادی ہونے والی تھی۔

جس دن اس لڑکی کی شادی تھی اسی شام وہ گھر سے غائب ہوگئی۔ اس مرتبہ لوگوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ محلے کے کچھ لوگ تو اسے جن اور بھوتوں کی کارستانی قرار دینے لگے۔ آخر وہ لڑکیاں کیسے غائب ہوئی تھیں اور کہاں گئیں کہ ان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ لوگ اتنے بددل ہوئے کہ وہ محلہ ہی چھوڑ گئے۔

بیگ صاحب نے اب بچوں کو پڑھانا چھوڑ دیا تھا۔ اب انہوں نے اپنے گھر میں کریم، ٹافیاں رکھ لیے تھے۔ شام کو ان کے گھر میں محلے کے دو جوان جمع ہو جاتے تھے۔ کچھ کریم ٹافیاں میں مصروف ہو جاتے کچھ شطرنج کھیلتے۔ بیگ صاحب بھی خصوصی طور پر ٹیچیں لیتے۔ وہ کہتے تھے کہ بچوں کو اس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رکھا جائے تو ان کے بگڑنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے

"ہاں صاحب!" ہوٹل کے مالک نے کہا۔ "یہ لڑکی دن میں دو دفعہ ادھر سے گزرتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہوتا تھا۔"

"تم نے آخری بار اسے کب دیکھا تھا خان۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

خان نے یاد داشت پر زور دیا اور چونک کر بولا۔ "اسے میں نے کل دیکھا تھا۔ پھر ایک گاڑی اس کا پیچھا کرتی ہوئی کار پر لگ کر تھوڑا آگے گئی تھی۔ پھر ایک گاڑی والا کوئی بچہ لایا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ کار پر جا رہا تھا۔ ہمارے پاس پرانی ٹھٹاس ہے ہم گاڑی والے کی شکل نہیں دیکھ سکا۔ پھر وہ لڑکی گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی چلی گئی۔" خان نے سوچ سوچ کر بتایا۔ "پھر ہم نے اس کو آتا کبھی ادھر جاتے نہیں دیکھا تھا ہم حیران رہ گیا کہ وہ لڑکی کہاں گیا۔ ہم نے ایک مزدور کے کہا کہ اس بچے کو اس کے گھر تک چھوڑ آئے۔"

"وہ گاڑی کون سی تھی؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"وہ نئے ماڈل کا ہنڈا تھا صاحب!" خان نے جواب دیا۔ گاڑیوں کے معاملے میں بھی ان کی معلومات عام لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس علاقے کے زیادہ لوگ کار والے ہوتے تھے یا پھر مزدوری کرتے تھے۔

"گاڑی کا نمبر دیکھا تھا؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں صاحب!" خان نے جواب دیا۔ ویسے اس عادت ہے کہ ہم گاڑی کا نمبر بھی دیکھتا ہے لیکن اس وقت تین گیراج (گیا تک) آ گیا اور ہم اور مصروف ہو گیا۔

"گاڑی کا رنگ۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"گاڑی کا رنگ سرخ تھا صاحب کالی کی جیسا بتر۔"

وہاں سے انسپکٹر اور دو کانوں پر گیا۔ وہاں بھی اس نے کنیز کی تصویر دکھائی اور اس کے بارے میں معلوم کیا۔

وہ دکان دار بھی اسے فوراً پہچان گیا اور بولا۔ "صاحب یہ لڑکی اکثر اپنے بچے کے ساتھ ہری دکان پر تانیاں اور پاپڑ وغیرہ خریدا کرتی تھی۔ اسے یہ بات یاد تھی کہ لڑکی کو آخری بار کب دیکھا تھا۔

ان دنوں کرسمس میں اتنی گاڑیاں نہیں ہوتی تھی جتنی اب ہیں۔ اس کے یاد جو گاڑیوں کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ انسپکٹر واقعی ذہین تھا کیا تھا۔ اس نے ریسٹرنٹ آفس سے تمام لوگوں کی آپ سٹری حاصل کی۔

متعلقہ ٹلارک نے دو دن میں انسپکٹر کو رپورٹ پیش کر دیا۔ انسپکٹر نے اس لسٹ میں صرف بڑی گاڑیوں کو لے کر پھر مزید کمی کی اور صرف ان کاروں کے نمبر نوٹ کیے جن کا رنگ سرخ تھا۔

اب لسٹ بہت مختصر ہو گئی تھی۔ انسپکٹر نے علاقے کے ہر تھانے میں اطلاع دی کہ سرخ رنگ کی ہنڈا جہاں بھی نظر آئے اسے اطلاع دی جائے۔

دو ایک مرتبہ اس جھونپڑی والی کے نزدیک سے گزرتا ہوا تھا کہ ہوٹل والے پینے رک گیا اس نے ہوٹل کے مالک سے پوچھا۔ "خان! کہیں نظر آیا وہ گاڑی والا؟"

خان نے نفی میں سر ہلا دیا پھر چونک کر بولا۔ "صاحب! کہیں ایک اور بات یاد آیا۔ اس گاڑی کا اس طرف ایک لائٹ لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ کسی بدبخت آدمی سے یہ گاڑی لے کر اس کا بیک لائٹ نوٹ کیوں تو اسے پکڑوا نہیں سکے۔"

انسپکٹر جوش میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اس روز سارے تھانوں کو اور خاص طور پر ٹریفک پولیس کو اطلاع دے دی کہ اس سرخ گاڑی پر نظر رکھیں جس کی بائیں طرف کی بیک لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے۔

اس سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ لگتا تھا کہ گاڑی کسی دوسرے شہر کی تھی یا پھر اس کے مالک نے بیک لائٹ فوراً ہی بدلوا لی ہے۔ ہر گھر کی تلاشی لینا ممکن نہیں تھی۔

پھر اس نے محلے میں تفتیش شروع کی۔ اس نے بیک صاحب کے گھر کا بھی جائزہ لیا اور ان سے کہا۔ "جناب آپ اپنا بیک گیٹ بند نہ کیا کریں۔"

"کیوں؟" بیک صاحب غرائے۔ "کیا یہاں جوا ہوتا ہے یا کوئی اور غیر قانونی کام ہے؟"

"یہاں بھی نہیں ہوتا لیکن آپ سے درخواست کرنا پڑا ہے کہ آپ کی کار کو کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا رہا ہے۔"

"انسپکٹر صاحب!" بیک صاحب غصیلے لہجے میں بولے۔ "ایک تو آپ میرے گھر کو بار بار بلیک کر کے اس کی توہین کر رہے ہیں پھر جو چاہ ہا ہے میرے گھر کے اندر ہوتا ہے یہ سلسلہ فوراً بند رست اندار ہی پولیس نہیں ہے۔"

"لیکن ہو سکتا ہے۔" انسپکٹر نے بھی نرمی سے کہا۔ "اگر یہاں سے کچھ برآمد ہو جائے تو آپ کے ساتھ ساتھ محلے کے بھی بہت سے لوگوں پر الزام آ سکتا ہے۔"

"آپ بے فکر ہی رہیں۔" بیک صاحب پکارے۔ "آپ شاید مجھے جانتے نہیں ہیں۔ میں اعلیٰ آفیسر ہوں۔ میرے ساتھ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں نوکروں کا کام کروں۔"

پھر اس نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "چلیے میں خود ہی آئی جی صاحب سے بات کر لیتا ہوں۔"

بیک صاحب نے ٹیلی فون سیٹ انسپکٹر سے لے لیا اور بولے۔ "انسپکٹر صاحب آپ کے تھانے کا ٹیلی فون نمبر نہیں ہے۔ رسیور اٹھائیں اس کلب کے ٹیلی فون سے آج ہی بند کروا دیتا ہوں، محلے والے آپ سے خوامخواہ نہیں لڑیں گے۔"

بھائی جان نے انسپکٹر سے سوال کیا۔ "آپ نے وہ کلب کیوں بند کروا دیا؟"

"وہاں دن رات لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "وہاں محلے ہی کے نہیں بلکہ دوسرے علاقوں کے لوگ بھی آتے تھے۔ کیا آپ نے بیک نوٹ نہیں کی؟"

"جی ہاں۔ یہ بات تو درست ہے۔" بھائی جان نے کہا۔ "بلکہ ان میں کئی لڑکے تو اوباش بھی ہیں۔"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے ان سب باتوں کا علم کیسے ہوا؟ اصل بات تو یہ ہے کہ انسپکٹر صاحب نے خود محلے کے تمام معززین کو بلا کر یہ کہا تھا کہ ہم اس سبز کار پر نظر رکھیں جس کی بائیں بیک لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کی یہ تفصیل بھی بتائی تھی کہ انہیں اس گاڑی کا علم کیسے ہوا؟ دوسری بات یہ کہ وہ انسپکٹر صاحب اپنے کو کنزن سے اس لیے ملنے گئے تھے کہ پہلے تو محلے والوں کو ساتھ ملا کر گھیرا بلیک کرنے کے لیے درخواست دینا چاہتی لیکن محلے کے لوگ واقعی ان لڑکوں سے پریشان تھے۔ جتنے لڑکے گھر کے اندر ہوتے تھے اتنے ہی گھر کے باہر چہرے پر بیٹھے رہتے تھے اور ہر گزرنے والی لڑکی کو گھورتے تھے۔ اب بیک صاحب خود بھی چور تھے ہر نہیں ہوتے تھے اس لیے ان لڑکوں کو کھڑکی کا دلاسا بھی کوئی نہیں تھا۔

ایک دن بیک صاحب نے مجھ سے کہا۔ "وقار بھائی! میں نے اپنے گھر کو کلب بنانے کے لیے بالکل قاعدہ درخواست دی ہے۔ میں حکومت کے اجازت نامے کے ساتھ کلب کھولوں گا اور اب کرسٹل بنیاد دیں پر کھولوں گا۔ وہاں آنے والوں کے لیے ممبر شپ لازمی ہوگی۔ پھر دیکھوں گا یہ انسپکٹر کیسے مجھے روکتا ہے۔"

"نکلا! کیا آپ پھر سے ممبر شپ نہیں لیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے جانے کی بات نہیں کرلیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "جاسو آئی جی صاحب جو حکم دیں میں اسی کے مطابق کام کروں گا۔" پھر اس نے ٹیلی فون سیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "چلیے میں خود ہی آئی جی صاحب سے بات کر لیتا ہوں۔"

بیک صاحب نے ٹیلی فون سیٹ انسپکٹر سے لے لیا اور بولے۔ "انسپکٹر صاحب آپ کے تھانے کا ٹیلی فون نمبر نہیں ہے۔ رسیور اٹھائیں اس کلب کے ٹیلی فون سے آج ہی بند کروا دیتا ہوں، محلے والے آپ سے خوامخواہ نہیں لڑیں گے۔"

بھائی جان نے انسپکٹر سے سوال کیا۔ "آپ نے وہ کلب کیوں بند کروا دیا؟"

"وہاں دن رات لوگوں کا مجمع رہتا تھا۔" انسپکٹر نے کہا۔ "وہاں محلے ہی کے نہیں بلکہ دوسرے محلوں کے لوگ بھی آتے تھے۔ کیا آپ نے بیک نوٹ نہیں کی؟"

"جی ہاں۔ یہ بات تو درست ہے۔" بھائی جان نے کہا۔ "بلکہ ان میں کئی لڑکے تو اوباش بھی ہیں۔"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے ان سب باتوں کا علم کیسے ہوا؟ اصل بات تو یہ ہے کہ انسپکٹر صاحب نے خود محلے کے تمام معززین کو بلا کر یہ کہا تھا کہ ہم اس سبز کار پر نظر رکھیں جس کی بائیں بیک لائٹ ٹوٹی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس کی یہ تفصیل بھی بتائی تھی کہ انہیں اس گاڑی کا علم کیسے ہوا؟ دوسری بات یہ کہ وہ انسپکٹر صاحب اپنے کو کنزن سے اس لیے ملنے گئے تھے کہ پہلے تو محلے والوں کو ساتھ ملا کر گھیرا بلیک کرنے کے لیے درخواست دینا چاہتی لیکن محلے کے لوگ واقعی ان لڑکوں سے پریشان تھے۔ جتنے لڑکے گھر کے اندر ہوتے تھے اتنے ہی گھر کے باہر چہرے پر بیٹھے رہتے تھے اور ہر گزرنے والی لڑکی کو گھورتے تھے۔ اب بیک صاحب خود بھی چور تھے ہر نہیں ہوتے تھے اس لیے ان لڑکوں کو کھڑکی کا دلاسا بھی کوئی نہیں تھا۔

ایک دن بیک صاحب نے مجھ سے کہا۔ "وقار بھائی! میں نے اپنے گھر کو کلب بنانے کے لیے باقاعدہ درخواست دی ہے۔ میں حکومت کے اجازت نامے کے ساتھ کلب کھولوں گا اور اب کرسٹل بنیاد دیں پر کھولوں گا۔ وہاں آنے والوں کے لیے ممبر شپ لازمی ہوگی۔ پھر دیکھوں گا یہ انسپکٹر کیسے مجھے روکتا ہے۔"

"یہاں کار دوبارہ کار دوبارہ ہے۔" پھر وہ ہنس کر بولے۔ "لیکن مجھے کے بجوں کے ساتھ یہ عنایت ہوگی کہ وہ فری گھنٹہ بھرسٹ حاصل کر سکیں گے۔"

میں نے یہ بات انسپکٹر صاحب کو بتائی تو وہ کہنے لگے۔ "میں نے محلے والوں سے پہلے ہی ایک درخواست لکھوا کر بھجوادی ہے کہ علاقہ مکینوں کو اس کلب کی وجہ سے بہت دقت ہوتی ہے۔ محلے کی لڑکیاں اس راستے سے گزر نہیں سکتیں چنانچہ اب کلب کو ختم کروا جائے۔ پھر یہ کوئی کمرشل علاقہ تو ہے نہیں۔ اس لیے کلب بھی نہیں کھل سکے گا۔"

مجھے کیرم کھیلنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ اس محلے میں کافی ماہر بھی ہو گیا تھا۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر کیرم کا ایک کلب تھا۔ کلب کیا ایک دکان میں دو تین کیرم بورڈ رکھ کر کلب بنا دیا گیا تھا۔ میں وہاں جانے لگا لیکن جو مزہ مجھے بیک صاحب کی چھت پر آتا تھا وہ وہاں نہیں آتا تھا۔

میں ان دنوں آٹھویں میں تھا۔ امتحانات ہو چکے تھے۔ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اس لیے ہم لوگ سارا دن فارغ رہتے تھے۔ سہ پہر سے ہی محلے کے لڑکے گلی میں نکل آتے اور کرکٹ شروع ہو جاتی۔ اس کے لیے ہم لوگ ہمیشہ کرکٹ کی بال استعمال کرتے تھے کیوں کہ اکثر گھروں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور کئی لوگوں کو سخت گیند سے چوٹیں بھی لگی تھیں۔

بیک صاحب اب دوبارہ چبوترے پر بیٹھنے لگے تھے۔ ان کے ساتھ محلے کے لڑکے ہوتے تھے لیکن صرف اس محلے کے۔ وہ کسی دوسرے علاقے کے بچوں کو وہاں نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔

ہم ایک مرتبہ پھر چبوترے پر بیٹھنے لگے اور بیک صاحب کی عنایت سے فیض اٹھانے لگے۔ وہ سیاست پر تو یوں بات کرتے تھے جیسے وہ سیاست پر اتھارٹی ہوں۔

ہم لوگ اکثر بڑے بلے لگا کر کرنٹ میچ کھیلنے لگے تھے۔ جن لوگوں نے نارتھ ناظم آباد دیکھا ہے انہیں اندازہ ہوگا کہ وہاں کی گلیاں کتنی چوڑی ہیں۔ پھر ہماری گلی تو کچھ زیادہ ہی چوڑی تھی۔ وہاں سے سڑک نکالنے کا پروجیکٹ تھا۔

دیکھیے بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں بات کر رہا تھا کرکٹ کی۔

اس دن شام کو ہم کرکٹ کھیل رہے تھے۔ میں نے زبردست ہٹ لگائی تو بال اوپر گلی کے کونے پر لگے ہوئے شیشم کے درخت کی شاخوں میں الجھ گئی۔ اب بال لڑکے کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ یا تو وہ گیند وہاں سے لے آئے یا پھر نئی گیند خرید کر لائے۔ اس دن کھیل کم ہی ہو سکا تھا۔ لڑکوں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ کل میں کچھ بھی کر لوں مغرب ہونے والی تھی اس لیے سب لڑکے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ میں بال کا وہ درخت بہت اچھی طرح جانتا تھا اور وہاں سے لڑنے والوں کو ڈرا دھمکا کر نکال کر لایا کرتا تھا۔ میں نے مجھے کے ایسے ایسے لڑکوں خوف زدہ کر رکھا تھا کہ مجھ سے اوپر کوئی جا کر دکھائے۔ اسی تکبر کی وجہ سے ہی تو میرا کرکٹ کا شوق ختم ہو گیا تھا۔

رات کو اکثر میں سے کوئی نہ کوئی اس شاخوں پر چڑھ جاتا تھا اور وہاں سے لڑنے والوں کو ڈرا دھمکا کر نکال دیا کرتا تھا۔ میں نے مجھے کے ایسے ایسے لڑکوں خوف زدہ کر رکھا تھا کہ مجھ سے اوپر کوئی جا کر دکھائے۔ اسی تکبر کی وجہ سے ہی تو میرا کرکٹ کا شوق ختم ہو گیا تھا۔

رات کو اکثر میں سے کوئی نہ کوئی اس شاخوں پر چڑھ جاتا تھا اور وہاں سے لڑنے والوں کو ڈرا دھمکا کر نکال دیا کرتا تھا۔ میں نے مجھے کے ایسے ایسے لڑکوں خوف زدہ کر رکھا تھا کہ مجھ سے اوپر کوئی جا کر دکھائے۔ اسی تکبر کی وجہ سے ہی تو میرا کرکٹ کا شوق ختم ہو گیا تھا۔

اس درخت تک پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کس طرف سے اوپر چڑھوں۔ میں آہستہ آہستہ اوپر چڑھ گیا لیکن گیند جانے کہاں نظر نہ آئی۔ میں مزید اوپر چڑھ گیا۔ ڈھونڈ نے لگا۔

اچانک میری نظر بیک صاحب کے گھر کی طرف اٹھ گئی۔ ان کی چار دیواری کے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ مجھے وہ دونوں جڑواں بچیاں وہاں دکھائی دیں جو پہلے ہمارے محلے میں آ کر رہی تھیں جن کی ایک بہن شادی والے دن غائب ہو گئی تھی۔ میں گویا کوئی بھول گیا اور ان لڑکیوں کو دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہی بیک صاحب دکھائی دیے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پلیٹ تھی جس میں رنگ رنگ مٹھائیاں تھیں۔ انہوں نے خوشی چھلانگ کر ہر ایک کو ایک ٹکڑا عطا کیا اور ان لڑکیوں کو بھی اصرار کر کے مٹھائی کھلانے لگے۔ دونوں لڑکیاں مزے لے لے کر مٹھائی کھا رہی تھیں۔ میں پھر گیند تلاش کرنے والا فی الحال کار چوبک اٹھانا بھول گیا۔ میں نے ایک لڑکی سے ہوچھا کہ وہ کون ہے؟ کہنے لگی۔

بیک صاحب اندر کمرے میں گئے اور وہ دونوں بچیاں آ گئیں۔ انہوں نے ایک چادر میں ایک لڑکی کو لپیٹ رکھا تھا۔ چوبک اٹھا لیا۔ تاہم دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میں بال لے کر اس وقت موبائل ہوتا تو میں بھاگ دوڑ سے بچ جاتا۔ میں جلدی سے درخت سے نیچے اترا اور محلے کی طرف بھاگ لگا دی۔ انسپکٹر اس وقت تو کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

مجھے ہوا میں دیکھ کر تو جوتے جوتے رک گئے۔

مجھے جلدی سے اپنی سائرن بجا دو۔"

وہ فوراً دو سپاہیوں کو لے کر پہنچ گئے۔ اس زمانے میں پولیس والوں کے پاس پولیس کی موبائل وغیرہ نہیں ہوتی تھی۔ پرانے زمانے کی زیرو میٹر ہوا کرتی تھی وہی ہمارے بڑے تھانوں میں۔ انسپکٹر صاحب کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ انہوں نے اپنے ایک ماتحت کو اپنے ساتھ بٹھایا اور بقیہ دو کو سیکیورٹی پر اپنے کی ہدایت کی۔ ان میں ایک کے ساتھ میں بھی بیٹھ گیا۔

جب پولیس والے وہاں پہنچے تو انہوں نے دو پولیس والوں کو سکان کے عقب میں بھیج دیا کہ وہ سکان کا ایک چوبی دروازہ جو پیچھے کی طرف کھلتا تھا، پر نظر رکھیں۔ پھر انہوں نے میں گیٹ پر لگی ہوئی اطلاعی گھنٹی بجائی۔

کچھ دیر بعد بیک صاحب اندر سے برآمد ہوئے۔ پولیس کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک اٹھے۔ پھر سنبھل کر بولے۔ "زہے نصیب! انسپکٹر صاحب آج کیسے زحمت فرمائی۔ کیا اب میرا گھر بھی تبدیل کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہم آپ کو سیل کرنا چاہتے ہیں۔" انسپکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"معاف کیجیے گا میں اس وقت آپ کو اندر نہیں بلا سکتا۔ میرے گھر کی پردہ دار آئے ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ پردہ دار خواتین بھی ہیں۔" بیک صاحب نے بہت متانت سے کہا۔

"ہم پردہ دار خواتین کی طرف دیکھے بھی نہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "آپ اندر تشریف لیجیں۔"

"آپ میری مرضی اور اجازت کے بغیر میرے گھر میں داخل نہیں ہو سکتے۔" بیک صاحب کا لہجہ بدل گیا۔

"تو آپ سے اجازت مانگ کون رہا ہے؟" انسپکٹر نے کہا۔ پھر درشت لہجے میں بولا۔ "اندر چلو۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے بیک صاحب کو دھکا بھی دیا۔

"یہ اچھا زبردستی ہے۔" بیک صاحب نے کہا۔ "پولیس خود ہی غیر قانونی حرکات کرے تو عوام کو کیسے روکے گی؟"

"اندر چل عوام کا بچہ۔" پولیس والے نے اس مرتبہ ان کی گردن پکڑ کر اندر دھکیلا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو میں دھک سے رہ گیا۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ سپاہیوں نے دوسرے کمروں میں بھی

پراسرار خط

محترم ایڈیٹر
آداب و نیاز
انسان کتنا ہی کچھ کرلے لیکن وہ قسمت کے آگے مجبور ہوتا ہے جسے انسان کبھی موت نہ ہو اسے چاہ کر بھی کوئی مار نہیں سکتا۔ زیر نظر روداد بھی ایک ایسے ہی شخص کی ہے۔ پتا نہیں شرجیل کہاں ہو گا لیکن اس کی کہانی میں بھولنے کی کوشش کروں بھی تو بھول نہیں سکتا۔
صداقت حسین ساجد
(شور کوٹ۔ جھنگ)

جیسے جیسے میں خط کی عبارت پڑھتا گیا، میرے دل کی دھڑکن بڑھتی گئی۔ میرے سامنے بیٹھے کاشف کا چہرہ بھی زرد تھا، جیسے اس کا سارا خون نچڑ لیا گیا ہو۔ خط کا مضمون کچھ اس طرح کا تھا۔

پیارے کاشف!

مجھے اُمید ہے کہ تم خیریت سے ہو گے۔

تم نے اس سال بھی پہلے کی طرح سرمائیوں کے شکار کا منصوبہ بنا رکھا ہو گا۔ اس بار بھی تم مجھے اپنے ساتھ باؤ گے۔ تمہارے لیے ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ اس سال مرغابیوں کی ایک بہت بڑی تعداد ہجرت کر کے جھیل پر آئی ہے اور ہاں! مضمور کو اپنے ساتھ لانا مت بھولنا، ہم تم دونوں کا انتظار کروں گا۔

فقط والسلام تمہارا دوست
شرجیل

خط کے نیچے لکھا ہوا نام پڑھ کر میں حیرت سے کاشف کو تکنے لگا۔

آپ کو یقیناً حیرت ہو رہی ہو گی کہ ایک دوست کی طرف سے شکار کی دعوت ملنے پر ہم اتنے خوف زدہ کیوں ہیں؟ تو سنیں۔ میں اور کاشف بچپن کے دوست ہیں اور ہم نے بہت سے ایسے خطرناک کام کیے ہیں کہ صرف ان کا ذکر سن کر عام آدمی کو پسینا آ جائے۔ مگر یہ خط پڑھ کر خود ہماری حالت بری تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ خط ہمارے اس دوست شرجیل نے لکھا تھا جسے ایک سال پہلے ہم اپنے ہاتھوں سے دفن کر چکے تھے۔

شرجیل کی موت ایک حادثاتی شے چھپانے کے لیے ہم نے اسے جھیل کے نیم دلدلی جنگل ہی میں دفن کر دیا تھا۔ ہر سال مرغابیوں کا شکار کرنے کے لیے جھیل جانا، ہم تینوں کا معمول تھا۔

شرجیل کراچی کے ایک نجی ادارے میں اکاؤنٹینٹ کے طور پر کام کرتا تھا۔ کاشف ایک انشورنس کمپنی کا کلرک تھا۔ جب کہ میں ایک انجینئر تھا اور ایک بہت اچھی ملازمت کر رہا تھا۔ اگرچہ ہمارے شعبے الگ الگ تھے لیکن شکار اور مہم جوئی کے شوق نے ہمیں ایک اکھٹا کر رکھا تھا۔ شوق کو پورا کرنے کے لیے ہم نے کئی سفر کیے تھے۔ کئی مہمات سر کی تھیں۔ دلدلی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی فضا جس بلا زدہ تھی۔ رات کو خطرناک کیڑوں اور مچھروں کی بھرمار نے لوگوں کو اس طرف کا رخ نہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب یہ علاقہ ویران تھا۔ پچھلے سال تو یہاں چند لوگ ہی شکار کے لیے آتے تھے۔ وہ بھی ہنگامی بنیادوں پر شکار تھے۔ یہ بات ہمارے لیے تازہ مسئلہ تھی۔ ہم اُس جگہ جانے ہی اس لیے تھے کہ شہر کی ہنگاموں سے بھرپور زندگی سے کچھ دن کا چھٹکارا مل جائے۔ جب سے یہاں شکار یوں نے آنا چھوڑا تھا، تب سے یہاں مختلف قسم کے پرندوں نے اپنا ڈیرا ڈال دیا تھا۔ یوں ہمارے شکاری جذبے کی تسکین کا خاطر خواہ انتظام قدرت کی طرف سے خود بخود ہو گیا تھا۔

کاشف نے ایک پرانا کیچ خرید رکھا تھا۔ یوں وہاں رہنے کا سلسلہ مل ہو گیا تھا۔ مرغابیوں کی طرح کے بے ضرر پرندوں کے شکار کے لیے ہلکے ہتھیار موجود تھے۔

شرجیل ادارے کے پُراسرار خط میں الجھا ہوا تھا کہ یہ مذاق کیا کسی نے۔

☆.....☆

ایک سال پہلے رونما ہونے والے واقعات آج بھی میرے ذہن میں اسی طرح تازہ تھے، جیسے کل پیش آئے ہوں۔

اس دن ہم صبح سویرے کراچی سے روانہ ہوئے۔ بارشوں نے راستے کو بہت خراب کر دیا تھا۔ اوپر سے سنسر فون بھی تھا۔ اس راستے پر سنیچر اور سپلسن اس قدر تھی کہ ہم بڑی مشکل سے سفر جاری رکھے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں تو رات اتنا تک ہو جاتا تھا کہ کسی اور گاڑی کو پاس کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ راستہ آخر کار دلدلی جنگلات تک جا پہنچتا تھا۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر جھیل تھی۔ یہ ایک زبردست قدرتی جگہ تھی۔ دلدلی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں کی فضا

جنگل کی طرف سے آنے والے خطرناک درندوں کے استقبال کے لیے دور مار رائفلیں بھی ساتھ تھیں۔

تین گھنٹے کے تھکا دینے والے سفر کے بعد ہم لکڑی سے بنے ہوئے اس کاٹیج تک پہنچ گئے۔ اس میں دو کمرے تھے۔ ایک کو ہم سونے کے لیے استعمال کرتے تھے اور دوسرے میں اپنا سامان وغیرہ رکھتے تھے۔ وہاں پہنچتے ہی ہم نے مختلف کام اپنے ذمے لے لیے تھے۔ کاشف کے ذمے صفائی کا کام تھا اور وہ بالکل کسی ماہر خاتون کی مانند یہ کام کرتا تھا۔ شرجیل کے ذمے گاڑی اور سامان کی دیکھ بھال تھی۔ رہ گیا میں، تو میرے ذمے باورچی خانہ تھا۔

اس دن تھکاوٹ کی وجہ سے ہم نے وہ کھانا استعمال کرنا تھا جو ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔ جتنی دیر میں ہم چھوٹے موٹے کاموں سے فارغ ہوئے، سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہم نے کھانا کھایا اور گپ شپ لگانے لگے۔ پھر نیند آنے لگی تو ہم سونے کی تیاری کرنے لگے۔ ہمارے پاس زپ سے بند ہونے والے خصوصی بستر موجود تھے۔ ان کی وجہ سے ہم مچھروں اور کیڑے مکوڑوں سے بالکل خوف زدہ نہیں تھے۔

بہت زیادہ تھکاوٹ کی وجہ سے اگلے دن کوئی بھی جلدی نہ اٹھ سکا۔ دس بجے کے قریب میری آنکھ سب سے پہلے کھلی۔ ان دونوں کو جگانے کے بعد میں نے تولیہ اور ٹوتھ برش لیا اور جھیل کی طرف چل دیا۔ باہر تھوڑی سی دھند چھائی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی مگر یہ سردی مجھے اچھی لگ رہی تھی۔ جھیل کا پانی بہت ٹھنڈا تھا لیکن میں نے ہمت سے کام لیا اور برداشت کرتے ہوئے ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھویا اور واپس آ کر چولہے پر چائے کا پانی رکھ دیا۔

وہ دونوں جاگ تو گئے تھے لیکن لیٹے ہوئے تھے۔

"بھئی! اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔" میں نے انھیں باری باری جھنجوڑ کر کہا۔ "ہم یہاں سونے کے لیے نہیں آئے ہیں بلکہ تفریح کے لیے آئے ہیں۔"

"رات کو میں نے ایک بہت خوف ناک خواب دیکھا ہے۔" کاشف نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"یہ کون سی نئی بات ہے، تم جب بھی کوئی خواب دیکھتے ہو وہ خوف ناک ہی ہوتا ہے۔ کبھی تم نے اچھا اور سہانا خواب بھی دیکھا ہے۔" شرجیل نے جملہ کسا۔

"اصل میں سوتے ہوئے مجھے تمھارا چہرہ دکھائی دیا تھا، اس لیے خوف ناک خواب تو آنا ہی تھا۔" کاشف نے بھی یہ کہہ کر حساب برابر کر دیا۔

ان دونوں کے درمیان اکثر ایسا مذاق چلتا رہتا تو میں خاموشی سے ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اب بھی میں بڑے خاموش رہتا لیکن دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے بول پڑا۔ "اب اٹھ جاؤ پھر باتیں کرتے رہنا۔"

وہ دونوں اٹھ تو گئے لیکن ان کی باتیں ختم نہ ہوئیں۔ وہ تیار ہو گئے اور میرے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ ہمارے پاس ہی ایک اسٹول پر ایک چھوٹا سا ریڈیو پڑا ہوا تھا۔ یہ ریڈیو شرجیل کا تھا اور وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس وقت اس پر کرکٹ میچ آ رہا تھا۔ ہمیں کرکٹ سے گہری دل چسپی تھی، اس لیے ہم بڑی توجہ سے کمنٹری سن رہے تھے۔ کمنٹری ختم ہوئی اور خبریں شروع ہو گئیں۔ ہم پوری توجہ سے خبریں سننے لگے۔ "آج صبح چند نامعلوم افراد نے مقامی بینک کی بکتر بند گاڑی پر حملہ کر کے اس کے ڈرائیور اور محافظوں کو قتل کر دیا اور گاڑی چھین کر لے گئے۔ گاڑی کی تجوری میں کئی لاکھ روپے موجود تھے۔ گاڑی اور مجرموں کا ابھی تک سراغ نہیں مل سکا ہے۔ لوگوں سے درخواست ہے کہ وہ اگر ڈاکوؤں یا گاڑی کا کوئی سراغ پائیں، تو فوراً مقامی پولیس اسٹیشن کو اطلاع دیں، اطلاع دینے والے کو معقول انعام بھی دیا جائے گا۔"

خبریں ختم ہوئیں تو کچھ دیر کے لیے فضا میں خاموشی سی چھا گئی۔ اس خاموشی کو کاشف کی آواز نے توڑا۔

"کاش! مجھے یہ رقم مل جائے تو میرے سارے ادھورے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔" اس نے اپنے ہونٹوں کو گول کر کے سیٹی مارتے ہوئے کہا۔

"بھئی! مجھے تو اتنی بڑی دولت کا کچھ حصہ بھی مل جائے تو میرے دن تبدیل ہو سکتے ہیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"پہلی تو بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ کام کیا ہے، وہ کبھی تمھارے حوالے نہیں کریں گے۔" شرجیل ہمارے خوابوں کے محل گراتے ہوئے بولا۔

"چھوڑو بھئی!" میں نے چائے کی پیالی ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "جو چیز ہمارے مقدر ہی میں نہیں ہے، اس پر بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

ان دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا اور پھر ہم تینوں اپنے اپنے ہتھیار سنبھال کر جھیل کی طرف چل دیے۔ ہوا میں پہلے کی نسبت زیادہ ٹھنڈک تھی۔ جھیل کی سطح سے

بھاپ سا دھواں اٹھ کر چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ یہ ماحول شکار کے لیے بہت نامناسب تھا، کیوں کہ دھند کی وجہ سے انسانی نظر چند فٹ سے آگے کام نہیں کر رہی تھی۔ اب ہمیں اس وقت کا انتظار تھا جب سورج اونچا ہو، کیوں کہ سورج جوں ہی اونچا ہوتا، دھند چھٹ جاتی۔ ہم اس وقت کے انتظار میں جھیل کے کنارے پر موجود ایک اونچی جگہ پر بیٹھ گئے۔

ابھی ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک پاس ہی سے ایسی آواز آئی...... جیسے کسی بھاری جانور کے پیروں تلے آ کر سوکھی جھاڑیاں ٹوٹ رہی ہوں۔ میں نے بہت تیزی سے اپنی رائفل اٹھائی۔ یہ اتنی طاقت ور رائفل تھی کہ اس کی ایک ہی گولی شیر کو بھی ہلاک کر سکتی تھی۔ کاشف اور شرجیل کے پاس چھرے والی عام رائفلیں تھیں۔ انھیں بھی اگر قریب سے استعمال کیا جاتا، تو یہ بھی مہلک ثابت ہوتیں۔

"احتیاط سے......" میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دھند کی دوسری طرف دیکھنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہمارے علاوہ یہاں اور کون ہو سکتا ہے، سب ہماری طرح پاگل تھوڑی ہیں!" کاشف بڑبڑایا۔ "مجھے تو کوئی جانور لگتا ہے؟"

ہم نے اس طرف چند قدم ہی بڑھائے تھے کہ ہمارے کانوں نے تیز تیز سانسوں کی آواز سنی۔ یوں لگا کہ جیسے کوئی طاقت ور درندہ ہوا سونگھ کر کچھ جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ابھی میرا ذہن اسی الجھن میں مبتلا تھا کہ اچانک ہوا میں کسی آدمی کا قہقہہ گونجا۔ خون ہماری رگوں میں جم سا گیا۔

"تم نے کچھ سنا؟" میں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں ان دونوں سے پوچھا۔

"کسی آدمی کی آواز تھی۔"

شرجیل نے میری تائید کی۔ پھر وہ ہمیں منع کرتے ہوئے بولا۔

"کوئی فائر نہ کرے، شاید ہمارے علاوہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔"

"اگر ایسا ہے، تو پھر اس کی زندگی شدید خطرے میں ہے۔" میرے منہ سے پریشانی کی حالت میں نکلا۔ "میں نے ابھی کسی درندے کی غراہٹیں بھی سنی تھیں۔"

اس سے پہلے کہ ہم میں سے کوئی کچھ کہتا، ایسی آواز آئی جیسے کوئی جانور جھیل میں سے پانی پی رہا ہو۔

"مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔" کاشف کی خوف زدہ آواز ابھری۔ "چلو! یہاں سے......"

ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ درندے کی دبی دبی غراہٹوں کے درمیان ایک بار پھر کسی آدمی کا قہقہہ گونجا۔ یہ قہقہہ پُرسکون تھا اور اس میں ذرا بھر بھی خوف شامل نہیں تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس عجیب و غریب صورتِ حال کو کیا نام دوں۔

اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی وہ وقت جب یاد آتا ہے، تو مارے خوف کے میرا جسم پسینے میں بھیگ جاتا ہے۔

ہم تینوں سانس روکے کھڑے رہے۔

اگر بات صرف درندوں کی ہوتی، تو ہم یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتے کہ شاید جنگلی بھیڑیے وغیرہ جھیل پر پانی پینے آئے ہوں گے لیکن ایک آدمی کی وہاں موجودگی اس معاملے کو پُراسرار بنا رہی تھی۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ہم کافی وقت جنگلوں میں گزار چکے تھے، اس لیے ہم مختلف جنگلی جانوروں کی آوازیں پہچان لیتے تھے۔ وہ آوازیں جنگلی بھیڑیوں یا ریچھوں کی ہرگز نہیں تھیں۔ ان کے علاوہ اس جنگل میں اور کوئی بڑا درندہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔

آہستہ آہستہ غراہٹیں غائب ہو گئیں، تو ہم سمجھ گئے کہ وہ یہاں سے چلے گئے ہیں۔

شرجیل نے گہری سانس لی اور کہنے لگا۔

"اف میرے خدایا! مجھے تو یہ کوئی خوف ناک خواب لگ رہا ہے۔"

"اللہ تعالیٰ جانے کیا معاملہ تھا۔" میں نے کہا۔ "آؤ! واپس چلیں...... کہیں وہ دوبارہ ادھر نہ آ نکلیں۔"

دونوں نے میری تائید کی اور ہم واپس کاٹیج کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی دیر بعد سورج بھی نکل آیا اور اس کی گرمی نے دھند دور کر دی۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ آس پاس کے دلدلی میدان کو سبزے نے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔

"یہ...... یہ...... کیسی آواز ہے؟" اس نے اپنی نگاہیں جھیل تک آنے والی کیچڑ زدہ سڑک پر گاڑتے ہوئے کہا۔

اگرچہ مجھے اور شرجیل کو کچھ نہیں سنائی دیا تھا مگر ہمیں پتا تھا کہ کاشف کی سننے کی حس بہت تیز ہے۔ وہ چاروں

طرف گھوم رہا تھا۔ آخر کار اس نے مشرق کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی گاڑی ادھر سے آرہی ہے۔“

ہم نے توجہ سے سننے کی کوشش کی تو ہمیں بھی کسی گاڑی کے انجن کی ہلکی سی گھرگھراہٹ سنائی دینے لگی۔

شرجیل نے پوچھا۔ ”کیا یہ کوئی دوسرا شکاری گروہ ہو۔“ ”شاید کوئی دوسرا شکاری گروہ ہو۔“ میں نے رائے دی۔

پھر ہم تینوں بھاگ کر اپنے کاپچ میں پہنچ گئے۔ کاشف اندر سے دوربین اٹھا لایا۔ اس نے چھت پر چڑھ کر دوربین آنکھوں سے لگالی۔

”اف میرے خدایا!“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”یہ..... یہ تو ٹینک کی گاڑی ہے۔“

”کک..... کک..... کیا مطلب؟“ میں اور شرجیل چلّا اٹھے۔

”اس برفستان صاف دکھائی دے رہا ہے۔“

یہ سن کر ایک لمحے کے لیے ہمیں سانپ سونگھ گیا۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

”تت..... تت..... تمہارا مطلب ہے۔ یہ وہی گاڑی ہے جسے ڈاکو اغوا کرنے لگے تھے؟“ شرجیل نے کہا۔

کاشف نے دوربین نظروں سے ہٹا کر کندھے اچکائے اور پھر جواب دیا۔

”شاید وہی ہے اور اس کا رخ ہمارے کاپچ کی طرف ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ قانون سے بچنے کے لیے ادھر آرہے ہیں۔“ شرجیل بڑبڑایا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟“ کاشف نے دوربین دو بارہ آنکھوں سے لگا کر پوچھا۔

”بھئی! سیدھی سی بات ہے۔“ شرجیل نے جواب دیا۔ ”ہمارا کاپچ پورا سنسان خالی پڑا رہتا ہے، اس لیے مجرموں نے اسے اپنا ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔“

”مگر تو ہماری جانوں کو بھی اس سے بہت خطرہ ہے۔“

اتنا کہہ کر کاشف چھت سے اتر آیا۔

”ہمیں فوراً اپنے آپ کو گاڑی سمیت چھپانا چاہیے..... ورنہ اب وہ لوگ اپنا راز چھپانے کے لیے ہمیں قتل بھی کر سکتے ہیں۔“

یہ سن کر میں پریشان ہو گیا۔ صورتِ حال ایسا کہ خوف ناک رخ اختیار کر گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہم ریڈیو پروڈاکسٹ کی خبر سنی تھی، تو ہم میں سے کسی نے بھی کچھ سوچا تھا کہ اتنی جلدی اس خوفی ڈراما میں ہم بھی شامل ہو جائیں گے۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ ہمیں قتل کرنا ہے کے لیے کون سا سائنٹفک کام کیا جائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہمیں کوئی فیصلہ نہیں کرنا تھا۔ وقت کام تو جانے کب سے کر رہے ہوں گے۔

”دل..... دل..... لیکن..... ہم فوراً کہاں چھپیں؟“ شرجیل کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”یہ وقت سوچنے کا نہیں ہے۔“

کاشف یہ کہہ کر جلدی سے گاڑی میں سوار ہوا اور اسے کاپچ کے پیچھے لائی ہوئی جھاڑیوں میں لیں کرا کر روکنے کے ساتھ ہی دو دھماکی نہیں دیتی۔

”اب ہم کہاں جائیں گے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”ہم اپنے ہتھیار سنبھال کر سامنے والی جھاڑیوں میں چھپ جائیں گے۔“ کاشف نے کارتوسوں کی پیٹی کو کاندھے سے باندھتے ہوئے کہا۔

اس کے سوا اور کوئی حل بھی تو نہیں تھا۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے تھے کہ تھوڑی دیر بعد بکتر بند گاڑی کاپچ کے دروازے پر آکر رک گئی۔ تین افراد اچھل کر باہر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں اور سر پر خوف ناک ماسک چڑھے ہوئے تھے۔ ہم سے وہ مشکل سے چند گز کے فاصلے پر تھے۔

”تو یہ ہے وہ جگہ۔“ ان میں سے ایک نے کاپچ کا تنقیدی نظروں سے جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”کیسی ہے؟“

دوسرے کے لہجے میں فکر تھا۔ شاید اسی نے ہماری اس ذاتی تفریح گاہ کا پتا لگایا تھا۔

”اس کے مالک سارا سال غائب رہتے ہیں۔“

”لیکن اگر وہ ہماری موجودگی کے دوران میں یہاں آجائے تو؟“ پہلے نے ذہانت بھرے لہجے میں کہا۔

”تو کیا ہوا پیارے!“ دوسرا کہہ کر ہنسی پیتے ہوئے بولا۔ ”اس کا بھی آسان سا حل ہے۔“

”وہ کیا.....؟“

”ہم ان کا قصہ پاک کر دیں گے۔“

یہ سن کر ہمارے جسموں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کاشف کو خطرہ ہی خطرہ نظر آرہا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً اپنے اپنے رائفل سے اس کا نشانہ لے لیا مگر میں نے اس کی رائفل جھکا دی۔

”بے وقوف نہ بنو۔“ میں نے سرگوشی کی۔ ”ان تینوں کے پاس خود کار رائفلیں ہیں، جتنے وقت میں ہم اپنی رائفلیں تیار کریں گے وہ ایک ہی برسٹ میں ہمارا خاتمہ کر دیں گے۔“

یہ سن کر کاشف نے گھوڑے پر سے انگلی ہٹالی مگر اس کی آنکھوں میں سے شعلے برابر بھی نکل رہے تھے۔ شرجیل میری تائید کرتے ہوئے بولا۔

”ہمیں یہ ہتھیار شکار کرنے کے لیے خریدے ہیں، انسانوں کے چیتھڑے اڑانے کے لیے نہیں۔“

”تم دونوں شاید بھول رہے ہو کہ وہ عادی مجرم اور سفاک قاتل ہیں۔“ کاشف نے کہا۔

”اور اگر انہوں نے ہمارا شکار کر لیا تو؟“

”کوئی کسی کو ایسے ہی گولی نہیں مار دیتا۔ قتل کرنے کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔“

تبھی ان میں سے ایک ڈاکو اسی جھاڑی کی طرف دیکھتا ہوا بڑھا جہاں پر ہمیں چھپے ہوئے تھے۔ شاید اسے شک ہوا تھا۔ اسے آگے بڑھتے دیکھ کر کاشف نے گھبرا کر گھوڑا بڑھا دیا۔

وہاں کے سے فضا گونج اٹھی۔ ڈاکو کے سینے سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور وہ دوسری سانس بھی نہ لے سکا۔

اس کے بعد ایک لمحے کے لیے فضا پر سکون رہی۔ پھر اگلے ہی لمحے ڈاکوؤں نے جھاڑیوں کی طرف گولیوں کی بارش کر دی۔

”یہاں سے نکلو۔“ شرجیل نے زمین سے چپک کر پیچھے رینگتے ہوئے کہا۔

گولیاں جھاڑیوں کو چھیدتی ہوئی ہمارے ادھر سے گزر رہی تھیں۔ اس وقت کاشف نے ڈاکوؤں کی طرف دو سر فائر کیا۔ اس سے ڈاکوؤں کا تو کچھ نہ بگڑا، لیکن اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ چند لمحوں کے لیے ان کے حملہ آور خاموش ہو گئے۔ ہمارے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ ہم ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جھاڑیوں سے نکل کر چند قدم دور موجود جھونپڑ کے قریب بنی ہوئی کھائی کے میدان کی طرف دوڑ پڑے۔ اس دوران میں شاید ڈاکوؤں نے ہمیں دیکھ لیا تھا کیوں کہ ان میں سے ایک کو میں نے چلاتے ہوئے سنا۔

”وہ..... وہ..... وہ بھاگ رہے ہیں۔“

اس کے ساتھ ہی فضا میں تار گولیوں کے دھماکوں سے گونج اٹھی۔ اگر ہم تیزی سے زمین پر نہ لیٹ جاتے۔ تو ہمارے سروں پر سے گزرنے والی گولیاں یقیناً ہمارے جسموں کو چھلنی کر ڈالتیں۔

اچانک فائرنگ رک گئی۔ ہم سانس روکے وہیں لیٹے رہے۔ وہ میدان کا کھلی حصہ تھا۔ اگر کسی نے ہم کو لیں دی۔ تو بھاگنے سے نتیجہ نکلے گا۔ لیکن..... اب ڈاکو ہمیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ انہیں دیکھنے کے لیے گھاس میں سے سر اٹھانا کردِ گمان ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

”یہاں سے کسی نہ کسی طرح ہے نکلو۔“ میں نے خوف زدہ خرگوش کی طرح ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”کہیں وہ ہمیں ڈھونڈ نہ رہے ہیں۔“

”مگر جائیں کہاں؟“ شرجیل کی آواز آئی۔ ”سر اٹھاتے ہی ان کی گولیاں ہمیں ختم کر ڈالیں گی۔“

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

”جنوب کی طرف درختوں کا جھنڈ ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اگر ہم وہاں تک سکھنچتے ہوئے پہنچ جائیں، تو پھر جنگل میں چھپنا ہمارے لیے آسان ہو گا۔“

”میں جنگل میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ کاشف نے گھبرا کر کہا۔ ”کیا تم لوگ جنگل پر آنے والی بلاؤں کو بھول گئے ہو؟“

ڈاکوؤں کے حملے کی وجہ سے میں جنگل والے پُراسرار معاملے کو بھول بیٹھا تھا۔ اب کاشف نے یاد دلایا تو میرا دل ایک بار پھر ڈوبا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ شکار کی یہ ہماری چھوٹی سی مہم اس قدر خطرناک ہو جائے گی۔ میرا ذہن ابھی ان ہی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اپنے پیچھے ہلکی سی آہٹ سن کر میں بے اختیار رائفل سمیت پیچھے کی جانب مڑ گیا۔ وہ دھک سے رہ گیا۔ ایک کرخت شکل والا ڈاکو رائفل تانے ہمیں گھورتے ہوئے سفاکانہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اتنی خطرناک تھی کہ میں اپنی جگہ جم کر رہ گیا۔

اس کی انگلی کی صرف ایک حرکت ہم تینوں کی زندگیوں کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ ایک لمحہ بھی نہیں گزرا تھا کہ خاموش فضا دھماکے سے گونج اٹھی۔ ڈاکو حرکت سے اپنے سینے میں بنے واسوراخ پر نگاہیں ڈالتا ہوا جس سے خون بھل بھل کر نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل نکل گئی اور وہ منہ کھولے ایک لمبی سی کراہ بلند کر پیچھے کی طرف گر گیا۔

شرٹیل کی رائفل کا تھا۔ جب ہم تینوں مردہ ڈاکو کی لاش کی طرف متوجہ ہوئے تو اس دوران میں تیسرا بندہ اٹھ کر فائرنگ کی آواز پیدا کیے چلتا ہوا ہمارے سروں پر پہنچ گیا۔ پہلا دھماکا ہوتے ہی میں جلدی سے زمین پر گر گیا۔ کاشف نے بھی میری تقلید کی لیکن..... افسوس! شرٹیل کو مہلت نہ مل سکی۔ وہ ویسے بھی ہم دونوں کے پیچھے ڈھال بنا کھڑا تھا، اس لیے گولی اس کے جسم میں گھس گئی۔ ڈاکو کچھ دیکھنے کے لیے اپنی جھونک میں چند قدم آگے بڑھا تو ہمارا نشانہ بن گیا۔ ہماری رائفلوں سے نکلنے والے چھروں نے مجاور نما ہی نہیں بلکہ حقیقت میں اس کا سینہ چھلنی کر دیا تھا۔

ڈاکوؤں کی موت کا یقین کر لینے کے بعد ہم جلدی سے شرٹیل کی طرف بڑھے، اس کی حالت بہت خراب تھی۔ پیٹ خون سے سرخ ہو چکا تھی۔ اس کا جسم اگر چہ ساکت تھا ..... مگر حرکت انگیز طور پر اس کی نبض چل رہی تھی۔

"وہ ابھی زندہ ہے۔" میں نے کاشف کو بتایا۔

"مگر اس کا بچنا مشکل ہے۔" اس نے میرے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "اگر ہم اسے اسپتال لے جانے میں کامیاب ہو جائیں، تو شاید بچ جائے۔"

"لیکن..... اس طرح ہم گاڑی میں رکھی رقم سے محروم ہو جائیں گے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔" میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "ہمارے دوست کی زندگی خطرے میں ہے اور تم پر لالچ کا بھوت سوار ہے۔"

"میرا دماغ بالکل درست ہے۔" وہ بے رحمی سے میرا ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "ہم تو ہماری قسمت بدل سکتی ہے اگر ہم شرٹیل کو اسپتال لے گئے تو ہمیں اربوں روپے پڑے گا یوں یہ سونج ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس ویرانے میں ہونے والے ان خونی واقعات کے گواہ صرف ہم ہی ہیں پھر اسپتال لے جانے کے باوجود شرٹیل کی جان بچنے کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔ ڈاکوؤں سے مقابلہ کر کے ہم نے اپنی جانیں خطرے میں ڈالی ہیں۔ اگر ہم نے رقم حکومت کو واپس کر دی تو سوائے کاغذی انعامات کے ہمیں کچھ اور نہیں ملے گا۔"

کاشف کی باتیں سن کر میں نے جان گئی کے عالم میں

جلتا شرٹیل پر نظر ڈالی اور اپنا سر آستین میں مار کر رہ گیا۔ اس کے دلائل اتنے کمزور بھی نہیں تھے۔

"مگر اب ہم کیا کریں؟" میرے لہجے سے اختیار نکلا۔

"ہم شرٹیل کی لاش یہیں دفن کر دیتے ہیں۔" اس نے مجھے قائل ہوتے دیکھ کر تجویز پیش کی۔ جواب دیا۔ "ڈاکوؤں کی لاشیں ان کے اسلحے سمیت بکتر بند گاڑی کے اندر چھپے ہیں، بکتر بند گاڑی کے اندر کا حصہ بھی ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے، اس میں فرق کو برسوں بھی پھر فرق ایک سال بعد حصہ لے سونا نکال لیں گے۔ تب تک یہ معاملہ ٹھنڈا ہو چکا ہوگا۔"

"لیکن....."

"کیا لیکن....."

"لیکن..... اگر شرٹیل کے بارے میں ہم سے پوچھا گیا، تو کیا وضاحت پیش کریں گے؟" میں نے اس کے مشورے پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں کوئی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں ہے دوست!" وہ پہلی بار مسکرا کر بولا۔ "شرٹیل کیا اخبار نہیں پڑھتا ہے کہ ہمارے سوا اس کا شہر میں کوئی اور دوست نہیں تھا، راناصاحب کی ادارہ تو اسے ہم سے بہتر جواب دیں گے کہ شرٹیل شہر کے بدمعاش سے اکثر کیا ہے آمالی قصبہ چلا گیا ہے، ہاں یہ کہ وہ کوئی مالی غبن تو کر کے نہیں گیا، اس لیے کچھ عرصہ کھانے کے بعد ادارہ بھی اسے بھول جائے گا۔"

آزاد! زیادہ دیکھتے ہیں کہ گاڑی میں رقم کہاں رکھی ہوئی ہے؟" مجھے سوچتے ہوئے دیکھ کر کاشف نے کہا۔

پھر ہم اپنے دوست کو خون میں لت پت چھوڑ کر اٹھ گئے۔

بکتر بند گاڑی کے پچھلے حصے میں ایک آگ اگلنے والا مشین گن نصب تھا۔ یہ خصوصی نمبروں سے کھلنے والی تجوری تھی لیکن ڈاکوؤں سے کھلوانے کے بجائے ہم اسے بند بند کر کے آرے سے کاٹنے والے تھے۔ کئی سو گز کی دوری پر خندقیں اور ٹیلے تھے، یہ ہی کھوں میں مشین گن کا سلنڈر اور فائرنگ پن کھولا گیا۔ میرے مسح کرنے کے بعد وہی کاشف نے وہاں رکھا ہوا خصوصی ہیلمٹ پہن کر وہ بلیڈ لگے۔ تاریخ روشن آباد کے اس کاشل صندوق کے تالے پر مسلسل کٹ لگانے لگا۔ کئی سو گز کی دوری پر خندقوں اور ٹیلے پر ہم گھبرانے لگا۔ کئی سو گز کی دوری پر خندقوں اور ٹیلے پر ہم کے ٹیلے کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے سامنے ہی ایک ویران جگہ پر کھڑی کی اور انجن کو چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ پھر ایک بلاک کو رسی کی مدد سے اعرا لیکسٹر پر رکھ کر نیچے بہت گیا۔ گاڑی دور ڈل ہوئی جھیل میں جا گری۔ گاڑی تھوڑی دیر تک پر کھلنے کی طرح بیٹھے کے لگاتی رہی اور پھر وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس گاڑی میں ہی رقم کا تھیلا اور سیلاب بھی ہوتا ہے۔ سیل توڑتے ہی ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔

"اوہ..... میرے خدایا!"

ہم دونوں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

میں کچھ دیر پہلے شرٹیل کی بری حالت کے بارے میں فکر مند تھا۔ اب میرے ذہن سے اس کا خیال نکل چکا تھا۔ اب مجھے صرف وہ گڈیاں یاد رہ گئیں جسے دیکھتے ہوئے ہر ایک کمزور سے سادھو جاتا ہے۔

"یہ دولت اب ہماری ہے۔" کاشف نے کمزور سے حالت میں تھیلے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "مگر اسے ابھی ہم ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ سامان ٹھنڈا ہو جائے گا جب اسے نکالیں گے۔" کچھ وقفے کے بعد بولا۔ "میں نے بتا لا اس لیے کا تاکہ کے بعد میں جب غوطہ خوری کا سامان لا کر جھیل سے بیک نکالیں تو ہمیں تالے کو کاٹنے والا کام نہ کرنا پڑے ..... آؤ اب شرٹیل کا بندوبست کریں۔"

ہم نے صندوق کی ڈھکنا دوبارہ اپنی جگہ پر لگا دیا اور شرٹیل کے پاس پہنچ گئے۔ اب بے چارے کی حالت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ نبض ہلکی ہلکی چل رہی تھی اور بھی اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا حرکت کرتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"اسے اس خراب حالت میں بھی دفن کرنا ظلم ہوگا۔" میں نے کہا، تو میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے یار۔" کاشف نے بے زاری سے بولا۔

پھر وہ کام جس سے ہمیں اتنا گھبرا رہا تھا، ہم نے کر لیا۔ "تم زمانہ ہاتھ میں لے کر ہمیں کھودو..... میں ڈاکوؤں کا بندوبست کر لوں۔"

میں نے جھاڑیوں کے پاس ایک گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں کاشف نے ڈاکوؤں کو ان کے اسلحے سمیت بکتر بند گاڑی کے اگلے حصے میں گھسیٹ لیا۔

"اب میں گاڑی جھیل میں غرق کرنے جا رہا ہوں۔"

اتنا کہہ کر اس نے گاڑی چلائی اور جھیل کی طرف چل دیا۔ جھیل سے چند گز کے فاصلے پر اس نے گاڑی ایک ڈھلوان جگہ پر کھڑی کی اور انجن کو چلتا چھوڑ کر نیچے اتر آیا۔ پھر ایک بلاک کو رسی کی مدد سے اعرا لیکسٹر پر رکھ کر نیچے بہت گیا۔ گاڑی دور ڈل ہوئی جھیل میں جا گری۔ گاڑی تھوڑی دیر تک پر کھلنے کی طرح بیٹھے کے لگاتی رہی اور پھر وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس گاڑی میں ہی رقم کا تھیلا تجوری میں بند تھا۔

"میں ایک زندہ انسان کو دفن نہیں کر سکتا۔" جوں ہی کاشف گاڑی غرق کر کے آیا، میں نے ناراضی سے کہا۔ "یہ کام بھی تم خود ہی کر لو۔"

"اس میں پریشانی والی کیا بات ہے۔" اس نے اپنی رائفل مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے ڈھکنا ہوں۔"

"بات وہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟"

"مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔"

"اگر تمہیں اتنا ہی خون خسوس ہو رہا ہے تو تم اندر چلے جاؤ۔ میں ابھی اسے دفن کر دیتا ہوں۔"

میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیا۔ آدھے گھنٹے بعد کاشف مٹی میں لت پت اور اندر داخل ہو کر کرسی پر گر سا گیا۔

"اگر پولیس بکتر بند گاڑی کے تعاقب میں یہاں تک پہنچ گئی تو....." چند لمحوں بعد میں نے اس سے پوچھا۔

یہ بات ابھی تک دیر پہلے میں میرے ذہن میں اچانک آئی تھی۔

"قدرت نے ہمارے حاسنے کی ہر رکاوٹ ختم کرنے کا بندوبست خود بخود کر دیا ہے۔" وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے بڑے مطمئن انداز میں بولا۔

"وہ کیسے؟"

"خاصے تھنے نکلنے موسمیات کی رپورٹ نہیں سنی۔"

"نہیں، کیوں کہ حالات ہی کچھ اس طرح کے تھے کہ میرا دھیان کسی اور طرف جانے ہی نہیں سکا۔"

"اس رپورٹ کے مطابق آج رات اس جھیل میں طوفان اور تیز بارش کا امکان ہے۔"

اس نے بالکل سچ کہا تھا۔ کیوں کہ اسی رات ہمارے وہاں سے روانہ ہونے کے دو گھنٹے بعد طوفانی بارش شروع ہو گئی۔ اس تند و تیز بارش نے جھیل کے کنارے ہونے والی ہماری ہر کارروائی کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔

☆☆☆

اب ایک سال بعد ہم رقم نکالنے کے لیے ہر ممکن تیاری کر چکے تھے، کہ ہمیں اپنے مرحوم دوست کی طرف سے وہ عجیب و غریب خط ملا۔ جس میں اس نے پچھلے سالوں کی طرح اس بار بھی شکار کھیلنے کی دعوت دی تھی۔ اگر چہ میں نے کاشف کو ہر طرح سے یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ شرٹیل

مر چکا ہے اور یہ چلا اس کا ہوبی نہیں سکتا۔ کسی نے مذاق کیا ہے اور یہ کوئی ایسا شخص ہے جو جانتا ہے کہ ہر سال ہم جنگل میں ریول کرجاتے ہیں لیکن اس بارے میں ہمارے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ ہمارے سوا کسی کو نہیں پتا۔"

کاشف کو مطمئن کرنے کے باوجود میرا اپنا ذہن شکوک وشبہات میں مبتلا تھا۔ فکر سے وابستی تک میں اسی بات پر غور کرتا رہا کہ وہ خط کون بھیج سکتا ہے جو اس نے لکھا ہے، تو اس کے انداز تحریر کی اتھاہ کی سایاب عقل کون کرسکتا ہے؟

دوسری طرف گذشتہ واقعات بادآنے پر جنگل میں پیش آنے والا اگر اسرار واقعہ بھی یاد آگیا جس کے ساتھ ہی دوسرے ہم میں سنسنی کی دوڑ گئی۔ پیڑوں کی خوفناک ہیبت اور سیاہ وسفید وسفید سے کو نجنے والی ہنسی کی وہ آواز ایک سال گزرنے کے باوجود بھی میری یادوں میں ایسے تازہ تھی جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ ان باتوں کے باوجود رقم حاصل کرنا میرے لیے بہت ضروری تھا۔

دو تین دن ہم گھوڑ خوری کا سامان گاڑی میں رکھ کر صبح سویرے جھیل کی طرف چل پڑے۔ اگر چہ اس بار ہمارا ارادہ شکار کا نہیں تھا..... اس کے باوجود ہم نے اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ بھی ساتھ رکھ لیا۔ پورے سفر کے دوران میں رقم ہی ہماری گفتگو کا موضوع رہی۔

"اتنی بڑی رقم کو لگھر لے جانا۔ ایک مسئلہ ہوگا۔"

میں نے کاشف سے کہا۔ جو بڑی دل جمعی سے اونچے نیچے رستوں پر گاڑی دوڑا رہا تھا۔

"میں نے اس کا بھی بندوبست کرلیا ہے۔" وہ کچھ دیر مظہر کر بولا۔

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ میرے انداز سے سمجھ گیا کہ مجھے سمجھ نہیں آئی ہے۔ یہ دیکھ کر وہ بولا۔

"تم نے لعل ماسٹر کا نام سنا ہے؟"

"لعل ماسٹر..... کیا پاکستان کے مشہور زمانہ بلے باز حنیف محمد کی تو نہیں بات کررہے ہو..... لیکن لعل ماسٹر کیا چاتا ہے۔"

"جی ہاں یہ وہ نہیں ہے۔"

"تو پھر کون ہے؟"

"تم نے دادو کے معلم شیرو کا نام سن رکھا ہے۔"

"ہاں، سن تو رکھا ہے لیکن تم تو مجھے لعل ماسٹر کے بارے میں بتا رہے تھے یہ شیرو کہاں سے ٹپک پڑا؟"

"یہ کہیں سے نہیں ٹپکا۔"

"پھر.....؟"

"پھر یہ کہ زیر زمین دنیا میں اس کا نام لعل ماسٹر ہے۔"

"کک..... کک..... کیا مطلب؟ تم اسے کیسے جانتے ہو؟"

"گھبراؤ نہیں کی ضرورت نہیں ہے۔ میری اس کے ساتھ جان پہچان اس وقت سے ہے جب وہ ایک مسٹک چھاپہ خانہ تھا۔"

"تو کیا تم اس راز میں اب اسی شریک کرو گے، ایک مجرم کو؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "مجھے تو سخت افسوس ہوگا تم پر اگر تم نے ایسا کیا۔"

"ارے، اتنا تو ہمارا حق ہے دوست! میں نے اسے حفاظت نہیں دیا۔"

"پھر کیا بتایا ہے؟"

میں نے اس سے صرف غیر قانونی طور پر حاصل کیے گئے نوٹوں کی تبدیلی کے بارے میں بات کی ہے کہ وڑوں کی کرنسی تو ہم یہاں استعمال نہیں کرسکتے اس لیے سوچا ہے کہ ان دونوں ہی وہ یہاں منتقل ہو جائیں گے۔"

میرا ذہن پہلے ہی کئی خدشات لے کر اسرار معاملے میں الجھا ہوا تھا کہ اب اس کی یہ بے وقوفی والی بات سن کر اور الجھ گیا۔ جھیل پر پہنچنے کے بعد ہم اس وقت تک گاڑی میں بیٹھے رہے جب تک کہ ہمیں یقین نہیں ہو گیا کہ وہاں ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ ماحول کی پراسرار دھند نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جواب اس جھیل کا ایک حصہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ کاشف نے گاڑی کے عقبی حصے سے آکسیجن سلنڈرہ اور ماسک وغیرہ نکال کر مجھے دے دیے۔

"میرے خیال میں پہلے ہم اس جگہ کو دیکھ لیں جہاں ہم نے خیمہ لگا کر قیام کیا تھا۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اس طرح ہمیں اطمینان ہو جائے گا اور ہم درست طور پر اپنا کام کرسکیں گے۔"

"آخر تم اس قدر وہمی کب سے ہو گئے ہو؟" کاشف کے لہجے میں ہلکا سا غصہ تھا۔ "بہر حال تم اپنا یہ شوق بھی پورا کرلو، میں تمہیں گاڑی کے پاس انتظار کرتا ہوں۔" شرنجل کی تیز رہا ایسے جانے کا خیال ہی خوف ناک تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے یہ خوف تھا کہ اگر میں نے کاشف کو ساتھ چلنے پر مجبور کیا، تو وہ بھی روک دے گا جب کہ میں چاہتا تھا کہ میں دیکھوں کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں تنہا جھیل پر آیا۔ میں نے بیلچہ اٹھایا اور مگ جھیل سے پچاس ساٹھ گز دور تک۔ وہاں تک پہنچنے سے پہلے میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا، تو کاشف گاڑی کے ڈگڈگ پاؤں رکھے جھیل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر بیلچے کی مدد سے مٹی ہٹانے لگا۔ میں نے کاشف کو اس لیے نہ بتایا کہ وہ کبھی میرا وہم ہی قرار دے کر مذاق کرتا۔ جیوں جیوں اندھی سے مٹی ہٹتی، توں توں میری حالت غیر ہوتی چلی گئی۔ میں چلانا چاہتا تھا۔ گھر آواز میرے حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ خیمہ میں ایک لاش موجود تھی، لیکن..... وہ لاش کسی انسان کی نہیں بلکہ ایک بچے کی تھی، جو اب کھل چکی تھی۔ اس سے اٹھنے والی بدبو اس قدر تیز تھی کہ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ میں نے بیلچہ وہیں پھینکا اور الٹے قدموں وہاں سے بھاگ اٹھا۔ میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ میری نظر کا ایک ناقابل یقین منظر تھا۔

"کک..... کک..... کاشف..... کاشف!..... وہاں ہے..... لل..... لاش..... جج..... جج..... بچہ..... بچہ!"

میں نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ بکھلاتے ہوئے کہا اور گاڑی کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

دو سے تین منٹ میں پوری کہانی کہہ کر کاشف نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ تک سے رہ گیا۔ وہاں میرے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ شاید وہاں تھا بھی نہیں اور میں نے بے جا بازی میں وقت ضائع کیا ہے۔ میرے جو حواس باختگی میں وہ بھی ساتھ چھوڑنے لگے۔ میرے دل کی دھڑکنیں اتنی تیز ہو چکی تھیں کہ ان کی دھمک مجھے اپنے کانوں میں صاف سنائی دینے لگی۔ دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

میں نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ نہ کھلا اور چابیاں بھی غائب تھیں۔ میں اس طرح پاگل پن سے چیخنے لگا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہونے لگا تھا کہ کاشف زندہ ہے اور اسی سے بدترین انتقام لے رہا ہے۔ اللہ خالی جانے اس نے کاشف کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا، تو اچھل پڑا۔ میرے پیچھے کاشف کھڑا تھا لیکن..... وہ اس حال میں تھا کہ اسے جانے افراد نے اپنے اسلحہ کی زد پر لے رکھا تھا۔ وہ چاروں شکل ہی سے بھیجے ہوئے بد معاش لگتے تھے۔ یہ کاشف کو زندہ دیکھ کر جتنا اطمینان ہوا تھا، اس سے بڑھ کر اس کے پیچھے چاروں بدمعاشوں کو دیکھ کر پریشانی ہوئی تھا۔

ان بد معاشوں میں سے ایک کی شکل مجھے جانی پہچانی سی محسوس ہوئی۔ اسے دیکھ کر جانے کیوں میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے اپنی بدحواسی پر سخت افسوس کیا۔ شیرو تھا۔ وہی شیرو جو زیر زمین دنیا کا سے تاج بادشاہ تھا۔ اسے لعل ماسٹر کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ اس کا لقب جواہر تھا۔ اپنی اس خامی کو چھپانے کے لیے وہ اکثر یہ کہا کرتا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ دیو ہوں، اس سے کہیں بڑھ کر میں زمین کے نیچے ہوں۔ اگر کوئی جاہل ہی مجھے چھپ جانے کی دعوت دے، وہ سچ کہہ سکتا۔ حقیقت بھی یہی تھی۔ آج تک پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکی تھی۔

ابھی میں انھیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کے دو ساتھیوں نے مجھ پر بھی اسلحہ تان لیا۔

"تو یہ ہے تمہارا دوست؟" لعل ماسٹر شیرو نے میرا جائزہ لیتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔ "اس سے کہو کہ خود خوری کا لباس پہن کر جھیل میں اتر جائے..... ورنہ ہم تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کردیں گے۔"

میں نے کاشف کو تسلی بھرے انداز میں دیکھا۔ یہ سب اس کی حماقت کا پھل تھا۔ کاشف کے منہ سے بھاری رقم کا ذکر سن کر لعل ماسٹر چونک اٹھا ہوگا۔ وہ اس سے دان کا بہانہ کر کاڑی لینے گیا تھا۔ پہنک ڈھکی ہی واردات اور پھر بکتر بند گاڑی کی پراسرار گم شدگی پہلے ہی سے اچھا ہوگی۔ لعل ماسٹر کا تعلق نہ جانے کتنا ہی زیر زمین دنیاؤں سے ہوگا۔ اس کے لیے یہ کام کیوں نہیں کرانے تھے؟

"تم اپنے آدمیوں سے یہ کام کیوں نہیں کراتے؟"

میں نے ہمت کرتے ہوئے گڑگڑا کر کہا۔

"میرے آدمی غوطہ خوری نہیں جانتے۔" وہ غرایا۔ "جب کہ تم نے اس بارے میں مکمل اور باقاعدہ تربیت حاصل کی ہے...... پھر تمھیں یہ بھی پتا ہے کہ گاڑی کہاں ڈوبی تھی اور ہاں! ایک بات خاص طور پر یاد رکھنا۔"

"وہ کیا؟"

"مجھے دھوکا دینے کی بالکل کوشش نہ کرنا، کیوں کہ مجھے گڈیوں کی اصل تعداد معلوم ہے اگر کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش کی، تو ایسی اذیت ناک موت دوں گا کہ تمھاری روحیں قیامت تک بلبلاتی رہیں گی۔"

اس وقت ہم اس کے رحم وکرم پر تھے۔ وہ جو کہہ رہا تھا اس پر عمل کرنے کی ہمت بھی رکھتا تھا، اس لیے اس کی بات مانے بغیر چارہ بھی تو نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے...... جیسا تم کہہ رہے ہو...... ویسا ہی کروں گا، لیکن......"

"لیکن...... کیا؟"

"لیکن...... یہ کہ میں جھیل کی تہ میں جانے سے پہلے ایک راز تمھیں بتانا چاہتا ہوں۔"

"راز...... کون سا راز؟"

میں نے مختصر طور پر اسے بتایا کہ کس طرح ہم نے اپنے زخمی ساتھی شرجیل کو زندہ دفن کیا تھا اور اب وہ کس طرح بچ کر ہم سے بھیانک انتقام لے رہا ہے۔ میں نے اس خط کا بھی ذکر کیا جو ہمیں چند دن پہلے ملا تھا۔

اس دوران میں وہ بڑی گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتا رہا تھا۔ جوں ہی میں خاموش ہوا، اس کا ایک آدمی بول اٹھا۔

"ماسٹر! یہ جھوٹ بک رہا ہے، آپ اسے جلدی سے جھیل میں بھیجیں تاکہ ہمیں رقم مل جائے۔"

لعل ماسٹر نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑا اور رائفل کی نال میرے منہ میں ٹھونس دی۔ پھر وہ ناگ کی طرح پھنکار کر بولا۔ "میں یہاں تمھاری بکواس سننے نہیں آیا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا تو اس نے غوطہ خوری کا سامان میری طرف پھینک دیا۔

میں ہر لحاظ سے مجبور تھا اس لیے میں نے غوطہ خوری کا سامان پہن لیا اور پھر آکسیجن سلنڈر کمر پر باندھا۔ مکمل تیاری کے بعد میں جھیل کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ میں جھیل میں اترتا، ان بدبختوں نے میری کمر کے گرد ایک رسی باندھ دی۔ اس رسی کا ایک سرا ان میں سے ایک نے پکڑ لیا۔

"اگر تم نے فرار ہونے کی کوشش کی، تو یاد رکھنا اس جھیل کا چپہ چپہ ہماری دور مار رائفلوں کے نشانے پر ہے۔" لعل ماسٹر نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور جھیل میں اتر گیا۔ مجھے یقین تھا کہ رقم حاصل کرنے کے بعد بھی وہ ہمیں قتل کر دیں گے۔ بھلا وہ کیسے اتنی بڑی رقم کے گواہ زندہ رہنے دیتے لیکن میں ان کی بات ماننے پر مجبور تھا۔ فی الحال تو مجھے بچاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پانی کے نیچے اترتے ہی مجھے جھیل کے شفاف پانی کی تہ میں موجود گاڑی کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ میں اس کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ صندوق موجود تھا لیکن اس کا اوپر والا حصہ الگ پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر میں ٹھٹک گیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھ سے پہلے کوئی اس صندوق تک آیا تھا اور اس میں سے رقم کی تھیلی لے اڑا۔ میں تیزی سے آگے بڑھا لیکن صندوق میں کیچڑ اور پانی کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ اس میں موجود کائی یہ بتا رہی تھی کہ یہ کام کافی عرصہ پہلے ہوا ہے۔ میں سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

پھر کچھ سوچ کر میں نے اپنی کمر سے بندھی ہوئی رسی کھولی۔ مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ اگر میں نے اوپر جا کر لعل ماسٹر کو خالی صندوق کے بارے میں بتایا، تو وہ اسے میری چال ہی سمجھے گا۔ یوں میرے حصے میں سیسے کی گولی آئے گی۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے بڑی تیزی دکھائی... اور اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی رسی کو کھول کر صندوق کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر تیز تیز ہاتھ پیر چلاتا ہوا جھیل کے اندر سے دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ زندگی بچانے کے لیے آخری کوشش تو کر لوں۔

کچھ ہی دیر میں، میں جھیل کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ میں نے سر باہر نکالا اور ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں بڑے اطمینان سے باہر نکل آیا۔ میری خوش قسمتی کہ وہاں آبی گھاس اور جھاڑیوں کے جھنڈ بہت تھے۔ ان میں خود کو چھپا کر میں آسانی سے وہاں سے بھاگ سکتا تھا۔ میں نے ایسا ہی کیا، لیکن میں نے جوں ہی جھاڑیوں سے نکل کر صاف زمین پر پاؤں رکھا، تو میرے اعصاب پر بجلی سی گر گئی اور میں اپنی جگہ پر منجمد سا ہو کر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

لعل ماسٹر اور اس کے گرگوں نے مجھے چاروں طرف سے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ ان کی رائفلوں کے دہانے میری طرف اٹھے ہوئے تھے۔

"مجھے پہلے ہی سے پتا تھا کہ تم ضرور یہ کمینی حرکت کرو گے۔" لعل ماسٹر دانت پیس کر بولا۔ "اسی لیے میں تمھاری موت بن کر پہلے سے یہاں آ گیا۔"

اتنا کہہ کر اس نے اپنی رائفل کا رخ تھر تھر کانپتے کاشف کی طرف کیا۔ اوپر تلے دو دھماکے ہوئے اور کاشف کی کھوپڑی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس بدنصیب کو چیخنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے لالچ نے آخر اس کی جان لے ہی لی تھی۔

"اپنے اپنے ہتھیار پھینک دو۔" اچانک لاؤڈ اسپیکروں کی آواز گونجی۔ "تم سب اس وقت چاروں طرف سے ہمارے گھیرے میں ہو۔"

اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے پولیس اور پولیس کے جوان نمودار ہو گئے۔ وہ سب کلاشنکوف ہماری طرف تانے ہوئے آگے بڑھے۔

لعل ماسٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ اسے اپنی موت سامنے ہی دکھائی دے رہی تھی کیوں کہ یہ پہلا اور شاید آخری موقع تھا کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالیں گے بلکہ بچنے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اگر وہ ایک بار پولیس کے گھیرے سے نکل جاتے تو پولیس بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی ایسی حرکت کرتے، میں نے اپنے جسم کی تمام تر طاقت ٹانگوں میں منتقل کی اور اچھل کر جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ کسی کی رائفل سے ایک شعلہ سا نکلا۔ لمحہ بھر کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے میرے دائیں شانے میں انگارے سے بھر گئے ہوں۔ اتنے میں مجھے ٹھنڈے پانی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ پتا نہیں۔ صرف اتنا احساس باقی تھا کہ میرا جسم کسی بے جان چیز کی طرح بہت ٹھنڈی تاریکیوں میں اترتا جا رہا ہے۔

جب مجھے ہوش آیا، تو میں نے خود کو بالکل بدلے ہوئے ماحول میں پایا۔ وہ ایک صاف ستھرا کمرا تھا جس کے اکیلے آرام دہ بستر پر میں لیٹا ہوا تھا۔ میرا دایاں شانہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ تھوڑے تھوڑے سے وقفے سے شانے سے اٹھنے والی درد کی ٹیسیں سارے جسم میں پھیلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ میرا ذہن آہستہ آہستہ معمول پر آنے لگا۔ جوں ہی میں معمول پر آیا، مجھے پچھلے تمام واقعات یاد آ گئے اور ایک بار پھر میرے ذہن میں یہ واقعات ایک فلم کی طرح چلنے لگے۔

میرا ذہن ان واقعات میں الجھ رہا تھا کہ میں دروازہ کھلنے کی آواز سن کر چونک پڑا۔ کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک لمبا تڑنگا سا نوجوان تھا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر نرس مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ اس کی ذمہ داری کا ایک حصہ تھی۔ پھر اس نے میری نبض دیکھی اور ایک ٹیکا میرے بازو میں لگا دیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد درد کی ٹیسیں ختم ہو گئیں۔

"مم...... مم...... میں کہاں ہوں؟" میرے منہ سے مشکل سے نکلا۔

"بے فکر رہو دوست! خطرے کا وقت نکل چکا ہے۔" ایک مانوس سی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ "اب تم ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔"

یہ الفاظ تو ہمدردی سے کہے گئے تھے، لیکن...... میرے لیے تو وہ بم کے دھماکے سے کم نہ تھے۔ وہ آواز میں پہچان گیا تھا۔ وہ آواز ہمارے اس دوست کی تھی جسے ہم نے ایک سال پہلے سونے کے لالچ میں زندہ دفن کر دیا تھا۔ میں اچھلا۔ وہ کمرے میں ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔

"تت...... تت...... تم تو......"

اس نے آگے بڑھ کر نرمی سے مجھے دوبارہ لٹا دیا۔ وہ شرجیل ہی تھا۔

"تمہارے زخم ابھی تازہ ہیں۔ مجھے کاشف کی موت کا بے حد افسوس ہے، لیکن وہ اپنی حماقتوں اور اندھے لالچ کی وجہ سے مارا گیا۔"

کاشف کی دردناک موت کے بارے میں سنتے ہی میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی۔ آہ! لالچ نے آخر اس کی جان لے ہی لی تھی۔ دولت کا تو یہی کام ہے۔ یہ کسی کے حصے میں ایسے نہیں آتی بلکہ یہ تو خون کی پیاسی ہوتی ہے۔ خون سے اپنی پیاس بجھانے کے باوجود بھی یہ کسی کے ہاتھ نہیں لگتی۔ بھلا دولت بھی کبھی کسی کی ہوئی ہے۔

میں نے پہلی بار غور سے شرجیل کو دیکھا۔ وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس حالت سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں تھا۔ جس حالت میں ہم نے اسے زندہ دفن کیا تھا۔ قبر اپنا مردہ کہاں واپس کرتی ہے، تو یہ کیسے بچ

گیا۔ شرنیل نے شاید میرے چہرے کے تاثرات سے کچھ اندازہ لگا لیا تھا اس لیے وہ بولا۔ ”شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں اتنا شدید زخمی ہونے اور زندہ قبر میں دفن ہونے کے باوجود کیسے تمہارے سامنے زندہ کھڑا ہوں۔“

میں نے ہونقوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔

”اصل میں سب اس فرشتہ صفت نوجوان کی وجہ سے ہوا ہے اور اب یہی تمہیں میرے ساتھ ہونے والے واقعات کے بارے میں بتائے گا۔“

اتنا کہہ کر اس نے اس لمبے تڑنگے نوجوان کو اشارہ کیا، جو نرس کے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تھا۔

”آپ تو مجھے ویسے ہی شرمسار کر رہے ہیں ورنہ میں نے تو ایک انسانی فرض نبھایا تھا، اللہ تعالیٰ کو آپ کی زندگی بچانا منظور تھی، سو بچ گئی۔“

”نہیں..... دوست! تمہاری بات بھی ٹھیک ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں وہاں وسیلہ بنا کر بھیجا تھا۔“

ان دونوں کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا، وہ بہت ہی حیران کن تھا۔ اس نوجوان کا نام طلحہ تھا۔ وہ ٹکنالوجی کی جنگلی حیات میں ملازم تھا۔ یہ محکمہ ایسے جانوروں پر تحقیق کرتا ہے جن کی نسل کو انسان کی مختلف بڑھائے کی جدید کلی کی وجہ سے ختم ہونے کا خطرہ ہو۔ ایک سال پہلے جب ہم تینوں جھیل کے کنارے ہونے والے فوٹو ٹرائے کا مصرعہ تو طلحہ اپنے ادارے کی طرف سے پیتوں پر تحقیق کر رہا تھا۔ اس تحقیق کے لیے اس جنگل کو منتخب کیا گیا تھا۔

تحقیق کا مقصد یہ پتا کرنا تھا کہ آیا پیتے جیسے جانور دلدلی ماحول میں زندگی گزار سکتے ہیں یا نہیں۔ یہ پیتے جب چھوٹے سے تھے تب سے ان کی نگرانی طلحہ کے ذمے تھی، اس لیے وہ اس سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ وہ اکیلے کے ساتھ یوں چلتے پھرتے تھے جیسے وہ پالتو جانور ہوں۔ تحقیق کے عرصے کے دوران میں وہ باقاعدگی سے جھیل کی طرف چکر لگایا کرتا تھا۔ اس دن بھی وہ پیتوں کے ساتھ جھیل کی طرف آیا ہوا تھا لیکن جنگل کے گھنے حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اس نے صرف نہیں جھیل میں کھڑی کو زبو ہوتے دیکھا تھا بلکہ جھاڑیوں میں چھپے کہ ہماری باتیں بھی سن لی تھیں۔

جب ہم نے شرنیل کو سنگ دلی سے زندہ دفن کیا تو اس نے جلدی سے تحقیقی مرکز سے اپنے ایک ساتھی کو بلچھے سمیت بلایا۔ پھر ان دونوں نے مل کر شرنیل کو باہر نکالا اور اسے تحقیقی مرکز لے گئے۔ گھنے جنگل میں داخل ہوں تو مرکز کو بنگامی طبی امداد کا شعبہ بھی قائم تھا۔ کولی وہ بڑیوں کے درمیان پھنسی ہوئی تھی جسے آسانی نکال لیا گیا۔ شکر ہے کہ وہ پنسل کا تاثر تھا اگر کلاشنکوف کی گولی ہوتی تو جان بچنا مشکل تھا۔ بروقت طبی امداد ملنے سے شرنیل کی جان تو بچ گئی لیکن اسے ایک طویل عرصے تک بستر پر لیٹنا پڑا۔ اس دوران اس نے پولیس کو بھی اس واقعے کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے پولیس کی مدد سے مجرموں کا انجام دیکھا۔ شرنیل سے زیادہ انتقام وہ لینا چاہتا تھا اس نے انعام لینے سے بالکل انکار کر دیا۔ شرنیل نے ان سے درخواست کی کہ جب تک وہ مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہو جاتا، تب تک اس کی زندہ بچ جانے کے راز کو راز ہی رکھا جائے۔ اصل میں ہمارے لاج کی سزا اسے طرح سے دینا چاہتا تھا۔ اس نے چوں کہ قانون کی نظر میں لاج کے حوالے کر دیا تھا۔ اس لیے شرنیل کی بات مان لی گئی۔

شرنیل کو مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں کئی ماہ لگ گئے۔ اس کے بعد اس نے خفیہ طور پر جیسی خوف زدہ کر دیا لیکن اسے یہ توقع بالکل نہیں تھی کہ اس ذرا سے انجام اتنا ہولناک اور المناک ہوگا۔ بہرحال کاشف کو اپنے کی سزا مل گئی تھی اور اصل ماسٹر مائنڈ آخر کار اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ جب اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی، تو طارق پولیس والوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کے سب آگا ناپنے انجام کو پہنچ گئے۔

جب وہ خاموش ہوئے، تو میں بے اختیار بول اٹھا۔

”لیکن وہ مرد ہیچا تھا، کہاں ہے؟ آئی تھا؟“

”وہ تو مجھے خیال تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تحقیقاتی مرکز میں ایک پیچا بیمار ہو کر مر گیا تھا۔ طلحہ کو یقین تھا کہ تم میری فیز ضرور کرو گے اس لیے اس نے پیتے کی لاش دفن کر دی تھی۔“

یوں تمام تر اسرار واقعات کی حقیقت سامنے آ گئی۔ مجھے حد درجہ خوشی ہوئی میں جان بچا لے گئے۔ مفروری کی تو دل کا روائی کے بعد پولیس نے شرنیل کی ضمانت پر مجھے چھوڑ دیا۔ شرنیل نے نہ صرف مجھے صاف کر دیا بلکہ برطرح سے میرا خیال بھی رکھا۔ آج ہم پھر تین دوست ہیں۔ آپ کبھی کبھی ہمیں ملنے کے لیے کاشف کی کی طرف سے پوری کی گئی پلکل پھر بھی ہاتھی کی سونڈیاں بھی مجھے بہت یاد آتی ہیں۔

اے بی سی

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم

بعض واقعات ایسے اچانک ہوتے ہیں کہ ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن رونما تو ہوتے ہیں اس لیے جھٹلا بھی نہیں سکتا۔ میں سادہ سا بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہوا ہے کچھ تو حالات کی ستم ظریفی اور کچھ میں نے اندازِ تحریر سے اسے دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اُمید ہے قارئین پسند کریں گے۔

محمد عالمگیر
(کراچی)

روشن آرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”عالمگیر تم میری شادی میں آؤ گے نا۔“

”تمہاری شادی!“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”میں سمجھا نہیں۔“

”ہوری ہے عالمگیر۔ میری شادی ہوری ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اور میں یہی بتانے کے لیے آئی تھی۔“

”سوال یہ ہے کہ تمہارے ابا نے تو کہا تھا کہ وہ

تمہاری شادی نہیں کریں گے۔ کم از کم اس وقت تک نہیں کریں گے جب تک تمہاری اماں مرحومہ کی قبر کی مٹی سوکھ جائے۔" اس غصے سے بولا۔

"اما کون سب باتوں کی پکی پاروا۔ شاید انہوں نے بھی جل جل کر اماں کی قبر کی مٹی سکھائی ہے۔" روشن آرا نے کہا۔ "کم بخت دعائیں بھی تو پوری نہیں ہوتیں۔"

"کیا دعا مانگی تھی تم نے؟"

"یہی کہ خوب بارش ہوتی رہے اور قبر گیلی رہے۔"

"یہ بارش کا سیزن ہی نہیں ہے اور تمہاری اماں نے بھی تو مرنے وقت موسم کا خیال نہیں کیا۔"

"اب میری اماں کو تو برا مت کہو۔ یہ سوچو کہ میری شادی ہوتی تو کیا ہوگا؟"

"میں یہ شادی ہونے ہی نہیں دوں گا۔"

"کیوں؟ کیا سلطان راہی بن جاؤ گے۔"

"نہیں تمہارے ابا سے بل کر ان سے درخواست کروں گا کہ وہ کچھ اور کر جائیں میری قسمت بدلنے والی ہے۔"

"یہ تو میں کب سے سن رہی ہوں۔"

"تو پھر ایک دفعہ اور سن لو میری قسمت واقعی بدلنے والی ہے۔ پہلے یہ بتاؤ تمہاری شادی کب ہو رہی ہے۔"

"ابا کا ارادہ دو مہینے بعد کا ہے۔" روشن آرا نے بتایا۔

"تو پھر نکری سے مت کرو ابھی بہت وقت ہے۔"

"معلوم نہیں ایسا کروگے اس عورت کو راستے سے ہٹا دو۔" روشن آرا نے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا تمہاری شادی کسی عورت سے ہو رہی ہے۔" مُنی نے پوچھا۔

"اوخدا! تم سمجھ ہی نہیں رہے۔ میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں۔ جو ابا سے شادی کے لیے زور دے رہی ہے۔"

اس نے بتایا۔ "اگر وہ راستے سے ہٹ جائے تو پھر ابا کو میری شادی کی اتنی جلدی نہیں ہوگی۔"

"ارے بچی اپنے ابا کی تمہیں کیا جانتیں۔ خود دیکھ لو تمہاری اماں مر گئیں تو انہوں نے ان کی پروا نہیں کی۔ دوسری شادی کے لیے تیار ہو گئے اب وہ عورت راستے سے ہٹ بھی گئی تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ دو دو چار مہینوں کے بعد کسی اور کو پکڑیں گے۔"

"تو پھر بتاؤ کیا کیا جائے۔" روشن آرا نے پوچھا۔

"مجھے اپنے ابا سے ایک بار ملنے دو۔ ان سے مل کر میں صورتِ حال بدل دوں گا۔ ان کو یقین دلا دوں گا کہ میں بہت جلد کروڑ پتی بننے والا ہوں۔"

"اگر اتنا ہی یقین ہے تو بھائی ایک بار اور مل کر دیکھ لو۔"

حالانکہ میں ایک بار پہلے روشن آرا کے ابا سے بے عزت ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود روشن آرا بیچ سے لے زندگی بنی ہوئی تھی اور اب وہی زندگی بتا رہی تھی کہ وہ اس اور کی ہونے والی ہے۔ یہ ظلم ہے بیچ صاحب میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ میرے ذہن میں محرکاتی کے ڈائیلاگ گونجنے لگے تھے۔

میں دوسری صبح شام روشن آرا کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ابا نے مجھے دیکھتے ہی برا سا منہ بنا لیا تھا۔ پھر آگئے۔ اب کتنی بار ضمانت کروں۔"

"انکل! میں اس بار اکیلا نہیں آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"اپنے ساتھ امام شرف الدین تبریزی کو بھی لے کر آیا ہوں۔"

"اچھا، کسی امام کو لائے ہو روشن آرا سے نکاح پڑھوانے کے لیے۔" وہ غرایا۔

"ارے نہیں انکل! امام شرف الدین تبریزی کے انتقال کو تو سو سال ہو گئے۔" میں نے بتایا۔ "آپ کی جنرل نالج کمزور ہے نا۔ اس لیے آپ امام صاحب کو نہیں جانتے۔"

"کیا بکواس کر رہا ہے۔" روشن آرا کا باپ پڑا تھا۔

"یہ بکواس نہیں ہے انکل سچائی ہے۔ امام شرف الدین تبریزی تحفہ خسرو جواہر منیری کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔"

"ابے کیا پاگل تو نہیں ہو گیا۔ کون ہے یہ جواہر منیری۔"

"انکل یہ کوئی آدمی نہیں بلکہ ایک متبرک اور

کتاب ہے۔" میں نے بتایا۔ "یہ امام شرف الدین تبریزی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں سونا بنانے کا بالکل سولہ آنے سچ فارمولا بتایا گیا ہے۔"

"کیا؟" روشن آرا کے ابا کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ کسی سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ روشن آرا کا باپ بہت رقوں تک سونا بنانے کے چکر میں خوار ہوتا رہا ہے۔ میں نے یہ بتا کر اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"یہ سب بکواس ہے۔" اس کا لہجہ بالکل نرم ہو گیا تھا۔ "کوئی سونا وونا نہیں بنتا۔"

"بنتا ہے انکل! امام صاحب سونا بنانا کہ پتھر خان کی بیویوں کو سہاگ بھی کرتے تھے۔" میں نے کہا۔

"اچھا چلو مان لیا کہ اس کتاب سے سونا بنتا ہے لیکن تم میرے پاس کیوں آئے ہو۔"

"انکل! میں پرسوں سے سونا بنانے کا پروگرام شروع کرنے والا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اُمید ہے کہ اس مہینے کے آخر تک چار پانچ تولہ سونا بنا ہی لوں گا۔"

"پھر یہ ہے انکل کہ آپ روشن آرا کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں تو ہم دونوں مل کر بہت دولت بنا سکتے ہیں۔"

"ہوں۔" روشن آرا کے ابا نے ایک گہری ہنکاری بھری۔ سوچنا رہا۔ پھر گردن اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ "نہیں بھائی میں اب ان پکڑوں میں نہیں پڑنے والا۔ بہت پڑ چکا ہے سینے میں پتھر کسی طرح نہ نہ ٹو۔ میں روشن آرا کی شادی تم سے نہیں کرنے والا۔ میں نے اپنے شیخ صاحب سے وعدہ کر لیا ہے۔ روشن آرا کی شادی رانا نوید سے ہو رہی ہے۔"

"اور یہ رانا نوید ہے انکل؟"

"ابے وہی جس سے روشن آرا کا رشتہ طے ہوا ہے۔"

"تو ان رشتے کے بیچ میں تم اپنے شیخ صاحب کو بیچ میں کیوں لا رہے ہو انکل؟"

"اس لیے کہ یہ رانا نوید ان ہی کا پیشہ ہے۔"

"تو یہ کہو نا انکل کہ اس میری فقیری کے چکر میں تم بیٹی کو برباد کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"ابے چپ، تجھے کیا معلوم کہ ان فقیروں کے درجے کیا ہوتے ہیں۔ اب اگر ان کی شان میں گستاخی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔"

"اچھا انکل چھوڑو اس بات کو، تم یہ بتاؤ کیا میں اپنے رشتے کو انکار سمجھوں۔"

"تو اب انکار کیسے سمجھ گے کیا ڈنڈا اٹھا کر کھوپڑی پھاڑ دوں۔ جب سمجھ گے۔"

میں پور ہو کر واپس آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ سونا بنانے کا لالچ اس کو راہ راست پر لے آئے گا لیکن اس نے تو سونے کو بھی لفٹ نہیں دی تھی۔

پھر روشن آرا سب ملی تو میں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ "نہیں روشن آرا تمہارا باپ ایک نمبر کا دوسرے درجے کا انسان ہے۔ وہ میری بات سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔" وہ میری بات سننے کو تیار ہی نہیں ہے۔"

"میں نے کہا تھا ہاں کہ وہ ہر حال میں رانا نوید سے میری شادی کروائے گا۔"

"لیکن میں کسی بھی حال میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" میں نے کہا۔ "سلطان راہی کی قسم، میں یہ شادی رکوا کے ہی رہوں گا۔"

"بڑی بڑی باتیں مت کرو، کچھ سوچو۔" اس نے بتایا۔ "بابا نے تو شادی کی تاریخ بھی طے کر دی ہے۔"

"کب ہے شادی؟"

"اٹھائیس تاریخ کو انجمن ہال میں۔ وہ ہال تو دیکھا ہی ہوگا تم نے؟"

"ہاں گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ شادی ہالوں کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتا۔"

"ہاں وہی۔ خاکسار میں تمہارے بغیر بہت اداس رہوں گی۔ یہ مجھے ہے کہ رانا نوید پیسے والا آدمی ہے لیکن تم یقین کرو اس کی شاندار گاڑی میں اس کے ساتھ جاتے ہوئے بھی تم ہی کو یاد کروں گی۔ بنگاک میں بھی تم ہی یاد آؤ گے۔"

"اب یہ بنگاک کہاں سے بیچ میں آ گیا۔"

"رانا نوید نے ایک بار مجھے فون کیا تھا۔ کہہ رہا تھا شادی کے ہنی مون کے لیے بنگاک جائیں گے۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ میں اسے کراچی ائرپورٹ سے نہیں نکلنے دوں گا۔ بنگاک تو بہت دور کی بات ہے۔"

روشن آرا اس وقت مطمئن ہو کر چلی گئی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اس شادی کو کیسے روکوں۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ روشن آرا کے ہونے والے شوہر شیخ صاحب سے ملاقات کر کے دیکھ لوں۔ ٹرائی کرنے میں کیا حرج تھا۔

میں نے اپنے گھڑیا سے موبائل سے روشن آرا کے دیئے ہوئے موبائل پر فون کیا۔ وہ میری آواز سن کر خوش ہو گئی تھی۔ ''عالمگیر میں جانتی تھی کہ تم کوئی نہ کوئی راستہ نکال لوگے۔ بتاؤ کیا راستہ نکلا۔''

''روشن آرا اس راستے ہی کی تلاش میں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ تمہارے رمانسو کے باپ شیخ صاحب کا کیا نام ہے اور وہ کہاں ملتے ہیں۔''

''ان کا نام شیخ گمیٹا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''شیخ گمیٹا۔ کیا یہ نام ہوا۔''

''سنا ہے کہ بہت منتوں کے بعد پیدا ہوئے تھے اور جب پیدا ہوئے تو منت پوری کرنے کے لیے انہیں ایک نوکری میں رکھ کر بہت دنوں تک گمیٹا گیا تھا۔ اس لیے وہ شیخ گمیٹا ہو گئے۔ تم سے کہتے تو دیکھو کہ ان کے بیٹے کا نام رمانسو ہے۔ یہ بھی تو کوئی نام نہیں ہوا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔ اب ان کا آستانہ بھی بتا دو۔''

''پشاور کارڈ سپر جا کر کسی سے پوچھ لو سب بتا دیں گے۔'' روشن آرا نے کہا۔

دوسری صبح میں بے چارہ کنبر میں جا کر معلوم کیا تو فوراً ہی پتا چل گیا۔ شیخ گمیٹا کا آستانہ اچھا خاصا بڑا اور خوب صورت مکان ثابت ہوا تھا۔

وہاں ایک عدد کنواں بھی تھا۔ جس کے برابر میں ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ اس کمرے میں بیٹھا ہوا ایک شخص آنے جانے والوں سے حساب کتاب لے رہا تھا۔

''ہاں بھائی، کس سلسلے میں آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''بھائی، شیخ صاحب اللہ والے لوگ ہیں۔ ان سے ملنے پر پابندی نہ تو نہیں ہونی چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسے لوگوں کا دربار تو ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ چاہے جو بھی آئے۔''

''بالکل ٹھیک کہتے ہو لیکن حضرت سے تمہاری ملاقات نہیں ہو سکے گی۔ کیوں کہ وہ حج پر گئے ہوئے ہیں۔''

''حج پر!'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''شیخ کا کون سا سیزن ہے۔ عمرے پر گئے ہوں گے۔''

''نہیں حج پر۔'' اس نے پھر دہرایا۔ ''حضرت جب بھی دو تین ماہ تنہا بیٹھ کر اپنے ساتھ عمرے پر لے جاتے ہیں وہ اسے حج ہی سمجھتے ہیں۔''

''اچھا سمجھ گیا تو خادمانِ خاص کی جو ر مشتے دار خواتین بچہ دانی ہوں گی انہیں لے جاتے ہوں گے۔''

''ارے نہیں بھائی۔ ان کی عقیدت مند خواتین۔'' اس نے بتایا۔

''لیکن وہ تو محرم ہوتی ہوں گی۔''

''جبت کیوں کر رہا ہے بھائی۔'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ ''کیا تجھے اتنا بھی نہیں معلوم کہ یہ بھیجے ہوئے لوگ ہوتے ہیں ان کے پاس محرم نامحرم کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔''

''واہ کیا کہنے ہیں تمہارے۔''

''کیا اتنا بھی ضروری کام ہے۔''

''ہاں بھائی بہت ہی ضروری ہے۔''

''وہ اٹھائیس تاریخ کو آئیں گے۔''

مجھے یاد آ گیا کہ روشن آرا نے یہ بتایا تھا کہ شادی کی تاریخ اٹھائیس مقرر ہوئی ہے۔ یعنی یہ حضرت اپنے بیٹے کی شادی کے دن ہی واپس آنے والے تھے۔ یعنی اب پچھتیس ہو سکتا تھا اور ویسے بھی میرے ذہن میں کوئی خاص پلاننگ بھی نہیں تھی۔

اب میرے لیے یہی رہ گیا تھا کہ میں بالے، لالے اور کالے کی خدمات حاصل کروں۔ یہ تینوں ایک نمبر کے بدمعاش تھے۔

تینوں بھائی مجھے لیکن وارداتیں ایک ساتھ ہی کیا کرتے۔ سب سے بڑا بالا تھا۔ اس کے بعد لالے اور کالے۔ تینوں مجھ سے بہت بے تکلف تھے اور میرا ہاتھ کیا کرتے۔ اسی لیے میں اپنی پرابلم لے کر ان کے پاس پہنچ گیا۔ ''یار کسی طرح اس شادی کو روکنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''زندگی میں پہلی بار ایک عبت کی دیوی ہاتھ سے جا رہی ہے۔''

''تو فکر ہی مت کر میرے یار ہم کس لیے ہیں۔ تیرے لیے سب کچھ کر سکتے ہیں۔'' بالے نے مجھے پکا

دی۔

''ہم اس سالے رمانسو کو اٹھا کر لے آئیں گے۔'' لالے نے کہا۔

''یار وہ ایک بات ہے اگر تمہارا کوئی چھوٹا بھائی ہوتا تو اس کا نام سالے ہی ہوتا۔''

''اب ایک تو تیری عبت ہاتھ سے جا رہی ہے اور تجھے قانون فالتو کی سوجھی ہے۔''

''تو پھر تم ہی بتاؤ کیا کروں۔''

''افوا کر لے اس رمانسو کو اور جب شادی کی تاریخ گزر جائے تو پھر چھوڑ دینا۔'' کالے نے کہا۔

''یار ایک آئیڈیا ہے۔'' لالے نے کہا۔

''وہ کیا ہے۔''

''عین اس وقت اٹھالیں گے جب وہ نکاح کے لیے بیٹھا ہوگا۔''

''کیا پاگل ہو گئے ہو؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔''

''اس لیے کہ ابھی مت کر۔ میرے غصے سے اٹھا کر لے آئیں گے۔'' کالے نے کہا۔ ''ہے ہم لوگوں نے ایسے کاموں میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے جب اس کی کرسی پر تنبولا لگا دیا جائے گا تو اس کا باپ بھی وہی کرے گا جو ہم کہیں گے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ وہی کرو۔'' میں نے مکمل اسے دیا۔

''اب یہ بتاؤ کہاں ہے شادی؟ کب ہو رہی ہے؟'' کالے نے پوچھا۔

''اٹھائیس تاریخ کو۔ نجمن ہال میں۔ دیکھا ہوا ہے ہاں؟''

''ہاں ہاں دیکھا ہوا ہے۔ ہماری بہن کی شادی بھی وہیں ہوئی تھی۔''

''لیکن اس سے رکھیں گے کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کی بھی فکر مت کرو۔ ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ صبح ہوتے ہی اسے چھوڑ دیں گے۔ اپنے پاس اپنے کاموں کے لیے ایک زبردست ٹھکانا بھی ہے۔''

''بلکہ ایسا کرو۔ ہمارے ساتھ چل کر وہ ٹھکانا بھی دیکھ لو۔'' کالے نے کہا۔ ''اور اٹھیس کی صبح وہیں

جان شیر خان

اسکواش کے عالمی چیمپئن۔ وہ نواں کلی (پشاور) میں بہادر خان کے ہاں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ مڈل اسکول پشاور کینٹ سے حاصل کی، اس کے بعد میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ایک پشاور سے پاس کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکواش کا کھیل بھی جاری رکھا کیوں کہ اسکواش ان کا خاندانی کھیل ہے۔ ان کے بڑے بھائی سب اللہ خان ورلڈ اسٹار چیمپئن کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں اور دنیا کے بہت سے اسکواش کے اعزازات لے چکے ہیں۔ دوسرے بھائی اطلس خان نے بھی اس کھیل میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ جان شیر خان نے پہلا انٹرنیشنل ٹورنامنٹ ورلڈ جونیئر اسکواش چیمپئن شپ 1985ء میں آسٹریلیا کے شہر برزبن میں جیتا، اس سے پہلے وہ 1984ء میں پاکستانی ٹیم میں شامل ہو کر کناڈا بھی گئے جہاں انہوں نے ایشین اسکواش چیمپئن کا اعزاز حاصل کیا۔ 1986ء میں سترہ سال کی عمر میں سنگاپور میں اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیت کر یہ ثابت کر دیا کہ دنیا میں صرف ایک ہی چیمپئن یعنی جان شیر خان موجود ہے۔ ہانگ کانگ اوپن میں اسکواش کے سابق عالمی چیمپئن جہانگیر خان کو 3-0 سے ہرا کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ازاں بعد انہوں نے جہانگیر خان کو پاکستان اوپن، ورلڈ اوپن، یو ایس اوپن، اقلاص اوپن اور دیگر ٹورنامنٹس میں شکست دی۔ 1987ء میں ان کی خدمات کے صلے میں صدر پاکستان نے پرائیڈ آف پرفارمنس سے نوازا۔ 1992ء تک انہوں نے پانچ مرتبہ ورلڈ اوپن اسکواش چیمپئن شپ جیتی۔ 1992ء میں صدر غلام اسحاق خاں نے برٹش اوپن کا اعزاز حاصل کرنے پر گولڈ میڈل دیا۔ جب کہ وزیر اعظم میاں نواز شریف کی طرف سے ایک لاکھ روپے اور اسلام آباد میں ایک کنال رقبے پر مشتمل پلاٹ بھی دیا گیا۔

مرسلہ: عطیہ زہرا، جہلم

آجانا۔"

"تمہارا اچھی امانت کے طور پر ہمارے پاس ہی ہوگا۔ پھر تمہاری مرضی۔ تم جو چاہو کرو۔"

میں نے الیاسیوں کے ساتھ جا کر وہ جگہ بھی دیکھ لی۔ بہت ہی محفوظ قسم کا ٹھکانا بنا رکھا تھا تینوں نے۔

میں نے جب ان تینوں سے اس کے لیے پیسوں کی بات کرنی چاہی تو وہ ناراض ہو گئے۔ لالے نے کہا۔ "یار تم نے ہم پر بھروسا نہیں کیا اس پیسے کو سمجھ لیا کہ ہم صرف پیسوں کے لیے کام کرتے ہیں۔"

"ارے نہیں بھائی۔ میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا۔ تم لوگ اتنی محنت کرو گے۔"

"اتنا تو اس میں محنت کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔" کالے نے کہا۔ "اگر تمہارا اتنا سا دل چاہ رہا ہے تو وارادات کی خوشی میں مٹھائی کے دس ہزار روپے دینا۔"

"ہاں وہ میں ضرور دے دوں گا۔"

"بس اب جاؤ اور بے فکر ہو جاؤ۔"

اور میں بے فکر ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میرا کام ضرور ہو جائے گا۔ یہ تینوں اس رمانسو کو ضرور اغوا کر لیں گے اور روشن آرا سے اس کی شادی کا خواب بھی پورا نہیں ہو گا۔

اس کے بعد اغوا میں تاریخ تک کچھ بھی نہیں ہوا اور صرف ایک بار روشن آرا کا فون آیا تھا۔ وہ بہت اداس تھی۔ میں نے بھی اس سے زیادہ بات نہیں کی کام ہونے کے بعد ہی بات کرنی تھی۔

اغوا میں تاریخ بھی آ ہی گئی۔

اور رات ساڑھے بارہ بجے لالے کا فون آ گیا۔

"مبارک ہو تمہارے مال کی ڈلیوری ہو گئی ہے۔ کل صبح پارسل لینے کے لیے آ جانا۔"

وہ مارا میں اپیل پڑا، کام ہو گیا تھا۔ وہ تینوں کے ٹھکانے پر سہ پہر رات کا کام نمٹا رہا تھا۔

میں نے دس ہزار کا بنڈل بنا کر رکھ لیا تھا۔ بہر حال جیسے تیسے رات گزاری اور صبح ہی ان تینوں کے اڈے پر پہنچ گیا۔

وہ تینوں اس وقت ناشتہ کر رہے تھے۔ "آؤ میری جان آؤ۔ تمہارا ہی انتظار تھا۔"

"کہاں ہے وہ لیے سیاں؟"

"وہ برابر والے کمرے میں۔" کالے نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے دس ہزار نکال کر لالے کو دے دیے۔

"یہ لو یار مٹھائی کے پیسے۔"

دوسرے کمرے میں پہنچا تو رمانسو ہی تھا۔ چارپائی پر پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ وہ واقعی رمانسو ہی تھا۔ آنچوہزار سیاہ فام۔ چانچہ میں یہ تینوں اس پر پیسے کا جو پاسیں ہوں گے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ "کیا بات ہے تم لوگ مجھے کیوں اٹھا کر لائے ہو۔ کیا پکڑا زیادہ ہے۔ میں نے تو تم کو بتا ہی دیا تھا کہ میں نہیں ہوں۔"

"تم غلط کہتے ہو۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں روشن آرا کو ضرور جانتا ہوں۔"

"کون روشن آرا ہے۔"

"وہی جس سے تمہاری شادی ہونے والی تھی۔ شیخ حمیدی کی بیٹی۔"

"کیا پاگل ہو گئے ہو۔ جس سے میری شادی ہونے والی تھی اس کا نام تو سلمیٰ ہے۔ ماسٹر یم کی بیٹی۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا تمہاری شادی انجمن ہال میں نہیں ہو رہی تھی۔"

"ہاں ہاں وہیں ہو رہی تھی۔" پھر خود ہی ہنسنے لگا۔ "یار لگتا ہے تمہارے ہندوؤں نے غلط آدمی پر ہاتھ ڈال دیا۔ بھائی انجمن ہال میں ہیں۔ اے بی اور کی۔ میری شادی سی میں تھی۔ ہو سکتا ہے تمہاری روشن آرا کی شادی اے یا بی میں ہو۔ خواہ مخواہ مجھے اٹھا کر لے آئے ہو۔"

اب روشن آرا سے کیا معلوم کرنا تھا۔ کیوں کر خود اس نے فون کر کے بتایا تھا۔ "عالمگیر! میں رمانسو کے ساتھ بہت خوشی محسوس کر رہی ہوں۔ وہ واقعی ایک رمانسو ٹائپ کی شخصیت ہے۔ پلیز مجھے بھولنے کی کوشش کرنا۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا ہو گا وہ آپ چشم تصور سے دیکھ ہی سکتے ہیں۔

نگہت بیگ
ڈیلر ایڈیٹر
آر اے ب

میری مادری زبان اردو نہیں لیکن مجھے بیگم زمانی نے اردو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے پھر بھی لکھنے میں وقت پوتی ہے، یاں روانی سے پڑھ لیتی ہوں۔ بیگم زمانی کے ہاں سرگزشت آتا ہے۔ میں بھی پڑھتی ہوں۔ شاید کسی کو میری زندگی کے اوراق پسند آجائیں اس خیال سے پہلے انگلش میں پھر اردو میں لکھی اور آپ کو بھیج رہی ہوں۔

جولیا جون
(مانچسٹر۔ یو کے)

اپنی بپتا سنانے سے پہلے میں بیتاؤں کہ اردو میری مادری زبان نہیں ہے اور نہ میں پاکستانی ہوں۔ مجھے اردو لکھنا پڑھنا اور بولنا ایک ہمدرد خاتون نے سکھایا۔ میں کون ہوں یہ بتانے کے لیے مجھے اپنی پوری کہانی سنانی پڑے گی۔ ان دنوں ہم لوگ برطانیہ کے ایک قصباتی علاقے میں رہتے تھے۔ اس کاؤنٹی میں میرا اسکول بھی تھا جہاں میں پڑھتی تھی۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پہنچی تو ایک لڑکے جون سے میری دوستی ہو گئی جو مجھ سے ایک سال بڑا تھا۔ مجھے یہ بتاتے ہوئے اب

بھی شرمندگی ہوتی ہے کہ ان لڑکوں میں اپنی ہم عمر لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ موٹی تھی۔ اس موٹاپے کی وجہ سے لڑکیاں میرا مذاق اڑاتی تھیں اور عجیب عجیب ناموں سے پکارتی تھیں۔ میں ان کی باتیں سن کر اداس ہو جاتی اور کبھی کبھی رونے لگتی تھی۔ ایسے میں جون مجھے بڑا سہارا دیتا تھا۔ مجھ سے چھ سال بڑی لڑکیوں کو ستاتے دیکھ کر ہمیشہ یہی سمجھتا تھا اور دلاسہ دیتا۔ چھ سال بڑی لڑکیاں اس سے کہتیں۔ ”تو تمہاری کیا لگتی ہے کہ تم اس کی حمایت کرتے ہو؟“

وہی جو تمہاری لگتی ہے۔ یعنی کلاس میٹ، ہم جماعت۔“

وہ مجھ کو سمجھاتا تھا کہ ان کی باتوں پر کیوں دھیان دیتی ہو اور انہیں بھونکنے دو، وہ کیا کرتے رہو۔

میں اس سے کہتی۔ ”دیکھو نا جون! اگر میں تھوڑی موٹی ہوں تو اس میں میرا کیا قصور؟ مجھے تو گوڈے ٹنے بیاہ ہے، پھر وہ میرا مذاق کیوں اڑاتی ہیں؟“

”یہ سوچ صحیح کا کہنا ہے۔“ جون کہتا۔ ”کسی کا دل دکھانا بہت بڑا گناہ ہے۔ وہ تو سب فوخوش رکھنے کا درس دیتے تھے۔ یہاں تک کہتے تھے کہ اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو اس کی خوشنودی کے لیے اپنا دوسرا گال بھی بڑھا دو۔“

”یہ سوچ صحیح کی اسکی اچھی اور پیاری بیاری باتیں ہم لوگ بھول گئے ہیں اس لیے تو اس حال کو پہنچ گئے ہیں۔ میں اپنا خیال پھر کرتی۔

جون نے ایک بچے دوست کی حیثیت سے میرا بڑا ساتھ دیا۔ اس کے کہنے پر میں شریر لڑکیوں اور لڑکوں کی پھبتیاں خاموشی سے برداشت کرنے لگی۔ اسکول میں وہ دونوں ساتھ ہی بیٹھتے تھے اور اسکول کے بعد بھی ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ مجھے چاکلیٹ، جیلی ٹنکس کھلاتا اور کولڈ ڈرنکس پلواتا تھا۔ میں اپنے گھر سے لائے ہوئے لنچ میں اسے ضرور شریک کرتی تھی۔

ایک دن چھٹی کے بعد ٹہلتے ہوئے ہم جا رہے تھے کہ اس نے دو لڑکیوں کو مجھ پر آوازیں کستے دیکھ لیا اور ایک خود کھانے لگا۔ اس نے تو جلدی جلدی اپنی آئس کریم ختم کرلی۔ میں موم نے ڈر کے مارے کھانا روک دیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”کیوں تم مجھے دیکھ کر اس طرح کیوں ہنس رہے ہو؟“

”میرے پاس کوئی آئینہ ہوتا تو میں تمہیں تمہارا چہرہ دکھاتا۔“

”کیوں کیا ہوا میرے چہرے کو؟“

”تمہارا چہرہ، چہرہ کم اور آئس کریم زیادہ ہو گیا ہے۔“ میں نے ایک لمحہ کے لیے اس مسخرہ خبر پر گردن کے بارے میں سوچا پھر اس سے کہا۔

”تم تو بہت خراب لڑکے ہو، میرا تماشا دیکھ کر خوش ہو رہے ہو۔ سچ ہے یہ ہیں ہوا کہ ہم ہر چہرہ صاف کر دیتے ہیں۔ لگے ہیں ظلم تیس آرہا ہے کہاں کہاں آئس کریم لگی ہے۔“

پہلے وہ حیرت سے کہتا پھر میرے قریب آکر میرے چہرے کو اپنی ہتھیلوں کے کٹورے میں بھر کر بغور دیکھنے لگا اور پھر بھک گیا۔

مجھے پہلے تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب آیا تو میں بھی اس جرم میں شریک ہو چکی تھی۔

اس سے پہلے ہم دونوں نے کبھی ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ اس وقت بھی شاید غیر ارادی طور پر یہ سرعملہ آگیا تھا اور نہ آیا تھا یہ آگے کی پوری داستان کہہ گیا۔ ہمیں ان دنوں اس بات کا بالکل احساس نہیں تھا کہ ہم کچھ کر رہے ہیں جبھی یہ سب خطرناک کھیل ہے۔ ہم یہی سمجھے کہ ایک دوسرے کے ساتھ یہ سرامر غلط اور نقصان دہ ہے۔ اب سوچتی ہوں کہ ہم کسے اندازوں سے کھیل رہے تھے جس کا ہمیں اختیار ہو سکتا ہے۔ ہم بھٹکتی ہوئی، بھرپور جوانی کی اس عمر سے گزر رہے تھے جس کی عمر بندی میں ہمارا کوئی دخل نہیں تھا۔ اس کا سب سے زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہمیں اپنی اس غلطی اور اس بھول پر کوئی پچھتاوا، کوئی ندامت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ نیا تجربہ ہمارے لیے ایک نئی تفریح اور انجانے لمحات ثابت ہوا اور انجام سے بے خبر ہم اس کی لذتوں میں ڈوبتے چلے گئے۔ اس وقت خراب ترگوش سے چوکے جب۔ وقت ہاتھ سے نکل گیا۔

اسکول لگی تو جون نے کہا۔ ”آج تم کچھ پریشان نظر آرہی ہو؟“

”کچھ نہیں، بہت زیادہ پریشان ہوں۔“

میری بات سن کر وہ کچھ بھی پریشان ہو گیا اور پریشانی کی وجہ معلوم کرنا چاہا۔

”ابھی نہیں، چھٹی کے بعد بتاؤں گی۔“ میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔

آج وقت بھی کچھ کالے نہیں لگ رہا تھا۔ بہرحال جب چھٹی ہوئی اور ہم اپنے مخصوص لوہاسپاٹ پر بیٹھے تو میں نے جون سے پہلے جون بول پڑا۔ ”کیا پانے فوا ہے؟ کسی نے مارا ہے؟“

”نہیں جون! ایسی کوئی بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”بات یہ ہے کہ..... میں.....“

”بات کیا ہے؟“

”نہیں.....“ وہ جھنجھلے انداز میں بولا۔

”ہاں جون یہ حقیقت ہے۔ ایک بھیانک حقیقت۔“

”مگر..... مگر یہ بات تمہیں کس نے بتائی؟“

”مجھے کون بتائے گا؟ میں خود ہی جانتی ہوں نا۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو.....!“ اس نے بے چینی کے عالم میں کہا۔ ”آخر تم کو کیسے معلوم ہوا؟“

”یہ معلوم ہوا جیسے ہر لڑکی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کب بالغ ہو گئی ہے۔“

”اچھا!“

اس کے بعد وہ اور کچھ نہیں بولا۔ اس پر میں خود بول۔

”ایسے بتاؤ میں کیا کروں؟“

”مجھے تو اس بات کا کوئی تجربہ نہیں۔“ اس نے ذرا توقف کے بعد جواب دیا۔ ”میں کیا بتاؤں؟ تم ہی بتاؤ تمہارے خیال میں تمہیں کیا کرنا چاہیے؟“

”تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے اس معاملے میں بہت تجربہ کار ہوں۔“

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ البتہ اس کی پیشانی پر شکنیں نظر آرہی تھیں۔ میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ان شکنوں کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ خصیا کچھ اور..... اگر خصیے پر شکن ہیں۔ مجھ پر اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ ”کیا ضرورت تھی اسے بتانے کی۔“

”تم ہی کسی سے پوچھ لیتیں۔“ جون نے کہا۔

”کس سے پوچھتی؟ کس سے پوچھ سکتی تھی؟ کیا کہتا چاہیے؟“

”کسی بھی لڑکی سے۔“

”تو پھر پہلی فرصت میں یہی بتاؤ۔ وہ تمہاری ہی ہیں۔“

وہ جو فیصلہ کریں گی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“

مجھے بڑی مایوسی ہوئی اس کے اس رویے سے۔ خود کوئی حل بتانے کی بجائے وہ مجھے دھکیل کر لڑکیوں کے حوالے کر رہا تھا۔ میں نے اسے ظرز انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”سارا ڈیئر! میں اپنی ایک پریشانی کا حل تم سے معلوم کرنا چاہتی ہوں۔“

”پریشانی! کیسی پریشانی؟“

”میں پریکٹیکل ہو گئی ہوں۔ بتاؤ میں کیا کروں۔“

”پریکٹیکل..... یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تمہاری شادی ہو گئی ہے؟ مگر تمہاری شادی کیسے ہو سکتی ہے؟ کیا صورت بنی تمہاری عمر 18 سال ہے۔“

”ہاں! میری عمر صرف 13 سال ہے۔“

”او مائی گاڈ! یہ تم نے اس اٹج میں کیا کرلیا؟ وہ کون ہے؟“

”وہ ہمیں ایک کلاس فیلو ہے۔ میرے ساتھ پڑھتا ہے۔“

سارا نے سر سے پاؤں تک مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر بے حد کھردرے لہجے میں بولی۔ ”شاید تمہارے جسم کی طرح تمہاری عقل بھی موٹی ہے۔ اس عمر میں تمہیں نہیں کرنا چاہیے تھا اور کیا بھی تھا تو..... تو تم دونوں کو احتیاطی تدابیر کرنا چاہیے تھی، جو لڑکیاں لڑکے شادی سے پہلے اس غلط راستے پر چلتے ہیں وہ ہر طرح کے پروٹیکشن کے کام کرتے ہیں۔“

”ہاں سارا! ہمیں پروٹیکشن سے کام لینا چاہیے تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر ہمیں اس وقت خیال آیا جب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اب تو تم مشورہ دو۔ مجھے اس حالت میں کیا کرنا چاہیے؟“

اس نے فوراً ہی کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ”تم نے آئی کوئیا؟“

”یہ کیسی آئی کی گولیاں ہوتی ہیں؟“

”تو پھر پہلی فرصت میں انہیں لے لو۔ اور تمہاری می ہیں۔“

کئی دن بعد میں نے جون سے کہا۔ ”تم ہی اپنے گھر میں ہم دونوں کی غلطی کا ذکر کرو اور ان سے پوچھو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”پوچھا تھا۔“

"تو پھر انہوں نے کیا جواب دیا اور تم نے اس کا تذکرہ مجھ سے کیوں نہیں کیا؟"

"اس ذرے سے نہیں کیا کہ تمہیں دکھ ہوگا۔"

"گویا انہوں نے کوئی اچھا مشورہ نہیں دیا۔ کیا کہا انہوں نے؟"

"میرا خیال ہے کہ ان کی رائے پاپا ایک دم مشتعل ہو گئے۔ کہنے لگے ہم تمہیں پڑھنے کے لیے اسکول بھیجتے ہیں یا غلط کام کرنے؟ تمہارا یہ تصور ہمارے قابل معافی ہے پھر بھی ہم تمہیں اس شرط پر صاف کر سکتے ہیں جب تم اس آوارہ لڑکی سے ملنا جلنا بالکل چھوڑ دو۔"

"مگر پاپا..... وہ جب..... ہو گئی ہے....." میں نے احتجاج کیا تھا۔

"اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اسے اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے دو۔ بانجھ نے خبیث سے کہا ہے۔"

مجھے جون کی ذہانت اس کے پاپا کی باتیں سن کر بڑا دکھ ہوا مگر میں نے اس سے اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ مجھے اس بات کا دھڑکا لگ گیا کہ کہیں اس باپ کے کہنے پر یہ میرا ساتھ نہ چھوڑ دے۔

جون کے گھر والوں کی طرف سے مایوس ہو کر اب ایک ہی آسرا رہ گیا تھا اور وہ یہ تھا کہ میں اپنے گھر والوں سے اپنی مدد کی درخواست کروں مگر جب بھی کچھ کہنے کا ارادہ کرتی۔ ساحل کے طعنے کا سوچ کر ہمت ہار جاتی۔ اس کشمکش میں کئی ماہ بیت گئے۔

ایک شام مجھے دیر سے گھر آنا پڑا۔ میں بہت پریشان ہو کر اشیاں کرنے لگی۔ میں دوڑ کر میرے پاس آئیں اور میری پیٹھ سہلاتے ہوئے بولیں۔ "میں اتنا غم غلط کھا لیا تھا کہ بدہضمی ہو گئی۔"

جب الٹی بند ہو گئی تو میں نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

"کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ یہ میری پریشانی کی وجہ سے....."

"کیا بکواس کر رہی ہے۔ جلدی بتا بھی ہے تو کیا کہہ رہی ہے؟"

"بس یار مجھے پتا ہے۔ یہ خیال ہے کہ میں پریگننٹ ہوں۔"

انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ ان کی پیشانی پر آہستہ آہستہ شکنیں ابھرنے لگی تھیں۔ پھر سوچنے کے انداز میں بولیں۔ "تو گویا تین چار ہفتے کا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"اب تک تو نے بتایا کیوں نہیں؟ چھپایا کیوں؟ اور کون تھا وہ ڈرٹی سوئین؟ حسن نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ایک چھوٹی عمر کی بچی ہے۔"

"سر! ڈر کے مارے نہیں بتایا تھا اور وہ میرا بوائے فرینڈ ہے۔"

"یہیں اسی کاؤنٹی میں رہتا ہے اور میرے ساتھ میری کلاس میں پڑھتا ہے۔"

"یہیں رہتی ہے اسی محلے میں؟"

"جی ہاں، مجھ سے ایک سال بڑا ہے۔"

اب وہ غصے سے بھوت بن گئی تھیں۔ "ہم تجھے تعلیم حاصل کرنے اسکول بھیجتے ہیں یا اپنی عمر سے بڑے لوگوں کے ساتھ کھیل کھیلنے؟" ان کے منہ سے ساحل کے ہاتھ کی پہلی چوٹ تھے۔ میرے بال نوچتے ہوئے وہ مجھے دونوں گالوں پر تھپڑوں کی بارش بھی کرتی جا رہی تھیں۔ "یہی سب کرنے اسکول جاتی ہے۔ چلو وہ تو کی حد تک تو درست ہے کہ گالی غلوچ سے کی جائے مگر دست کے ساتھ دو سب کچھ کر گزرنا، جس کا انجام اتنا شرمناک ہو۔ سوئی بھینس! تجھے ذرا بھی خیال نہیں آیا کہ تیری عمر کھیلنے کی ہے۔ سب کچھ نہیں کرنے کی۔"

ان کے تھپڑ اور لاتیں میرے دونوں گال سن ہو گئے۔ جب وہ تھک کر چور ہو گئیں تو تھپڑوں کی بارش رک گئی۔ وہ دیر تک روتے رہنے کے بعد میں نے کہا۔ "ممی! جو غلطی ہم سے ہوئی تھی، ہو گئی۔ اب آپ بتائیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"ڈوب مرنا چاہیے۔ ہاں تجھ جیسی سوئی تھی کی نرازا کے لیے یہی بہتر ہے کہ تو ڈوب مرے۔ مٹ اپنے تو رے بھائی کی تمیز، دوسروں کے لیے یہی بہتر ہے کہ مر جائے۔"

میں کچھ دیر تک خاموش رہی، میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بھی چپ بیٹھی رہیں۔ تھوڑے وقفے کے بعد میں نے بجھی بجھی سی آواز میں کہا۔ "ممی! بتائیے نا مجھے کیا کرنا ہے؟"

"ابارشن۔" انہوں نے اپنے لہجے کے بھنگلے کے ساتھ کہا۔

میں ایک دم سناٹے میں آ گئی۔ مجھے ہی سے ہر گز اس جواب کی توقع نہیں تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر چند لمحوں کے بعد بولیں۔ "ملی میرے ساتھ چلاؤ۔ دیکھتی ہوں۔ کہیں اس کا کوئی بندوبست ہوتا ہے یا نہیں۔ یہ ہر طرح کی آسان نہیں۔"

"نہیں ممی! آپ کا یہ پروپوزل مجھے قبول نہیں آیا۔ اپنے جرم کی سزا ہم اس معصوم کی جان کو کیوں دیں، جو ہے گا۔ یہ ہے، کہ اسے دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار دیں؟"

ممی کا وہ غصہ جو تھوڑے کم ہو گیا تھا۔ ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔

"تو پھر تو خود مرنے کے لیے تیار ہو جا۔" انہوں نے للکارتے ہوئے کہا۔ "میں تیری بہنوں سے سوسائٹی میں منہ دکھانا نہیں چاہتی۔"

"مگر ممی! ہمارا معاشرہ ایسا بھی بے لباس ماندہ نہیں۔ شادی کے بغیر بہت سی لڑکیاں ماں بن جاتی ہیں اس کے باوجود باعزت زندگی گزارتی ہیں۔"

"مگر وہ میری طرح بچی نہیں ہوتیں۔ 18 سال سے زیادہ عمر کی ہوتی ہیں۔"

"آپ مجھے ابارشن پر مجبور نہ کیجیے۔" میں تن کر کھڑی ہو گئی۔ "مجھے شوٹ کر دیجیے۔ سر اکاٹ دیا کر مار دیجیے یا میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیجیے۔"

انہیں شاید میرے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ لمحہ بھر کو رکیں، کچھ سوچا پھر بولیں۔ "میں تیری طرح قوی عقل کی نہیں کہ تیرے خون میں ہاتھ رنگے کر قانون کی مجرم بن جاؤں۔ اتنا کہہ کر وہ میری طرف جھپٹیں اور میرے کچھ سمجھنے سننے سے پہلے مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے دروازے تک لائیں اور دھکا دے کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔ "جا دفع ہو جا اور ادھر پلٹ کر بھی نہیں آنا۔ آج سے تو میرے لیے مر گئی۔" اور زور سے دروازہ بند کر دیا۔

میرے پیر ہی نہیں گویا جسم سوار ہو گیا تھا۔ میں رکی نہیں، میں روتا ہوا دروازہ کھولنے کی درخواست کی چلتی رہی روتی رہی۔ جانے کتنی دیر تک اور کتنی دور تک چلی تھی کہ ایک کار میرے قریب آ کر رکی اور کھڑکی سے مرزا کل کر کہنے لگا۔

"پیدل چلنے کے لیے جسم فٹ پاتھ موجود ہے تو سڑک پر کیوں چل رہی ہو؟"

میں نے چونک کر گاڑی کی طرف دیکھا اور جواب دینے کی کوشش کی مگر میری آواز میں سسکیوں اور رونے کی وجہ سے گڈمڈ ہو کر رہ گئی۔ اگلے لمحے کار کا دروازہ کھلا اور ایک خاتون میرے قریب آ کر کھڑی تھیں۔ "کیا ہوا ہے تم رو کیوں رہی ہو؟ کیا کسی نے مارا ہے؟ یا کوئی اچھا تمہارا کوئی چیز چھین کر بھاگ گیا ہے؟"

جواب دینے کے لیے مجھے سلطنے میں دیر لگی تو وہ خود ہی بول پڑیں۔ "بیٹا! تمہیں گھر سے اکیلے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ آج کل یہاں اس کاؤنٹی میں بھی آوارہ گرد لڑکے....."

"نہیں آنٹی!" میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"میری کسی نے بے حد گھر سے نکال دیا ہے۔"

"مگر کیوں؟"

اب میں نے نہایت اختصار کے ساتھ اپنی بپتا سنا دی۔ انہوں نے مجھے سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا۔ پھر پولیس۔ "تمہاری ممی کا فون ہے جانتیں ہے۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ اب تم کہاں جا رہی ہو؟ تمہارا کوئی عزیز رشتے دار ہے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر کہاں جاؤ گی؟"

"پتا نہیں۔"

چند لمحوں تک وہ مجھے حیران و پریشان دیکھتی رہیں پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بولیں۔ "چلو میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"میرے گھر۔"

"نہیں آنٹی! مجھے میرے گھر کا دروازہ، مجھ پر بند ہو گیا تو پھر میں کس اور کے گھر کیوں جاؤں! میرے لیے تو اب موت جانا ہی بہتر ہے۔"

"پاگل ہے کی باتیں نہ کرو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ اپنے لیے نہیں اور اس معصوم کی جان کے لیے بھی جو تمہاری کوکھ میں موجود ہے۔"

یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرے مزید کچھ کہنے کا انتظار نہیں کیا۔ مجھے تھپتھپاتی ہوئی گاڑی تک لائیں اور اپنی بازو والی سیٹ پر بٹھانے کے بعد گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

ان کے ساتھ ایک اجنبی لڑکی کو دیکھ کر ان کے گھر کے لوگ حیران ہوئے۔ سب یہ جاننا چاہتے تھے کہ میں کون ہوں؟

بچوں کو تو انہوں نے یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ "یہ ہماری مہمان ہیں اب یہ ہم سب کے ساتھ رہیں گی۔"

بڑوں کے درمیان بٹھا کر انہوں نے مجھ سے کہا۔ "سب سے پہلے تو تمہیں یہ بتانا ہوگا تمہارا نام کیا ہے؟"

"جولیا۔ جولیا رابرٹ۔"

"اچھا جولیا اب یہ بتاؤ وہ کون ہے، کیا کرتا ہے جس نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے؟"

"وہ میرا ہم جماعت ہے، میرے ساتھ پڑھتا ہے۔"

اس کا نام جون ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ابھی نہیں آیا ہے؟"

"وہ چھ سے عمر میں ایک سال بڑا ہے، اس کی عمر 14 سال ہے۔"

"اوہ اچھا گاڈ!" ایک انگل خشمگیں کے مرد نے کہا۔ "اس عمر میں تو وہ لوگوں کا یہ اقدام، اس ملک کے قانون کے مطابق بہت بڑا جرم ہے۔ 18 سال کی عمر سے پہلے کوئی شادی نہیں کرسکتا۔ کیا تم دونوں کو اس بات کی خبر نہیں تھی؟"

"جانتا ہوں، ابھی بھی ہے۔" سیری جانے آنٹی بول پڑیں۔ "عدالت کی رو میں بھٹکنے والے ایسی باتوں کا سب خیال رکھتے ہیں۔" اب وہ مجھے مخاطب کرکے بولیں۔

"جولیا! تم ہمارے ساتھ گھر میں رہو، ہمارے ساتھ رہو گی۔ اب ہم تمہارے معاملات کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور ہم کوئی غلط بات سوچ بھی نہ کرنا خلاف قانون اقدام کی۔ سمجھے آنٹی بیٹی ہوئی؟ آنٹی بھی ہے۔"

آنٹی کی اس محبت پر میں اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ آنٹی نے مجھے تسلی دلاسا دی۔ سیری بیٹھ گئیں اور کہا۔ "اب تمہیں کچھ سوچنے اور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ سوچنا ہے اور کرنا ہے، ہم کریں گے۔"

آنٹی کا نام مریم زمانی تھا۔ ان کا تعلق سمندر کنارے سے تھا۔ ان کے ہسبینڈ ایس ایم زمان اس کا ڈنی میں ایک طویل عرصے سے بزنس پارٹنر تھے اور کاروبار کرتے تھے۔

اگلے روز مریم آنٹی مجھے اپنے ساتھ لے کر اپنی ایک جاننے والی لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئیں۔ ڈاکٹر نے میرا بہت اچھی طرح معائنہ کیا۔ کچھ ٹیسٹ بھی لیے اور آنٹی سے کہا۔

"گومری میں ماں بننے والی لڑکیوں کو بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب کہ یہاں عام بچوں کے مقابلے میں بہت کمزور ہوتا ہے۔ اس کی پرورش بھی بہت مشکل ہوتا کرنی پڑتی ہے۔"

گھر آکر آنٹی بولیں۔ "ماتم نہ کرو ڈاکٹر کیا کہہ رہی تھی؟"

"ہی ہائی!"

"تو اب تمہیں ہر قدم محتاط ہو کر اٹھانا چاہیے تاکہ تمہیں اور تمہارے ہونے والے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

آنٹی جس طرح اپنے بچوں کو چاہتی تھیں اسی طرح مجھے سے بھی پیار کا اظہار کرتی تھیں۔ ہر طرح میرا خیال رکھتی تھیں۔ ایک دن انکل زمان نے ان سے کہا۔ "زمانی بیگم!

جولیا کو تم نے اپنے پاس رکھا ہے، اسے یہ فکشن ہاؤس سے باہر بہت اچھی بات ہے لیکن قانونا کل کو ہمیں یہ پولیس کیس نہ بن جائے۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔" آنٹی نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ "اور اگر اس کے باوجود بھی کسی نے ہمارے خلاف کوئی مقدمہ بنانے کی کوشش کی تو جولیا ان کے الزام کو غلط ثابت کردے گی۔"

آنٹی کے گھر آنے کے بعد میں اسکول نہیں جارہی تھی، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری کتابیں اور یونیفارم میرے گھر ہی میں رہ گئے تھے۔ آنٹی مجھ سے بولیں۔

"تمہیں تمہاری گمشدگی کے بعد تمہارے گھر والوں نے تمہیں ڈھونڈنے کی کوشش بھی کی یا نہیں؟ اسکول گئے تھانے جاکر رپورٹ لکھوائی یا نہیں؟"

اسکول کے بارے میں تو معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"جون کے ذریعے۔"

"کیا جون سے کہہ کر معلوم کروں؟"

"نہیں اس سے فون پر بات کرکے۔"

"تو پھر فون کرکے اسے یہاں بلا لو۔ یوں بھی اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی وجہ سے تم کس حال میں ہو۔" انکل بولے۔ "تھانے کے بارے میں، میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ کسی نے رپورٹ درج کرائی ہے یا نہیں۔"

جون کو میں نے فون کیا تو وہ میری آواز سنتے ہی بولا۔

"تم کہاں ہو، اسکول کیوں نہیں آرہی ہو، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میں گھر پر نہیں ہوں، ہمی نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔"

"نہیں!" وہ بے یقینی کے عالم میں چیخا۔

"یہ حقیقت ہے جون۔"

"پھر تم کہاں ہو۔ خیر سے تو ہو؟"

میں نے اسے آنٹی کے گھر کا پتا دیا اور یہاں آکر نے کہا۔ اس نے شام کو آنے کا وعدہ کیا۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق شام کو پہنچا۔ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

"میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ کیوں نکالا تمہاری ہی نے تمہیں اپنے گھر سے۔ تم نے ابھی بتایا ہوگا کہ....."

"ہاں اس پر تو بھاگ کھڑا ہوا۔ ان کے خیال میں میرا جیرم معافی کے قابل نہیں ہے۔" اس کے بعد میں نے ساری باتیں بتادیں اور کہا۔ "اگر آنٹی اس سوئچ پر مجھے سہارا نہ دیتیں تو پتا نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ تم یہ بتاؤ اسکول میں میرے گھر سے کوئی آیا تھا؟"

"میرے خیال میں شاید کوئی نہیں آیا۔ میں نے تو یہی سمجھا کہ تمہاری طبیعت بگڑ گئی ہوگی۔ تمہاری کمی کے رویے پر بہت افسوس ہوا۔"

"مگر بیٹا!" آنٹی بول پڑیں۔ "ان کا خیال ان کا رویہ بے جا نہیں۔ جولیا! تمہیں بات چھپانی چاہیے۔ اس چھوٹی عمر میں اس نے جو غلط قدم اٹھایا ہے وہ بہت بڑا جرم ہے۔ یورپ میں آزادی تو حاصل ہے مگر 18 سال کی عمر کے بعد۔ ابھی اس کی عمر 13 اور تمہاری صرف 14 برس ہے۔ اس عمر میں ایسا کچھ کرنا قابل مواخذہ ہے اور سزا کے بھی۔ اتنا آسان جرم نہیں ہے ناک بنا بھا نا ہے۔ بلکہ ان میں تو اس جرم پر ماں باپ اور عزیز و اقارب اپنے بچوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں اگر یہ وہاں شادی بیاہ کے لیے سفر کی کوئی قید نہیں۔"

جون نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شرمندگی سے سر جھکائے تھا۔ ذرا دیر تک کوئی کچھ نہیں بولا۔ آخر دیر بعد آنٹی ہی کہہ رہی تھیں۔

"جون! موجودہ حالات میں تمہیں جولیا کا ساتھ دینا چاہیے۔ اگر چہ ہم ہر طرح اس کا خیال رکھتے ہیں لیکن اسے تمہاری رفاقت کی بھی ضرورت ہے۔ تم آتے جاتے رہو اور دونوں مل کر آنے والے ننھے مہمان کے مستقبل کے بارے میں بھی منصوبہ بندی کرتے رہو۔"

اور ایسا ہی ہوتا رہا۔ جون اکثر آنے لگا۔ وہ مجھ سے ساتھیوں جیسا برتاؤ کرتا بھی مجھے سے باتیں کرتا جب آنٹی ہم دونوں کو تنہائی میں ملنے کا بھی موقع دیتیں۔ ایسے میں ہم ایک دوسرے سے باتیں بھی کرتے اور آنے والے دنوں کی منصوبہ بندی بھی کرتے۔

"جون! تم مجھے اس حالت میں چھوڑ کر نہیں بھاگو گے نا؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو جولیا!"

"دیکھو جان! اب مجھ سے زیادہ اس بے بی کو تمہاری ضرورت ہے۔" میں بولی۔

وہ کہتا۔ "سوئٹ ہے بی! تم اطمینان رکھو تمہارا پاپا بیشک تمہارے پاس رہے گا۔"

جون کے بارے میں مجھے جو ڈر خوف تھا کہ وہ مجھے اس حال میں چھوڑ کر بھاگ نہ جائے، ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ روز بروز سنجیدہ ہوتا جارہا تھا۔ اب اس نے پڑھائی کے بعد چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم جاب کرنی شروع کردی۔ ویک اینڈ میں اسے جو تنخواہ ملتی اس سے وہ مجھے نئے کپڑے، جوتے وغیرہ لا کر مجھے دیتا اور کبھی کبھی ہمی میرے ساتھ رہ پڑتا۔ کبھی کبھی آنٹی کے بچوں کے لیے بھی چیزیں لے کر آتا۔ اس نے تو آنٹی کو بھی کچھ رقم میری خوراک کے طور پر دینا چاہی تھی مگر آنٹی نے اسے ڈانٹ دیا۔

"جولیا میری بیٹی ہے، اس لیے میرے گھر میں ہے۔ فی الحال تمہیں اس کی لائبلٹی بورڈنگ کے بارے میں گفتگو ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ تم اپنی بے بی کے لیے جو کچھ کرسکتے ہو اس کے بارے میں، میں تمہیں، دونوں کی تلقین کرتی رہوں گی۔"

وقت کو گزرنے میں دیر نہیں لگتی۔ آنٹی اکثر مجھے لے کر ڈاکٹر کے پاس جاتیں اور معائنہ کرواکر اور دوائیاں وغیرہ لے کر آتیں۔ پھر ڈیلیوری کا وقت بھی آگیا۔ یہ مرحلہ آسان تھا۔ جو آپریشن کے ذریعے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیسے میری ساری تکلیفیں دور ہوگئیں۔ اسپتال میں ہی ان کزن اگر کرم آنٹی کے گھر آگئے۔ آنٹی کے گھر میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ لگتا تھا جیسے وہ اپنی حقیقی بیٹی کی ماں بننے کے بعد ہائی جن کی ہیں۔ جون بھی بہت خوش تھا۔ بیٹی کو گود میں لے کر وہ رنگ بیاد کرتا رہتا۔

"دیکھو کیسی عجیب بات ہے۔" میں نے جون سے کہا۔ "لوگ میرے بچے کو بن باپ کا کہتے تھے مگر اس نے تو خوش نصیب ہے۔ جو لوگ سب کچھ تھے انہوں نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔ انہوں نے تو قانونی میں گمشدگی کی رپورٹ تک نہیں لکھوائی۔"

"تمہارے ساتھ کیسے معلوم ہوا کہ؟"

"انکل نے خفیہ طریقے سے معلوم حاصل کی تھیں۔"

"ایک بات پوچھوں تم سے جولیا؟" آنٹی اور کب تک تمہیں اپنے ساتھ رکھیں گی؟"

"ان کا کہنا ہے کہ جون جب تک اپنی تعلیم مکمل کرکے کوئی اچھی ملازمت نہیں کرلیتا اور تمہیں اپنے ساتھ رکھنے کے قابل نہیں ہو جاتا ہم تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھیں گے۔"

"یہ کیسے اچھے لوگ ہیں۔ خیر ہونے کے باوجود کہتے اپنے ہیں۔"

جون کے ساتھ یہ آسانی تھی کہ وہ اپنے گھر میں رہتا تھا اور اس کے ماں باپ اس کے تمام اخراجات پورے کرتے

تھے۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالج کے زمانے میں بھی وہ عارضی ملازمت کرتا رہا اور میری اور بے بی کی ضرورتیں پوری کرتا رہا۔

ہم دونوں کو اپنا الگ گھر بسانے کی بڑی تمنا تھی ہمارا تائی کا کہنا تھا کہ جب تم دونوں قانونی طور پر شادی کے قابل ہو جاؤ گے تب میں اپنا بھائیوں والا فرض ادا کر کے رخصت کروں گی۔ لڑکا مجھے اپنے اٹھارہ سال کی عمر میں پہنچنے کا انتظار تھا جب جون 19 سال کا ہو جائے گا۔ آنٹی بڑی جہاندیدہ عورت تھیں۔ اس لیے ہمارے جذبات و احساسات کا اندازہ لگاتے ہوئے انہوں نے ہمیں قربت کی اجازت دے دی تھی کہ اٹھارہ انیس سال کی عمر کو پہنچتے میں ابھی پانچ چھ سال باقی تھے۔ یوں بھی جب ہم ایک بچے کے ماں باپ بنتے تو ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھنے کا جواز غیر منطقی تھا۔ بے بی ابھی ڈھائی سال کی ہی ہوئی تھی کہ اٹھارہ ایک بچہ بھی پیدا ہو گیا۔

ایک دن میں نے انکل کو کہتے ہوئے سنا۔ ”بیگم زمانی! تمہارے گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا ہمارے بچوں پر کیا اثر پڑے گا؟“

”میں نے بچوں کو پہلے ہی بتا دیا تھا۔ سمجھا دیا تھا کہ جول تمہاری بہن اور جون تمہارا بھتیجا ہے۔ دولہا بھائی ہے اور پھر یہ بھی سوچیں مسٹر زمان کہ جون کے بیروں میں تو زنجیر ڈالنے کی بھی ضرورت تھی اگر میں انہیں آزادی کی اجازت نہیں دیتی تو کیا اس کا امکان نہیں تھا کہ وہ اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے چپکے سے دور ہو جاتا اور وہ..... کس اور کا ہو جاتا؟“ آنٹی زمان کیس تو انکل بول پڑے۔

”زمانی بیگم تو بہت دور تک دیکھتی ہو۔ بہت دور کی سوچتی ہو۔“

”سوچنا پڑتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے زمانی صاحب! میں نے جولیا کو ایک بے سہارا لڑکی سمجھ کر سہارا دیا ہے مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں زندگی بھر اسے اپنے پاس رکھوں گی کیونکہ اس کا اصل اور حقیقی سہارا تو جون ہے۔ جس کے ساتھ اسے زندگی گزارنی ہے اس لیے اسی نے اس کا دان یہاں اور کنسن لڑکی کو وقت سے بہت پہلے مار بنا دیا ہے۔ آپ کو تو یہاں پر ملائیشیا کے اس روش یا کٹوفی قلم کے کیمپاس کے بیشتر لڑکے اپنی گرل فرینڈز کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ انہیں اپنی خواہشوں کا شکار بنانے کے بعد فرار ہو جاتے ہیں اور ان کے فریب میں پھنسنے والی لڑکیوں کو زندگی بھر خیار و جگتاپڑتا ہے۔“

مجھے انکل اور آنٹی کی باتیں سن کر شدت سے احساس ہوا کہ ہم نے جو زیادتی بھول اپنی کسی اور نادانی کی وجہ سے کی تھی اس کا نتائج ۱۸ نہ بڑا ہے اگر آنٹی اس کی گرفت میں نہیں پہنچتیں تو میرا مستقبل بالکل تباہ ہو جاتا۔ میں کسی کے سہارے کے بغیر زندگی کیسے گزارتی؟ میرے لیے جون کا ساتھ آنے والے دنوں کے لیے ضروری تھا اور میری بیماری بہت زیادہ پیچیدگی اور دردِ انگیز تھی آنٹی کی وجہ سے میری اس ضرورت کی تکمیل آخر کار ہو گئی۔

میری عمر 18 برس ہوتے ہی آنٹی نے میری اور جون کی شادی کروا دی۔ ہمارے شادی کی رسم و رواج اور عقیدے کے مطابق چرچ میں شادی بھی ہم سے ادا کروائی۔

اس وقت تک جون تعلیم مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ آنٹی نے اس گھر کی ساری ضرورتیں اپنے خرچ سے پوری کر دی تھیں۔

اب میں خوش ہوں کہ ایک نیک اور بردبار خاتون کی وجہ سے میرا مستقبل تباہ ہونے سے بچ گیا۔ مجھے میری منزل مل گئی اور ناخوش بھی ہوں دکھی بھی ہوں کہ میرے دیکھے ہوئے خواب پورے نہ ہو سکے۔ میں ایک اچھی ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ میں بہت زیادہ دولت مند بننا چاہتی تھی کہ میری یہ خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔ میں اس بات پر بھی دکھی ہوئی ہوں کہ جون اور میرے درد بچوں کے لیے بہت زیادہ وقت کرنی پڑتی ہے۔ میں یہ سوچ کر بھی اکثر افسردہ ہو جاتی ہوں کہ دوسری بیویوں کی طرح معاشی طور پر اپنے شوہر کا ہاتھ نہیں بٹا سکتی۔ اس کا بوجھ بانٹ نہیں کر سکتی۔ جون کے اس قدر محنت کرنے کے باوجود ہم اپنے بچوں کی تمام خواہشیں پوری نہیں کر سکتے۔ میں اکثر یہ بھی سوچتی ہوں کہ اگر اپنی کسی کے روپ میں اتنی بڑی غلطی نہ کرتی تو اپنے میرج شدہ کے زیرِ سایہ وہ کتنا مستقل زیادہ شاندار ہوتا۔ آج میں زیادہ خوش حال زندگی بسر کر رہی ہوتی۔ کاش پاکستان جیسا حاشیہ والا ملک ہوتا تو ہم کسی بنک سے بھی قرضہ لے لیتے۔

میں نے اپنی یہ کہانی اس لیے لکھی ہے کہ میری طرح دوسری لڑکیاں اپنی آنے والی زندگی کو مشکلات میں، خطرات میں نہ مبتلا کریں۔ یہ ناول کا کہنا ہے کہ خود ظلم کھا کر گرنے سے بہتر ہے کہ دوسروں کو ٹھوکر کھا کر گرتے ہوئے دیکھ کر سنبھل کر اور احتیاط کے ساتھ چلنا سیکھیں۔ میری اس کہانی کا بھی یہی مقصد ہے۔

تعاقب

محترم مدیر
السلام علیکم
آپ پُراسرار نمبر نکالتے ہی ہیں۔ اسی مناسبت
اشتہار دیکھا کہ آپ پُراسرار نمبر نکالنے لگی کیونکہ
سب میں اپنی سہیلی شہناز کی داستانِ حیات لکھنے لگی کیونکہ
اس داستان کی ایک کردار میں خود بھی ہوں۔ کہانی دلچسپ ہے
اگر خاص نمبر کے معیار کی نہ ہو تو عام شمارے میں شامل کرلیں۔
حنا رئوف
(کراچی)

یہ بلانک، ہم دونوں کی تھی۔
یعنی میری اور شہناز کی۔ بلکہ پوری بلانک، اسی کی تھی۔ میں نے تو صرف اس کا ساتھ دیا تھا اور وہ بھی کسی خرابی یا کسی جرم کے لیے نہیں، بلکہ شہناز کی جان بچانے کے لیے۔
وہ میری بہت اچھی دوست تھی۔
اور اب وہ نہ جانے کہاں ہے۔ میں نہیں جانتی۔ اس کے والدین اسے لے کر چلے گئے تھے۔ کہاں، یہ مجھے نہیں معلوم۔

اس کہانی کی ابتدا اس دن سے ہوتی ہے جب ایک شام شہناز کی کال آئی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں تھی۔ جب میرے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ کال شہناز ہی کی تھی۔
”کیا حوا میری جان؟“ میں نے پوچھا۔
”باز آ جاؤ اس وقت میرے پاس آ جاؤ۔“ اس نے کہا۔
”خیریت تو ہے نا؟“
”خیریت ہی تو نہیں ہے۔ تم بس جلدی سے گھر

آجائے۔"

میں شہباز کے گھر پہنچ گئی۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھی۔ "ہاں بھائی کیا آفت آگئی تم پر۔" میں نے پوچھا۔

"کیوں کہ مجھے تم سے ٹاپل دکھانی ہے۔"

"یارا ٹاپل اوروں کے لیے ہے۔ میرے لیے نہیں ہے۔" اس نے بتایا۔

"ہوا کیا ہے؟"

"وہی کہانی پھر شروع ہوگئی ہے۔" اس نے کہا۔ "گھر والے امجد سے شادی کے لیے بے تاب ہو رہے ہیں۔"

امجد شہباز کا کزن تھا۔ میں بھی اس کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ ایک نمبر کا فالتو انسان تھا۔ کئی لڑکیوں سے اس کے تعلقات تھے۔ اچھا خاصا بدنام شخص تھا۔ خوبی صرف یہ تھی کہ اس کے باپ کا اچھا خاصا بزنس تھا۔ پیسے والے لوگ تھے اور شہباز کے رشتے دار بھی ہوتے تھے۔

جب کہ شہباز ایک مختلف لڑکا تھا۔ لٹریچر سے دلچسپی رکھنے والا۔ نازک مزاج، خوب صورت، وہ گیدڑ اکثر کی طرح کے قابل نہیں تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہارے گھر والوں کو تم ان کو سمجھا تو سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"ہاں لیکن ان کی سمجھ میں بات نہیں آرہی اور تم جانتی ہو کہ شادی اور میں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

میں کا شہباز کو بھی پتا تھی وہ بالکل شہباز کے مزاج کا تھا۔ کلچرڈ، پڑھا لکھا، نرم مزاج۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے پاس امجد جتنے پیسے نہیں تھے لیکن وہ اسے آگے بڑھنے کی لگن تھی اور وہ آگے بڑھ بھی تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ شہباز اور کاشان ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔

"امجد کے گھر والے شادی کے لیے زور دے رہے ہیں۔" شہباز نے بتایا۔ "بلکہ ان کا خیال ہے کہ وہ دس مہینوں میں شادی ہو جائے۔"

"تو پھر بتا دیا کیا ہے؟"

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا اس لیے تو مشورے کے لیے تم کو بلایا ہے۔"

"میں آنٹی سے بات کروں۔ ان کو سمجھاؤں۔" میں نے پوچھا۔

"کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان کے سر پر بھوت سوار ہے۔" شہباز نے کہا۔ "انہیں امجد کے علاوہ کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔"

"پھر۔"

"پھر یہ کہ میں مختلف باتیں سوچ رہی ہوں۔ یہ بہتر سمجھ لینا کہ میں کاشان سے جا کر کورٹ میرج کر لوں کیوں کہ یہ میرے مزاج اور میرے کردار کے خلاف ہوگا اور نہ ہی کاشان بھی ایسا کہیں چاہے گا۔ میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"اتنا تو تمہیں بھی جاننا ہوں کہ کاشان نہیں چاہے گا۔"

"میں ایک راستہ نہ دیکھا ہے میرے پاس۔" اس نے پُراسرار انداز میں بتایا۔ "اب بات میں تم سے مشورہ چاہتی تھا۔"

"کیا راستہ۔"

"یہ آئیڈیا کل رات ہی میرے ذہن میں آیا ہے۔" اس نے کہا۔ "کل رات میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی ایک بار سوچتی رہی کہ میرے ہی گھر کیوں آئیڈیا آگیا۔"

"بتاؤ تو سہی کیا آئیڈیا ہے؟"

"بتاتی ہوں صبر تو کیجیے گا۔" اس نے بتایا۔

"کیا مکھن اس کو بھی لگانا ہے میری جان۔"

"بہت زبردست بلیک ہے میری جان۔" اس نے کہا۔ "میری جو آنٹی ہیں، امجد کی امی۔ وہ ایک نمبر کی وہمی عورت ہیں۔ جادو ٹونے، چڑیل، بھوت اور جنوں وغیرہ پر یقین رکھتی ہیں۔ ہر بہت اثر کو مختلف عاملات پر حاضری کے لیے جاتی رہتی ہیں۔"

"یعنی وہ کمزور عقیدے کی عورت ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں بہت کمزور عقیدے کی۔"

"تو پھر تم کیا کرو گی؟"

"ان کے اس کمزور عقیدے کا فائدہ اٹھانا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں اپنکٹ کرتی ہوں گی۔ زبردار عاملی آواز نکالا کر بولتا ہوں گا۔ اُنی سیدھی حرکتیں کرتی ہوں گی۔ اس کے بعد ہم بن جائے گا۔ اس عورت کو جیسے ہی یقین ہو جائے گا کہ ہم کسی جن یا بھوت کے قبضہ کر لیا ہے تو پھر وہ زندگی بھر ہمارے نخرے ہی اٹھائے گی۔"

"ترکیب تو شاید کام آجائے لیکن میں ایک الجھن ہے۔"

"وہ کیا؟"

"تم ہر وقت یہ اینکنگ کیسے کرتی رہو گی؟"

"باجی ہوتم، ایسی قسم کی ہر وقت اس کنڈیشن میں نہیں رہتے۔ بس کبھی کبھی اٹان پر دورے پڑتے ہیں اور وہ جنلی ہو جاتے ہیں۔"

"کیا ہیں ذرا سے کو سنبھال لو گی۔"

"سہ قصد تم خود کو تیار رہا جا گی۔"

"اب اس میں ایک چلہ اور بھی ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"سنا ہے کہ ایسے سریضوں کو کسی بابا وغیرہ کے حوالے کر دیا جاتا ہے جو عورتوں اور لڑکیوں سے اتنی سیدھی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔"

"ارے بابا یوں کی ایسی کی تیسی۔" اس نے اپنی باہیں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "خوب مزہ آئے گا مجھے ہے مارشل آرٹ کی ٹریننگ یوں ہی تو نہیں لی۔ بابا کے بھی ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

"اس کا مطلب ہے تم کو اترنے کا ارادہ کر لیا ہے۔"

"بالکل پکا۔ لیکن میں یہ کام بڑی ہوشیاری کے ساتھ کروں گی۔" اس نے کہا۔ "پہلے میں ہوگا کہ اپنکٹ شروع ہو جاؤں۔ وہی آنٹی محترمہ تو وہ اُنکے پنتے منوڑہ کے مزار پر حاضری دینے کا ارادہ کر رہی ہیں اور ہم کو بھی کہہ رہی ہیں کہ ہم بھی ان کے ساتھ چلے جائیں۔ میں وہاں جاؤں گی اور وہاں آکر اپنکٹ شروع۔"

"میرا خیال ہے کہ تیری یہ ترکیب کام آ ہی جائے گی۔"

"سو فی صد کیں کہ صرف آنٹی ہی نہیں بلکہ پورا گھر ہا وہی ہے۔ اس قسم کی خرافات پر یقین رکھتا ہے۔ امجد تو جنے اس حال میں دیکھ کر وہاں دور سے بھاگ جائے گا۔"

دریغ ہنسنے رہے تھے۔

ایک ہفتے کے بعد شہباز نے فون پر بتایا۔ "کام شروع ہو گیا ہے یار۔ ہم کل آج منوڑہ گئے تھے۔ وہاں سے واپسی میں تھوڑی کھوئی رہنے کی ہوں۔ خاموش رہنے کی اداکاری شروع کر دی ہے۔ کل تک دیکھ لینا کیا ہوتا ہے۔"

دوسری شام کو شہباز کی امی کا فون آگیا۔ وہ بے چاری بہت پریشان ہو رہی تھیں۔ بیٹی ذرا سا شہباز کو آکر دیکھ لو کیا ہوا ہے اس کو۔"

"کیا ہوا ہے آنٹی؟"

"ہم سب کل منوڑہ گئے تھے۔" انہوں نے بتایا۔ "وہاں سے واپسی پر اس کا یہ حال ہو گیا ہے۔ تم آکر دیکھ لو۔ مشورہ دو پتا کہ ہم کیا کریں۔"

میں جب شہباز کے گھر پہنچی تو اس کی اداکاری اپنے عروج پر تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی۔ کبھی ہنس رہی تھی۔ کبھی رو رہی تھی۔ کبھی اپنے آپ سے باتیں کر رہی تھی۔

وہ سوئی اور بھدی آواز بنانا کر زور زور سے بولے جا رہی تھی۔ "میں دیکھو کیوں قابو سے کب جلا کر خاک کر دوں گا۔ شہباز میری ہے۔ کوئی میرے راستے میں نہ آئے میں نے اس کو پسند کر لیا ہے۔"

پتا نہیں وہ کیا کیا ہوں کر رہی تھی۔

"شہباز کی امی شدید خوف زدہ اور حیران تھیں۔ "کس کا نظر لگ گئی ہے۔ یہ لڑکی باتیں کیوں کر رہی ہے۔"

اس وقت میرے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو رہی تھی۔ بہت بڑا کی ایکٹنگ کر رہی تھی۔

"آنٹی یہ کچھ خطرناک معاملہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "دعا کریں اس کے لیے ہے بہت سے واقعات دیکھ چکے ہیں۔ خدا خیر کرے۔"

"اب تم آجاؤ ہم تو اس کی شادی ہی کرنے جا رہے تھے اور اس کے ساتھ یہ ہو گیا۔ خدا جانے کس کی نظر لگ گئی ہے اس کو۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا آنٹی۔" میں نے تسلی دی۔ "یہ کسی چکر میں آگئی ہے۔ اسی کی شادی کا ذہنہ ہو گیا۔ پہلے اس کو ٹھیک ہونے دیں۔"

"ہاں بتاؤ اس حالت میں کون اس سے شادی کرے گا۔"

آنٹی کچھ دیر بعد کمرے سے باہر چلی گئیں۔ شہباز نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ آنٹی کے جانے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے اشارہ کیا کہ میں جلدی سے دروازہ بند کر دوں۔

میں نے دروازہ بند کیا اور وہ پھر سے لیٹ کر پہلی طرح ہنسنے لگی۔ "ہاں اب بتا تو کیسی رہی اداکاری۔"

"شاندار۔" میں نے اس کی تعریف کی۔ "تو ایک نمبر کی کمینی ہے۔"

"یار کیا کرتی، یہ لوگ تو پیچھے ہی پڑ گئے تھے۔" اس نے کہا۔ "جان عذاب میں کر رکھی تھی۔ میرے پاس تو اس کے علاوہ کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔"

"میری جان یہ بتاؤ یہ ڈراما کب تک کرتی رہو گی۔"

"جب تک امجد سے جان نہیں چھوٹ جاتی۔"

"ایسا نہ ہو کہ تمہارے کاشان کو بھی پتا چل جائے کہ تم پر جن آنے لگے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے اس کو اعتماد میں لے لیا ہے۔" شہباز نے بتایا۔

تیسرے دن شہباز کا پھر فون آ گیا۔ "یار آج ڈیمرے پاس ایک بہت ہی ضروری بات ہو گئی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے۔"

"تم آؤ گی تو سہی۔" اس نے کہا۔ "ابھی صرف اتنا بتا سکتی ہوں کہ دونوں ماں بیٹے آئے تھے۔ تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ ان کے آنے کے بعد کیا ہوا ہوگا۔"

جتنے مزے کی بات ہو گی ہو گی۔ اس لیے میں بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔

وہ اپنے کمرے میں تھی۔ جب کہ اس کی امی اور نوجوان تھیں۔ انہوں نے مجھے روک لیا تھا۔ "بیٹا کیا بتاؤں کہ کیا ہوا۔"

"کیا ہوا آنٹی۔"

"معاملہ اب بہت آگے بڑھ گیا ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "تم تو جانتی ہو کہ ہم نے امجد سے اس کا رشتہ طے کر لیا ہے۔"

"جی آنٹی، جانتی ہوں۔"

"کل امجد اور اس کی امی آئے ہوئے تھے۔ شہباز نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔"

"حملہ کر دیا تھا!"

"ہاں بیٹی! وہ اپنی امی جنونی کیفیت میں تھی۔ اس نے امجد کی امی کی گردن دبا دی تھی۔"

ایک سے ساعت قبل میرے ملحق میں ایک کرہ گیا تھا۔ شہباز نے تو اتنا ہی کہا تھا۔

"اس کے بعد کیا ہوا آنٹی۔" میں نے تجسیم صورت بنا کر پوچھا۔

"تم بتاؤ اس کے بعد کیا ہوتا تھا۔ امجد کی امی ویسے ہی ڈرپوک اور وہمی قسم کی عورت ہیں۔ وہ تو قریب کرسی ہوئی تھی کہ سے بھاگی نکلیں۔"

"یہ تو بہت برا ہوا آنٹی۔" میں نے کہا۔ "وہ بے چاری رشتے کے لیے کب تک انتظار کریں گی۔"

"ارے بیٹا کہاں کا رشتہ، کیسا رشتہ وہ صاف انکار کر کے گئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ ایسی لڑکی سے کون شادی کرے جس کے اوپر جن آتے ہوں۔"

میں بری طرح ہنسنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے آنٹی سے کہا۔ "آنٹی میں ذرا دیکھ لوں اس کو۔"

"سنبھل کر جانا، ایسا نہ ہو تم پر بھی حملہ کر دے۔"

"فکر نہ کریں۔ میں سنبھال لوں گی اس کو۔"

میں کمرے میں آئی تو شہباز دوسری طرف رخ کیے بیٹھی تھی۔ میری آہٹ سن کر اس نے میری طرف دیکھا اور خفا ہی پڑا۔

کیا تماشہ ہے۔ اس کے چہرے کی کھال جگہ جگہ سے اس طرح سکڑی ہوئی تھی جیسے کسی نے اس کے چہرے پر تیزاب ڈال دیا ہو اور آنکھیں جیسے اپنے حلقوں سے باہر آ رہی تھیں اور اس کی آواز خدا کی پناہ وہ آواز اس کی تو نہیں تھی۔ چاہے وہ اکا بن کر بولے، وہ کوئی اور ہی تھا۔

"ہم لوگ اپنا فالی اڑانے والوں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں سمجھیں۔" پھر ایک وحشیانہ قہقہہ۔

مجھے صرف اتنا ہوش تھا کہ میں کس طرح اس کمرے سے باہر آئی تھی۔ بری طرح چیخی ہوئی۔ خوف کا ایسا ریلا پڑا، احساس تو کبھی نہیں ہوا ہوگا۔

اس کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس کی بھرے ہوئے مجھے گھورتی آنکھیں اور میں چیخ رہی تھی۔ روتی ہوئی۔ چلاتی ہوئی۔

میرے پورے بدن میں بے شمار سوئیاں سی اتر گئی تھیں۔ میرا پورا بدن جل رہا تھا۔ کیوں کہ میں بھی اس پاگل میں شریک تھی۔ میں نے بھی شہباز کے ساتھ مل کر مذاق اڑایا تھا۔

اس بات کو کئی مہینے ہو گئے ہیں۔ ہاں کئی مہینے۔

شہباز کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس کو نہ جانے کہاں کہاں لے جا کر دکھایا گیا ہے۔ تعویذ گنڈے نہ جانے کیا کیا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔

پہلے تو اس کا چہرہ ہی مسخ رخ رہا تھا اور اب اس کے ہاتھ اور پیروں کا بھی وہی حال ہوتا جا رہا ہے۔ وہ انتہائی بدصورت ہوتی جا رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر خوف محسوس ہوتا ہے۔

اور جہاں تک میرا سوال ہے تو میرے پورے بدن میں سوئیاں چبھتی رہتی ہیں۔ میں بھی کسی کام کی نہیں رہی ہوں اور یہ داستان میں ان لوگوں کے لیے تحریر کر رہی ہوں کہ وہ ایسی نادیدہ قوتوں کا مذاق نہ اڑائیں۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

انجانی راستے

جناب ایڈیٹر صاحب

السلام علیکم

سب سے پہلے یہ بتا دوں کہ پلیز میرا اصل نام کہانی کی ساتھ نہ لگائیں میں اپنی کہانی صرف اس لیے بھیج رہا ہوں کہ فی زمانہ انٹرنیٹ کی وجہ سے لوگ بہت زیادہ بہک رہے ہیں اگر ایک شخص بھی میری طرح خود کو برقت سنبھال لیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہو گئی۔

عارف

(اسلام آباد)

میرے ہی جیسی آئینہ بہت خوب صورت ہے اور مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس کی چاہت کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میرا دل لاہور سے اسلام آباد ہو گیا۔ میں ایک بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا ہوں۔ ملک کے ہر بڑے شہر میں اس کے دفاتر ہیں اور میں شروع سے اس کے لاہور والے دفتر میں کام کرتا آیا ہوں۔ میں نے جاب کا آغاز اسی کمپنی سے کیا اور بالکل تازہ تازہ ایم بی اے ہونے کی بنا پر کمپنی نے مجھے جاب دی۔ شاید اس لیے بھی کہ میں نے بہت ہائی

ریک کے ساتھ ایم بی اے کیا تھا اور ایک بہت اچھے ادارے سے کیا تھا۔ پرانے لاہور میں والد صاحب کی خاصی جایداد تھی۔ مگر وہ انہوں نے وراثت میں تقسیم کے لیے دے دی تھی اور گزر اوقات کے لیے اسے کرائے پر دلوایا ہوا ہے۔ جب میں نے آئی کام کیا تو میاں نیلمہ مارکس کے ساتھ کیا تو میں نے بی ایڈ آنرز میں داخلہ لیے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر میں جس یونیورسٹی میں جانا چاہتا تھا۔ وہ بہت مہنگی تھی۔ اس کا ایک سمسٹر ایک لاکھ روپے سے اوپر پڑتا تھا۔ والد صاحب اتنا خرچا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ انہوں نے کہا۔ "بیٹر کسی سستی سی یونیورسٹی سے ایم بی اے کر لے۔"

"ابا جی فائدہ کیا کہ نہیں ہوگا۔ سستا ایم بی اے کر کے میں بھی اسی مقام پر پہنچوں گا جہاں میں اس یونیورسٹی سے پڑھ کر پانچ سال میں پہنچ جاؤں گا۔"

ابا جی روایتی ابا جی تھے جو بچے پر بچہ کرتے گزار دیتے یا ہم پر کم چلاتے تھے اس لیے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ میری بات مانیں گے مگر کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے پہلے خوب غور کیا کہ ان کے کس سوال کا کیا جواب دینا ہے اور انکار پر کس زاویے سے پھر کوشش کرنی ہے۔ میری بات پر ابا جی نے کہا۔ "تو کیا چاہتا ہے؟"

"ابا جی میں اسی یونیورسٹی سے ایم بی اے کرنا چاہتا ہوں۔"

فیس وغیرہ کے بارے میں ابا جی کو پہلے ہی بتا چکا تھا۔ انہوں نے حتمی گزر گزایا اور اس پہلے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "لاکھ روپے ہر چھ سمسٹر بعد چھ دوں تو ان لوگوں کو پتا ہے تو کرا دیں گا۔"

میرے چھ بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ چھ مجھ سے بڑے اور تین چھوٹے ہیں۔ ہم سب شادی شدہ ہے قریب ایک جو بھی ہمارا مان میں رہتے ہیں۔ مجھ سے بڑے دو بھائی اور دو بہنیں شادی شدہ ہیں اور بھائیوں کی بھی خاصی آل اولاد ہے۔ اس لیے جو بھی بڑی ہونے کے باوجود بھرپور پری تکلفی تھی۔ میں نے ہمت کر کے بات جاری رکھی۔ "اگر نہ کرے کہ کوئی فاقہ کرے۔ ہر ابا جی رحمت اور حشمت بھائی اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ اپنا خاندان دیکھ رہے ہیں۔ شفقت بھائی بھی ملازمت کر رہے ہیں۔ راحت نہ پڑھ رہا ہے اور نہ جاب کر رہا ہے۔ صرف ہیں اور مجھ سے

چھوٹے بہن بھائی پڑھ رہے ہیں تو ابا جی آپ کی کال دے دی اور تو ہم میں باقی سب اپنا اپنا کما کھا رہے ہیں۔ کتنے برس لے۔"

"بیٹر، جب تک میں ذمہ دار ہوں جب تک میرے دستے داری ہیں۔ میرے بعد سب اپنا اپنے دیکھ۔"

"تب ابا جی میں تو آپ کی اولاد ہوں نہ۔ آپ کھانے پینے بیٹوں کے لیے کر رہے ہیں تو میرے لیے کیوں نہیں کر رہے؟"

"اس لیے بیٹا جی کہ میں سب کے ساتھ برابر کر رہا ہوں اور اگر آپ کے ساتھ زیادہ کیا تو دوسروں کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ میں سمجھے کے پانچ چھ ہزار کما سکتا ہوں لیکن سولہ سترہ ہزار نہیں کر سکتا۔"

ابا جی کے جواب سے مجھے مایوسی ہوئی تھی مگر میں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ یہ جواب میرے لیے متوقع تھا اور میں نے سوچا ہوا تھا کہ اس صورت میں مجھے کیا کہنا ہے۔ میں نے تمہید باندھی۔ "ابا جی میں آپ کا وارث ہوں آپ کی جایداد میں میرا بھی حصہ ہوگا۔"

"کیوں نہیں ہوگا بیٹر جی، لیکن اس کے لیے میرے مرنے کا انتظار کرنا ہوگا۔"

"اللہ آپ کا سایہ ہمارے سروں پر تادیر رکھے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں آپ سے کہوں گا اپنی زندگی میں مجھے جو میرا حصہ بنتا ہے وہ دے دیں اس کے بدلے میں گلہ کر دیے کہ تیار ہوں کہ آپ کی وراثت میں میرا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔"

ابا جی سوچ میں پڑ گئے اور حتمی نتیجہ نہ نکال سکے۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ گہری سوچ میں ہیں اور ایسے وقت کوئی بات کرے انہیں بالکل پسند نہیں تھا اس لیے میں صبر کے ساتھ ان کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ خاصی دیر بعد بولے۔ "بیٹر جی آپ نے بات تو معقول کی ہے مگر ایک مسئلہ ہے۔ اس صورت میں ہر ایک اپنے بچے کی جایداد مانگنے لگے گا اور میں کس کس کے ٹکڑوں گا۔"

"ابا جی سیدھی سی بات ہے۔ میں ایک مقصد کے تحت آپ سے مانگ رہا ہوں۔ پوری جایداد نہیں مانگ رہا۔ ہاں استطاعت دیں کہ میں ایم بی اے کر لوں۔ اگر کسی اور کا تقاضا بڑا مقصد ہو تو وہ آپ سے بات کرے۔ پھر ابا جی آپ نے رحمت اور حشمت بھائی کو بھی کام کرا کے دیا ہے وہ آج کما رہے ہیں اور انہوں نے آپ سے یہ بات بھی نہیں

جایداد بنا لی تھی جو جایداد حاصل کرتے اسے بھی کمانے پر دے کر آمدنی کا ذریعہ بنا لیتے تھے۔

وہ اس آمدنی سے کمر پر بھی خرچ کرتے تھے مگر صرف ضرورت کی حد تک۔ جب دوسری جایداد خاصی ہو گئی تو انہوں نے روایتی ابا جی بننا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ ہنسی مذاق بھی کر لیتے تھے۔ ان کی اس دوستانہ طبیعت میں ادب لحاظ سرخ پکی اینٹوں سے بنی اس دو منزلہ عمارت میں اوپر نیچے بیس کمرے تھے۔ پہلے لیٹرین اور غسل خانے چھوٹے تھے مگر ابا جی نے جب عمارت شکن پائپ کا نیا سیٹ لگوایا تو اسے چھوٹی نلکیوں کو ختم کر دیا اور ہر کمرے میں واش بیسن لگوا دیے۔ ہر کمرے میں واش روم بنوا کے ہر ایک حد بندی کر دی تھی۔ شادی شدہ بھائیوں کو اوپر تین کمرے دیے تھے۔ ابا جی کا ارادہ تھا کہ جس بیٹے کی شادی کریں گے اسے ایک کمرہ دے دیں گے۔ کمرے بھی خاصے بڑے تھے۔ مکان کے پیچھے چوتھائی کنال کا صحن تھا۔ جو ہمارے بچپن کا کھیل کا میدان تھا۔ مجھے سے بڑے شفقت بھائی نے سنبھرک کر کے مکان کو بہت خوبصورت بنا رکھا تھا۔ ابا جی کبھی کبھی ہی ہمارے گھر آتے تھے ورنہ ابا جی ان کی اولاد کے گھر جاتے رہتے تھے۔

ابا جی نے گہری سانس لی اور مجھ سے کہا۔ "بیٹر جی تیرے دوں سوچنے کی مہلت دے، اللہ نے چاہا تو میں تمہارا سوال حل کر دوں گا۔"

دو دن بعد ابا جی نے مجھے بلایا اور پوچھا۔ "بیٹر جی یونیورسٹی کی کل فیس کتنی ہوگی اور اگر کسی ساتھ ساری فیس دے دی جائے تو کتنی ہوگی؟"

دینے تو یہ ابا جی نے اس رات یہ طے کر لیا کہ کوئی بات کرنے سے پہلے میں ہوں یا جاگر میں اس رات ایسے سے معلومات حاصل نہیں کی تھیں۔ اگلے دن میں نے جا کر یہ معلومات حاصل کیں تو مجھے پتا چلا کہ پک شٹ پورے ایم بی اے کی فیس جمع کرانے پر مجھے میں فیصد رکاوٹ دے گی اور مجھے سات لاکھ جمع کرانے ہوں گے۔ میں نے اپنے آئی کام کے پراسپکٹس کا حوالہ دیا اور کہا کہ میرے پاس پچاس ہزار کا ڈیمانڈ ڈرافٹ بھی ہے۔ مگر ساتھ ہی خبردار کیا کہ اگر ایک بھی سمسٹر پڑھا تو مجھے پوری رقم لاکھ اضافی لینی دینا ہوگی۔ میں نے کہا کہ ابا جی کو بتاؤں گا تو انہوں نے کہا۔ "میں نے تم کو آکر ابا جی کو بتاؤں گا تو انہوں نے کہا۔ "میں یونیورسٹی کے باقی خرچ تجھے خود برداشت کرتا ہوں کہ نہ کرو۔ میں کروں گا۔"

"وہ میں کروں گا۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "میں نے انہی سے یہ کچھ فیصلہ طلب کرنی ہیں۔ ان سے مجھے اتنا طے جانا کہ کتنی فیس ہوگی۔"

ابا جی نے مجھے لگے ہاتھ پیسے ساز مجھے چھاپا کہ دے دیا۔ ابا جی نے مجھے کہا تھا کہ انہوں نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا میں میرے حصے کی جایداد بیچ کر مجھے رقم دی ہے۔ ابا جی نے بہت بھروسا دلوانا کام کیا تھا۔ ابا جی پڑھے لکھے معمولی تھے۔ ان کے والد ہجرت کر کے امرتسر سے لاہور آئے تو انہوں نے یہاں ایک عارت الاٹ کرائی اگر وہ چاہتے تو اسے بیچ کھوچ کر اچھے خاصے پیسے حاصل کر سکتے تھے مگر انہوں نے اسی جگہ پر کاروبار کیا تھا۔ انہوں نے بھی ابا جی کو ورثے میں ملی چوتھائی الاٹ اور اسی جگہ پر کاروبار کیا تھا۔ انہوں نے اس الاٹ کو محفوظ رکھا تھا کہ ان کی اولاد کے پر دیا اور کرائے سے حاصل ہونے والی رقم سے مزید جایداد خریدتے رہے۔ یہ جایداد بھی انہوں نے اور مگر گھر کا خرچ کفایت سے چلاتے ہوئے بچت بھی کرتے رہے۔ جب تک ہم بڑے ہوئے انہوں نے خاص

آنے والے چند سالوں میں گروی کی رقم بھی ادا کر دیتے۔ ان دنوں ملک بھر میں زمین جائیداد کی قیمت بڑھنے کا رجحان شروع ہوا تھا جو میرے ایم بی اے مکمل کرنے تک عروج پر پہنچ گیا۔ یہ آج سے آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ اباجی نے جو دکان گروی رکھی تھی اس کی قیمت تین گنا ہو کر تیس لاکھ تک چلی گئی تھی اور جیسے جیسے کرایہ بڑھتا گیا اباجی ادھار جلدی ادا کرتے گئے۔ پانچ سال سے بھی پہلے انہوں نے ادھار کی رقم اتار دی۔

میں نے ایم بی اے کے دوران بہت محنت کی اور دن رات پڑھتا تھا پھر ٹیوشن بھی پڑھاتا تھا۔ ان پانچ سالوں میں میں شاذ ہی کبھی رات بارہ بجے سے پہلے سویا اور ایسے موقع بھی کم آئے جب صبح چھ بجے کے بعد تک بھی سوتا رہا۔ اس محنت کا صلہ یہ ملا کہ میں نے ڈپارٹمنٹ میں ٹاپ کیا تھا۔ پوزیشن کی وجہ سے مجھے رزلٹ آنے کے ایک مہینے بعد اس ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی جو الیکٹرانکس برانڈ بناتی ہے اور پورے پاکستان میں اس کے کئی مینوفیکچرنگ پلانٹس ہیں۔ میں انتظامیہ میں تھا۔ دو سال بعد میں اسسٹنٹ ایڈمن آفیسر بن گیا۔ میری تنخواہ اور دوسری سہولتیں اتنی تھیں کہ میں بیوی کا خرچ برداشت کر سکتا تھا۔ اس لیے اماں کو گرین سگنل دے دیا جو کب سے مجھے شادی پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان پانچ سالوں میں نہ صرف شفقت بھائی بلکہ مجھ سے ایک سال چھوٹے عظمت کی شادی بھی ہو گئی تھی۔ ایک تو وہ کم عمری سے کمانے لگا تھا دوسرے شادی اس نے پسند کی کی تھی۔ اماں اور اباجی کو خطرہ تھا کہ اس کی شادی میں تاخیر کی گئی تو وہ کوئی اور گل نہ کھلا دے اور انہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑے۔

اماں نے مجھ سے لڑکی کے بارے میں پوچھا تو میں نے دو شرائط رکھ دیں۔ ایک لڑکی خوب صورت ہو اور دوسرے کم سے کم گریجویٹ ہو۔ اماں نے اسی لحاظ سے تلاش شروع کی جو آئینہ پر جا کر ختم ہوئی تھی۔ آئینہ ان دنوں گریجویشن کے آخری سال میں تھی۔ شکل صورت کے لحاظ سے لاکھوں میں ایک تھی۔ پہلے اماں اور جب میں نے دیکھا تو میں بھی فریفتہ ہو گیا۔ ہماری برادری کے تھے اور شاہدرہ میں ہی رہتے تھے۔ آئینہ کے گھر والوں نے اباجی کو دیکھا اور رشتے کے لیے ہاں کر دی۔ مگر طے پایا کہ شادی اگلے سال ہوگی جب آئینہ کا بی اے کا رزلٹ آ جائے گا۔ ہمیں بھی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اباجی نے شفقت اور عظمت کو فی الحال اوپر دو دو کمرے دے دیے تھے یوں چاروں شادی شدہ بھائی اب اوپر تھے۔ اباجی نیچے کا حصہ بنوا رہے تھے اور اس میں کچھ وقت لگتا۔ قصہ مختصر کہ پانچ سال پہلے آئینہ میری زندگی میں آ گئی اور مجھے لگا جیسے میری اصل زندگی اب شروع ہوئی ہو۔

میں نے شادی کے موقع پر ایک مہینے کی چھٹی لی اور ہم پورے تین ہفتے تک ناردرن ایریا کی حسین وادیوں میں گھومتے اور ہنی مون مناتے رہے۔ سچ یہ ہے کہ میرا واپس آنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر آنا مجبوری تھی۔ واپس آ کر میں دفتر میں اور آئینہ گھر میں لگ گئی۔ شادی کا ابتدائی جوش و خروش بھی کم ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم معمول پر آتے گئے۔ اس وقت مجھے لگا کہ ہم ایک عام سے جوڑے ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم میں میاں بیوی والی انسیت اور لگاؤ ہے لیکن وہ جو ایک دوسرے سے والہانہ محبت ہوتی ہے جو آدمی کو بے چین رکھتی ہے وہ ہمارے درمیان نہیں تھی۔ کیونکہ ہم ایک بڑے جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتے تھے۔ یہاں بے شمار لوگ تھے اور پرائیویسی کم تھی۔ پھر ہم نچلے فلور پر تھے جہاں تقریباً سب ہی دن رات گھیرے جمع رہتے تھے۔ اباجی نے پورشن سب کے الگ کر دیے تھے مگر کچن ایک ہی اور بہت بڑا تھا۔ سب اپنا اپنا کھانا یہیں بناتے تھے۔

میں شادی کے بعد بھی اباجی کے ساتھ رہا تھا اور ہمارا کھانا مشترک ہوتا تھا۔ کیونکہ میرے ساتھ مجھ سے چھوٹی بہن زینب کی شادی بھی ہوئی تھی اور اب اماں اکیلی تھیں اس لیے آئینہ نے کہا کہ وہ ماں جی کے ساتھ رہے گی۔ یوں اس نے اماں اور اباجی کا کچن بھی سنبھال لیا تھا۔ اس پر میری بڑی بھابیوں نے برا منایا اور ہمیں چالاک قرار دیا کیونکہ اباجی کھانے پینے کو بہت کھلا لاتے تھے۔ ان کے کچن سے دوسروں کو بھی حصہ جاتا تھا۔ مگر یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ میں ساری تنخواہ بھی اباجی کے ہاتھ پر رکھتا تھا اور وہ اس میں سے جتنی رقم چاہے رکھ کر باقی مجھے دے دیتے تھے۔ میں نے پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا کہ انہوں نے اتنی رقم کیوں لی ہے۔ پر اباجی بھی مناسب ہی لیتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اب میں شادی شدہ تھا اور میرے بہت سے خرچے تھے۔ پھر اس رقم سے میں آئینہ اور اماں کو جیب خرچ دیتا تھا۔

شادی کو چھ سات مہینے گزرے اور کسی خوش خبری کے آثار نظر نہیں آئے تو ہم سے زیادہ اماں کو تشویش ہونے لگی۔

انہوں نے پہلے تو آئینہ کو لے جا کر اس کا معائنہ اور ٹیسٹ کرائے جو سب کلیئر آئے۔ ڈاکٹر کے مطابق اس میں کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے اماں نے آئینہ کے توسط سے مجھے کہلوایا کہ اب میں اپنا معائنہ کراؤں۔ اگرچہ میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا کیونکہ مجھے سب ٹھیک لگ رہا تھا۔ پھر بھی میں نے آئینہ اور اماں کی تسلی کے لیے اپنا چیک اور ٹیسٹ بھی کرا لیا اور یہ بھی کلیئر آیا تھا۔ گویا اب قدرت کی طرف سے دیر تھی۔ اماں اس طرف سے مطمئن ہو گئیں مگر انہوں نے دوسرے ٹوٹکے شروع کر دیے۔ وظائف جو آئینہ کو پڑھنے کے لیے دیے اور دوائیں جو انہیں کھانی پڑتی تھیں۔ آنے والے تین سالوں میں سب کر کے دیکھ لیا۔ مگر اولاد نہیں ہوئی۔ حد یہ کہ آئینہ ایک بار بھی امید سے نہیں ہوئی تھی۔

آئینہ شروع میں تو بہت فرسٹریٹ تھی کیونکہ اولاد کے لیے اماں کی طرف سے بھاگ دوڑ بھی زیادہ تھی اور اس سے ایک ماحول سے بن گیا تھا۔ مگر جب بے شمار جتن کے باوجود وہ امید سے نہیں ہوئی تو اس کی مایوسی فطری تھی۔ بہرحال رفتہ رفتہ سب کو صبر آ گیا اور اب اس معاملے کو تقدیر پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سال پہلے میرا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔ اگرچہ میں نے یہ تبادلہ رکوانے کی کوشش کی تھی مگر اوپر سے حکم آنے کے بعد میرے ڈائریکٹر بھی بے بس ہو گئے جو مجھے اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ اصل میں اسلام آباد آفس میں کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی اور وہاں کے ایڈمن آفیسر کو پراسرار انداز میں جاب سے نکالا گیا تھا۔ مجھے اس کی جگہ ایڈمن آفیسر بنا کر بھیجا جا رہا تھا۔ مہنگا شہر ہونے کی وجہ سے مجھے تنخواہ کا دس فیصد مہنگائی الاؤنس بھی دیا جا رہا تھا اور میرا عہدہ بھی بڑھ گیا تھا اس کے باوجود میں بہ مشکل خود کو جانے پر آمادہ کر سکا تھا۔ ایک بار خیال آیا کہ میں جاب ہی چھوڑ دوں مگر اباجی کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے بے بھاؤ کی سنا دیں۔

”پتر جی تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ روٹیاں لگ گئی ہیں۔ آس پاس آنکھیں کھول کر دیکھو، کتنے پڑھے لکھے معمولی ملازمتیں کر رہے ہیں یا بے روزگار ہیں۔ تمہاری تو اتنی اچھی جاب ہے پتر جی، چند سال میں اوپر والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔“

اباجی ٹھیک کہہ رہے تھے۔ چند سال بعد جب نچلے افسران سے اوپری افسران کا چناؤ کیا جاتا تو اس میں میرا نام آنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ میری کارکردگی اتنی اچھی تھی کہ مجھے لگاتار دو سال بہترین ایمپلائی کا ایوارڈ ملا تھا۔ ممکن ہے یہ ایوارڈ زیادہ بار ملتا مگر کمپنی پالیسی کے مطابق ایک ملازم دو بار سے زیادہ حاصل نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی میری سروس بک بہترین ریمارکس سے بھری ہوئی تھی۔ اباجی نے مجھے راضی کر لیا انہوں نے کہا کہ اسلام آباد کتنا دور ہے میں ہر ہفتے نہ سہی دو ہفتے بعد لاہور آ سکتا ہوں۔ کیونکہ کمپنی میں ہفتہ اتوار کی چھٹی ہوتی تھی اس لیے میں آرام سے آ جا سکتا تھا۔ اس لیے میں راضی ہوا۔ آئینہ مجھ سے زیادہ مشکل سے راضی ہوئی تھی۔ وہ رو دھو رہی تھی کہ وہ سب کو چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ اماں نے بہ مشکل اسے راضی کیا کہ بیوی شوہر کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے۔ ورنہ شادی کا فائدہ۔

پہلے میں گیا تھا کیونکہ مجھے مناسب رہائش بھی تلاش کرنا تھی۔ کمپنی کا دفتر اسلام آباد کے بلیو ایریا کے پاس ایک بڑی سی کوٹھی میں تھا اور مجھے یہاں رہائش کے لیے ایک کمرا مل گیا تھا۔ دفتر کا چارج لینے اور معاملات سمجھنے میں چند دن لگے تھے۔ اس کے بعد مجھے ذرا فرصت ملی تو میں نے مکان کی تلاش شروع کی۔ اسلام آباد خاصا مہنگا ہے اور یہاں چھوٹی رہائش کم ملتی ہے۔ اس لیے مجبوراً مجھے مری روڈ پر واقع ایک آبادی میں چھوٹا فلیٹ لینا پڑا۔ یہاں تمام سہولتیں تھیں اور کرایہ بھی مناسب تھا۔ بس یہ تھا کہ یہاں زیادہ تر نچلے طبقے کے لوگ رہتے تھے اور آس پاس کا ماحول بہت اچھا نہیں تھا۔ فلیٹ مین روڈ سے ذرا اندر ایک عمارت کے دوسرے فلور پر تھا۔ دراصل یہ چار منزلہ مکان تھا۔ مالک نے اسے خاص طور سے کرائے پر دینے کے لیے بنایا تھا۔ ہر فلور پر دو فلیٹ تھے۔ ہر فلیٹ کے میٹرز الگ تھے۔ پانی کی موٹر چلانے اور سیڑھیوں کی لائٹ کے لیے الگ میٹر تھا جس کا بل سب مل کر ادا کرتے تھے۔

ہر فلیٹ میں دو بیڈ روم اٹیچ باتھ کے ساتھ تھے اور ایک بالکونی تھی جہاں کپڑے وغیرہ سوکھنے کے لیے لٹکائے جا سکتے تھے۔ ایک چھوٹا سا لاؤنج تھا جس کے ساتھ ہی امریکن اسٹائل کا کچن تھا۔ آبادی سے قطع نظر فلیٹ بہت اچھا، نیا اور جدید انداز کا بنا ہوا تھا۔ کرایہ بھی مناسب تھا اور مجھے صرف ایک مہینے کا ایڈوانس اور ایک مہینے کا پیشگی کرایہ دینا پڑا تھا۔ چابی لے کر میں نے آنے والے پیر سے دو دن کی چھٹی لی اور جمعرات کی شام لاہور روانہ ہو گیا۔ جمعے کی صبح میں اور آئینہ اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ میرے

پاس ذرا پرانے ماڈل کی بنڈا اسٹی کار تھی۔ اس میں ہم جس قدر ذاتی اور ضرورت کا سامان لا سکتے تھے وہ رکھ لیا تھا۔ آئینہ نے بیشتر برتن کا سامان لیا تھا۔ ہم طیبہ پہنچے پھر دو آرام کیے۔ جمعہ پڑھا اور پھر شام کے وقت ہم دونوں ضروری فرنیچر اور سامان لینے نکلے۔

ہمیں زمین پر سونے کی عادت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے ایک استعمال شدہ فولڈنگ ڈبل بیڈ، بمعہ گدوں کے، صوفہ سیٹ، قالین اور تین افراد کے لیے چھوٹی ڈائننگ ٹیبل لی تھی۔ وقتاً فوقتاً ہی سہی لیکن اب فلیٹ میں سیٹلڈ نظر آ رہا تھا۔ ان تین دنوں میں مسلسل کام کرکے ہم دونوں ہی تھک گئے تھے اس لیے بجائے دن آرام کیا اور سنگل کو ہم گھومنے نکلے تھے۔ بخلاف توقع آئینہ خوش تھی اور اپنی خوشی کا اظہار بھی کر رہی تھی۔ ہم نے اسلام آباد کی تعریف بھی سنی۔ سارا تفریحی مقامیں دیکھ لیں اور شام کے وقت کھانا واپس آکر ہی کسی ریستوران میں کھایا تھا۔ ہم اس سے پہلے بھی اسلام آباد آچکے تھے اور یہاں گھومے پھرے تھے مگر وہ جلدی میں کیا ہوا تھا۔ اب ہم نے ہر جگہ تسلی سے دیکھی اور شام کو جب واپس گھر آئے تو بہت خوش تھے۔

میرا دفتر اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ مشکل سے پندرہ منٹ میں وقت پر پہنچ جاتا اور واپسی میں اتنا ہی وقت لگتا تھا۔ چھٹی ہو جانے سے پہلے میں بہت سے معاملات دیکھ چکا تھا اور ان سے متعلق مسئلے سلجھا لیے تھے۔ باقی میں نے چھٹی کے بعد کے لیے چھوڑ دیے۔ مسئلہ ایڈمن کا تھا اور وہ ایک دوسری ملٹی نیشنل کمپنی کے لیور میں یہاں کے انتظامی معاملات میں کڑیدکر رہا تھا کہ مقامی مارکیٹ سے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس نے خاصا نقصان پہنچایا بھی دیا تھا مگر اس کی خلاقی ممکن تھی۔ ہمارے کچھ ڈیلرز مقامی دفتر کے رویے سے بددل ہو کر ڈبلیو شپ چھوڑ چکے تھے اور باقی بھی تنگ آئے ہوئے تھے۔ میں نے معاملات سلجھانے کے لیے ان کی میٹنگ بلائی اور اس میں ڈیلرز کے مسائل سن کر ایک رپورٹ تیار کرکے لاہور کے ہیڈ آفس بھیج دی۔

میں نے کچھ سفارشات بھی کی تھیں جو مان لی گئیں اور دو ہفتے میں وہ سارے مسئلے حل ہو گئے جو کئی عرصہ چھ مہینے سے حل نہیں ہو رہے تھے۔ جاوٹ ڈیلرز ڈبلیو شپ چھوڑ گئے تھے ان سے رابطہ کیا اور انہیں کچھ مراعات کے ساتھ دوبارہ سے ڈیلر شپ لینے پر آمادہ کر لیا۔ یہ کسی قدر مشکل کام ثابت ہوا

کیونکہ وہ لوگ دوسری کمپنی کی ڈیلر شپ میں سرمایہ کاری کر چکے تھے اور اب اگر وہ پیچھے ہٹتے تو انہیں نقصان ہوتا۔ پھر میری کمپنی نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ ان کا نقصان پورا ہو گا اور وہ آگے بھی فائدے میں رہیں گے۔ اس شرط پر وہ مان گئے۔ میری روزانہ کی ان ڈیلرز سے میٹنگ ہوتی گئی اور اس وجہ سے میں اکثر دیر سے گھر آتا تھا۔ بعض اوقات تو دس بج جاتے تھے۔ چار دن میں آئینہ کے ساتھ رہا اور اس کے بعد آنے والے پیسے میں میری امی سے ملاقات ہوئی تھی۔ دفتر سے آنے کے بعد ہی ہم کھانے پر بیٹھ کر دیر باتیں ہوتی تھیں۔ رات سے آنے کے بعد میں اتنا تھک جاتا تھا کہ دس بجے تک بستر پر لیٹ کر اگلی صبح ہی میری آنکھ کھلتی تھی۔

ان دنوں میں آئینہ کو بالکل بھی وقت نہیں دے پایا تھا۔ دیکھا جائے تو میں اس کے ساتھ معمول کے مطابق ہی پیش آ رہا تھا۔ لاعلمی میں ہم دونوں سارے دن تک کرے میں تھے۔ وہاں ہم زیادہ باتیں نہیں کرتے تھے۔ دفتر سے آکر میں زیادہ تر ابا جی اور بھائیوں سے لگا رہتا تھا۔ آئینہ ہاں اور ہوں میں ہی جواب دیتی تھی یا یوں میں گم رہی راتی تھی۔ وہ بچوں سے بہلا کر رکھتی تھی اس لیے بچے بھی اسے گھیرے رہتے تھے۔ مگر یہاں ہم دونوں تھے۔ تھکے دفتر کی مصروفیت کے پکارتا تھا مگر آئینہ فارغ تھی اور وہ میری توجہ چاہتی تھی۔ ہم آتے ہی اپنا اپنا سامان لیپ ٹاپ اور ڈی وی ڈی لے آئے تھے۔ میں نے کیبل لگوایا تھا۔ میرے پاس لیپ ٹاپ اور آئینہ کے پاس اسمارٹ فون کے ساتھ ٹیب بھی تھا۔ میرے خیال میں اس کے پاس وقت گزاری کے لیے انہیں خاصی چیزیں تھیں اس لیے میں نے اس کو وہ پروا نہ دی۔ جب آئینہ نے دیکھا کہ میں اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا ہوں۔ تو اس نے مکمل کر کہا۔

"میں سارا دن بور ہوتی ہوں اور رات کو آپ آتے ہیں کھانا کھاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔"

"بھئی تھکن آتی ہوتی ہے کہ مجھے ہوش ہی نہیں رہتا۔" میں نے عذر پیش کیا۔ "تم ڈی وی ڈی دیکھا کرو۔"

"ڈی وی کتنا دیکھوں۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "دیکھو یہاں کے معاملات سے لگ رہا ہے کہ میں دفتر سے دیر سے ہی آیا کروں گا۔ یہاں کام زیادہ نہیں ہے مگر کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جب تک وہ نہیں ہو جاتے میں دفتر سے اٹھ نہیں سکتا ہوں۔ اس لیے آنے میں دیر ہو جاتی ہے۔ میں کوشش کروں تو شاید آٹھ بجے تک آسکوں گا۔"

"اور اس کے بعد آکر سو جائیں گے۔" آئینہ نے شکوہ کیا۔

"نہیں میں تمہیں وقت دوں گا مگر میں بات کر رہا ہوں دن کی جب تم اکیلی ہوتی ہو اور کرنے کو کچھ ہوتا نہیں ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ انٹرنیٹ لگوا دوں تم نیٹ استعمال کرنا۔"

وہ خوش ہو گئی۔ "یہ ٹھیک رہے گا۔ مجھے ٹی وی کا شوق نہیں ہے فیس بک اور انسٹاگرام استعمال کر سکوں گی۔ میری بہت سی جاننے والیاں ہیں نیٹ پر۔"

اسے انٹرنیٹ لگوا دیا تو اس کا دن کا وقت اچھا گزرنے لگا۔ صبح ناشتے کے بعد وہ صفائی اور کپڑوں سے فارغ ہو کر ٹی وی لگا لیتی یا پھر انٹرنیٹ استعمال کرتی تھی۔ دوپہر میں کچھ دیر آرام کرتا یا سامان استعمال کرتی۔ رونق ڈال لیتی یا پھر چاول بنا لیتی تھی۔ تازہ سالن وہ رات میں بنا لیتی تھی۔ جب میں گھر آتا تو وہ کھانا وغیرہ بنا کر فارغ ہو جاتی تھی۔ میں نہا دھو کر تازہ دم ہوتا تو ہم مل کر کھانا کھاتے۔ ٹی وی دیکھتے ہوئے رات کی جائے پی لیتے اور وہیں بچے تک سونے کی تیاری شروع کر دیتے۔ صبح سات بجے اٹھنا ہوتا تھا۔ کیونکہ میں صبح بھی نہانا تھا اور اس وقت لگتا تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے میں دفتر کے لیے نکل جاتا تھا۔

ہفتہ اور اتوار کے دن میں باہر کے سارے کام نمٹاتا تھا۔ مگر کل سامان لاتا۔ آئینہ کو کہہ لیتا ہوا تو اسے لے کر وہ دلاتا۔ عام طور سے اتوار کی رات کا کھانا ہم کہیں باہر کھاتے تھے۔ دیکھا جائے تو دن بھی مصروفیت میں گزر تے تھے اور نہیں ایک دوسرے کے پاس بیٹھ کر سکون سے بات کرنے کا موقع کم ملتا تھا۔ یہاں آنے کے ایک مہینے میں میری کمپنی میں آگ جاگ جان پہچان ہو گئی تھی۔ اباجی نے مجھے سمجھایا تھا کہ جہاں رہو وہاں کے لوگوں سے ہمیشہ تعلق رکھو کہ کبھی بھی کسی مشکل وقت میں پڑوی کام آتے ہیں بعد میں آتا ہے۔ اس لیے میں نے یہاں لوگوں سے تعلق استوار کیا۔

لاہور میں میں دفتر میں بہت مصروف ہوتا تھا اور یہاں اتنا آرام تھا کہ میں بور ہو جاتا تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں بیشتر استعمال کرتا تھا مگر اب ان میں بھی مزہ نہیں رہا تھا۔ فیس بک بھی ایک حد تک ہی تفریح دیتی تھی۔ ایک شام میں بیٹھا بور ہو رہا تھا اور ایسے ہی وقت گزاری کے لیے براؤزنگ کر رہا تھا کہ ایک سائٹ پر ڈیٹنگ سائٹ کا اپنڈ آیا۔

یہ پہلا موقع نہیں تھا جب میں نے کسی ڈیٹنگ سائٹ کا اپڈ دیکھا تھا۔ مجھے کبھی اس میں دلچسپی محسوس نہیں ہوئی اس لیے میں نے بھی کسی ڈیٹنگ سائٹ پر جانے کی زحمت نہیں دیکھا تھا۔ میں ایسی سائٹس کو فضول اور بیکار سمجھتا تھا۔ مگر اس شام میں نے سوچا کہ جا کر دیکھوں آخر ان سائٹس پر ہوتا کیا ہے؟ میں نے ایڈ پر کلک کیا تو سائٹ کھل گئی۔ آغاز میں ہی لڑکیوں اور لڑکوں کی تصاویر تھیں اور یہ سب نوجوان اور خوب صورت تھے۔ انہوں نے ایسی ڈیٹنگ کی ہوئی تھی کہ ان کے جسم نمایاں تھے۔ یہ ابتدائی صفح تھا اور اصل صفح پر جانے کے لیے لاگ ان ہونا ضروری تھا۔ گویا ہر اکاؤنٹ ہونا لازمی تھا۔ صفح پر کڑی ایک اکاؤنٹ کا بٹن بھی تھا۔ میں نے انگلیاں تھوڑے سے اس پر کلک کیا اور ایک فارم کھل گیا جس میں مجھ سے معلومات طلب کی گئی تھیں۔ میں فارم فل کرنے لگا۔

فارم فل کرکے سب سمٹ کیا تو بتایا گیا کہ میرے ای میل پر جو میں نے فارم پر دیا تھا ایک ای میل اس ڈیٹنگ سائٹ کی طرف سے آئے گی۔ اس لنک کو کلک کرکے ہی اکاؤنٹ ایکٹو ہو گا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور جب جا کر ڈیٹنگ سائٹ پر لاگ ان والے خانوں میں یوزر آئی ڈی اور پاس ورڈ ڈالا تو میں لاگ ان ہو گیا۔ اس کے بعد ایک پیج کھلا اور مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کون ہوں اور کس سے ملنا پسند کروں گا۔ ظاہر ہے میں نے تکمیل کے بٹن پر کلک کیا اس کے بعد مجھ سے خواتین کی خصوصیات پوچھی جانے لگیں جو میں چاہتا تھا۔ میں نے ایسے ہی بغیر سوچے سمجھے کچھ خصوصیات کے بٹن دبا دیے۔ آخر میں مجھ سے کلک اور شوکیا پوچھا گیا۔ میں نے پاکستان اور اسلام آباد کا بٹن دبا دیا۔ اس وقت میرا ارادہ تھا کہ یہاں بھلا ڈیٹنگ کے لیے خواتین یا لڑکیاں کہاں ہوں گی؟ مگر جب رزلٹ آیا تو میں حیران رہ گیا۔

میری منتخب کی ہوئی پسند کی خواتین کی ایک لمبی لسٹ تھی۔ میں نے عمر کی حد بھی کسی کے آگے پاس کی تھی۔ اس طرح آنکھوں، بالوں کے رنگ، جلد کی رنگت۔ جسمانی ساخت اور قد وقامت کے ساتھ کوئی دو درجن خواتین میں

جو کسی مرد سے بات کرنے کی متحمل نہیں اور مرے کی بات ہے کہ یہ اس وقت آن ٹپکی تھیں۔ فوراً ہی بھانپ گئے، ہیلو اور سلام کے تبادلے آنے لگے۔ میں نے فارم نکال کر دینے وقت اپنی غرض بتانی چاہی تو ہوکر اصل مدعے پر ایک سوال کر ہی لی کیونکہ تصویر بنانا لازمی تھا اور میں اپنی اصل تصویر نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے میں نے کمپیوٹر میں موجود ریکارڈ سے اپنے آفس یونیفارم کی تصویر دے دی۔ وہ خوش شکل تھا اور عورتیں کے آس پاس گھی۔ میری طرح ان خواتین اور لڑکیوں نے بھی اپنی تصاویر دی ہوئی تھیں۔ میں نے تصاویر کا جائزہ لیا اور ایک نام نکل پڑا کیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹائپ جیسے کا خانہ کھل گیا۔ اس نے مجھے ہائے امانت کہا تھا۔ میں نے جواباً لکھا۔

"ہائے لیلیٰ۔"

اس کی طرف سے فوری جواب آیا۔ "آپ مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی بھی آپ کے نام پر کلک کیا ہے۔"

"مجھے آپ اچھے لگے ہیں۔" وہ بے تکلفی سے بولی۔

"اپنے بارے میں بتائیں گے؟"

"میں ملازم پیشہ آدمی ہوں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا ہوں۔"

"شادی شدہ ہیں؟"

میں ہچکچایا مگر تسلیم کرلیا۔ "ہاں شادی شدہ ہوں۔"

"بچے ہیں؟"

"نہیں۔"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

سازے تین سال سے زیادہ ہوگئے ہیں۔"

"اوہ تو آپ یا آپ کی سز میں کوئی پرابلم ہے۔" اس نے پوچھا تو ایک لمحے کے لیے سٹشدر رہ گیا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ مجھ سے دور ہے اور میں اسے جانتا بھی نہیں ہوں اس لیے وہ یوں عمل کر بات کر رہا تھی ظاہر ہے وہ دو بدو اس قسم کا سوال نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے جواب دیا۔

"کوئی پرابلم نہیں ہے۔ ہم دونوں ٹھیک ہیں بس قدرت کی طرف سے دیر ہے۔"

"اُمید ہے آپ دونوں کی یہ کمی پوری ہوجائے گی۔"

اب میں نے سوالات کا آغاز کیا۔ "آپ میرا پروفائل کیسے پسند آیا؟"

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔ "بچوں کا مسئلہ لاینحل لگا کیونکہ ابھی میری شادی کو صرف چھ مہینے ہوئے ہیں۔"

"آپ کی شادی کو چھ مہینے ہوئے ہیں تب بچوں کی سے دوستی کرنے کی وجہ؟"

"میرے ہسبینڈ بہت روڈ اور بور آدمی ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور مجھ سے بلا ضرورت بات بھی نہیں کرتے ہیں۔ میرا سسرال بھی ایسا ہی روکھا پھیکا ہے۔ سات لوگ رہتے ہیں مگر سب اپنے اپنے کمروں میں گھسے رہتے ہیں۔ باہر سے آئیں گے اور سیدھا کمرے میں چلے جائیں گے۔ میری ننداوں تک کا یہ حال ہے۔ میں بور ہوتی ہوں۔"

"تو اس کے لیے کسی مرد سے ہی دوستی کیوں؟ وہ بھی ایک ڈیٹنگ سائٹ پر۔"

اس نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ "اس میں ایک تھرل ہے جب میں کسی اتنی سرد سے یوں بات کرتی ہوں تو میری بور بہت تفریح میں بدل جاتی ہے۔"

"آپ کی اور مردوں سے بھی بات چیت ہے؟"

"آف کورس آپ اس سائٹ پر آئے ہیں تو مرد تو ہیں۔ میری شاید ایک درجن سے زیادہ مردوں سے بات ہے۔"

"آپ نے تصویر اصلی دی ہے؟"

اس نے جتنے کا سائن بنایا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ تصویر اصلی نہیں ہے۔"

وہ ہنسی۔ "آپ کا خیال غلط ہے یہ تصویر اصلی ہے اور تھرل کی وجہ یہی ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ میں کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی ہوں۔ میرے شوہر یا ان کے جاننے والوں یا سسرال میں سے کوئی دیکھ سکتا ہے۔"

"جب آپ حرافت کر رہی ہیں تو یہ آپ کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔" میں نے حیرت سے محسوس کرکے جواب دیا۔ "میں نے پہلی بار اس قسم کی کسی سائٹ پر کسی عورت سے بات کی ہے میں نے اپنی تصویر اصلی نہیں دی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں نے آپ کی اصل تصویر دیکھ لی ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ "وہ کیسے؟"

وہ پھر ہنسی۔ "آپ بہت سادہ آدمی ہیں۔ آپ نے اپنا ای میل دیا ہوا ہے اور میں نے آپ کو ذرا سی دیر میں کس

بک پر تلاش کرلیا ہے اس میں آپ کی اصل تصویر موجود ہے۔"

میں ہکبکا سی رہ گیا۔ میں بھول ہی بھلا گیا۔ "میرے خدا مجھے اس چیز کا تو خیال ہی نہیں آیا۔"

"اور مزے کی بات ہے کہ اس میں آپ نے سوٹ اور ٹین رکھا ہے میں آپ کی بیوی اور فیملی کے دوسرے افراد کی تصویریں بھی دیکھ رہی ہوں۔"

"یہی بات ہے مجھے ان چیزوں کا زیادہ علم نہیں ہے اور میں استعمال بھی نہیں کرتا ہوں۔"

"پھر آج آپ ڈیٹنگ سائٹ جوائن کرنے کی وجہ؟"

"دفتر میں بوریت۔" میں نے جواب دیا۔ "یہاں کرنے کو کچھ نہیں ہے اور خاص طور سے شام کے وقت مجھے دو دو گھنٹے فارغ بیٹھنا پڑتا ہے۔ میں براؤزنگ کر راتھا کہ اس سائٹ کا لنک دیکھ کے آزمانے کا سوچا۔"

"گویا آپ بھی اپنی بوریت مٹانے آئے ہیں۔"

"مجھی بات تو یہ ہے کہ میں یہاں بھی براؤزنگ کی نیت سے آیا تھا میرا خیال تھا کہ اپنی سائس زیادہ تر وقت کے اور فراغ پر بھی ہوتی ہیں۔"

"آپ نے ٹھیک کہا لیکن اس سائٹ پر ہر کا نہیں ہوتا ہے۔ یہاں آپ کو سائٹ سے نہیں افراد سے دھوکا ہے کا۔"

"پھر شروعہ نہ کرتیں۔" میں نے کہا۔ اس دوران میں میں بھی اس کی ای میل آئی ڈی کی مدد سے اس فیس بک پر تلاش کر راتھا مگر وہ نہیں ملی۔ "آپ فیس بک استعمال نہیں کرتی ہیں؟"

"یعنی آپ بھی مجھے تلاش کر رہے ہیں۔" وہ بولی۔ "میں فیس بک استعمال کرتی ہوں مگر اس ای میل آئی ڈی سے نہیں۔"

وہ سیاہ بالوں اور سیاہ آنکھوں اور بہت گوری رنگت والی خوب صورت عورت تھی۔ تصویر میں اس کا بیتر اور شانے تھے مگر لگ رہا تھا کہ وہ متناسب جسم کی مالک ہوگی۔ وہ یقیناً خاصے مرے سے اس سائٹ پر آرہی تھی اور مردوں سے بات کرتی رہی تھی اس لیے وہ زیادہ بے تکلفی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے لکھا۔ "ویسے آپ نے جس کی تصویر دی ہے اس سے کہیں زیادہ ہینڈسم ہیں۔"

"شکریہ مگر میں بہت خوب صورت خاتون ہیں۔"

"اچھا، مجھ میں آپ کو کیا اچھا لگا؟"

"سب کچھ، آپ کی آنکھیں، نقوش اور بال سب خوب صورت ہیں۔ خاص طور سے اسکن کلر اور آئی کلر کنٹراسٹ بہت اچھا لگ رہا ہے ایسا میں نے بہت کم خواتین میں دیکھا ہے۔"

"آپ نے بہت غور کیا ہے میری تصویر پر۔"

"ہاں آپ غور کرنے کے قابل ہیں۔" اب میں نے بھی بے تکلفی سے کہا۔ میں ہر حال مرد ہوں جو زیادہ بے باک اور پیش قدمی کرنے والے ہوتے ہیں۔

"آپ مجھے دیکھنا چاہتے ہیں؟"

"اگر آپ کا اشارہ مزید تصویروں کی طرف ہے تو ضرور دیکھنا چاہوں گا۔"

میرا خیال تھا کہ وہ اپنی تصویر بدل دے گی مگر اس نے لکھا۔ "میری تصویر پر کلک کریں، میرا البم کھل جائے گا اس میں میری کئی تصویریں ہیں۔ بہت سی فل فرم ہیں۔ دل بھر کر دیکھئے۔"

میں نے اس کی تصویر پر کلک کیا تو البم کھل گیا۔ اس میں اس کی دو درجن سے زیادہ تصویریں تھیں اور وہ درست کہہ رہی تھی ان میں سے اکثر فل فرم تھیں اور باقاعدہ کیمرے سے لی ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا وہ متناسب جسم کی مالک تھی اور اکثر تصاویر میں جسے کپڑوں میں اس کا متناسب تھا یاں تھا۔ میں تصویروں میں محو تھا کہ اچانک موبائل نے بیل دی اور میں اچھل پڑا تھا۔ میں نے موبائل دیکھا تو آئیفہ کال کر رہی تھی۔ میں نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو۔"

"خیریت آپ کی سانس کیوں پھول ہوئی ہے؟"

"میں نیچے کی چکر لگا کر آرہا ہوں شاید اس لیے۔" میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ "کیوں تم نے کیسے فون کیا؟"

"بور ہو رہی تھی سوچا کہ آپ سے بات کرلوں آپ بھی اس وقت فارغ ہوتے ہیں۔"

میں فارغ نہیں تھا اور اسے اپنی مصروفیت کے بارے میں بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ اس لیے پھر جھوٹ بولا۔ "نہیں اتفاق سے کام کر رہا ہوں ایک رپورٹ ہیڈ آفس بھیجنی ہے۔"

"اچھا۔" آئیفہ نے مجھے لہجے میں کہا۔ "اوکے بائی۔"

"بائی۔" میں نے موبائل رکھا تو مجھے احساس ہوا کہ

اسے ہی کی ہنکی میں بھی مجھے بہتا آیا ہوا تھا اور مجھے اپنی کیفیت پر حیرت ہوئی تھی۔ میں آئینہ سے بے وفائی یا لیلیٰ سے غلط بیانی کا بوجھ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں اندر سے اتنا ہولکا لگا تھا۔ اس دوران میں لیلیٰ منہ پھیر کر رہی تھی۔ وہ اپنی تصویروں کے بارے میں پوچھ رہی تھی کہ مجھے کیسی لگیں۔ جب میں نے جواب نہیں دیا تو اس نے پوچھا تھا کہ میں کہاں ہوں اور جواب کیوں نہیں دے رہا؟ میں نے جلدی سے ٹائپ کیا۔

"سوری آئینہ کانوں آئی تھا۔"

"آپ کو کھلا لگے ہوں گے؟"

"ہاں۔" میں نے اعتراف کیا۔ "میں تمہاری تصویریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک بجلی چلی گئی۔ مجھے لگا میں چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا ہوں۔"

اس نے میرے مزاحیہ انداز میں تبدیلی پر توجہ نہیں دیا اور رسمی کا سا کمنٹ بنایا۔ "اگر آپ کی وائف کو پتا چل گیا کہ اس وقت آپ ایک عورت سے بات کر رہے ہیں اور اس کی تصویریں دیکھ رہے ہیں تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟"

"ظاہر ہے ایسے موقع پر ایب یوری کے کیا تاثرات ہو سکتے ہیں؟"

"مجھے اندازہ ہے کہ یونکہ میں خود کسی کی بیوی ہوں۔" اس نے کہا۔ "خیر چھوڑیں یہ بتائیں کہ ان تصویروں میں میں کیسی لگ رہی ہوں؟"

میں بتا تو دیتا لیکن ان فل فریم تصویروں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ ایک مکمل خوب صورت عورت ہو۔ "مکمل" کئی معنوں میں؟" اس نے انجان بن کر پوچھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ میرے منہ سے اپنی تعریف مکمل کروانے پر اتری ہوئی تھی۔

"ویسے تو عورت ہونا ہی حسن کی علامت ہے۔ مگر ہم لوگوں نے اس کے کچھ پیمانے بنا لیے ہیں۔ تم سر سے پاؤں تک ان پیمانوں پر پوری اترتی ہو۔"

"اف اللہ آپ نے کتنے پیارے لفظوں میں تعریف کی ہے۔" اس نے کہا۔

"کیا کسی اور نے بھی تعریف کی ہے؟"

"ان سب نے جن سے میں بات کرتی ہوں۔ مگر اتنے واہیات انداز میں اور بعض نے تو فحش الفاظ استعمال کیے تھے۔"

میں مرد ہوں اور سمجھ رہا تھا کہ مردوں نے کس انداز میں اس کی تعریف کی ہوگی۔ میں نے لکھا۔ "شاید وہ تم کو صرف ایک عورت سمجھ رہے ہوں گے۔"

"اور آپ؟"

"سچ تو یہ ہے کہ تمہاری عورت ہونے کی کشش سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن تم نے آج مجھے جس طرح ہمارا تعارف دی ہے میں اس کے لیے ایک دوست کے طور پر تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

اس نے جواب دیا۔ "سچ کہوں تو جب سے میں نے یہ ڈیٹنگ سائٹ جوائن کی ہے پہلی بار مجھے کسی سے دل کا رشتہ جڑ رہا ہے۔"

ہمارے درمیان کچھ دیر اور بات ہوئی اور پھر وہ چلی گئی کیونکہ اس کا شوہر گھر آنے والا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی اور حیران ہوا کیونکہ ساڑھے سات بج گئے تھے۔ میں نے ساڑھے پانچ بجے کے اس سے پہلے اپنے لیپ ٹاپ کی بیٹری صاف کی۔ اگر یہ چوتی میرے کمرے اور کیپٹر تک رسائی نہیں رکھتا تھا مگر میرا حال بے دفتر کا کیپٹر تھا اور کہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب کون اسے استعمال کرے اگر میں چند دن پابند پڑ جاتا تو لازمی کوئی دوسرا میری سیٹ پر آتا اور اسے استعمال کرتا۔ بستری صاف کرکے میں نے ایک نیملہ اور کیا کہ اب میں اپنا لیپ ٹاپ دفتر لایا کروں گا اور اسی پر لیلیٰ سے رابطہ کروں گا۔ دفتر سے گھر جاتے ہوئے میں اسی کم کی بلانک سے یہ معروف رابطہ کیا میں کس طرح لیلیٰ سے محفوظ رابطہ کروں جس کا آئیڈیا یہ میرے دفتر میں کسی کو علم نہ ہو۔ آئیڈیا کو لیپ ٹاپ سے تو دور ہی رکھا جا سکتا تھا اور ردی سے اسے سلم تھا کہ اندر کی چیزیں کیسے تلاش کرتے ہیں۔

مگر مصرات جب میں سونے کے لیے لیٹا اور میرے پہلو میں آئینہ پہلی ہی سوری تھی تو مجھے خیال آیا کہ کہیں میں اس سے بے وفائی تو نہیں کر رہا ہوں۔ میں ایک غیر ظرت سے رابطہ رکھ رہا تھا یہ شک سے رابطہ بنے کی حد تک تھا مگر ہر حال رابطہ تھا۔ میں اس کی تصویریں بھی دیکھ رہا تھا اور اس کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ کہیں وہ اس مختلف مزاج کا مرد نہ ہوتا تو لیلیٰ نے مجھے جس طرح اکسایا تھا میں دوسرے مردوں کی طرح اس کی تعریف کرتا۔ مگر میں نے اخلاق اور تہذیب کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔ اسی بات نے لیلیٰ کو متاثر کیا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ جن دوسرے مردوں نے اس کی دیگر انداز میں تعریف کی تھی تو اس نے کیا ردِعمل دیا تھا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ میں اگلے دن اس سے پوچھوں گا۔ آئندہ نے اس شام سے زیادہ بات نہیں کی اور ڈنر کے بعد مجھ میں سکی رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شام میں اس نے مجھ میں صاف نہیں کیا تھا۔ ساڑھے دس بجے تک۔ وہ تھک کر لیلیٰ اور خوراک سو گئی تھی۔ اگلے دن ناشتے کے بعد میں نے لیپ ٹاپ بیگ میں رکھا تو اس نے پوچھا۔

"ہاں دفتر کا کمپیوٹر گھر کا کر رہا ہے۔ اس کے ٹھیک ہونے تک میں لیپ ٹاپ استعمال کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا کچھ ضروری ہے؟"

"نہیں۔" اس نے انکار کا جواب دیا۔ "میرے پاس موبائل بھی ہے اور نیٹ بھی۔"

میں دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے لیپ ٹاپ پر وہ سائٹ کھولی اور لاگ ان ہو گیا۔ میرا لیلیٰ لاگ آف تھا۔ میں نے اپنی آئی ڈی کو ہائیڈ کر لیا اب مجھے کوئی دیکھ سکتا تھا نہ سوائے لیلیٰ کے کیونکہ وہ میرے پاس ایڈ ہو گئی تھی۔ جیسے ہی وہ آن لائن ہوئی میسج چلا چلا جاتا۔ اپنے کام نمٹانے کے دوران میں وقتاً فوقتاً سے دیکھتا رہا تھا کہ وہ آن لائن ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ دوپہر تک نہیں آئی تھی شاید گھر کے کاموں میں معروف تھی۔ لنچ کے بعد نیچے کے رائٹر پر جاتے ہوئے میں نے لیپ ٹاپ پر اسکرین سیور پاس ورڈ کے ساتھ لگا دیا۔ تاکہ کوئی میرے کمرے میں آئے بھی تو اسے کھول نہ سکے۔ رائٹر سے واپس آ کر میں نے لیپ ٹاپ دیکھا تو خوش ہو گیا۔ لیلیٰ آن لائن تھی اور اس نے میسج کیے ہوئے تھے۔ "ہائے..... کیسے ہیں..... کب سے لاگ ان ہیں؟"

"ہائے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو..... میں تو سچ لو بیٹھے سے لاگ ان ہوں۔"

اس نے تھکی کا سائن بنایا۔ "ائے اللہ اتنی بے تابی؟"

میں جھینپ گیا۔ "ہاں، وہ بس آرہے تھی سائٹ کھول کر اگ گئی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں میسج کر دوں۔"

"ہاں میں عام طور سے دوپہر میں تین بجے تک آتی ہوں کیونکہ وہ ٹیبر کا کھانا اور کچن میری ذمے داری ہے۔ اس سے نمٹ کر کمرے میں آتے آتے تین بج جاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اب میں بھی تین بجے ہی آؤں گا۔"

"نہیں۔" اس نے جلدی سے لکھا۔ "آپ نو بجے آئیے گا۔ میں گیارہ بجے تک فارغ ہوتی ہوں اس کے بعد میرا کام شروع ہوتا ہے۔ اگر آپ کے پاس صبح وقت ہوتا ہے تو ہم بات کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے صبح بھی گپ شپ کر لیا کریں گے۔"

"آپ یوں ملے کر رہے ہیں جیسے ہمارے درمیان کبھی دوستی ہو گئی ہے۔"

میں بے چین ہو گیا۔ "تو کیا کبھی نہیں ہوئی ہے؟"

اس بار اس نے شرارتی سائن دیا۔ "آپ کا کیا خیال ہے عورت اتنی جلدی رام بھی ہو جاتی ہے۔"

"میں نے تو سنا ہے عورت ایک نظر میں مان جاتی ہے۔"

"وہ تو محبت کے بارے میں کہا جاتا ہے۔"

"اس میں دوستی بھی شامل کر لو۔"

"یہ بھی دوستی سوچ سمجھ کر کرنی چاہیے۔" اس نے لکھا۔ "چند ایک مرد جو آغاز میں اتنے سوبر تھے کہ مجھے سسٹر تک کہہ دیا تھا مگر جب میں بے تکلف ہوئی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔"

"جب تم نے ایسے آپے سے باہر ہونے والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

"میں نے ان کو بلاک کر دیا۔ وہ آئی ڈی بدل کر آئے مگر میں نے بات نہیں کی۔"

"ایک بات پوچھوں اگر تم برا نہ مانو؟"

"پوچھیں۔"

"آج کل تمہاری کتنے افراد سے بات چیت ہو رہی ہے؟"

"کل تک آپ سمیت تین افراد سے تھی۔"

"اور اب؟"

"آج صرف آپ سے ہے۔ آنے والے دنوں کا میں کچھ نہیں سکتی کہ کس سے ہوگی یا نہیں ہوگی۔"

"تم صاف گو لڑکی ہو۔"

"میں عورت ہوں۔" اس نے کہا۔

"ہاں لیکن دیکھنے میں لڑکی لگتی ہو۔ آئینہ بھی عورت ہے مگر دیکھنے میں لڑکی لگتی ہے۔"

"آپ نے ٹھیک کہا، شاید اس لیے کہ اس کے بچے نہیں ہیں۔" لیلیٰ نے لکھا۔ "بچے ہونے کے بعد بہت کم عورتیں لڑکیوں جیسی لگتی ہیں۔"

"شاید اس لیے کہ ہمارے ہاں عورتیں اپنی کیئر نہیں

کرتی ہیں۔"

"کر بھی نہیں سکتی ہیں۔" اس نے کہا۔ "ہمارے ہاں عورت پر دوسری ذمے داریاں اتنی ہوتی ہیں کہ اس کے لیے اپنے پاس وقت بچتا ہی نہیں ہے۔"

میں نیلی سے مخاطب تھا۔ ایسا منہمک ہوا کہ مجھے آفس میں اپنی ذمے داریوں کا خیال ہی نہیں رہا۔ پھر نیچے سے کال آئی تو مجھے ہوش آیا۔ آدھے گھنٹے میں کام نمٹا کر میں دوبارہ سائٹ پر آگیا اس دوران میں نیلی نے یہ کیا کہ اس نے اپنی مزید تصویریں البم میں ڈال دی تھیں۔ اس نے مجھے بتایا اور میں نے البم کھول کر دیکھا۔ اس بار اس نے زیادہ تیاری والی تصویریں ڈالی تھیں ان میں وہ شاید کسی شادی کی تقریب میں تھی۔ جیسا کہ آج کل رواج چل نکلا ہے کہ عام خواتین اور لڑکیاں بھی شادیوں میں کھلے کھلے والے لباس پہننے لگی ہیں اور دوپٹا ان کے ہاتھوں پر ہوتا ہے۔ نیلی نے چھوٹی سی کرتی کے ساتھ لمبا گھیر دار ہوا تھا اور اس میں دوپٹا غائب تھا۔ چست کرتی کے سیاہ رنگ نے بالوں سے اس کا دودھیا رنگ بہت نمایاں تھا۔ میں نے اس تصویر کی تعریف کی تو وہ کھل اٹھی۔ "سچ میں بہت اچھی لگ رہی ہوں؟"

"ہاں اچھی تو لگ رہی ہو لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔"

"وہ کیا؟"

"نیلی کرم خواتین اس قسم کے لباس میں نہ تو گھر سے باہر نکلتی ہیں اور نہ ہی گھر میں کوئی مہمان آئے تو اس کے سامنے آتی ہیں لیکن شادی کی تقریب میں سینکڑوں مردوں کے سامنے دوپٹے سے بے نیاز اور کھلے گلوں کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں خود بھی ایسا ہی کرتی ہوں اور ایسے سوٹ کیا عام لباس میں بھی بغیر دوپٹے کے باہر یا گھر میں آئے والوں کے سامنے نہیں جاتی۔ مگر شادیہ ہمارے ہاں رواج بن گیا ہے اور جو چیز رواج بن جائے وہ عجیب نہیں لگتی ہے۔"

"آئینہ شادی یا تقریب میں بھی ایسی ڈریسنگ نہیں کرتی ہے اس کا تو پورا جسم سر اور سینے پر رہتا ہے۔"

"سب عورتیں نہیں کرتی ہیں مگر کچھ کرتی ہیں۔" اسے شاید میری بات بری لگی۔ "آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آئینہ زیادہ شریف عورت ہے۔"

میں نے معذرت کی۔ "سوری اگر تمہیں یہ بات بری لگی۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا اور تم ٹھیک کہہ رہی ہو اگر عورتیں ایسا نہیں کرتی ہیں خود میری بھابیاں اور بہنیں کھلے گلے میں شادیوں میں شرکت کرتی ہیں اور اس وقت میں مجھے نہیں لگتا ہے۔"

"میں نے برا نہیں مانا۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ بتائیں آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟"

"میں اچھا یا برا کا فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے یہ اچھا بھی لگتا ہے اور نہیں بھی لگتا۔ اصل بات جو مجھے کھٹکتی ہے وہ دوہرا معیار ہے۔ کیا جو بے کو عورتیں اور لڑکیاں شادیوں اور تقریبات میں اپنی یوں نمائش کرتی ہیں جب کہ عام حالات میں وہ دوپٹہ لپیٹ کر رہتی ہیں۔"

"میں نے کہا نا یہ رواج بن گیا ہے۔" وہ بولی۔ "ایک زمانے میں گھروں میں عورتیں سروں کے ساتھ بیٹھ کر فلپائی ڈی خوندیں یعنی میس خاص طور سے باپ بھائیوں کے ساتھ کراچ سے یہ رواج چل گیا ہے اور بیٹھ کر دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اسے معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔"

اسی گفتگو میں وقت ہو گیا اور میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ میں نے نیلی کو خدا حافظ کہا۔ سیلز والوں سے رپورٹ طلب کی اور اسے ہیڈ آفس روانہ کر کے میں خود بھی گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ کال نیلی کے جواب میں آئینہ نے دروازے سے دروازہ کھولا۔ وہ تازہ دم اور تیار تھی۔ اس نے نہا کر تازہ سوٹ پہنا تھا۔ میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "خیریت آج بہت تیار ہو؟"

"ہاں میرا دل چاہ رہا تھا۔" اس نے کہا۔ "آپ فریش ہو جائیں تو میں کھانا لگا دوں۔"

آئینہ عام طور سے دوپہر میں نہایا کرتی تھی اور اسی وقت کپڑے بھی بدلا کرتی تھی۔ اگر موسم اچھا ہوتا تو دوپہر بعد نہاتی اور کپڑے بدلتی تھی۔ ان دنوں جون کا آخر تھا اور گرمی شدت کی تھی اس لیے وہ روز ہی نہایا کرتی تھی مگر میں نے مکمل بار اسے شام میں نہاتے اور کپڑے بدلتے دیکھا تھا۔ میں فریش ہو کر آیا تو اس نے میرے پوچھنے پر کھانا لگا دیا۔ آج اس نے مٹن کڑاہی اور ساتھ میں فرنی بنائی تھی۔ دونوں میری پسندکی چیزیں تھیں۔ میرا موڈ مزید خوشگوار ہو گیا اور میں نے ڈنر کے بعد باہر چلنے کا کہا تو آئینہ خوش ہو گئی۔ "سچ آج میرا بھی دل چاہ رہا تھا کہ ہم کہیں باہر جائیں۔ میں آپ سے کہنے والی تھی مگر آپ نے پہلے ہی میری خواہش پوری

میں دلچسپ مضامین کا مرقع فروری 2016ء کا پُرلطف تا پُرگیرہ

ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی

☆ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اطہر شجاعت کے ایمان افروز اسلامی مضامین

☆انجم انصار کے مشاق قلم سے شاہکار ناول..... گم شدہ محبت کی پہلی قسط

☆نگہت سیما کا خوب صورت ناول، اعتبار وفا انتہائی مراحل کی طرف گامزن

☆ درخشاں بلال، نایاب جیلانی اور تابندہ نعیم کی مسلسل کاوشوں کی نئی داستانیں

☆مکافات..... ناہید سلطانہ اختر کی ایک اور دل پزیر کہانی

☆انکشاف..... سحرش جدر کی چونکا دینے والی تحریر

☆جگمگاتا ستارہ..... رفاقت جاوید کے قلم سے ایک جاں گداز کاوش

شیف گلزار حسین اور
روبینہ گلزار کی مزیدار باتیں.....
پاکیزہ کے مہمان میں

اس کے علاوہ

ان رائٹرز نے بخشی پاکیزہ کے صفحات کو مزید رونق جن میں ام ایمان قاضی، فرح طاہر قریشی، صائمہ قریشی، ثریا انجم، فائزہ رابعہ، سیما راجپوت و دیگر شامل ہیں۔

پاکیزہ کے ہر شمارے میں سائنسی، تاریخی، مذہبی، نفسیاتی، تفریحی اور اصلاحی سلسلے آپ کے ذوق کی نذر

کردی۔"

"کہاں چلیں؟"

"جناح سپر مارکیٹ وہاں آئسکریم فالودہ بہت اچھا ملتا ہے۔"

ہم باہر آئے اور جناح سپر مارکیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ کھانے کی سب سے اچھی چیزیں وہیں ملتی تھیں۔ میں نے آئیڈیل کی فرمائش پر آئسکریم فالودہ لیا۔ وہاں کھلی جگہ میزیں اور کرسیاں بھی تھیں۔ ہم ان پر بیٹھ کر فالودہ آئسکریم سے لطف اندوز ہونے لگے تھے۔ ہماری طرح بے شمار لوگ یہاں کھانے پینے آئے ہوئے تھے۔ اسی طرح شاپنگ کرنے والے بھی تھے۔ یہاں تھکن کے ساتھ بھوک بھی ساتھ آجاتی تھی۔ ہماری طرح بہت سے لوگ تھے۔ مگر سب آپس میں مگن تھے۔ میں ماحول سے بھی لطف اٹھا رہا تھا کہ اچانک میری نظر سامنے والی میز پر گئی وہاں لیلیٰ بیٹھی تھی۔ پہلے تو میں اپنی آنکھوں پر شبہ کر سکا۔ آخر میں نے اسے تصویروں میں بہت دیکھا تھا اس لیے مجھے اس کو پہچاننا لیلیٰ کا گمان ہو رہا تھا۔ مگر جب میں نے غور کیا تو وہ لیلیٰ ہی تھی۔ اس نے سوٹ بھی وہ پہنا ہوا تھا جو ایک تصویر میں وہ پہنے ہوئے تھی۔

اس کے ساتھ ایک کسی قدر بڑی جسامت کا مرد بھی آیا تھا۔ اس نے فی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی جو اس کے باڈی بلڈر ہونے کی چغلی کھا رہی تھی اور وہ دل جمعی کے ساتھ موجود پلیٹ سے نمٹ کھا رہا تھا۔ لیلیٰ کے سامنے وہی بڑے کی پلیٹ تھی۔ وہ برائے نام کھا رہی تھی جس کا دل نہ چاہ رہا ہو۔ وہ دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ لیلیٰ مجھے پوری نظر آرہی تھی جب کہ اس کے ساتھ بیٹھا مرد پشت سے اور چہرے کے ایک رخ سے ذرا ذرا دکھائی دے رہا تھا۔ آئیڈیل فالودہ آئسکریم کھا رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ میں رکا ہوا ہوں تو اس نے کہا۔

"آپ کیوں نہیں رہے یہ تو پگھل جائے گی۔"

میں چونکا اور کھانے لگا۔ اب میں چوری چوری لیلیٰ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھی اور جب آدمی کچھ کہتا تو وہ بات کرتی تھی۔ آدمی کی جسامت کی طرح اس کی آواز بھی بھاری تھی مگر الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ آئیڈیل آرام سے کھا رہی تھی اور میں نے درمیان میں رکنے کے باوجود اپنا کپ جلدی خالی کر دیا تھا۔ میں نے آئیڈیل سے پوچھا۔

"چاٹ کھاؤ گی یہاں کی چاٹ بھی بہت مشہور ہے۔"

"گنجائش نہیں ہے لیکن آپ بھی کھا کیں تو میں کھا لوں گی۔"

"میں ابھی لے کر آتا ہوں۔" میں نے کہا اور اٹھ کر لیلیٰ والی میز سے ذرا فاصلے پر پہلو والی شاپ پر پہنچا یہاں چاروں طرف کھانے پینے کی دکانیں تھیں۔ میں نے اس سے ایک چاٹ اور دو عدد کولڈ ڈرنک لیں۔ واپس میں لیلیٰ کی میز کے پاس سے آیا اور اس بار میں نے آدمی کو قریب سے دیکھا۔ وہ موٹے نقوش والے پہلوانوں جیسے خم والا آدمی تھا۔ ناک کے اعمام لیلیٰ اس کے سامنے ایسی لگ رہی تھی جیسے ہاتھی گینڈے کے سامنے ہرنی لگ سکتی ہے۔ قریب سے گزرتے ہوئے میں نے سنا آدمی کہہ رہا تھا۔ "تم کھا کیوں نہیں رہی ہو؟"

"میں سیر اول نہیں جاؤں گا۔" لیلیٰ نے چیخ چھوڑ کر تو اضافہ کیا۔ اس دوران میں میں اس کے پاس سے ہو کر چلا گیا تھا۔ اگر وہ لیلیٰ کا شوہر تھا تو یہ جوڑی شادی شدہ تھی وہ محرم بھی اس سے بڑا لگ رہا تھا۔ مگر محرم اور غیر محرم کی چیزیں ہوتی ہیں اصل چیز میاں بیوی کی ہم آہنگی ہوتی ہے اگر وہ ان میں ہوتی تو لیلیٰ یوں ڈیٹنگ سائٹ پر مردوں سے دوستی کرتی نہ پھر رہی ہوتی۔ جب میں اس کے پاس سے گزرا تو آدمی اسے کچھ سنا رہا تھا اور لیلیٰ کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے بہت سے لوگوں کے درمیان وہ بے عزتی کروانا بہت ناگوار سے محسوس کر رہی تھی اور مجھے اس کی آدمی پر غصہ آنے کا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ جا کر اسے سناؤں کہ وہ جھوم مت بیٹھ کر اپنی بے عزتی کی ہے عزتی کر رہا تھا۔ گھر اسی لمحے دماغ سے نکل گئے۔ آئیڈیل کی آواز نے مجھے چونکایا۔

"کیا بات ہے آپ کہاں گم ہو رہے ہیں کیا یہاں مجھ سے بھی زیادہ کوئی خوب صورت عورت ہے۔"

میں جھینپ گیا۔ "نہیں اصل میں ایک دفتری مسئلہ بار بار ذہن میں آرہا ہے۔ سوری اب بالکل نہیں غائب ہوں گا۔"

میں نے آئیڈیل کے ساتھ چاٹ کی پلیٹ شیئر کی اور بہت مزہ آیا۔ اس میں مرچیں کچھ تیز تھیں اور ہم مرچ کے بعد کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ لیتے تھے۔ پلیٹ ان مرچوں کے ساتھ دونوں ہم نہیں کھا سکتے تھے مگر مرچیں لگی جاری تھیں اس لیے روانگی سے پہلے میں نے دو دہی اور لیے تھے۔ وہ ہم نے راستے میں ختم کیے تو بھوک آباد ہو گئی میں خوشگوار سوچ میں رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آئیڈیل مجھ سے بات کرے گی۔ بیچ بات نہ کرے میرا بھی اس سے بات کرنے کا موڈ ہو رہا تھا مگر اس کی بجائے اس نے گھر آکر کپڑے بدلے اور اپنا ٹیب اٹھا کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ میں نے کپڑے بدلے اور واش روم سے آکر ڈرائنگ روم میں جھانکا تو وہ نہایت انہماک سے ٹیب پر جھکی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "سونے کا ارادہ نہیں ہے کیا دو بج رہے ہیں؟"

"آپ سو جائیں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "میں کچھ دیر بعد سو دوں گی۔"

میں آکر بستر پر لیٹ گیا۔ آج میں نے آئیڈیل کو ٹیب لیے دیکھا تھا ورنہ وہ رات کو جلدی سونا پسند کرتی تھی۔ عام طور سے میرے ساتھ یا مجھ سے پہلے ہی لیٹ جاتی تھی۔ میرے آنے کے بعد وہ موبائل یا ٹیب استعمال نہیں کرتی تھی۔ میرا دل ہی دل میں کسی بات پر جھگڑا کرنے کو چاہ رہا تھا مگر ساتھ ہی دیکھنے بھی تھی۔ جب سے میں نے نیٹ لگوایا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ رات کے وقت نیٹ استعمال کر رہی تھی اس کا انداز مجھے اس کی ٹیب پر پلکیں جھپکنے سے ہوا جیسے وہ کچھ لکھ رہی ہو۔ ظاہر ہے صرف انٹرنیٹ استعمال کرتے ہوئے آدمی کچھ لکھتا ہے۔ جیسے ویب ایڈریس یا سرچنگ کے لیے کچھ لکھتا ہے۔ میں تھک گیا تھا اس لیے لیٹا اور کچھ ہی دیر بعد سو گیا تھا۔ بظاہر نہیں معلوم کہ آئیڈیل کب سوئی۔ میں صبح سویرے بہادر آباد میں آکر لیلیٰ کے مکمل طور پر بے نقاب ہونے کے معمول کے مطابق جاگا تو وہ سو رہی تھی اور میں نے اسے جگایا۔

"آج ناشتہ نہیں دو گی کیا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟"

وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ اٹھی اور بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے بولی۔ "ہاں ٹھیک ہوں، ٹیب واش روم سے ہو آئیں تب تک میں ناشتا بناتی ہوں۔"

میں واش روم میں سو رہا تھا کہ کیا وہ واپسی دیر تک جاگتی رہی تھی کہ صبح وقت پر اس کی آنکھ ہی نہیں کھلی۔ ورنہ آئیڈیل صبح خود اٹھ جاتی تھی اور اس کی عادت اتنی پختہ تھی کہ اسے الارم لگانے کی ضرورت بھی نہیں پیش آتی تھی۔ میں واش روم سے آیا تو وہ ناشتا لگا چکی تھی۔ مگر اس نے صرف ناشتہ بنایا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا تم ناشتا نہیں کرو گی؟"

"میرا موڈ نہیں ہے رات اتنا کھا لیا تھا کہ پیٹ ابھی تک بھرا ہوا لگ رہا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد میں آرام کروں گی۔"

"تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی ہے کیا تم رات دیر تک جاگتی رہی تھیں؟"

"نہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔ "میں بارہ بجے تک آرام سے سو گئی تھی۔"

"تم نے رات کو نیٹ استعمال کیا کل کوئی خاص بات تھی۔"

"ہاں فیس بک پر تھی کچھ فرینڈز ہیں جو امریکا اور کینیڈا میں ہوتی ہیں وہ رات کے وقت ہی تھی ہیں۔"

میری اطلاع کے مطابق اس کی ایسی کوئی دوست قریبی دوست نہیں تھیں جو کینیڈا اور امریکا میں تھیں اور رات کے وقت ہی دستیاب ہوتی تھیں۔ اصولاً تو ان کا نیٹ کا وقت ہمارے ہاں تھی کا وقت ہوتا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں آئی لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں دفتر جا رہا تھا اور مجھے لیلیٰ کا خیال آرہا تھا۔ میں صبح تھا کہ اس سے کل رات کی بات کروں۔ ناشتا کر کے میں دفتر روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر میں نے لیپ ٹاپ پر ڈیٹنگ سائٹ کھول لی۔ آج لیلیٰ موجود تھی۔ اس نے پہلے لکھا۔

"کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں لیکن کل تمہیں دیکھا تو تم ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں۔"

"ہاں طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"

"کیا بات ہے کہاں کھویا کھویا۔"

"کل میں اور آئیڈیل جناح سپر آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم نے شاید اپنے شوہر کے ساتھ آئی تھیں۔ بڑے جثے والا آدمی جو تمہارے ساتھ دیر تک بیٹھا ہوا تھا۔"

"لیکن بدقسمتی سے وہ میرا شوہر نہیں ہوائی ہے۔" لیلیٰ کے مخاطب کرنے سے تھے۔ "مگر آپ کہاں تھے کاش کہ مجھے پتا ہوتا کہ آپ آئے ہیں تو میں آپ کو دیکھتی۔"

"میں تمہارے سامنے تھا مگر تم وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھیں۔"

"آپ نے ٹھیک کہا کیونکہ دیکھیں مجھے زبردستی لایا تھا میرا بالکل سوڈ نہیں تھا۔"

"زبردستی کیوں لایا تھا؟"

لیلیٰ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے لکھا۔ "وہ کہہ رہا تھا کہ مجھے کسی کو رکھانا ہے۔"

"کس کو رکھانا ہے؟" میں سمجھا نہیں تھا۔

"اس کی کسی عورت سے دوستی ہے اور وہ اسے دکھانا

چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کہاں ہے۔"

میں حیران رہ گیا تھا۔ "یہ کس قسم کا شوہر ہے۔"

اس نے الٹی کا سائس بنایا۔ "مجھ جیسی بیوی کا شوہر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اس سے چھپ کر کئی مردوں سے نیٹ پر دوستی کی ہے۔ وہ مرد ہے اور کھل کر کسی عورت سے مل بھی سکتا ہے۔"

میں کچھ دیر کے لیے چپ ہوا تھا پھر میں نے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں یہ کافات کھل گیا ہے؟"

"اس کل رات جب اس نے مجھ کو کہتے یہ بات بتائی تو مجھے ایسا ہی لگا تھا۔"

"وہ وہاں کیسی ذہانت بھی رہا تھا؟"

"ہاں، وہ کہہ رہا تھا کہ میں خود کو سمجھتی کیا ہوں۔ کیا میں ہی دنیا میں ایک حسین عورت رہ گئی ہوں جو اس کے ساتھ یوں فخر سے دکھائی ہوں۔ اس نے کہا کہ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین عورت ہے۔ مگر آگر اس نے مجھے اس عورت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہے۔"

"وہ جھوٹ کہتا ہے تمہیں طلانا چاہ رہا ہے۔ تم کسی سے کم نہیں ہو۔"

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ رئیس ایسا آدمی نکلے گا۔ میں تو سمجھتی تھی کہ اسے عورتوں سے رال ٹپکتی ہیں ہے اور وہ تو مجھ پر بھی پوری توجہ نہیں دیتا ہے۔ میڈم کہ دوست بات نہیں کرتا ہے اور نہ ہیں کے لیے جاتا ہے۔ جب کل اس نے چلنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ اس نے مجھے زبردستی تیار کرایا اور ساتھ لے کر آیا تھا۔"

مجھے لیلیٰ کے شوہر پر غصہ آیا تھا۔ وہ نہ جانے کس قسم کی شخصیت کا اس کی بیوی اتنی حسین تھی اور وہ کسی دوسری عورت کے چکر میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے اندر سے ایک آواز ابھری۔ "حسین تو تم بھی کم نہیں ہے مگر تم دوسری عورت کے چکر میں ہو۔"

میں نے گھر آکر سوچا کہ میں نے لیلیٰ سے صرف دوستی کی ہے۔ اندر کی آواز نے جواب دیا۔ "ضروری نہیں ہے کہ عورت سے جسمانی تعلقات قائم کیے جائیں۔ اگر تم اپنی بیوی سے چھپ کر کسی دوسری عورت سے بات کر رہے ہو تو یہ بھی بے وفائی ہے۔ اگر آئینہ ایسا ہی کرے تو کیا تم اس بات کو پسند کرو گے۔"

میں نے تسلیم کیا کہ میں اس بات کو ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ اب میں نے اس زاویے سے سوچا تو مجھے رئیس اور لیلیٰ دونوں ہی برابر کے قصوروار نظر آئے تھے۔ دونوں اپنے جائز ساتھی کو چھوڑ کر دوسروں سے ناجائز ملنے جا رہے تھے اور یہی غلطی میں بھی کر رہا تھا۔ جب مجھے خیال آیا کہ آئینہ ایسا کر سکتی ہے تو اس خیال کے ساتھ ہی مجھے اس کی رات کی سرگرمیاں یاد آئی جب وہ لب سے لگ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی تھی اور مجھ وقت پر اس کی آنکھ بھی نہیں کھلی تھی۔ میرا سوچ ذہن میں آتے ہی مجھے بے چینی کا ہونے لگی تھی۔ لیلیٰ کا سچ آیا تو میں چونکا۔ اس نے کہا تھا۔ "آپ نے کچھ کہا کیا؟"

"کہا کہوں، میں تو اپنے بارے میں سوچ رہا تھا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔ "اگر آئینہ کی آواز سے یوں چھپ کر بات کرے تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگے گا۔"

"مگر یہاں تو میرا شوہر بھی ہے وہ فائل آیا ہے۔" لیلیٰ بولی۔ "اگر میں نے تمہاری کال کی ہے تو اس نے بھی تو لیلیٰ کی ہے۔"

"وہ اس عورت میں کس حد تک الجھا ہوا ہے؟"

"یہ تو نہیں لیکن وہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت بہت حسین ہے۔"

"شاید یہ اس کا خیال ہے آدمی کو دوسرے کی بیوی زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ وہ عورت مجھ سے زیادہ خوب صورت نہیں ہو گی لیکن پرائی عورت ہے تو اس لیے رئیس کو زیادہ اچھی نظر آرہی ہے۔"

"ہاں میرا یہی خیال ہے۔" میں نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ آئینہ لیلیٰ سے زیادہ حسین تھی لیکن میں مجھے زیادہ پُرکشش محسوس ہوئی تھی۔ وہ دنیا کی کہ پرائی عورت زیادہ اچھی لگتی ہے۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آئینہ کسی اور کو زیادہ اچھی لگتی ہو۔ دراصل لیلیٰ کی اس بات نے مجھے زیادہ بے چین کر دیا تھا کہ جب میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس بات کو کافات عمل سمجھتی ہے تو اس نے اثبات میں جواب دیا تھا۔ اس طرح میں آئینہ سے چھپ کر لیلیٰ سے رابطہ رکھے ہوئے تھا اور اس کا بھی کوئی کافات عمل ہوتا اور آئینہ بھی مجھ سے چھپ کر کسی سے دوستی کرتی۔ ممکن ہے اگر آئینہ گزشتہ رات وہیں کسی سے ڈرائنگ روم میں چیٹنگ رہتی تو میرے ذہن

میں یہ خیال نہ آتا۔ مگر اب یہ خیال اتنی شدت سے میرے دماغ میں تھا کہ میں نے گھبرا کر آئینہ کو کال کر دی۔ اس نے خاصی دیر بعد کال ریسیو کی۔

"کہاں تھیں تم؟" میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "اتنی دیر سے بیل بج رہی تھیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں۔" اس نے کہا۔ "تین بیل کے بعد ہی اٹھا لیا۔ یقین بھی نہیں آتا تو خود آج کیسے بار کر لیا۔"

میں اپنے آفس جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ آج ہم ڈرائیور کو ساتھ لے کر جائیں گے۔ میں نے کہا۔ "اچھا، میں آتا ہوں۔"

"باہر مگر ہم کل ہی تو واپس آئے ہیں اور آج تو چھٹی کا دن بھی نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن میں آجاؤں گا۔" میں نے کہا۔ "تم تیار رہنا۔"

"کہتے ہے تک۔"

میں سات بجے تک آجاؤں گا۔" میں نے جواب دیا اور کال کاٹ دی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں نے اسے باہر نکلنے کے لیے کہہ دیا۔ شاید میں خالی کنارہ رابطہ رکھا ہوا تھا۔ کل گیارہ بجے بیل بجی تھی کہ اسے دیر پہر کا کھانا بنانا تھا۔ میں اپنے کاموں میں لگ گیا۔ آج اتفاق سے کام خاصا تھا۔ بیڈ آفس سے کئی اکھوار پر آئی تھیں ان کا جواب دینا تھا پھر یہاں ڈیلرز کی طرف سے ایک میٹنگ کی درخواست تھی اس کے فائنانسر سے بھی بات کرنا تھی۔ یہ سب نمٹاتے ہوئے تین بج گئے۔ میں نے ہاتھ پونچھ کا سوچا تھا۔ اس کے بعد میں فارغ ہوا تو مجھے لیلیٰ کا خیال آیا مگر میں لاگ ان نہیں ہوا۔ میرے اندر سے آواز آرہی تھی کہ مجھے اس سلسلے کو یہیں روک دینا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود میں نے خود کو بڑی مشکل سے روکے رکھا تھا پھر میرا ہاتھ لیپ ٹاپ کی طرف بڑھا تھا اور میں نے روک لیا۔

پھر فرشتہ والوں کی طرف سے کھانا آگیا اور میں ان کو نمٹانے لگا۔ مجھے ہی میں نے سوچا کہ نکلش میں بیٹھنے رہنے سے بہتر ہے کہ ہم کہیں چلا جائیں۔ آئینہ سے سات کا کہا تھا لیکن میں چھ بجے بھی چلا جاؤں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے بلیز والوں سے کہا کہ وہ اپنا کام مکمل کر کے جائیں میں رپورٹ بعد میں لے لوں گا۔ میں دفتر سے نکلا اور پندرہ منٹ بعد فلیٹ کے دروازے پر تھا۔ کال بیل کے جواب میں دوسرے بعد آئینہ کی آواز آئی۔ وہ پوچھ رہی تھی کہ کون ہے میں نے جواب دیا تو اس نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ "آپ... لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ آپ سات بجے آئیں گے۔"

"کیا تمہیں آفس سے جلدی چھٹی مل گیا اس لیے جلدی آگیا۔" میں نے اندر آتے ہوئے کہا۔ "تم کیا کر رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں بس ایسے ہی۔" اس نے کہا اور بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے لیپ ٹاپ میز پر رکھا اور صوفہ پر آبیٹھا۔ آئینہ واش روم میں جا چکی تھی۔ میں الماری کھول کر اپنا اس نکال رہا تھا کہ اچانک مجھے خیال آیا اور میں نے آئینہ کا لیپ ٹاپ کھولا۔ مجھے یہاں نہیں تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں آیا تو وہ صوفے کے عقب میں تائیں پر کھا تھا اور چارج ہو رہا تھا۔ سائڈ وہیں تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر آن کیا۔ فیس بک کا ہوم دکھایا تو وہ لاگ ان تھی۔ میں نے اس کا ہسٹری چیک کیا۔ اگر وہ رات کے وقت واقعی اپنے امریکا اور کینیڈا والے دوستوں سے بات کر رہی تھی تو یہ نیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کے ہسٹری میں ایسا کوئی سراغ نظر نہیں آیا۔ یعنی اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں لیپ بند کر کے واپس وہیں رکھ رہا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اسے پھر اٹھایا۔

اس بار میں نے اس کے میسجز کھولے اور ان میں اس کی کئی مختلف خواتین سے بات چیت موجود تھی۔ یہ تینوں امریکا اور کینیڈا میں تھیں اور انہی کی باتوں سے ظاہر تھا کہ ان میں پرانی دوستی تھی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ آئینہ اولاد کے حوالے سے پریشان تھی اور ان سے آئینہ کا لیپ کا کیا کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے خیال آیا اور میں نے اپنا اس نکال کر اسے چیک کیا۔ یہ بھی وہی تھا۔ میں نے آئینہ کا لیپ واپس رکھا اور میں نے اسے اٹھا کر آن کیا۔ فیس بک کا ہوم دکھایا تو وہ لاگ ان تھی۔ میں نے اس کا ہسٹری چیک کیا۔ اگر وہ رات کے وقت واقعی اپنے امریکا اور کینیڈا والی دوستوں سے بات کر رہی تھی تو یہ نیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کے ہسٹری میں ایسا کوئی سراغ نظر نہیں آیا۔ یعنی اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں لیپ بند کر کے واپس رکھنے جا رہا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اسے پھر اٹھایا۔

اس بار میں نے اس کے میسجز کھولے اور ان میں اس کی کئی مختلف خواتین سے بات چیت موجود تھی۔ یہ تینوں امریکا اور کینیڈا میں تھیں اور انہی کی باتوں سے ظاہر تھا کہ ان میں پرانی دوستی تھی۔ یہ سب دیکھتے ہوئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا۔ آئینہ اولاد کے حوالے سے پریشان تھی اور ان سے آئینہ کا لیپ کا کیا کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے خیال آیا اور میں نے اسے اٹھا کر آن کیا۔ فیس بک کا ہوم دکھایا تو وہ لاگ ان تھی۔ میں نے اس کا ہسٹری چیک کیا۔ اگر وہ رات کے وقت واقعی اپنے امریکا اور کینیڈا والی دوستوں سے بات کر رہی تھی تو یہ نیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کے ہسٹری میں ایسا کوئی سراغ نظر نہیں آیا۔ یعنی اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ میں لیپ بند کر کے واپس رکھنے جا رہا تھا کہ مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اسے پھر اٹھایا۔

جگہ میرے شانے پر رکھ دیا۔

"میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ کسی اچھی کانا کو ڈھونڈ ہی لوں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ بے حد مخلص ہیں۔ بے شک ساڑھے تین سال سے زیادہ عرصہ ہوا ہے مگر یہ زیادہ دیرپا نہیں ہے۔ لوگوں کے ہاں تو دس اور پندرہ سال بعد بھی اولاد ہوتی ہے۔"

"سچ میں؟" وہ خوش ہوگئی۔

"ہاں میں کل ہی سے تلاش شروع کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اس رات ڈنر کے دوران ہم نے بہت عرصے بعد بہت ساری باتیں کیں اور جب واپس آئے تو بہت خوش تھے۔ اگلے دن میں نے دفتر جاتے ہی سب سے پہلے ڈیٹنگ سائٹ کھولی۔ حسبِ توقع لیلیٰ موجود تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ "آپ کہاں تھے کل دوپہر میں بھی نہیں آئے؟"

"اب میں کبھی نہیں آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "مجھے احساس ہوگیا ہے کہ میں نے غلط کام کیا اور اپنی بیوی کو دھوکا دیا ہے۔"

"تب میرا کیا ہوگا۔" وہ روہانسی ہوگئی اس نے رونے والا سائن بنایا تھا۔ "میں آپ سے مخلص ہوگئی ہوں۔"

"لیلیٰ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں اور تمہیں مشورہ دیتا ہوں کہ یہ سلسلہ یہیں روک دو۔ گھر سے باہر تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ رئیس جیسا بھی ہے تمہارا شوہر ہے اور اگر تم اس کے ساتھ نہیں رہ سکتیں تو دوسرے راستے ہیں مگر جو راستے گھر سے باہر ہوں وہ ہمیشہ کسی کھائی یا دیوار پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہے۔"

لیلیٰ کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مگر رئیس جو کر رہا ہے؟"

"یہ اس کا اپنا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "جیسے مجھے سمجھ آئی ہے اسی طرح اسے بھی سمجھ آسکتی ہے۔ توفیق تو اوپر والا ہی دیتا ہے۔ اگر تم یہ راہیں چھوڑ دو تو ہوسکتا ہے کہ وہ بھی تمہاری طرف پلٹ آئے۔"

"لیکن آپ جو میرے لیے ہو چکے ہیں اس کا کیا ہو گا؟"

"مجھے بھول جاؤ۔ سمجھ لو کہ میں زندگی کے طویل سفر میں راستے میں آنے والا ایک سایہ دار درخت تھا اور درخت کتنا ہی سایہ دار کیوں نہ ہو مسافر اس کے نیچے بس ستانے کے لیے ہی رکتا ہے۔"

"تو آپ مجھ سے کبھی نہیں بات کریں گے؟"

"نہیں بات ہے کہ میں دل پر جبر کر کے یہ سب کر رہا ہوں اور ان چند دنوں میں اس نے میرے اندر ایک مقام بنا لیا تھا۔ میں نے بادل نخواستہ کہا۔ "مناسب نہیں ہے۔ اس تعلق کا کوئی قانونی، اخلاقی اور معاشرتی جواز نہیں ہے اس لیے اس کا ختم ہوجانا ہی مناسب ہوگا۔"

اس نے کچھ دیر بعد لکھا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... اللہ حافظ۔"

"ایسے نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "جانے سے پہلے مجھ سے ایک وعدہ کرو۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ اب کسی اجنبی مرد سے بات نہیں کروں گی اپنی راہ گھر کے اندر ہی تلاش کروں گی۔" اس نے جواب دیا وہ سمجھی تھی کہ میں اس سے کیا وعدہ لینے جا رہا تھا۔

"شکریہ، مجھے یقین ہے تمہیں گھر کے اندر ہی خوشی ملے گی۔" میں نے کہا۔ "میں ہمیشہ تمہیں یاد رکھوں گا اور تمہارے لیے دعا کروں گا..... خدا حافظ۔"

"میں بھی آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گی۔"

میں نے ڈیٹنگ سائٹ کو ہمیشہ کے لیے بند کیا تو اعداد بے بابا بھگا ہوگیا تھا۔ جب کہ پہلے میرا خیال تھا کہ میرا دل بوجھل ہوگا۔ مگر شاید فلاراہ سے نکلنے کے بعد انسان ابتدائی محسوس کرتا ہے۔ آج اس بات کو تقریباً ڈیڑھ سال ہونے کو آیا ہے۔ اللہ نے پھر میرے قدموں کو مضبوط رکھا اور مجھے کبھی کسی دوسری عورت سے دوستی کرنے کا خیال نہیں آیا۔ میں نے ایک اچھی اور باہمت کانا کو ڈھونڈ تلاش کی تھی۔ دو مہینے بعد آسیہ آمید سے ہوگئی تھی اور آج ہماری سات سیٹے کا بچا ہے۔ سال بھر بعد میں واپس لاہور آگیا تھا اور اب ابتدوں کے ساتھ ہوں۔ اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے اور کوئی کمی نہیں ہے۔ کبھی کبھی لیلیٰ کا خیال آتا ہے تو دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ اسے سیدھی راہ پر رکھے اور اس کی مشکلات آسان کرے۔ صرف اسے ہی کیوں بلکہ ان تمام عورتوں اور مردوں کو سیدھی راہ دکھائے جو اپنی غلط سوچ کے سبب اپنے ہی خاندان سے دور ہو گئے ہوں اور اپنی راستوں پر بھٹک رہے ہوں۔

ماما زیوائے

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم

میری زندگی کسی ناول یا فلم سے کم نہیں۔ ایسے ایسے موڑ آئے ہیں کہ جب میں غور کرتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں کہ یہ سب میرے ساتھ رونما ہوا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کریں اگر سرگزشت کے معیار کی یہ تو اسے شاملِ اشاعت بھی کرلیں۔

مسز فواد

(اسلام آباد)

رات کے آٹھ بج رہے تھے لیکن فرحانہ کو نیند نہیں آتی تھی۔ وہ عموماً جو بچے سے پہلے ہی گھر آجاتا تھا اور اگر کسی دیر ہو جاتے تو بچے فون کر کے بتادیتا تھا لیکن اس روز نہ جانے کیا بات ہوئی کہ اس نے فون کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ باہر بارش بھی زوروں پر تھی اور ایسے موسم میں بجلی چلا جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے جنم لے رہے تھے۔ باہر گلی کُتّی یا بادل

کی کھاتا۔ اسے ٹیلی ویژن دیکھنے کا بہت شوق تھا اور کھانے ہی کے بعد بھی وہ دو تین گھنٹے مختلف اسپورٹس چینل پر اپنے پسندیدہ پروگرام دیکھا کرتا۔

فرہاد میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ شادی کے چھ سال بعد ہی میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ وہ ایک بینک میں منیجر تھے۔ اچھے عہدے پر فائز تھے اور میں بھی ایم ایس سی کرنے کے بعد ایک کالج میں لیکچرار لگ گئی تھی۔ شادی کے بعد شوہر نے اصرار کیا کہ ملازمت چھوڑ دوں لیکن میں نہ مانی۔ اچھی بھلی سرکاری نوکری تھی۔ اسے چھوڑ دینا کفرانِ نعمت ہوتا۔ لہٰذا میں نے منت سماجت کر کے انہیں راضی کرلیا۔ شادی کے ایک سال بعد فرہاد پیدا ہوا تو یہ مسئلہ ایک بار پھر کھڑا ہوگیا۔ اس بار وہ بچے کو ٹی رعایت دینے پر تیار نہیں تھے لیکن اللہ بھلا کرے میری ساس کا۔ انہوں نے اس موقع پر میرا پورا ساتھ دیا اور بچے کو سنبھالنے کی ذمہ داری قبول کرلی۔ مجھے تین مہینے کی چھٹی کرنا پڑی اور ان دنوں میں نے ایک آیا کا بندوبست کرلیا تاکہ گھر فرہاد کی دیکھ بھال کرے۔ ساس کا کام صرف اس کی نگرانی کرنا ہوتا تھا۔ ویسے بھی میں ایک ڈیڑھ بجے بے کھٹکے گھر واپس آجاتی تھی اس لیے یہ مرحلہ بھی آسانی سے طے ہوگیا۔

زندگی اچھی بھلی گزر رہی تھی کہ اچانک ہی خزاں نے میرے آنگن میں ڈیرے ڈال دیے۔ میں وہ شام کبھی نہیں بھولوں گی جب میری زندگی کا سامنی کالج سے واپسی کا شکار ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس روز میرا دل صبح سے ہی بے چین تھا۔ بڑے برے خیالات آرہے تھے۔ میں نے فواد کی طرف دیکھا اور حسبِ معمول خوشگوار موڈ میں دفتر جانے کی تیاری کررہے تھے۔ میں بچے اپنی پوری زندگی میں اتنا سلیقہ مند اور نظم و ضبط کا پابند شخص نہیں دیکھا۔ عام شہروں کی طرح وہ اپنی چیزوں کے لیے آواز نہیں دیتے تھے اور انہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون سی چیز کہاں رکھی ہے۔ وہ عموماً سوٹ کو ہی کپڑے استری کرلیتے، جوتوں پر پالش کرتے اور اپنا بریف کیس بھی تیار کرلیتے۔ صبح اٹھ کر انہیں صرف شیو، غسل اور ناشتا کرنا ہوتا، اسی دوران میں وہ سرسری طور پر اخبار کی سرخیاں بھی دیکھتے اور ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دفتر کے لیے روانہ ہوجاتے۔

اس روز بھی میں نے معمول کے مطابق ان کے لیے ناشتا بنایا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ آج آپ دفتر نہ جائیں؟“

”کیوں؟“ وہ چونکتے ہوئے بولے۔ ”کوئی کام ہے کیا؟ کہیں جانا ہے؟“

”نہیں۔ کوئی کام نہیں ہے اور نہ ہی کہیں جانا ہے۔“

”پھر میں کیوں چھٹی کروں؟“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔

”میں نہیں چاہتی کہ آج آپ دفتر جائیں۔ نہ جانے میرا دل کیوں گھبرا رہا ہے۔ عجیب عجیب خیالات آرہے ہیں۔“

”بعض اوقات بدہضمی کی وجہ سے بھی ایسا ہوتا ہے۔ شاید رات زیادہ کھالیا ہوگا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولے۔

”مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ اچھا بھلا تو ہوں تم اپنے بارے میں دیکھو بے کیک کھڑا ہوا ہے تو بلڈ پریشر ہائی ہوگا۔ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنا بریف کیس سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے حسبِ عادت ہوتے ہوئے فرہاد کی پیشانی کو پیار سے چوما اور چلے گئے۔ میں بوجھل دل سے انہیں رخصت کرتی رہی۔ اس وقت تک فرہاد کی آیا بھی آچکی تھی۔ میں نے اسے معمول کے مطابق ہدایات دیں اور کالج جانے کے لیے تیار ہونے لگی۔ میرا پیریڈ ساڑھے نو بجے لگتا تھا۔ اس لیے آرام سے تیار ہوتی رہی۔ دس بجے وین والا نہ آتا تھا اور میں پندرہ منٹ میں کالج پہنچ جاتی تھی۔ اس دن اتفاق سے میرا ایک ہی پیریڈ تھا۔ اس لیے پرنسپل سے اجازت لے کر نکلنے کے ذریعے گھر آگئی۔ شام تک میں نے اپنے آپ کو مختلف کاموں میں مصروف رکھنا چاہا لیکن دل کسی طرح قابو میں نہیں آرہا تھا۔ بے چینی میری ضعیرات بڑھتی جارہی تھی۔ لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔

بالآخر وہ منحوس گھڑی آگئی جس نے مجھے صبح سے ہی خبردار کیا تھا۔ ساڑھے پانچ بجے کا وقت ہوگا جب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں باورچی خانے سے اٹھنے کو تھی کہ دوبارہ گھنٹی بجی۔ کسی کا فون ہو سکتا ہے، ذہن کو یہ نہیں سوجھا۔ یہ تو ان کے گھر آنے کا وقت تھا۔ میں نے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے ریسیور اٹھایا اور بولی۔ ”ہیلو۔“

دوسری طرف سے مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔

”کیا سنوفر اہل رہی ہیں؟“

”جی ہاں! میں سنوفر اہی ہوں۔“

”محترمہ میں ..... اسپتال سے بول رہا ہوں آپ

کے شوہر کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ آپ فوراً اسپتال آجائیں۔“

یہ سنتے ہی مجھے زور کا چکر آیا اور ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اگر فوراً ہی صوفے کا سہارا نہ لیتی تو میں فرش پر گر چکی تھی۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ چیخ کی آواز سن کر میری ساس اور دیور فراز دوڑتے ہوئے آئے اور دونوں ہی میری حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ میں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں انہیں حادثے کے بارے میں بتایا تو فراز فوراً ہی دروازے کی طرف دوڑا، میں بھی اس کے ساتھ اسپتال جانا چاہ رہی تھی لیکن امی نے مجھے روک دیا اور فراز اکیلا ہی اپنی گاڑی پر اسپتال کے لیے روانہ ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی مصلّی بچھا کر بیٹھ گئی اور اللہ تعالیٰ سے اپنے سہاگ کی سلامتی کی دعا مانگنے لگی۔ ایک گھنٹا گزرا، پھر دو گھنٹے گزر گئے لیکن فراز کا کہیں کوئی فون کال نہیں آیا۔ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی پھر اعصاب پر ٹیلی فون کی گھنٹی کی زوردار آواز سے بجلی سی کوند گئی۔ میں دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگی تو ٹرک ایسوسی ایٹ سے اسٹیج کا تار دیکھا۔ الٰہی کا چہرہ سفید چادر سے ڈھاپ دیا گیا تھا۔ میں اسٹریچر کی طرف لپکی لیکن فراز نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور بولا۔ ”بھابی! اندر جانیں بھائی جان اب اس دنیا میں نہیں رہے۔“

تین دن تک مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ میں نہیں جانتی کہ اس دوران کون آیا اور کون گیا۔ لوگ آئے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے، تسلی دلاسے دیتے اور چلے جاتے۔ ہمدردی کے یہ بول میرے دکھ کا مداوا نہیں ہوسکتے تھے۔ میرے سامنے پہاڑ سی زندگی تھی اور ذہن میں ایک ہی سوال گردش کررہا تھا۔ اب کیا ہوگا۔ پانچ سال فرہاد کو سمجھتی تو کچھ سمجھ نہ آتا تھا۔ اس غریب نے دیکھا ہی کیا تھا کہ باپ کی شفقت سے محروم ہوگیا۔ ہر آنے والے کی زبان پر ایک ہی جملہ ہوتا۔ ”اب اس کی پوری ذمہ داری تم پر ہے بہن ماں اور باپ دونوں کا فرض نبھانا ہے۔“ یہ سوچ جیسے میرے تن بدن میں آگ لگا دیتی۔ کیا میں نہیں جانتی تھی کہ فرہاد کی پوری ذمے داری میرے ہی ناتواں کندھوں پر آن پڑی ہے۔ میں نے بھی تہیہ کرلیا کہ فرہاد ہی میری زندگی ہے۔ اسے ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردوں گی۔

اس حادثے کے بعد میں فرہاد کا سایہ بن کر رہ گئی۔ چالیس دن گزر گئے تو ایک بار پھر سب مرحوم کو بھولنے میرے ماں باپ اور بڑے بھائی بھی آئے ہوئے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ یہ میٹنگ کس مقصد سے ہورہی تھی۔ میں سب لوگوں کے لیے چائے لے کر آئی تو ساس صاحبہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پاس بٹھا لیا اور شفقت سے بولیں۔ ”بیٹی ہم جو بات کرنے جارہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ تمہیں اچھی نہ لگے۔ یہ صرف تمہارا شوہر ہی نہیں بلکہ میرا بیٹا اور فراز کا بھائی بھی تھا لیکن ہم اسے نہیں لاسکتے۔ اب اسے میرے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اب تمہیں اکیلے کی طرف دیکھنا چاہیے۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ تمہید کس لیے باندھ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتی، انہوں نے دوبارہ بولنا شروع کردیا۔ ”دیکھو بیٹی! میں ہوں کسی اپنی منزل کے مسافر ہیں۔ میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ کسی وقت بھی بلاوا آسکتا ہے۔ فراز بھی امریکا جارہا ہے۔ اس کی تیاری مکمل ہوچکی ہے۔ وہ صرف بھائی کے انتقال کے باعث رک گیا تھا۔ وہ دونوں کے بعد بالکل تنہا رہ جاؤ گی۔ بیٹے میں بھی تم زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتیں۔ جب تک ماں باپ زندہ ہیں وہ تمہیں مکمل بھلا چنگا بنا کر رکھیں گے۔ اس کے بعد.....“ وہ کہتے کہتے رک گئیں پھر بولیں۔ ”معاف کرنا بیٹی عورت اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہے۔“

”تو کیا یہ میرا گھر نہیں رہا؟“ میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔

”لاحول ولا۔ بیٹی۔ تم غلط سمجھ رہی ہو میرا مطلب تھا.....“

شاید وہ اپنی بات کہنے کی ہمت نہیں کر پا رہی تھیں۔ انہوں نے ابو کی طرف دیکھا تو وہ کافی صاف کرتے ہوئے بولے۔ ”بیٹی ہم چاہتے ہیں کہ تم عقد ثانی کرلو۔ تمہیں اور تمہارے بیٹے کو ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ دیکھو بیٹی اس معاشرے میں عورت کے لیے تنہا رہنا بہت مشکل ہے۔“

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔ میں نے بے یقینی سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کیا آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ابھی تو میرے سر سے شوہر کا غم ہی مٹا نہیں ہے اور آپ لوگوں کو میری شادی کی فکر پڑ گئی۔“

”بیٹی میں ہوں اور آپ لوگوں کو میری شادی کی فکر پڑ گئی۔“

”نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ ابھی تین سال چھ مہینے بعد میں

بارے میں ضرور سوچا ہوگا۔" ابو نے کہا۔

"سال چھ مہینے تو دور کی بات ہے اگر لوگ میرا فیصلہ ابھی سن لیں۔ میں ساری عمر دوسری شادی نہیں کروں گی چاہے بڑی سے بڑی تباہت آجائے۔ اپنے بیٹے پر سوتیلے باپ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔"

"خیر جیسے تمہاری مرضی اس وقت تم رشتوں اور غصے کی کیفیت میں ہو۔ ہم پھر بھی اس موضوع پر بات کریں گے۔" ابو آہستہ سے بولے۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے گرج دار آواز میں کہا۔ "اگر کسی نے دوبارہ یہ بات کی تو اس سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرلوں گی اور پھول جاؤں گی کہ میرا آپ سے کوئی رشتہ ہے۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ سب لوگوں نے چائے پی اور رخصت ہوگئے۔ ان کے جانے کے بعد ساس صاحبہ نے کہا۔ "تم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اچھا لیکن اس کے علاوہ بھی کچھ مسائل ہیں جن پر ہمیں بات کرنا ہوگی۔ تم سن رہی ہو نا بیٹی؟"

"جی ماں، آپ کہیں۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"فراز تو چند روز بعد چلا جائے گا۔ اس کے بعد ہم دونوں کو ہی سب کچھ دیکھنا ہے، تم کیل بینک، جگی چاؤ اور معلوم کرو کہ فواد کے اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے۔ کیونی کی طرف سے اس کے واجبات کا چیک آگیا ہے۔ وہ بھی اس اکاؤنٹ میں جمع کروا دینا۔ ذہنہ جنریشن بن جائے تو انشورنس کلیم بھی داخل کروا ہوگا۔ فراز کی گاڑی تو اس جیسی نہیں رہی کہ اس کی مرمت ہوسکے اگر کوشش بھی کی جائے تو کیونی سے اس کی جگہ دوسری گاڑی مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ تم فراز کی الماری بھی دیکھو کہ بینک اکاؤنٹ کے علاوہ بھی کیا اس نے چھپا رکھا ہے۔ انویسٹ کرسکتی ہے۔"

مجھے اپنی ساس کی باتیں سن کر حیرت ہوئی۔ وہ کتنے احسن طریقے سے میری رہنمائی کررہی تھیں ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اپنی ذمہ داری سے ہی سارے اخراجات پورے کرنا ہوں گے۔ میں نے ذہرے ذہرے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک بات اور آئی ہے اگر آپ اور کوئی پاور آف اٹارنی لکھ دیں اور آئی ہے تو ہمیں ہر ماہ ایک معقول آمدنی ہوسکتی ہے۔"

"اچھا خیال ہے لیکن اس کے لیے فراز کا مشورہ کرنا ضروری ہے۔"

فراز کو اس تجویز پر اعتراض تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کرایہ دار بہت تنگ کرتے ہیں اگر کوئی قبضہ کرکے بیٹھ گیا تو آپ دونوں پریشان ہوجائیں گی۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" میں نے کہا۔ "میری ایک کولیگ کو مکان کی ضرورت ہے۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ شریف خاندان کی ہیں۔ ان کے شوہر بھی سرکاری ملازم ہیں۔ ہمیں ان سے کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"دیکھ لیں۔ جیسے آپ کی مرضی۔" فراز نے کہا۔

آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہوگیا۔ انشورنس کی رقم مل گئی اور کمپنی نے دوسری گاڑی بھی دے دی۔ میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے ساس صاحبہ کی اور تو گاڑی چلا کر کالج جانے لگی۔ فراز اور اسکول چھوڑنی اور واپسی میں ساتھ لے آتی۔ آصفہ باجی میرے ساتھ ہی آگی جاتی تھیں۔ ان کے دو بچے اور دو لڑکیاں تھیں۔ وہ لڑکے ہم عمر ہی تھے۔ ان لڑکوں کے آجانے سے میری تنہائی بھی ختم ہوگئی تھی۔ اب فراز اسکول جانے لگا تھا اور مجھے آیا کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے اس سے ساس صاحبہ کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں کے لیے رکھ لیا۔ فواد کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ سالوں کے لیے فکر نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ کافی تعداد میں انہوں نے شیئرز، بانڈز اور سیونگ سرٹیفکیٹ خریدے گئے تھے جن سے معقول منافع مل رہا تھا۔ فراز نے بھی پیسے بچھا کر بڑھاوے کردیے تھے۔ وہ میں ساس صاحبہ کے حوالے کردیتی کیونکہ ان کا حق زیادہ تھا۔

مجھے مالی طور پر اطمینان ہوا تو میں نے پوری توجہ اپنے بیٹے پر مرکوز کردی۔ اب وہی میری اُمیدوں کا مرکز تھا۔ میں نے ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جن بچوں کے باپ نہیں ہوتے۔ ان کی شخصیت تباہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ کسی بھی ماں کے لیے یہ بھی کتنی کڑی آزمائش ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی سرگرمیوں اور گھر سے باہر جانے والی حرکت پر نظر رکھ سکے۔ ان لڑکوں کے باپ ماں کو بے وقوف بنانے کے لیے سو بہانے ہوتے ہیں۔ مثلاً کھیل میں ایکسٹرا کلاسز ہورہی ہیں۔ دوست کے گھر جانا ہے۔ ہم کمبائنڈ اسٹڈی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کالج کے گیٹ کے باہر چھٹی کے وقت کئی آوارہ لڑکے منڈلا رہے ہوتے تھے تاکہ لڑکیوں کو چھیڑا کریں اور ان پر آوازے کسیں۔ میں اس طرح کے تماشے

روز دیکھا کرتی تھی۔ اب مجھے ماں کے ساتھ باہر کا رول بھی ادا کرنا تھا تاکہ کسیر اپنا ایمیج ان خرافات سے محفوظ رہے۔

میں نے شروع دن سے ہی اس پر کڑی نگرانی رکھی۔ اسی لیے اپنے ساتھ اسکول لے کر جاتی اور واپس لاتی تاکہ وین میں دوسرے بچوں سے اس کا سیل جول نہ ہو۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ اس کے اسکول ضرور جاتی اور پرنسپل سے لے کر کلاس ٹیچر تک سے اس کی پروگریس کے بارے میں سوالات کرتی۔ ساتھ میں یہ فکر بھی دامن گیر رہتی کہ اس کا دوسرے لڑکوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کیسا ہے۔ تھوڑے کے بعد بھی میں اس کے ساتھ چلتی رہتی۔ میں نے اس کا ایک ٹائم ٹیبل بنا رکھا تھا کہ جس میں اس کے سونے، کھانے، پینے، پڑھنے، کھیلنے، ٹی وی دیکھنے کے اوقات مقرر تھے۔ وہ جب ٹی وی دیکھتا تو اس کے پاس بیٹھی رہتی کہ وہ بلاوجہ چینل نہ بدلتا رہے۔

پانچ سال بعد وہ میرے اشاروں پر چلتا رہا۔ اب مجھے اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گھڑی کی سوئی کے مطابق سارے کام کرلیتا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں کے برابر تھی۔ وہ اپنی دنیا میں مگن ہوگیا تھا۔ میں اسے اپنے ساتھ بازار لے کر جاتی اور اس کی پسند کی چیزیں اسے خرید کر دیتی۔ ایک دن اس نے کرکٹ بیٹ کی فرمائش کی تو میں چونک گئی اور اسے چیرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم بیٹ کا کیا کرو گے؟"

"کھیلوں گا۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیکن کس کے ساتھ کھیلو گے۔ ارسلان اور ارشد (اوپر والوں کے لڑکے) تو تمہارے گروپ کا حصہ نہیں ہیں اور ہمارے گھر میں اتنی جگہ بھی نہیں ہے کہ وہاں کرکٹ کھیل جاسکے۔"

"اوہ مما! آپ بھی بہت بھولی ہیں میں گھر میں نہیں بلکہ گراؤنڈ میں جاکر کھیلوں گا۔ وہ جو خالی جگہ ہے کچھ بیچے ہے، ہمارا دوست راشد بھی وہاں کھیلتا ہے۔ اس نے کہہ تھا کہ وہ بھی اپنی بیٹ لائے گا۔"

وہ صحیح ہی کہہ رہا تھا۔ میں اسے کھیلنے سے منع کردیتی یا اس کی فرمائش پوری نہ کرتی۔ میں نے اسے ایک چھوٹی سی دلوا دی اور ساتھ ہی رنگین گیند، جوتے، موزے، گلوز اور کیپ بھی لے کر دیا۔ میں یہ بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی کہ وہ پتلون پہن کر کھیلنے جائے اور گراؤنڈ میں ننگے پیر دوڑتا رہے۔ وہ یہ چیزیں لے کر خوش ہوگیا۔ میں نے بھی اپنے دل کو تسلی دی کہ اگر وہ کھناؤنا پن محسوس کرے گا تو کوئی قباحت نہیں آجائے گی۔ میں خود کسی روز گراؤنڈ میں جاکر دیکھوں گی کہ وہ کن لڑکوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

اب میں نے اس کے ٹائم ٹیبل میں ترمیم کردی تھی۔ پانچ بجے وہ ایک گھنٹے کے لیے کھیلنے جاتا۔ میں نے اسے تاکید کررکھی تھی کہ وہ ہر صورت میں مغرب کی اذان سے پہلے گھر آجائے۔ اس نے میرا یہ حکم بھی بلا چوں چرا مان لیا اور پھر تو اسے اس ٹائم ٹیبل پر عمل کرنے لگ گیا۔ میں نے اسے گراؤنڈ میں جانے کی اجازت تو دے دی تھی لیکن دل میں وسوسے مستقل چبھن تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوتا تو تیسرے یا چوتھے روز شاپنگ کے بہانے گھر سے نکلتی اور باہر کا ایک چکر لگا کر آتا شاپنگ کی۔ اس وقت اتفاق سے فراز بھی بینک اکاؤنٹ کھلوانے گیا تھا اور اس نے پیدل آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی آگی جاتی تھیں۔ ان کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ وہ لڑکے ہم عمر ہی تھے۔ ان لڑکوں کے آجانے سے میری تنہائی بھی دور ہوگئی تھی۔ اب فراز اسکول جانے لگا تھا اور مجھے آیا کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں نے اسے ساس صاحبہ کی دیکھ بھال اور گھر کے کاموں کے لیے رکھ لیا۔ فواد کے بینک اکاؤنٹ میں اتنی رقم جمع ہوگئی تھی کہ سالوں کے لیے فکر نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ کافی تعداد میں انہوں نے شیئرز، بانڈز اور سیونگ سرٹیفکیٹ خرید رکھے تھے جن سے معقول منافع مل رہا تھا۔ فراز نے بھی پیسے بچا بچا کر بڑھاوے کردیے تھے۔ وہ میں ساس صاحبہ کے حوالے کردیتی کیونکہ ان کا حق زیادہ تھا۔

مجھے مالی طور پر اطمینان ہوا تو میں نے پوری توجہ اپنے بیٹے پر مرکوز کردی۔ اب وہی میری اُمیدوں کا مرکز تھا۔ میں نے ایک اچھا اور کامیاب انسان بنانا چاہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ جن بچوں کے باپ نہیں ہوتے۔ ان کی شخصیت تباہ ہوکر رہ جاتی ہے۔ کسی بھی ماں کے لیے یہ کتنی کٹھن گھڑی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کی سرگرمیوں اور گھر سے باہر جانے والی حرکت پر نظر رکھ سکے۔ ان لڑکوں کے باپ ماں کو بے وقوف بنانے کے لیے سو بہانے ہوتے ہیں۔ مثلاً کھیل میں ایکسٹرا کلاسز ہورہی ہیں۔ دوست کے گھر جانا ہے۔ ہم کمبائنڈ اسٹڈی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کالج کے گیٹ کے باہر چھٹی کے وقت کئی آوارہ لڑکے منڈلا رہے ہوتے تھے تاکہ لڑکیوں کو چھیڑا کریں اور ان پر آوازے کسیں۔ میں اس طرح کے تماشے

ہوئے بولا۔ ''اوہ مما، یو آر سو گریٹ۔''

میں نے لوہا گرم دیکھ کر چوٹ لگائی اور بولی۔ ''بیٹا میں کل تم لوگوں کو کھیلتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ تم تو اچھی خاصی بیٹنگ کر لیتے ہو لیکن دوسرے لڑکوں کا لیول کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔ وہ نہ تو ٹھیک طرح سے گیند کر رہے تھے اور نہ ہی ان سے فیلڈنگ ہو رہی تھی۔ اس طرح تو تمہارا کھیل بھی خراب ہو جائے گا۔ تم کوئی اکیڈمی کیوں نہیں جوائن کر لیتے۔''

''اوہ مما! وہاں کی تو فیس بہت زیادہ ہوتی ہے؟''

''کوئی بات نہیں۔ کم از کم تم اچھے ماحول میں کچھ سیکھ تو سکو گے؟''

دوسرے روز میں اسے اپنے ساتھ گھر کے قریب واقع ایک اکیڈمی میں لے گئی جہاں ایک سابق کرکٹر لڑکوں کی کوچنگ کر رہے تھے۔ مجھے وہاں کا ماحول بہت پسند آیا۔ سب لڑکے رنگین کٹ میں ملبوس تھے اور کوچ کی زیر نگرانی بیٹنگ بولنگ اور فیلڈنگ کر رہے تھے۔ میں نے فارم بھرا، مقررہ فیس ادا کی اور اس طرح فرہاد نے اکیڈمی جوائن کر لی۔

زندگی اپنی ڈگر پر گزر رہی تھی۔ فرہاد پوری طرح میرے قابو میں تھا اور ایک روبوٹ کی طرح میرے اشاروں پر چلتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے اپنا ذہن و دل میرے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ اس کی اپنی کوئی سوچ نہیں تھی اور وہ ہر کام مجھ سے پوچھ کر کیا کرتا۔ نویں جماعت کے رجسٹریشن فارم بھرنے کا وقت آیا تو وہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''مما! آپ بتائیں کہ اس میں کیا بھرنا ہے؟''

میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے کیا پوچھ رہے ہو؟ کیا تمہیں اپنا نام، باپ کا نام، گھر کا پتا اور مضامین کے بارے میں علم نہیں؟''

''مجھ سے کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ آپ بولتی جائیں۔ میں لکھتا رہوں گا۔''

اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ فرہاد میں خود اعتمادی کی بہت کمی ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی اور وہ پوری طرح مجھ پر انحصار کر رہا تھا۔ میں نے یہ مسئلہ اپنی ساس کے سامنے رکھا تو انہوں نے بھی مجھے ہی الزام دیا اور بولیں۔ ''یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ تم نے اسے پوری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ اسے ہلنے جلنے کی بھی آزادی نہیں۔ پھر بھلا اس میں خود اعتمادی کہاں سے آئے گی؟''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ میں نے آہستہ آہستہ اپنا شکنجہ ڈھیلا کرنا شروع کر دیا لیکن شاید دیر ہو چکی تھی اور وہ ان پابندیوں کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب ایک روز اسے اپنے ساتھ شاپنگ کے لیے لے گئی۔ اس کے لیے کچھ کپڑے خریدنا تھے۔ میں نے سیلز مین سے کہا کہ وہ کچھ شرٹس اور پینٹس دکھائے۔ اس نے چند ہی منٹ میں ڈھیروں قمیص اور پتلونیں سامنے لا کر رکھ دیں تو میں نے فرہاد سے کہا کہ وہ اپنی مرضی اور پسند کے مطابق کپڑوں کا انتخاب کرے۔ تو اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مما میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ بتائیں کون سا رنگ اچھا رہے گا۔''

اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ جیسے تیسے شاپنگ مکمل کی اور گھر آ گئی لیکن میرے دل میں ایک پھانس چبھ کر رہ گئی۔ وہ واقعی ماماز بوائے بن چکا تھا۔ اس کا ہر جملہ آپ بتائیں سے شروع ہوتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی مرضی تھی نہ کوئی پسند۔ وہ ہر کام مجھ سے پوچھ کر کیا کرتا۔ میٹرک کے بعد کالج میں داخلے کا مرحلہ آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ وہ مستقبل میں کیا بننا چاہتا ہے۔ اس نے حسب عادت کہا ''آپ بتائیں''۔ مجھے غصہ آ گیا میں جھنجلاتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری اپنی بھی کوئی مرضی ہے یا ہر کام مجھ سے پوچھ کر ہی کرو گے۔''

وہ میرے غصے سے ڈر گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔''

''اونہہ!'' میں منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''آج کل ڈاکٹروں کو کون پوچھتا ہے۔ ہاؤس جاب کے بعد بھی نوکری کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ سرکاری ملازمت ملتی نہیں اور پرائیویٹ والے آٹھ دس ہزار سے زیادہ نہیں دیتے۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں کامرس میں داخلہ لینا چاہیے۔ ایم بی اے کرنے کے بعد کسی بھی ملٹی نیشنل کمپنی میں بہت اچھی جاب مل جائے گی۔''

''جیسے آپ کی مرضی۔'' اس نے ایک بار پھر میرے آگے سر جھکا دیا لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ اگر اپنی ہی مرضی چلانی تھی تو مجھ سے کیوں پوچھا؟

اب اس نے اکیڈمی جانا بھی چھوڑ دیا تھا اور پوری طرح پڑھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ کامرس کی پڑھائی بہت سخت ہوتی ہے۔ اس لیے اکیڈمی نہیں جا رہا۔ ویسے بھی مجھے کون سا ٹیسٹ کرکٹر بننا

ہے۔ اصل وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ ان کی ٹیم کوئی ٹورنامنٹ کھیلنے لاہور جا رہی تھی لیکن فرہاد نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ مما اجازت نہیں دیں گی۔ اس پر لڑکوں نے اس کا خوب مذاق بنایا اور ماماز بوائے کا خطاب دے ڈالا، اسی لیے اس نے اکیڈمی جانا چھوڑ دیا تھا۔

فرہاد کو کالج میں داخلہ لیے چند ماہ ہی ہوئے تھے کہ میری ساس کا انتقال ہو گیا۔ اس سے پہلے میری امی اور ابو بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ بھائی اپنے حال میں مست تھے اور میرا دیور فراز امریکی شہریت اختیار کر چکا تھا۔ اس دوران وہ صرف ایک مرتبہ پاکستان آیا اور شادی کر کے بیوی کو ساتھ لے گیا۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ اکثر فون پر میری خیریت پوچھتا رہتا تھا۔ اب گھر میں صرف میں اور فرہاد رہ گئے تھے۔ آیا کو میں نے ابھی تک ساتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے بہت ڈھارس تھی۔ فرہاد اب بھی میرے ساتھ ہی کالج جاتا۔ واپسی پر میں اسے پک کیا کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کئی دفعہ کہا کہ واپسی میں سیدھی گھر چلی جایا کروں لیکن مجھے گوارہ نہیں تھا کہ تپتی دوپہر میں میرا بچہ بسوں کے دھکے کھاتا ہوا آئے۔

میرے بیٹے نے بہت اچھے نمبروں سے انٹر کامرس کا امتحان پاس کیا اور اس کا بہ آسانی آئی بی اے میں داخلہ ہو گیا۔ جہاں بھی میری ہٹ دھرمی قائم رہی۔ اس کے کئی دوست ایک مشہور پرائیویٹ یونیورسٹی میں داخلہ لے رہے تھے۔ فرہاد کی بھی خواہش تھی کہ وہ ان کے ساتھ پڑھے لیکن میں نے اسے آئی بی اے کے ٹیسٹ میں بٹھا دیا اور اس نے ایک بار پھر میری خواہش کے آگے سر جھکا دیا لیکن اب اس کے لیے آنے جانے کا مسئلہ پیدا ہو گیا تھا کیونکہ اس کی کلاسوں کے اوقات بالکل مختلف تھے اور میرے لیے اسے ساتھ لے جانا اور واپس لانا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسے اپنی گاڑی دینا چاہی لیکن وہ نہ مانا۔ مجبوراً میں نے اسے ایک بائیک لے کر دے دی تاکہ اسے آنے جانے میں کوئی تکلیف نہ ہو لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی عائد کر دی کہ وہ کالج سے سیدھا گھر آئے گا۔ اس نے ماماز بوائے ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے یہ شرط بھی قبول کر لی۔

وقت تیزی سے پر لگا کر اڑتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے فرہاد نے ایم بی اے کر لیا اور اسے میری خواہش کے مطابق ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت بھی مل گئی لیکن وہ ماماز بوائے ہی رہا۔ اس کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ جب اسے پہلی تنخواہ کا چیک ملا تو وہ میرے پاس آ کر بولا۔ ''مما یہ رکھ لیں۔''

''یہ کیا ہے؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ یہ چیک مجھے کیوں دے رہا ہے۔

''مما مجھے تنخواہ ملی ہے۔ یہ اسی کا چیک ہے۔''

''یہ چیک تم مجھے کیوں دے رہے ہو۔ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کروا دو۔''

''میرا تو کوئی اکاؤنٹ ہی نہیں ہے۔'' وہ معصومیت سے بولا۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے کل صبح میرے ساتھ بینک چلنا۔ میں تمہارا اکاؤنٹ کھلوا دوں گی۔''

عملی زندگی میں آنے کے بعد بھی اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ صبح دفتر جاتا اور چھٹی ہوتے ہی شام کو گھر آ جاتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں تھا اور نہ ہی وہ کہیں گھومنے جاتا تھا۔ گھر واپس آنے کے بعد اس کا سارا وقت میرے ساتھ ہی گزرتا۔ ابھی تک وہ اپنے کپڑوں، جوتوں اور دیگر ضرورتوں کے لیے میرا محتاج تھا اور میں ہی اس کے لیے سب چیزوں کا بندوبست کرتی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ اپنی مرضی سے بھی کچھ کرے لیکن وہ ہر کام کے لیے میری طرف ہی دیکھتا تھا۔ ایک دفعہ اس کے دفتر میں کسی غریب آدمی کی بیٹی کی شادی تھی۔ سب لوگ اس کے لیے پیسے جمع کر رہے تھے لیکن فرہاد اپنے طور پر فیصلہ نہ کر سکا کہ اسے اس نیک کام میں کیا دینا چاہیے۔ شام کو اس نے ڈرتے جھجکتے یہ مسئلہ میرے سامنے رکھا اور بولا۔ ''مما آپ ہی بتائیں کتنے پیسے دوں؟''

مجھے غصہ آیا اور ساتھ ہی ہنسی بھی چھوٹ گئی۔ ''مجھ سے پوچھ رہے ہو جو تمہارا دل چاہے دے دو۔''

''دس ہزار دے دوں؟''

''ہاں ضرور اس نیک کام میں کنجوسی نہیں کرنی چاہیے۔''

اس طرح کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے۔ مجھے تو ڈر لگنے لگا کہ یہی حال رہا تو کسی دن وہ واش روم بھی مجھ سے پوچھ کر جائے گا۔ میں اسے اس خول سے باہر نکالنا چاہ رہی تھی لیکن اس نے اپنے آپ کو جن دیواروں میں قید کر لیا تھا انہیں توڑنا اتنا آسان نہیں تھا۔ ایک دن رات کے کھانے پر میں نے اس سے کہا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم دفتر سے آنے کے بعد گھر میں ہی رہتے ہو۔ نہ کہیں جاتے

ہو۔ نہ کسی سے فون پر بات کرتے ہو۔ یہ ٹھیک نہیں ہے بیٹا۔ آج کل تو لڑکیاں بھی اس طرح گھر میں بند ہو کر نہیں بیٹھتیں۔ کبھی کبھار کہیں چلے جایا کرو اس طرح تمہاری طبیعت بھی بہل جائے گی۔"

"مما آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے اور نہ ہی مجھے فالتو گھومنا پھرنا پسند ہے۔"

"اس شہر میں تمہارے ماموں اور خالہ بھی رہتی ہیں۔ انہی کے گھر چلے جایا کرو۔ ان کے بچوں کے ساتھ تمہارا اچھا وقت گزر جائے گا۔"

"جی اچھا۔" اس نے حسبِ معمول سر جھکاتے ہوئے کہا۔

اگلے روز اتوار تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہو کر مہینے بھر کی خریداری کی فہرست بنا رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فرہاد کے ساتھ سپر اسٹور جا کر پورے مہینے کا سامان خرید لوں کہ بالکل اچانک ہی گیارہ بجے کے قریب میری سوتیلی بہن ناہید اپنی بیٹی نائلہ کے ہمراہ بن بلائے مہمان کی طرح نازل ہوگئی۔ میں نے ہمیشہ اس سے فاصلہ رکھا اور ہمارا بہت کم ملنا جلنا ہوتا تھا۔ خدانخواستہ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن اس کی عادتوں کی وجہ سے میں نے اس سے دور رہنے میں ہی بہتری سمجھی۔ میں اس کے یہاں خاص خاص موقعوں پر جاتی تھی جب کہ وہ موقع بے موقع منہ اٹھائے میرے پاس آجاتی تھی۔ دراصل اس کی کچھ حرکتیں مجھے سخت ناپسند تھیں۔ اس نے ہمیشہ میری تقلید کی۔ کپڑوں، جوتوں، ہیئر اسٹائل ہر چیز میں وہ میری نقل کرتی۔ البتہ دو چیزوں میں وہ مجھ سے پیچھے رہ گئی۔ میں نے ایم ایس سی کرلیا لیکن وہ میٹرک سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اسی طرح میری شادی فواد جیسے پڑھے لکھے خوش شکل اور اچھے عہدے پر فائز شخص سے ہوئی جب کہ اس کے حصے میں نعیم بھائی آئے جو شادی کے وقت کسی سرکاری محکمے میں کلرک تھے اور بیس سال میں ترقی کرتے کرتے بمشکل سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچ سکے۔ البتہ اوپر کی آمدنی ہونے کی وجہ سے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ اس نے فرہاد کی حرص میں اپنے بچوں کو بھی اچھے اسکولوں میں داخلہ دلوایا لیکن جس گھر میں حرام کی کمائی آرہی ہو گھر کے افراد رات کو دیر تک جاگتے اور صبح دیر تک سوتے ہوں۔ دن رات ٹی وی چلتا ہو بہانے بہانے تقریبات منعقد ہوتی ہوں اور رات کا کھانا اکثر باہر سے آتا

ہو۔ وہاں پڑھائی کا کیا کام۔ اسی لیے ناہید کا کوئی بھی بچہ انٹر سے آگے نہ پڑھ سکا۔ البتہ نائلہ نے بی اے کا پرائیویٹ امتحان دیا اور اتفاق سے پاس بھی ہوگئی۔

وہ پہلی بار ہمارے گھر آئی تھی۔ میں نے کافی عرصے بعد اسے دیکھا تھا۔ اچھی خاصی قبول صورت لڑکی تھی۔ اگر ڈھنگ کے کپڑے پہنتی تو اور اچھی لگ سکتی تھی لیکن اس نے تو عجیب حلیہ بنایا ہوا تھا۔ ٹی شرٹ اور ٹائٹ جینز میں وہ بالکل کارٹون لگ رہی تھی۔ دوپٹے کی بجائے اس نے گلے میں اسکارف ڈال رکھا تھا۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور کولڈ ڈرنک سے ان کی خاطر تواضع کی۔ فرہاد گھر پر ہی تھا۔ میں نے اسے بھی ڈرائنگ روم میں بلایا۔ وہ اس سے پہلے میرے ساتھ دو تین مرتبہ ناہید کے گھر جا چکا تھا لیکن نائلہ سے اس کا تعلق ہائے ہیلو سے آگے نہ بڑھ سکا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب اس نے فرہاد کو بڑی بے تکلفی سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ڈیئر کزن، تم پر کئی مٹھائیاں ڈیو ہیں۔ تم نے ایم بی اے کرلیا پھر جاب بھی ہوگئی لیکن ہم لوگوں کو پوچھا تک نہیں۔ بس انتظار ہی رہا کہ تم کوئی پارٹی وغیرہ دو گے۔"

فرہاد کے لیے یہ ایک غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ آج تک کسی لڑکی نے اس سے اس انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "مما بتائیں میں کیا جواب دوں۔"

میں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھ گئی اور اس کی طرف سے جواب دینے کا فریضہ مجھے ہی انجام دینا پڑا۔ میں نے نائلہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "پارٹی بھی ہوتی رہے گی لیکن آج میں تمہیں اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی مزے دار ڈش کھلاؤں گی کہ تم بازار کے کھانے بھول جاؤ گی۔"

"اوہ ونڈرفل، یو آر گریٹ۔" وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی پھر اس نے فرہاد سے کہا۔ "چلو، مجھے اپنا کمرا دکھاؤ، دیکھوں تو سہی کہ تمہارے پاس کیا کلیکشن ہے؟"

وہ توقع کر رہی تھی کہ فرہاد کے کمرے میں دیواروں پر فلم اسٹارز کے پوسٹرز لگے ہوں گے۔ ڈھیروں سی ڈیز ہوں گی۔ جدید ترین ساؤنڈ سسٹم اور ہوم تھیٹر ہوگا۔ فرہاد نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ "مما لے جاؤں۔"

میں اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے بولی۔ "ہاں فرہاد! تم نائلہ کو اپنا کمرا دکھاؤ۔ میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں۔"

میں یہ سوچ کر دل ہی دل میں ہنس رہی تھی کہ نائلہ کو فرہاد کے کمرے میں جا کر شدید مایوسی ہوگی کیونکہ اسے وہاں ایک لیپ ٹاپ کے علاوہ کچھ نہیں ملے گا۔ فرہاد کو بس پڑھنے کا شوق تھا۔ نہ فلمیں دیکھنے اور میوزک سننے کا۔ اس لیے اس کے کمرے میں سی ڈی اور کیسٹ کہاں سے آتے۔ میں نے ناہید کو بھی ساتھ لے لیا تاکہ کام کے ساتھ ساتھ ہم کچن ٹیبل پر بیٹھ کر باتیں بھی کرتی رہیں حالانکہ ہم دونوں کی ذہنی سطح میں نمایاں فرق تھا۔ ناہید کے پاس سوائے مہنگائی، فیشن اور گھر کی سجاوٹ کے علاوہ کوئی موضوع نہیں تھا جب کہ میں کالج کولیگز سے سیاست، حالاتِ حاضرہ اور سماجی مسائل پر گفتگو کیا کرتی تھی لیکن اس وقت وہ میری مہمان تھی اور اسے کمپنی دینا میرا فرض تھا۔

میرا خیال تھا کہ نائلہ پانچ دس منٹ بعد ہی کمرے سے بور ہو کر باہر آجائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا ان دونوں کی واپسی دو گھنٹے بعد ہوئی۔ نہ جانے اتنی دیر وہ کیا باتیں کرتے رہے۔ بہرحال کھانا لگ چکا تھا۔ سب نے مزے لے کر کھانا کھایا۔ ناہید حسبِ عادت مجھ سے کھانوں کی ترکیبیں پوچھتی رہی جب کہ نائلہ کھانے کی میز پر بھی فرہاد سے باتیں کرتی رہی اور وہ بے چارہ میری وجہ سے ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اچانک نائلہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

"آنٹی! آپ نے فرہاد کو اتنا پڑھایا لکھایا لیکن بولنا نہیں سکھایا۔ میں دس باتیں کرتی ہوں تو یہ ایک کا جواب دیتا ہے۔"

وہ اتنی بے تکلفی سے فرہاد کا ذکر کر رہی تھی جیسے بچپن سے دونوں ایک ساتھ کھیلتے آئے ہوں۔ میں اتنی دیر میں اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ بے حد چرب زبان اور باتونی ہے۔ اس لیے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ چلتے وقت اس نے فرہاد سے کہا۔ "ڈیئر کزن، کسی روز ہمارے گھر آؤ۔ میں تمہیں اپنی سہیلیوں سے ملواؤں گی۔ ہر وقت اپنے کزنز کا نام لے کر شیخی بگھارتی ہیں۔ ذرا انہیں بھی تو پتا چلے کہ میرا بھی ایک لائق فائق کزن ہے۔"

فرہاد نے ایک بار پھر میری طرف دیکھا تو میں بولی۔ "میں تو کل ہی اس سے کہہ رہی تھی کہ اپنی خالہ اور ماموں کے گھر چلے جایا کرو۔ اب تم نے کہہ دیا ہے تو یہ ضرور آئے گا۔"

☆......☆

فرہاد کی واپسی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ وہ میری طرح بارش میں بھیگ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر میری جان میں جان آئی لیکن یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ "کہاں رہ گئے تھے؟"

"وہ......! ناہید خالہ کے یہاں چلا گیا تھا۔" اس نے مجرموں کی طرح سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"گھڑی دیکھی ہے تم نے؟ کیا وقت ہو رہا ہے۔ تمہاری چھٹی تو پانچ بجے ہو جاتی ہے۔"

اس نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو میں کپڑے تبدیل کرلوں۔ اس کے بعد آپ کو پوری بات تفصیل سے بتاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے تم کپڑے تبدیل کر کے آؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔"

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔" اس نے نظریں چراتے ہوئے کہا اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں تو اس کے انتظار میں بھوکی اور پریشان بیٹھی ہوئی تھی اور وہ مزے سے دعوت اڑا کر آگیا۔ ایسا زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ مجھے بغیر بتائے کہیں گیا ہو۔ وہ پانچ گھنٹے وہاں بیٹھا رہا اور اس نے مجھے فون کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ میرے ذہن میں اندیشے سر اٹھانے لگے۔ کہیں ناہید اور اس کی بیٹی کوئی نیا کھیل تو نہیں کھیل رہیں لیکن میں نے اس خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ جب تک فرہاد سے بات نہ ہو جاتی۔ میرے لیے کسی وہم کو دل میں جگہ دینا ٹھیک نہیں تھا۔

چند منٹ بعد ہی وہ واپس آگیا اور کہنے لگا۔ "دراصل آج نائلہ کی سالگرہ تھی۔ اس نے مجھے ساڑھے چار بجے فون کر کے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں نے فوراً ہی آپ کو فون کر کے بتانے کی کوشش کی لیکن شاید ہمارا فون خراب ہے۔ تین چار مرتبہ گھر کا نمبر ملایا لیکن رابطہ نہ ہو سکا میں نے سوچا کہ خالہ کے گھر سے فون کر کے آپ کو بتا دوں گا لیکن وہاں سے بھی فون نہ ہو سکا۔ میں نے نائلہ سے کہا کہ جلدی گھر چلا جاؤں گا کیونکہ مما کو بتا کر نہیں آیا۔ یہ سن کر اس نے میرا ریکارڈ لگا دیا کہ تم ننھے بچے نہیں ہو جو کہیں گم ہو جاؤ گے۔ آرام سے چلے جانا۔ ابھی تو مہمان بھی نہیں آئے۔ اس کی سہیلیوں کی آمد سات بجے کے بعد شروع ہوئی۔ آٹھ بجے کیک کاٹا گیا۔ اس دوران میں نے اپنے موبائل سے

بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن آپ کا موبائل بند تھا۔ سالگرہ کی تقریب ختم ہوئی تو میں نے گھر آنے کا قصد کیا۔ اتنے میں موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ خالہ نے کھانا لگوا دیا اور کہا کہ بارش تھم جائے تو چلے جانا۔ جیسے ہی بارش کا زور کم ہوا میں گھر کے لیے روانہ ہو گیا لیکن سڑکوں پر پانی اور پھسلن بہت تھی۔ اس لیے گھر پہنچنے میں دیر ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے معصومیت سے بولا۔ "مما آپ ناراض تو نہیں ہیں؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے پیار سے کہا۔ "لیکن تم نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے یاد ہے کہ موٹر سائیکل خریدتے وقت تم سے طے ہوا تھا کہ کہیں جانا ہو تو گھر آنے کے بعد جاؤ گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مما لیکن نائلہ نے عین وقت پر فون کیا اگر پہلے گھر آ جاتا تو وہاں پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔"

"خیر جو ہوا سو ہوا آئندہ خیال رکھنا۔"

وہ سونے چلا گیا تو میں سوچوں کے بھنور میں گھر گئی۔ فرہاد نے جو کہانی سنائی اس میں کوئی جھول نہیں تھا۔ واقعی گھر کا ٹیلی فون صبح سے خراب تھا اور میں نے اس کی شکایت بھی کر دی تھی۔ ادھر میرے موبائل کی بیٹری کام نہیں کر رہی تھی اور میں اسے چارج پر لگانا بھول گئی تھی لیکن میں یہ سوچنے میں حق بجانب تھی کہ ناہید اور اس کی بیٹی نے فرہاد کو پھانسنے کے لیے جال بچھا دیا تھا ورنہ اسے پہلے بھی فون کر سکتی تھی۔ عین وقت پر فون کرنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ اسے گھر آنے یا مجھ سے پوچھنے کی مہلت نہ ملے اور وہ نائلہ کا خیال رکھنے کی خاطر سالگرہ کی تقریب میں دوڑا چلا آئے۔ نہ جانے نائلہ اور اس کے درمیان ٹیلی فون پر رابطے کا سلسلہ کب سے چل رہا تھا البتہ اس سے پہلے وہ کبھی وہاں نہیں گیا تھا۔

اس کے بعد فرہاد نے وقفے وقفے سے ناہید کے گھر جانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ خود چلا جاتا اور کبھی اسے کسی نہ کسی بہانے بلا لیا جاتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ وہ ہمیشہ مجھے بتا کر جایا کرتا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے وہاں جانے سے روک سکتی کیونکہ میں نے خود ہی اس سے کہا تھا کہ کبھی کبھی خالہ اور ماموں کے یہاں چلے جایا کرو۔ اس نے میری آدھی بات پر عمل کیا۔ خالہ کے گھر کے چکر تو لگانا شروع کر دیے لیکن ماموں کے یہاں جانے کا کبھی ذکر نہ کیا۔ اس میں کچھ میرے بھائی اور ان کے گھر والوں کا بھی قصور تھا۔ انہوں نے ہم سے واجبی سا تعلق رکھا ہوا تھا اور صرف نام کی رشتے داری نبھا رہے تھے۔

نائلہ کی سالگرہ والے واقعے کو چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ میرا اندیشہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ ایک روز رات کا کھانا کھانے کے بعد فرہاد نے شرماتے اور جھجکتے ہوئے کہا کہ نائلہ اسے پسند ہے اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ سنتے ہی میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا اور مجھے لگا کہ میرے سامنے ماماز بوائے کی بجائے ایک خود سر اور اپنے فیصلے خود کرنے والا بیٹا بیٹھا ہوا ہے۔ جس نے ساری زندگی چھوٹے چھوٹے کام بھی مجھ سے پوچھ کر کیے۔ اب اس میں اتنی ہمت آ گئی تھی کہ اس نے اتنا بڑا فیصلہ اپنے طور پر کر لیا۔ ناہید اور اس کی بیٹی نے ہی اسے اس موڑ تک پہنچایا تھا کہ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے۔

میں کسی قیمت پر بھی نائلہ کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھی لیکن اس نے یہ حق مجھ سے چھین لیا تھا اور میں اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اس فیصلے کی مخالفت کر سکوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ابھی تک اس کی شادی کے بارے میں سوچا ہی نہ تھا اور نہ ہی میرے ذہن میں کوئی لڑکی تھی۔ اتنا تو میں سمجھ گئی تھی کہ نائلہ کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور میری مخالفت بے سود ہو گی۔ البتہ یہ خطرہ ضرور تھا کہ ایسی صورت میں وہ مجھ سے باغی ہو سکتا ہے۔ فرہاد میرا اکلوتا بیٹا تھا اور میں اس سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔

میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ فیصلہ تم نے سوچ سمجھ کر کیا ہے؟"

"فیصلہ تو آپ کریں گی۔ میں نے تو صرف اپنی پسند بتائی ہے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے وہی ہو گا جو تم چاہتے ہو۔ میں اگلے اتوار کو ناہید کے گھر رشتہ مانگنے جاؤں گی۔"

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "اوہ مما یو آر گریٹ، مجھے معلوم تھا کہ آپ میری خوشی کی خاطر سب کچھ کر سکتی ہیں نائلہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ آپ کا بڑا خیال رکھے گی۔"

میں نے جمعہ والے دن ناہید کو فون کر کے بتا دیا کہ اتوار کو ایک ضروری بات کرنے اس کے گھر آ رہی ہوں۔ بھائی صاحب سے کہنا گھر پر ہی رہیں۔ شام کی چائے تمہارے ساتھ ہی پیوں گی۔ وہ میرا اشارہ تو سمجھ گئی ہو گی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا البتہ یہ ضرور کہا کہ میں فرہاد کو بھی ساتھ لے کر آؤں۔ دوسرے روز میں نے بازار جا کر ایک قیمتی انگوٹھی خریدی اور اتوار کے دن مٹھائی لے کر

فرہاد کے ہمراہ ناہید کے گھر پہنچ گئی۔ ان لوگوں نے میرا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد میں حرف مدعا زبان پر لے آئی اور کہا میں نائلہ کو اپنی بہو بنانا چاہتی ہوں۔ وہاں تو سب کچھ پہلے سے طے تھا۔ ناہید نے رواج کے مطابق سوچنے کے لیے بھی وقت نہیں مانگا اور بولی۔ "تم میری بہن ہو اور فرہاد گھر کا بچہ ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی عزت افزائی کیا ہو گی کہ نائلہ تمہاری بہو اور فرہاد کی دلہن بنے۔ مجھے یہ رشتہ قبول ہے۔"

اتنی دیر میں نائلہ چائے لے کر آ گئی۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ناہید کی اجازت سے اسے انگوٹھی پہنا دی۔ پھر سب لوگوں کا منہ میٹھا کر دیا گیا میں اس کام میں تاخیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے طے پایا کہ شادی چھ ماہ بعد ہو گی اور اگلے اتوار کو وہ لوگ فرہاد کو انگوٹھی پہنانے ہمارے گھر آئیں گے۔ پھر اگلا اتوار بھی آ گیا۔ ناہید اور اس کا شوہر انگوٹھی اور مٹھائی لے کر آئے۔ نائلہ بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس کی آزاد خیالی اور بے باکی دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ شاید اسے اس گھر میں آنے کی بہت جلدی تھی۔

دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں اور پھر وہ دن بھی آ گیا جب نائلہ دلہن بن کر ہمارے گھر آ گئی۔ میں نے فرہاد کی شادی میں دل کھول کر پیسا خرچ کیا تھا اور کسی چیز میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ایسی شاندار بری بنائی کہ دیکھنے والے اش اش کر اٹھے۔ ولیمہ بھی ایک بڑے کلب میں ہوا... نائلہ اپنے ساتھ واجبی سا جہیز لے کر آئی لیکن میں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا اور مزید چیزیں رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔

دلہن بیگم نے شادی کے دوسرے روز سے ہی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ مجھے ہمیشہ سے ہی صبح سات بجے ناشتا کرنے کی عادت ہے اور فرہاد بھی میرے ساتھ ہی ناشتا کیا کرتا تھا۔ برسوں سے یہی معمول چلا آ رہا تھا۔ اس روز میں نے جان بوجھ کر ایک گھنٹا تاخیر سے ناشتا لگوایا کہ رات کو یہ لوگ دیر سے سوئے ہوں گے لیکن جب آیا انہیں بلانے گئی تو بہو بیگم نے کہلوا دیا کہ آپ ناشتا کر لیں ہم دیر سے کریں گے۔ پچیس سال میں یہ پہلا موقع تھا جب میں نے تنہا ناشتا کیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور یوں لگا کہ ماماز بوائے کسی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں سے نکلا جا رہا ہے۔

دونوں میاں بیوی گیارہ بجے ناشتے کی میز پر آئے۔ مجھے سلام کیا اور ناشتا کرنے بیٹھ گئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور ناشتا کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں صوفے پر بیٹھی انہیں دیکھتی رہی۔ آنے والے دنوں کی تصویر میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں نے اس منظر کو ذہن میں رکھ کر حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کا فیصلہ کر لیا۔ اگر نائلہ یہ سوچ کر آئی تھی کہ فرہاد کو مجھ سے چھین لے گی تو یہ اس کی بھول تھی۔ وہ وقت آنے سے پہلے میں خود ہی فرہاد کو اپنی زندگی سے نکال دوں گی۔ میں اس کی محتاج نہیں میرے پاس اب بھی اتنا جمع تھا کہ بقیہ زندگی آرام سے بیٹھ کر کھا سکتی تھی۔

ماماز بوائے نے پہلی بار اس وقت میرے حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کی جب نائلہ کے گھر والوں نے ہمیں چوتھی کی دعوت میں بلایا۔ میں وقت پر تیار ہو گئی لیکن وہ دونوں ابھی تک کمرے سے باہر نہیں آئے تھے۔

خدا خدا کر کے دو گھنٹے بعد ان کی تیاری مکمل ہوئی۔ میں حسب معمول فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے لگی تو نائلہ ٹھٹک کر اپنی جگہ کھڑی ہو گئی اور اس نے تیز نظروں سے فرہاد کو گھورا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "مما پلیز آپ پیچھے بیٹھ جائیں۔ نائلہ کو آگے آنے دیں۔"

اس لمحے مجھے شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ جی چاہا کہ جانے سے انکار کر دوں لیکن سمدھیانے کا معاملہ تھا۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ سارے راستے میں فرہاد کے طرز عمل پر غور کرتی رہی۔ یہ وہی لڑکا تھا جو ساری عمر میرے اشاروں پر ناچتا رہا لیکن دو دن میں ہی اتنا بدل گیا کہ اس نے میری سیٹ اپنی بیوی کو دے دی۔ اگر یہی حال رہا تو چند ہی دنوں میں وہ مجھے بھی گھر سے باہر نکال دے گا۔ اسی وقت میں نے اپنی حکمت عملی طے کر لی۔ پہلا فیصلہ تو یہ کیا کہ آئندہ کبھی ان لوگوں کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی کیونکہ میں اپنی جگہ کسی اور کو نہیں دے سکتی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ ان دونوں میاں بیوی کو مکمل طور پر نظر انداز کروں گی اور ان کے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی۔ ناشتے یا کھانے پر بھی ان کا انتظار نہیں کروں گی۔

میں تو اپنی طرف سے مورچہ بندی کر کے بیٹھ گئی لیکن فرہاد ابھی تک ماماز بوائے ہی تھا۔ اب بھی وہ بہت سے کام

تجھ سے پوچھ کر کیا کرتا تھا کیوں میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایسا کرے کیونکہ اس وقت نائلہ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اسے فرہاد کا یہ انداز بالکل پسند نہ تھا۔ میں اس چنگیاں ختم ہوئیں تو زمرد کی اپنی پرانی ذکر پر بات آئی۔ نائلہ کو ذرہ سے اٹھنے کی عادت تھی۔ اس لیے فرہاد نے ایک بار پھر میرے ساتھ باتیں کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے بڑا کہ یہ کا طلبہ ستا ہوا ہے۔ نائلہ مجھے بدلہ لینے کی آج اس شام تک پہنچا اور اب اب بھی ضرورت پڑنے پر ان سے مشورہ کرتا رہوں گا چاہے ہم بعد میں بارہا مارا جائے۔

"دیکھو نائلہ۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ماضی وہاں کہ میں نے ضرورت سے زیادہ فرہاد کو اپنے ساتھ جوڑے رکھا لیکن یہ میری کمزوری تھی۔ جسے بیک وقت ماں اور باپ دونوں کا فرض انجام دینا تھا۔ ذرہ کی کمی کا احساس ہر کمزوری تھی تو یہ کچھ جانتی ہے۔ اس لیے اس کا سایہ بن کر رہ گئی۔ میرا وقت اس کے ساتھ ہی گزرا ہے کیس کی کے بچوں سے بڑھ کر ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ جو پہناؤں وہ پہن لیتا۔ جو کھلاؤں وہ کھا لیتا۔ کاش اگر تم دونوں میں سے کوئی ایک بھی اس کی شادی بھی میں اپنی مرضی سے کرتی۔"

"کیا اس شادی میں آپ کی مرضی شامل نہیں تھی؟" نائلہ نے چونک کر پوچھا۔

"نہ۔ ظاہر تو یہی ہوا۔ میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ مجھے تو اچھی صلاح ہی نہیں ملی۔ اس سے پہلے بھی فرہاد نے تم سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور فرہاد کے مجھے اپنے بیٹے کی خوشی مرضی میں اپنے تحفظات رکھے تھے۔ پھر بھی۔"

"وہ کہتا ہے کہ آپ کی مانیں درست ہوں لیکن آپ فرہاد کو مارنا چاہتے ہے تو خول سے باہر آجانا چاہیے۔ شادی کے بعد انسان کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ آپ نے فرہاد کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی ماضی کا حصہ ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ یہ ساری غرباء کا خراج ادا کرتے رہیں۔ اب انہیں اپنے فیصلے خود کرنا چاہئیں۔ مجھے بڑی گفت ہوئی ہے جیسے یہ ہر بات میں ماں سے پوچھ کر ہوا ہے۔ واقعی اب اسے ماں کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

کر کرا مت کرو۔ میں کیا بتاؤں کہ تمہیں مری سوال یا کا خان میں سے کہاں جانا چاہیے۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنی بیوی سے مشورہ کر کے کوئی دو ہی تجاویز میرے سامنے رکھ دو۔"

"لگتا ہے آپ ناراض ہو گئی ہیں لیکن مجھے ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ماضی بارہا کے طور ستا آرام ہوں۔ آج یہی کی زبان سے بھی سن لیا۔ نائلہ مجھے مارنا چاہتے ہوئے پوچھ رہے۔ ساسے مشوروں اور خیالی

"نہیں ہے۔ میں اپنے بچوں کو مارنا نہیں چاہتا۔ میں ماں ہوں جانتی ہوں۔"

"اب تو بھی اپنے بچے کو مارنا نہیں چاہتی۔ ہاں گی۔" فرہاد نے بتایا۔

"یہ وقت آنے پر ہی پتا چلے گا۔"

اس کے بعد بھی کئی واقعات ہوئے۔ میری جگہ کوئی کمزور عورت ہوتی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایسی سیفٹر میں پناہ لے لیتی لیکن میں بڑے مضبوط اعصاب کی واقع ہوئی تھی۔ مگسٹ ناامیدی میں میں تھا۔ میں نے ساتھ مقابلہ کیا تا تو میرے ساتھ مقابلہ کسی کسی۔ اب وہ راست پر آنا چاہے ہے اسی باتھ کا کام تھا۔ یہ عورت ہوئی کی طرح میں بھی خواہش کی کہ اس کا اپنا گھر ہو۔ جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق جیے۔ لیکن سرحد اس خواہش کا پورا ہونا ممکن نہیں تھا۔ فرہاد کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ علیحدہ مکان کے متحمل ہو سکتا اور اسے ایسا کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ یہ مکان بھی اسی کا تھا تاہم میری زندگی میں وہ اب پرانا خلا جو نکلے نہیں ہو سکتا تھا۔ گھر کی بالکل میں بھی اور میں نے سارے معاملات اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے۔ نائلہ کو میں نے ایک کمرے سے نکال کر دوسرا کمرہ دے دیا تھا۔ اب میرا مکان اس گھر میں رہ رہی تھی اور اتنا اعتماد بھی نہیں تھا کہ وہ ایک کمرا بھی ادھر سے ادھر کر سکے۔

ایک دن وہ میرا اپنی بیٹی سے ملنے آئی۔ دونوں مائیں بیٹی کافی دیر تک کمرے میں مصروف گفتگو رہیں۔ میری عادت نہیں تھی کہ میں بیٹی کی مہمان اتفاق سے میرا کمرا اس کمرے کے پاس ہے ہوا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور کمرے میں ہونے والی باتوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں اپنا کام نہ سن کر کھٹکا کھٹکھٹایا۔ دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سننے لگی۔ یہ بیوقوفی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں قصور خود بھی جانتی ہوں کہ ہم دونوں اپنے فیصلے خود کر لیں گے اور مجھے اس کی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ بہتر ہو گا کہ تم اپنی بیوی سے مشورہ کرو کیونکہ وہی تمہاری سچی خیر خواہ ہے۔"

"لگتا ہے آپ ناراض ہو گئی ہیں لیکن مجھے ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ماضی بارہا کے طور ستا آرام ہوں۔ آج یہی کی زبان سے بھی سن لیا۔ نائلہ مجھے مارنا چاہتے ہوئے پوچھ رہے۔ ساسے مشوروں اور خیالی بدلہ لینے کی آج اس شام تک پہنچا اور اب اب بھی ضرورت پڑنے پر ان سے مشورہ کرتا رہوں گا چاہے ہم بعد میں بارہا مارا جائے۔

"دیکھو نائلہ۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "اس میں برا ماننے والی کوئی بات نہیں ہے۔ ماضی وہاں کہ میں نے ضرورت سے زیادہ فرہاد کو اپنے ساتھ جوڑے رکھا لیکن یہ میری کمزوری تھی۔ جسے بیک وقت ماں اور باپ دونوں کا فرض انجام دینا تھا۔ ذرہ کی کمی کا احساس ہر کمزوری تھی تو یہ کچھ جانتی ہے۔ اس لیے اس کا سایہ بن کر رہ گئی۔ میرا وقت اس کے ساتھ ہی گزرا ہے کیس کی کے بچوں سے بڑھ کر ہے۔ اس کی اپنی کوئی مرضی نہیں تھی۔ جو پہناؤں وہ پہن لیتا۔ جو کھلاؤں وہ کھا لیتا۔ کاش اگر تم دونوں میں سے کوئی ایک بھی اس کی شادی بھی میں اپنی مرضی سے کرتی۔"

"کیا اس شادی میں آپ کی مرضی شامل نہیں تھی؟" نائلہ نے چونک کر پوچھا۔

"نہ۔ ظاہر تو یہی ہوا۔ میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔ مجھے تو اچھی صلاح ہی نہیں ملی۔ اس سے پہلے بھی فرہاد نے تم سے شادی کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور فرہاد کے مجھے اپنے بیٹے کی خوشی مرضی میں اپنے تحفظات رکھے تھے۔ پھر بھی۔"

"وہ کہتا ہے کہ آپ کی مانیں درست ہوں لیکن آپ فرہاد کو مارنا چاہتے ہے تو خول سے باہر آجانا چاہیے۔ شادی کے بعد انسان کی نئی زندگی شروع ہوتی ہے۔ آپ نے فرہاد کے ساتھ جو کچھ کیا وہ بھی ماضی کا حصہ ہے۔ اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ یہ ساری غرباء کا خراج ادا کرتے رہیں۔ اب انہیں اپنے فیصلے خود کرنا چاہئیں۔ مجھے بڑی گفت ہوئی ہے جیسے یہ ہر بات میں ماں سے پوچھ کر ہوا ہے۔ واقعی اب اسے ماں کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

نص

آنکھاں، کھول کھول کر بیان کرنا۔ وہ قرآنی آیات جو بالکل کھلا رہی ہیں، صاف نصوص۔ اس کا اطلاق قرآن و حدیث دونوں پر ہی ہوتا ہے۔ اسے وہ احکام جو قرآن یا حدیث میں کھل کھلا کے بیان کیے گئے ہیں۔

مرتب: بلور دخان، شخوپورہ

جہیز جہنم

ایک جلیل القدر فرشتے کا کام جو انہیں کی طرف وحی لانا تھا قرآن میں حضرت جبرائیل کا کام تین جگہوں پر آیا ہے۔ دوسرے مقامات پر فقط اشارے ملتے ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت جبرائیل حضرت جبرائیل پر براق لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور بتایا کہ اللہ نے تمہیں کتنا اعزاز بخشا ہے۔ تمہیں انعامات دیے، انجیل اور توریت میں بھی آپ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

مرسلہ: نازاں فاطمی پردیس۔ حیدرآباد

وہ اوّل درجے کی کنجوس عورت ہیں لیکن تمہیں تو ان باتوں کا خیال ہونا چاہیے۔ دیکھو تو گھر کی کیا حالت ہو گئی ہے۔ کئی سالوں سے یہ تار ٹک ویسے ہی ہیں ہوا سب چیزیں پرانی اور بوسیدہ ہو گئی ہیں۔ ٹی وی، فریج، ٹائلس، صوفے، پردے سب کو بدلنے کی ضرورت ہے گھر کیا ہے لگتا ہے کسی مویشی میں آگئے ہیں۔"

"امی میں کیا کروں۔ میری اس گھر میں حیثیت ہی کیا ہے۔ ایک مہمان کی طرح رہتی ہوں جب چاہے مجھ کو آتی جاتی ہے۔ میں ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ ہاں میں اپنی مرضی سے ایک گھر لے لوں تو اور بات ہو سکتا ہے۔"

"فرہاد نے کہو۔ اسے احساس دلاؤ کہ گھر کی حالت بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی ماں کا بہت لاڈلا اور چہیتا بیٹا ہے اور ماں کوئی چیز ایسی خریدنے پر تیار نہیں ہے۔"

"جو حکم! مادر بولا ہے۔" نائلہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "وہ کیا بات کریں گے۔ ان کی تو ماں کے سامنے زبان نہیں کھلتی۔ میں نے گاڑی بدلنے کی بات کی تھی تو ماں سے کہو یہ اپنی کی گاڑی ہے۔ مجھے تو بڑی شرم آتی ہے ان پچیس سال پرانی گاڑی میں کہیں جاتے ہوئے۔ لوگ ہنسی کیا کہتے ہوں گے۔"

"کیا فرہاد کی اتنی حیثیت بھی نہیں کہ وہ دوسری گاڑی

جنت البقیع

جنت البقیع مدینہ منورہ کا معروف قبرستان ہے۔ یہ قبرستان مسجد نبوی سے مشرق کی سمت واقع ہے۔ پہلے زمانے میں یہاں آنے پہنچنے کے لیے سادات کی آبادی کی بہت سی گلیوں سے گزرنا پڑتا تھا لیکن اب سعودی نے مسجد نبوی اور بقیع کے درمیان سیدھی، کھلی پختہ سڑک بنادی ہے۔ جنت البقیع کا قبرستان زمانہ جاہلیت سے اہل مدینہ کا قبرستان چلا آرہا ہے۔ عقائیوں کے دور میں یہاں بھی بہت سی پختہ قبریں اور ان پر خوب صورت قبے بنے ہوئے تھے لیکن نجدی حضرات نے شریف حسین کو شکست دے کر جب مدینہ منورہ پر قبضہ کیا تو یہاں کے "ڈھکے" قبے گرادیے اور قبریں توڑ دیں۔ اس قبرستان کی فضیلت میں کئی احادیث مروی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ جو شخص مدینے میں مرے اور بقیع میں دفن کیا جائے وہ میری شفاعت سے ممتاز ہوگا۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے آنحضورؐ اپنی قبر مبارک سے اٹھیں گے ان کے بعد اہل بقیع اور پھر اہل مکہ اٹھیں گے۔ حدیث میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ وہ شخص ایسے ہیں جن کی روشنی آسمان پر ایسی ہے جیسی کہ زمین پر چاند اور سورج۔ ایک تو مقبرہ بقیع ہے اور دوسرا مقبرہ عقلان۔ اس قبرستان میں بے شمار صحابی مدفون ہیں۔ مسلمانوں میں سے جنت البقیع میں سب سے پہلے دفن ہونے والوں میں حضرت عثمان بن مظعون ہیں ان کے بعد سیدنا ابراہیم بن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قبرستان میں دفن کیے گئے۔ جب جنت البقیع میں زیارت کے لیے جائیں تو

خریدے گے۔" ثابیہ نے چڑ کر کہا۔

"اس کے لیے بھی تمہارے پر چھاپڑے گا۔" نائلہ نے چڑ کر کہا۔

"اس تو نیچی رہو ہای طرح بے یارو مددگار، بھلے اگر چاہتا تو فرہاد اس بری طرح ماں کے پر ہاڑ ہے تو بھی اس کے ساتھ تمہاری شادی نہیں کرتی۔ میں نے ایسا کوئی سرو نہیں دیکھا جس کی اپنی کوئی مرضی نہیں۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے۔" نائلہ بے بسی سے بولی۔

"میں تو اس دن کا انتظار کر رہی ہوں۔ جب اس گھر پر میرا راج ہوگا۔"

گویا وہ سرے لفظوں میں وہ یہ میرے مرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ فرہاد کو تو بھنک نہ لگی۔ کیں ایسا نہ ہو کہ مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرلے۔ اب مجھے اپنے تحفظ کا بھی بندوبست کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ فیصلہ بھی کرلیا کہ نائلہ کو آہستہ آہستہ گھر کے معاملات میں شریک کیا جائے تاکہ اقتدار میں حصہ ملنے کے بعد وہ مطمئن ہو جائے اور میرے مرنے کا انتظار کرے چنانچہ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد میں نے رات کے کھانے پر نائلہ کی موجودگی میں فرہاد سے کہا۔

"میرے خیال میں تمہیں دوسری گاڑی لے لینی چاہیے۔ میری کار تو ویسے بھی بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اسے میں اپنے استعمال میں رکھوں گی۔"

فرہاد نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ "مما دوسری گاڑی کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو بائیک پر دفتر جاتا ہوں اور کبھی آنے جانے کے لیے ٹیکسی کافی ہے۔"

"میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی کار سے دفتر جاؤ۔ شریف ٹریفک بہت خراب ہو گیا ہے۔ بائیک پر اتنی دور کا سفر ٹھیک نہیں۔"

"لیکن مما دوسری گاڑی کے لیے تو بہت پیسے چاہئیں۔ میں شاید اتنا فوراً نہ کر سکوں۔"

"کوئی بات نہیں اگر کمی ہوگی تو میں دے دوں گی لیکن یہ کام اس ہفتے ہو جانا چاہیے۔"

شکر ہے کہ فرہاد نے یہ نہیں پوچھا کہ میرا کون سا بینک اور ماڈل کی گاڑی خریدوں ورنہ نائلہ کو پتے لگ جاتے۔ اس وقت تو میں گاڑی کا سن کر واقعی خوش نظر آرہی تھی۔ پھر میں نے اسے کتاب کرتے ہوئے کہا۔ "نائلہ میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اپنے کچھ سے باہر نکلو اور کم سے کم معاملات میں حصہ لینا شروع کردو تاکہ تمہیں بھی معلوم ہو کہ گھر کس طرح چلایا جاتا ہے۔"

"آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے نزخ کر جواب دیا۔

"میں یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں اور اب

سنت یہ ہے کہ قبیح کے دروازے پر پہنچ کر السلام علیکم یا اہل القبور کہے اور... دعا پڑھیں۔ نیز دعا سے پہلے یا بعد گیارہ مرتبہ سورۃ اخلاص پڑھ کر اس کا ثواب اہل مقبرہ کی ارواح کو بھیج دے۔ سلام کی نیت اور حضور یہ ہونا چاہیے کہ جنتی آل واصحاب اور مومنین جو اس قبرستان میں آرام فرما ہیں انہیں ثواب پہنچے پھر اپنا حاجت مند ہونا کہ ہماری بھی قبر کی جانب کرے جو بقیع کے دروازے کے متصل یا بھی جانب مدفون ہیں اور زیارت ہم بھی انہیں پر کرنی چاہیے۔ اس بارے میں بعض علما کا اختلاف ہے کہ کس قبر سے زیارت کی ابتدا کرے۔ اہل کروہ کے نزدیک حضرت عباس اور ائمہ اہل بیت سے جو لوگ آپ کے قدیم مدفون ہیں ان سے ابتدا کرے کیونکہ یہ قرب ہے اور یہاں سے گزر کر دوسروں کی زیارت کی طرف متوجہ ہو۔ ایک شخص کی بے ادبی یہ ہے بڑھ کر وہ اپنی دلیل میں یہ بات بھی کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں اہل مدینہ کا یہی عمل تھا۔ دوسرے گروہ کے نزدیک زیارت کی ابتدا حضرت ابراہیم سے کرے کیونکہ ان کے ساتھ ان کی بہنیں مدفون ہیں اور چونکہ یہ آپ کے جزو شریف اور آپ کے گوشے ہیں اس لے دوسروں کو ان پر مقدم کرنا مناسب نہیں۔ بعض علما نے بعض علما نے اس سے مختلف آرا کا اظہار بھی کیا ہے۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلوپیڈیا صفحہ نمبر 669
مرسلہ: نرجس مختاری، کراچی

ہوئے بولی۔ "میں اپنی پسند کی گاڑی خریدوں گی۔"

یہ بھی میری ایک چال تھی۔ پرانی گاڑیوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا اگر کل کو اس میں کوئی بڑا کام نکل آیا تو میں بے صورت خرچوں کی زد میں آسکتی تھی۔ اس لیے میں نے نائلہ کو آگے کر دیا تاکہ سارے ذمے داری اس پر آجائے۔

دوسرے دن نائلہ نے فرہاد کے ساتھ جا کر گاڑی پسند کرلی۔ فرہاد نے مجھے آکر بتایا کہ ایک جیسا بھائی بہن لیا اور پوری بچت خود ہی کی۔ سلیٹی رنگ کی خوبصورت سی گاڑی تھی۔ نائلہ گاڑی لے کر آئی تو اس کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ وہ مٹھائی بھی لے کر آئی تھی۔ فرہاد نے کہا۔ "مما میں نے آپ کو گاڑی میں ایک چکر دے دوں۔" مٹھائی کھا کر میں نے تحریہ کر رکھا تھا کہ کبھی اس کے ساتھ گاڑی میں نہیں بیٹھوں گی تیں اس خوشی کے موقع پر فرہاد کا دل تو نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ اس لیے تیار ہو گئی۔ میں نے پھولا روانہ ہونا تو نائلہ میرا بازو پکڑتے ہوئے بولی۔

"نہیں آنٹی آپ آگے بیٹھیں۔ میں پیچھے بیٹھ جاتی ہوں۔"

میں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ یہ کایا پلٹ کیسے ہو گئی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ حسن سلوک سے دلوں پر بھی حکومت کی جاتی ہے۔ میں نے فرہاد کو گاڑی خریدنے کی اجازت دی تھی اور نائلہ اپنے ساتھ شریک مجھے بھی سہارے کی ضرورت ہے۔ میں تم سے یہیں کہہ رہی لگا دی۔ ان کاموں کے لیے آپ اداس ہی موجود ہیں۔ ہم کاسودا ہے۔ یقین جانو میں بھی دادا دادی تو صرف یہ سوچ کے گزر جاتا ہے کہ آج کیا پکایا جائے گا۔"

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" فرہاد بولا۔ "واقعی انہوں نے بہت کام کرلیا۔ اب تمہارا فرض ہے کہ ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"

"میں نے کب انکار کیا ہے۔ آنٹی جو کہیں گی میں وہی کروں گی۔"

میرا پہلا داؤ کامیاب رہا۔ میں نے گاڑی کا جھانسا دے کر نائلہ کو اپنے قابو میں کرلیا تھا۔ وہ فرہاد کو مجھ سے چھینا چاہ رہی تھی اور میں نے اسے ہی مار کرل بنانے کے منصوبے پر کام ضرور کر دیا تھا۔ تیسری چادر میں بھی فرہاد نے مجھے بتایا کہ ایک کار ڈیلر سے اس کی گفتگو اس کے مطابق تین چار گاہکوں کی بھی ہے باہر کھڑا ہو کر مجھے معاملات میں حصہ لینا شروع کر دوں تاکہ مجھے بھی معلوم ہو کہ گھر کس طرح چلایا جاتا ہے۔"

"آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" اس نے نزخ کر جواب دیا۔

"میں یہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گئی ہوں اور اب

اقتدر کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے حق سے دستبردار ہو گئی اور مجھے فرسٹ سیٹ پر بٹھا دیا۔

دو تین ہفتے گزر جانے کے بعد میں نے نائلہ سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ہمیں گھر کی سیٹنگ تبدیل کر لینی چاہیے۔ سب چیزیں پرانی ہو گئی ہیں اور رنگ روغن کی بھی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ سارے کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ تم اپنی گنجائش اور پسند کے مطابق ایک ایک کر کے چیزیں تبدیل کر سکتی ہو۔ میں سمجھتی ہوں کہ سب سے پہلے باتھ روم ہونا چاہیے۔"

اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ میں نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی اور ساتھ ہی اسے احتیاط بھی دے دی تھی کہ کہیں کوئی خواہ مخواہ کی فرمائش نہ کر بیٹھے۔ وہ ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ اس میں میرا کچھ نہیں بگڑ رہا تھا۔ وہ بااختیار بننے کے شوق میں اپنے سیاں کی کمائی جس طرح چاہے خرچ کرے۔

اس نے یہی بات فرہاد سے کہی تو وہ حسب عادت بولا۔ "ماما سے پوچھو لو۔" اس پر نائلہ چڑ گئی اور جھلاتے ہوئے بولی۔ "میرا کسی کا مشورہ سے تم کل ہی کسی ایجنسی سے جنگ سائز بلڈوزر منگا کے میں اسے تکلو کیسم سمجھا سکوں۔"

دوسرے دن سے ہی گھر میں تبدیلیوں کا آغاز ہو گیا۔ پہلے رنگ روغن ہوا۔ پھر ایک ایک کر کے تمام پردے، صوفے اور پردے تبدیل ہوئے۔ پھر ٹی وی، ڈی وی اور فریج کی باری آئی۔ جس دن گھر میں نیا ایل ای ڈی آیا۔ اس کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ فرہاد کی اتنی خوشی تو مجھے کسی چیز پر نہیں ہوئی تھی۔ پھر اس کا پیک بیس بھی اچھا خاصا تھا۔ کیونکہ اس کی پوری کمائی تو بینک میں ہی جاری تھی۔ گھر کا خرچ، ملازموں کی تنخواہ اور بلوں کی ادائیگی اب بھی میرے ہی ذمے تھی۔ بینک سے ملنے والے منافع اور پنشن کے ذریعے میرے سارے اخراجات بخوبی پورے ہو رہے تھے۔

انہی دنوں مجھے خوش خبری ملی کہ نائلہ اُمید سے ہے اور چند ماہ بعد اس نے ایک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا۔ مجھے لگا کہ دوسرا فرہاد اس دنیا میں آ گیا ہے۔ وہ بھی بہو فرہاد جیسا تھا۔ اس کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو فرہاد نے اپنا روایتی جملہ دہرایا۔ "ماما آپ بتائیں۔"

مجھے مقصد آ گیا اور بولی۔ "تم بچے کا نام بھی نہیں رکھ سکتے۔ تم دونوں مل کر ہی کوئی نام تجویز کر لو۔"

بہت سوچ بچار کے بعد اس کا نام فرہاد رکھا گیا۔ نائلہ اتنی خوش تھی جیسے اسے ملکہ الیزبتھ کی دولت مل گئی ہو۔ وہ اس کی جان سے زیادہ حفاظت کر رہی تھی کہ کہیں کوئی اس سے دولت چھین نہ لے۔ وہ شروع دن سے ہی بچے پر پوری طرح قابض ہو گئی تھی۔ میرا بہت دل چاہتا تھا کہ بچے کو گود میں لوں۔ جب بھی آیا کے ذریعے بچے کو اپنے پاس بلاتی تو چند منٹ بعد ہی بلکنا شروع کر دیتا۔ نائلہ کہتی کہ میں بہلانے کے لیے اپنے ساتھ لے جاتی ہوں، چپ کراتی ہوں، کھلاتی ہوں، سلاتی ہوں، اس لیے یہ میرے پاس زیادہ رہتا ہے۔ میں کیا کہتی۔ اس کے قریب ہی نہ آتا تھا۔ میں کیا کرتی۔ جب وہ اسکول جانے کے قابل ہوا تو اسے اسکول چھوڑنے جاتی اور چھٹی ہونے پر خود ہی لے آتی۔ اس کام کے لیے وہ میری خدمات استعمال کر رہی تھی۔ فرہاد نے بہت کہا کہ وہ ان کی ذمہ داری نہیں ہے لیکن وہ مجھ سے کسی دو ٹوک بات کرنے سے قاصر تھا۔ فرہاد نے بتایا کہ اس نے ایک نوکر رکھ لیا ہے جو اس کی پوری ذمے داری اس نے لے رکھی ہے۔ اسے کیا کھانا ہے، کیا پہنانا ہے، کس اسکول میں پڑھانا ہے، کب سونا ہے، کب اٹھانا ہے، سب کچھ وہ خود ہی طے کرتی تھی۔ اسے اسکول میں کسی کے ساتھ کھیلنے یا کسی کو دوست بنانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں نے تو ہر چند بھی فرہاد کو کراٹے میں کھیلنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اس معاملے میں وہ نائلہ سے بھی زیادہ سخت نکلی اور اس نے فرہاد کو دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیا۔ تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا اور میں نے پہلی بار اس کے معاملے میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ "اس طرح تو بچے کی شخصیت بالکل دب کر رہ جائے گی۔ اگر تم اسے اسی طرح اپنے اشاروں پر چلاتی رہیں تو یہ بھی فرہاد کی طرح نامراد بن جائے گا۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" اس نے غصے فرہاد کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

شمارہ جنوری 2016ء کی منتخب بہترین کہانیاں
ہماری پسند کی ٹاپ فیورٹ کہانیوں کا انتخاب
☆ اول: چھوٹا سا گھر ..... رابعہ (لاہور)
☆ دوم: خانہ خالی ..... فصل (سیالکوٹ)
☆ سوم: خواب پائیدار ..... ندیم الانصاری (کراچی)

PEELS LIKE FRUIT.
PEELS LIKE FRUIT
Same great taste.
New easy peel cap
Shezan
Fruit Drink
Lemon Barley